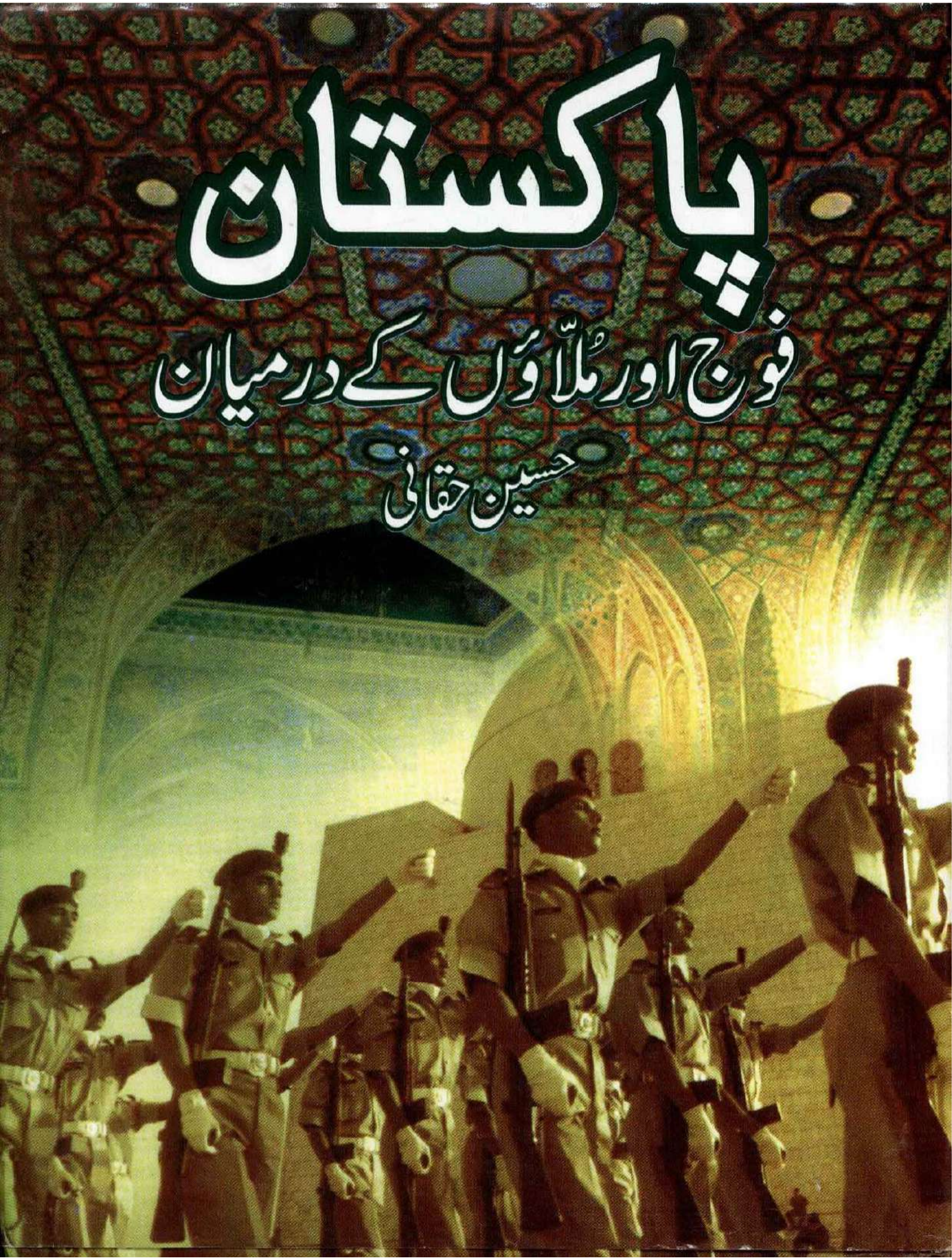
پاکستان
فوج اور مُلّاؤں کے درمیان
حسین حقانی

پاکستان

فوج اور ملاؤں کے درمیان

پاکستان

فوج اور ملاؤں کے درمیان

حسین حقانی

مترجم:

شفیق الرحمٰن میاں

مصنف: حسین حقانی   مترجم: شفیق الرحمان

پاکستان
فوج اور ملاؤں کے درمیان

(فہرست ابواب)   صفحہ نمبر

پیش لفظ

اظہار تشکر

1.	تعارف: شناخت اور نظریہ	1
2.	نظریاتی سرحدوں کا دفاع	48
3.	پرانا اور نیا پاکستان	81
4.	اسلامی جمہوریہ سے اسلامی ریاست تک	120
5.	افغان جہاد	145
6.	دیگر زرائع سے فوجی حکمران	180
7.	سرحدوں کے بغیر جہاد	240
8.	نتیجہ نظریاتی ریاست سے فعال ریاست	285
9.	Notes	303

پیش لفظ

دہشت گردی کے خلاف عالمی سطح پر لڑی جانے والی جنگ میں جتنے ممالک امریکہ کا ساتھ دے رہے ہیں، ان میں پاکستان پریشان کن ترین لیکن بلاشبہ اہم ترین ملک ہے۔ سالہا سال سے اس پر الزام عائد کیا جارہا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی سابقہ حکومت اور بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کی حمایت کی صورت میں وہ دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ تاہم نائن الیون کے بعد اس نے اپنا وزن امریکہ کے پلڑے میں ڈال دیا اور افغانستان میں امریکہ نے جو فوجی کاروائی کی۔ اس میں آخر الذکر کو پاکستان کی معاونت حاصل رہی۔ دونوں ملک آپس میں انتہائی اہم اور بیش قیمت انٹیلی جنس کا تبادلہ بھی کرتے رہے۔ آج پاکستان بیک وقت اسلامی انتہا پسندوں کی افزائش کے لئے زرخیز ترین زمین کا کام بھی دے رہا ہے اور جنوبی ایشیاء بلکہ دنیا بھر سے دہشت گردی کے خاتمے کی امریکی کوششوں میں اس کا کلیدی اتحادی بھی ہے۔

اس مبہم تعلق کی جڑیں پاکستان کے اسلام پسندوں اور پاکستانی فوج کے درمیان تاریخی اتحاد سے جا ملتی ہیں۔ "کارنیگی انڈومنٹ" کے مہمان سکالر۔ سیاسی مبصر اور پاکستان کے سابق سفارتکار حسین حقانی نے زیر نظر کتاب میں اس نو عمر اور مضطرب ریاست کی دل چسپ اور پرکشش سیاسی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی مہارت سے ان اہم محرکات کا سراغ لگایا ہے۔ جنہوں نے ملکی ارتقاء کے خدوخال کو متشکل کیا۔

حقانی بتاتے ہیں کہ پاکستان کو لاحق اندرونی اور بیرونی خطرات کا ادراک کس طرح اسلام پسندوں اور فوج کے درمیان ایک کمزور کن اور مبنی بر مصلحت شراکت کے معرض وجود میں آنے کا باعث بنا۔ سرکاری حکام نے کثیر اللسان اور متعدد نسلی گروہوں کی حامل پاکستانی ریاست کو متحد اور یکجا رکھنے کے لئے ہی نہیں، بھارت کی غالب ہندو اکثریت کے مقابلے میں پاکستان کی شناخت کو قوی تر بنانے کے لئے بھی اسلام ہی کو استعمال کیا۔ ہمسایہ ملک بھارت کے ساتھ مقاومت سے زیادہ فائدہ پاکستانی فوج نے اٹھایا اور اپنے ارفع و اعلیٰ مقام کے باعث حکومتی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ سویلین حکومتوں کے ادوار میں بھی فوج نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ حقانی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ پاکستان کے سیاسی راہ نماؤں نے اپنے ذاتی ایجنڈوں کی تکمیل اور فروغ کیلئے مذہبی وطن پرستی کا بار بار سہارا لیا لیکن اس کے ناپسندیدہ اور منفی اثرات پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ حقانی تنبیہاً رقمطراز ہیں۔ "اسلام پسندوں اور پاکستان فوج کے درمیان تاریخی اتحاد میں صلاحیت موجود ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف کی جانے والی کاروائیوں کو سبوتاژ کر سکے۔ اسلامی دنیا کے کلیدی اور اہم طبقات کو انتہا پسند بنا دے اور بھارت اور پاکستان کو ایک مرتبہ پھر جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کرے"۔

"پاکستان۔ ملاؤں اور فوج کے درمیان"(Pakistan Between Mosque and Military) کے عنوان سے لکھی گئی یہ کتاب سویلین حکمرانی کے دور کی سمت واپسی اور فوج کے ساتھ اسلام پسندوں کے اتحاد کے خاتمے کے لئے غیر مبہم مبنی پر دلیل اور قابل قبول تجویز ہے۔ حقانی اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "(ملاؤں اور فوج کی) اس شراکت پر انحصار نے ہمیشہ جنگ کے شعلوں کو ہوا دی۔ یہی انحصار دہشت گردی کے خاتمے کے لئے کی جانے والی کاوشوں کی راہ میں رکاوٹ بنا اور اسی نے ملک وقوم کے قیمتی (اقتصادی) ذرائع کا رخ ترقیاتی کاموں سے ہٹا کر کسی اور جانب موڑ دیا"۔ ایسا کرتے ہوئے حقانی اس موقف۔ خیال یا مفروضے کو سختی سے مسترد کرتے ہیں کہ (حکومت میں ایک حد سے) زیادہ جمہوری شراکت اسلامی انتہا پسندوں کو اقتدار میں کھینچ لائے گی۔

پاکستان اور امریکہ کے مقدر میں جو مماثلت آج دکھائی دے رہی ہے۔ ماضی میں اس کی کوئی نظیر دستیاب نہیں۔ دہشت گردی کے خلاف اقدامات سے لیکر جوہری پھیلاؤ کی راہ میں بند باندھنے تک اور امریکہ کی بحرانی خارجہ پالیسی کی کامیابی کے لئے پاکستان کے ساتھ موثر تعاون ناگزیر ہے۔ دونوں ملکوں کے پریشان کن باہمی انحصار کی تازہ ترین مثال ڈاکٹر اے کیو خان کا جوہری نیٹ ورک ہے جس کا تباہ کن انکشاف 2003ء میں ہوا۔ جہاں سے شمالی کوریا، ایران، لیبیا اور دیگر ممالک کے ہاتھ جوہری بم کی تیاری میں کام آنے والے ساز وسامان کے ہمراہ اس کے ڈیزائن بھی فروخت کئے جاتے رہے۔ اس نیٹ ورک کو آپریٹ پاکستان میں بیٹھ کر کیا گیا اور اس سارے عمل کی نگرانی بھی یہیں سے کی گئی۔

امریکہ اپنی خارجہ پالیسی کے ثمرات تک رسائی حاصل کر سکے یا اس کے لئے ایسا ممکن نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں (عالمی سطح پر) پاکستان کے مرکزی کردار کے پیش نظر جنوبی ایشیاء کی اس قوت کے ساتھ شراکت مستقبل کی اولین امریکی ترجیحات میں یقیناً شامل ہوگی۔

"پاکستان۔ ملاؤں اور فوج کے درمیان" ایک ایسی بروقت اور برمحل تصنیف ہے جو امریکہ کے مہماتی اتحادیوں میں سے ایک کو سمجھنے میں ہماری بھرپور مدد کرے گی۔ امریکہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات میں آنے والے اس خصوصی، فیصلہ کن اور نازک موڑ پر مسٹر حقانی کا یہ جاندار تجزیہ اور عملی سفارشات ہماری بھرپور توجہ کی مستحق ہیں۔

جیسیکا ٹی میتھیوز

صدر" کارنیگی انڈومنٹ برائے عالمی امن"

اظہار تشکر

تمام عمر میری شدید خواہش رہی کہ وطن عزیز کی تاریخ اور سیاست کو سمجھوں اور پاکستان کو ایک "جمہوری پاکستان" کی شکل میں دیکھوں۔ زیر نظر کتاب میری انہی خواہشات اور جذبات و احساسات کا نتیجہ ہے۔ پاکستان میں جس کسی نے میرے علم میں اضافہ کیا۔ یا میرے نظریات کے ارتقاء میں میری مدد کی۔ دیکھا جائے تو اس نے اس کتاب میں اپنا حصہ ڈال دیا۔ ان میں میرے زمانہ طالب علمی کے ہمسائے، اساتذہ کرام اور دوست شامل ہیں۔ ان دنوں میں اسلام کے ساتھ ہمدردیوں کا حامل ایک فعال طالب علم ہوا کرتا تھا۔ بطور صحافی میرے متعدد ساتھی اور پاکستانی حکام جن کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا یا وہ لوگ جن کے ساتھ میں نے حکومت میں دن گزارے، وہ سب میرے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے۔

میرے والد گرامی محمد سلیم حقانی نے میری اوائل عمری میں ہی مجھے سکھا دیا تھا کہ پاکستان میں جن واقعات کو سرکاری سطح پر مسخ کیا گیا انہیں چیلنج کس طرح کرنا ہے۔ میری والدہ ماجدہ سعیدہ سلیم حقانی نے جس طرح زندگی کے ہر مرحلہ پر میری معاونت کی۔ اسی طرح ان کی مدد آج بھی مجھے حاصل ہے۔ اگرچہ میں کئی متنازعہ فیہ مسائل میں الجھا رہا۔ تاہم انہوں نے ہمیشہ مجھے قابل اعتبار جانا۔

پاکستان کی سول بیوروکریسی کی اخلاقیات میں نے روئیداد خان۔ سعید مہدی۔ انور زاہد اور اجلال زیدی سے سیکھیں۔ زیدی نے ایک اضافی ذمہ داری نبھائی اور پاکستان میں ہونے والی سیاسی پیش رفت کے کئی اسرار و رموز بھی مجھے بتائے۔

پاکستانی فوج اور انٹیلی جنس سروسز کی حتی الوسع کوشش ہوتی ہے کہ وہ پراسرار نظر آئیں۔ اسلم بیگ اسد درانی، حمید گل، جہانگیر کرامت، ذوالفقار خان، آصف نواز، عبدالقیوم اور سید رفاقت جیسے جرنیلوں کے ساتھ واقفیت مددگار ثابت ہوئی اور میرے لئے مذکورہ بالا اداروں کو سمجھنا ممکن ہو گیا۔ اگرچہ کبھی کبھار ہماری رائے اور سوچ میں اختلاف پیدا ہوتا رہا، تاہم جنرل اسد درانی اور جنرل رفاقت کی دوستی کا میں تادم تحریر دم بھرتا ہوں۔ پاکستان کی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے کئی کرنلوں اور جونیئر افسران سے دوستی کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن شاید اس نوعیت کی کتاب میں وہ اپنے ناموں کی اشاعت پسند نہ کریں۔

پاکستان کی سیاسی شخصیات میں سے میں بے نظیر بھٹو کا شکر گزار ہوں کہ ہماری ایک عشرے پر محیط رفاقت کے دوران وہ میرے ساتھ آزادانہ تبادلہ خیالات کرتی رہیں۔ میرے تجزیات نے قاضی حسین احمد، پروفیسر خورشید احمد، کمال اظفر،

حامد ناصر چٹھہ، سید منور حسن، سابق و مرحوم صدر غلام اسحٰق خان، غلام مصطفیٰ جتوئی، شفقت محمود، سردار عبد القیوم، انور سیف اللہ، نواز شریف اور منظور وٹو کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں اور نشستوں سے بھی استفادہ کیا۔

کئی امریکی سفارتکاروں اور دانشوروں کے ساتھ دوستی کو بھی میں اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتا ہوں۔ ان میں سے میں جیری برینگ، سٹیفن کوہن، ولیم میلام، رابرٹ اوکلے، رابن رافیل، ٹریسیٹا اور ہاورڈ شیفر۔ مائیکیل سائسن اور مارون وین بام کا تذکرہ کرنا پسند کروں گا۔

نوشی جمیل، ملیحہ لودھی، نجم سیٹھی اور نسیم زہرہ نے اس وقت بھی مجھے روشنی اور راہنمائی اور مدد مہیا کی جب ہم ایک دوسرے سے شدید اختلافات رکھتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نوشی اور نجم کیساتھ باہمی اختلافات کے مقابلے میں باہمی ہمخیالی کی مقدار بڑھتی رہی۔ اردشیر کاؤس جی، آمنہ جیلانی، عارف نظامی، شیری رحمان، محمد صلاح ایدین، محمود شام، مجیب الرحمٰن شامی اور سجاد میر کے مشورے میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اسی طرح خواجہ اشرف، صوفیہ اسلم، یحیٰ الحسینی، ضیاء کھوکھر، میاں سلیم اللہ اور انیق ظفر کی دوستی سے بھی میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ میری خوشدامن محترمہ اختر اصفہانی کی طرف سے تنقید کے خوف نے کئی مقامات پر میرے پیش کردہ دلائل کی نوک پلک درست کی۔ "کارنیگی انڈومنٹ برائے عالمی امن" نے اس کتاب کے بارے میں غور کرنے اور لکھنے کے لئے مجھے موقع اور بہترین ماحول فراہم کیا۔ "انڈومنٹ" کے صدر جیسیکا میتھیوز۔ نائب صدر پال بلاران اور جارج پرکووچ۔ کارنیگی کی لائبریرین کرس ہینلے اور لائبریرین کیتھلین ہگز کا میں خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے میری ہر ممکن مدد کی۔ آخر الذکر دونوں نے کسی شکایت کا موقع دیئے بغیر حوالہ جات کے لئے مجھے مبہم ترین اور مشکل الحصول مواد بھی مہیا کیا۔ اشاعتی ٹیم۔ بالخصوص کارمن میک ڈاگل۔ فلس جیسک اور سکھی ساہنی نے اس کتاب کی تحریر، اشاعت اور مارکیٹنگ کے مراحل میں میرا بھرپور ساتھ دیا اور اس وقت میری حوصلہ افزائی کی جب مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔

میرے اس تحقیقی کام کے دوران "کارنیگی انڈومنٹ" میں میرے جونیئر ساتھیوں فیتھ ہلس، الیگزینڈر کووڈ اور رواتی پرشاد کے علاوہ تازہ ڈگری یافتہ فریحہ حق انردھ سوری نے میری معاونت کی۔ علاوہ ازیں میرے طلباء حمزہ تارڑ، اپرنا پانڈے اور شلپا مورتھی نے نوٹس میں استعمال ہونے والا تحریری مواد تلاشنے میں میری مدد کی۔

میرے بچوں ہدیٰ حقانی اور حماد حقانی نے نہ صرف اپنی موسم گرما کی چھٹیاں قربان کر دیں بلکہ انہیں وقت دینے یا ان کے ساتھ وقت گزارنے کے میں نے جتنے وعدے بھی کئے۔ میری تحقیقی مصروفیات کے باعث ان کے ٹوٹ جانے کو بھی انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ جن دنوں یہ کتاب تکمیل کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ اکثر اوقات ان کا ایک ہی سوال ہوا کرتا تھا کہ "کتاب کہاں تک پہنچ چکی ہے؟" یا "آپ کتاب کہاں تک مکمل کر چکے ہیں؟" ان کے اسی سوال نے

میرے اندر اس پروجیکٹ کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی شدید خواہش پیدا کی۔ اگر چہ ماہا اور میرا اس دوران اپنے باپ سے دور رہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کا ردعمل بھی اپنی بہن اور بھائی کے ردعمل سے مختلف نہ ہوتا۔

مجھے زندگی میں جتنی انسپائریشن اور معاونت حاصل ہوئی اس کا اہم ترین اور سب سے زیادہ قابل ذکر ذریعہ میری اہلیہ فرح ناز اصفہانی ہیں۔ ان کے امریکی دوست انہیں فرح کے نام سے جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھے وہ جذباتی اور دانشورانہ استقامت مہیا کی جو کسی بھی بڑی کاوش یا بڑے کام میں درکار ہوتی ہے۔ فرح نے میری جو مدد اور حوصلہ افزائی کی، اس کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ ان کے متعدد مخصوص، برمحل اور ناقدانہ مگر انتہائی مفید تبصروں نے اس کتاب کی تکمیل کو ممکن بنایا۔ میری شدید خواہش ہے کہ اپنی بقایا زندگی کے دوران ان کی مفید رفاقت سے استفادہ کرتا رہوں۔

جس طرح اس کتاب میں موجود غلطیاں اور سہو میرے ہیں اسی طرح اس کے اندر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بھی کاملاً میرے ذاتی خیالات ہیں۔

تعارف

شناخت اور نظریہ

ایک عشرے سے بھی زائد عرصے سے پاکستان پر الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ وہ متنازعہ ہمالیائی ریاست جموں وکشمیر میں بھارتی حکمرانی کی مخالفت پر کمربستہ جنگ جوؤں کی حمایت کر رہا ہے۔ اس پر دوسرا الزام یہ ہے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت کو اس کی پشت پناہی حاصل رہی۔ گیارہ ستمبر 2001ء کو جب دہشت گردوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر حملے کیے تو امریکہ کا دباؤ قبول کرتے ہوئے پاکستان نے اپنی راہ تبدیل کر لی، دہشت گردی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور امریکہ کا کلیدی اتحادی بن گیا۔ افغانستان کے خلاف فوجی کارروائیوں کے دوران اس نے امریکہ کو سہولیات اور "القاعدہ" کے کارکنوں کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اس کے باوجود پاکستان کے اندر دہشت گردوں کی کارروائیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور یہاں بیٹھ کر وہ دیگر ممالک کو بدستور اپنا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ آج کل یہ ملک بیک وقت دہشت گردوں کا ہدف بھی ہے اور اس نوعیت کی کارروائیوں کے لئے اس کی سرزمین بھی استعمال کی جا رہی ہے۔ اور امریکی پالیسی ساز جنوبی ایشیاء میں دہشت گردی کے خاتمے کی کلید بھی پاکستان ہی کو خیال کرتے ہیں۔

پاکستان مستقبل میں جو رخ بھی اختیار کرے۔ اس کا جھکاؤ جس سمت بھی ہو۔ وہ رخ یا سمت دہشت گردی کے خلاف امریکی سربراہی میں لڑی جانے والی جنگ کے حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ مذکورہ اہمیت کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ پاکستان ایک علانیہ جوہری قوت ہے۔ اسلام پسندوں اور پاکستانی فوج کے درمیان تاریخی اتحاد اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کو سبوتاژ کر سکے۔ اسلامی دنیا کے کلیدی طبقات کو انتہا پسند بنا دے اور دونوں ہمسایہ ملک یعنی پاکستان اور بھارت کو ایک مرتبہ پھر جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کرے۔

پاکستان کے اسلام پسندوں نے اپنی طاقت کا مضبوط ترین اظہار اکتوبر 2002ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے دوران کیا۔ ان پارلیمانی انتخابات میں 11.1 فی صد رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی ان کے حق میں استعمال کیا اور وہ پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں 20 فیصد نشستیں حاصل کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس کے بعد آج تک وہ مصر ہیں کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں طالبان کی طرز کا اسلامی نظام متعارف کرائیں۔ واضح رہے کہ وہ افغانستان کی

سرحد کے ساتھ متصل اس صوبے میں برسراقتدار ہیں اور ارصوبائی انتظامیہ پر انہیں کنٹرول حاصل ہے۔ پاکستان کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف دنیا کو یہ باور کرانے کے لئے متعدد بیانات دے چکے ہیں کہ وہ پاکستان کی پالیسی کا رخ تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے اسلام پسندانہ اور جہادی ماضی سے اس کا ناطہ انقلابی انداز میں منقطع کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے 12 جنوری 2002ء کو اپنے پالیسی خطاب میں ان اقدامات کا اعلان کیا جن کے ذریعے وہ ملک کے اندر اسلامی جنگ جوؤں کے اثرات کو محدود کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان اسلامی جنگ جوؤں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں وہ اس سے قبل " کشمیری مجاہدین آزادی " قرار دے چکے تھے۔ انہوں نے برملا اور واضح لفظوں میں اعلان کیا کہ " کسی تنظیم کو کشمیر کی آڑ میں دہشت گردی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ ملکی ہے یا غیر ملکی، آئندہ جو بھی اس نوعیت کی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا، اس کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔

مشرف کے حامیوں نے ان کے اس خطاب کو انقلابی قرار دیا۔ عالمی سطح پر انہیں خراج تحسین ملا اور حمایت حاصل ہوئی۔ پاکستانی عوام جو کئی سالوں پر محیط مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد کے باعث تھک چکے تھے۔ انہوں نے مشرف کے اس بیان سے اتفاق کیا کہ۔ " تشدد اور دہشت گردی کئی سالوں سے جاری ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا دن آن پہنچا ہے کہ ہم کلاشنکوف کلچر سے تنگ آ چکے ہیں اور اس نے ہمیں ذہنی طور پر بیمار کر دیا ہے "۔ لیکن جلد ہی واضح ہو گیا کہ مشرف حکومت " دہشت گردوں " (یہ اصطلاح " القاعدہ " کے ارکان کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو زیادہ تر غیر ملکی ہوتے ہیں یا پھر اس کا اطلاق پاکستان کے فرقہ وارانہ جنگ جوؤں پر ہوتا ہے) اور " مجاہدین آزادی " (یہ وہ لیبل ہے جسے کشمیری جنگ جوؤں کے لئے پاکستان میں سرکاری سطح پر ترجیح دی جاتی ہے) اور " مجاہدین آزادی " (یہ وہ لیبل ہے جسے کشمیری جنگ جوؤں کے لئے پاکستان میں سرکاری سطح پر ترجیح دی جاتی ہے) میں بدستور امتیاز برت رہی ہے۔ مزید براں۔ مشرف حکومت طالبان کے دور حکومت کی باقیات کو اس امید پر برداشت کر رہی ہے کہ امریکہ کی نصب کردہ کرزئی حکومت کے ڈگمگانے کی صورت میں وہ افغانستان میں اپنا رسوخ بحال کر سکے۔

پاکستان کی پالیسی میں پایا جانے والا دوغلہ پن ایک تشکیلی مسئلہ ہے جس کی جڑیں تاریخ اور ریاست کی مسلسل اور مستقل پالیسی میں موجود ہیں۔ عام تاثر ہے کہ یہ دوغلا پن کچھ حکومتوں (جن کا آغاز 1977ء میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت سے ہوا) کے فیصلوں کا (فطری) نتیجہ ہے (یعنی اس میں ارادے یا نیت کا کوئی دخل نہیں) لیکن یہ تاثر غلط ہے۔

پاکستان کے معرض وجود میں آ جانے سے لیکر اب تک اس کے راہنما پاکستان کے تشخص اور شناخت کو قوی تر کرنے کے لئے مذہبی جذبات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ مغرب نواز حکمرانوں کے ادوار حکومت میں بھارت کی طرف سے لاحق تصوراتی خطرات کے مقابلے میں اسلام کا سہارا لیا گیا۔ ایسے حکمرانوں نے " جنگجویانہ اسلام پسندی " کے فروغ کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ لیکن مذکورہ اسلام پسندی کی حدود و قیود کا تعین کرتے وقت اس امر کا خیال رکھا کہ مغربی ممالک

کے ساتھ مراسم بھی خراب نہ ہوں اور ملکی سیاست کو عدم استحکام سے دوچار کئے بغیر یہ اسلام پسندی قومی تعمیر کا فریضہ بھی سرانجام دیتی رہے۔ جنرل ضیاء الحق پاکستان کے قانونی اور تعلیمی نظام کی "اسلامائزیشن" میں دوسروں پر سبقت لے گئے۔ ان کی اسلامائزیشن کی پالیسی کو ایک مستقل ریاستی نظریے کی توسیع کا نام تو دیا جا سکتا ہے۔ غلط روی نہیں کہا جا سکتا۔

مختلف اوقات پر ملکی سیاست پر اثر انداز ہونے والے فوج کے سیاسی تسلط کو حمایت دلانے کے لئے ریاستی مشینری کے ذریعے اسلام پسند گروہوں کی سرپرستی اور مدد کی جاتی رہی۔ کشمیر کے مستقبل پر مذاکرات کے لئے بھارت پر دباؤ ڈالنے اور سٹریٹیجک اعتبار سے افغانستان میں قدم جمانے کے لئے پاکستانی فوج نے جو کاوشیں کیں، جنوبی ایشیائی خطے کے اسلام پسندان میں اس کے اتحادی بنے رہے۔ نظریات کے زیر اثر متحرک اور فعال ہونے والے موکلین اور ان کے ریاستی سرپرستوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ ہموار نہیں رہتے۔ یہ ناہمواری اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ نائن الیون کے بعد پاکستانی جرنیل اسلام پسندوں کو مکمل طور پر اپنے قابو میں نہ رکھ سکے۔ پاکستان میں ملاؤں اور فوج کے درمیان کئی مرتبہ اتحاد کا قیام عمل میں آیا اور پاکستانی تاریخ میں پیدا ہونے والے تغیرات کے ساتھ ساتھ مذکورہ اتحاد کی نوعیت بھی تغیر پذیر رہی۔

پاکستان اگست 1947ء میں ایک آزاد ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اس وقت سے لیکر آج کے دن تک اس کے اداروں، بالخصوص فوج اور انٹیلی جنس سروسز جیسے قومی دفاعی اداروں نے مذہب کی بنیاد پر پاکستان کے قومی تشخص کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک نظریاتی ریاست کے ساتھ اس سیاسی وابستگی یہ رفتہ رفتہ جہادی نظریے کو مقدس جنگ کا نظریہ کہا جانے لگا۔ خصوصاً یہ تبدیلی 1971ء میں لڑی جانے والی بنگلہ دیش کی جنگ کے دوران اور اس کے بعد اس وقت رونما ہوئی جب پاکستانی فوج نے "اسلام پسند" کی اصطلاح کا استعمال شروع کیا اور اسلام پسند گروہوں کی مدد سے ان سیکولر مگر منتخب راہنماؤں کو اقتدار سے دور رکھا جنہیں بنگالی بولنے والی پاکستانی آبادی کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ وہ راہنما بنگالی بولنے والوں ہی کے منتخب کردہ تھے۔ (نتیجتاً) بنگالیوں نے بغاوت کر دی جسے پاکستانی فوج نے بے رحمانہ انداز میں کچل ڈالا۔ 1971ء میں ہونے والی جنگ کے دوران پاکستان دولخت ہوا اور "بنگلہ دیش" کے نام سے ایک آزاد ملک معرض وجود میں آگیا۔

1971ء کی جنگ کے بعد باقیماندہ پاکستان (سابقہ مغربی پاکستان) میں مذہب کے نام پر یا مذہب کے ذریعے مختلف النوع اور غیر متجانس نسلی اور لسانی گروہوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش زیادہ اہمیت اختیار کر گئی اور اس کے نسبتاً زیادہ جنگ جویانہ مظاہر سامنے آنے لگے۔ ملاؤں اور فوج کے درمیان اس اتحاد کے نتیجے میں مسلح اور غیر مسلح مذہبی گروہ زیادہ طاقتور ہو گئے۔ اسلام پسندانہ نظریے کے انتہا پسندانہ اور متشدد مظاہر جو بعض اوقات پاکستان کے استحکام کے لئے خطرات کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ دراصل ایک "ریاستی منصوبہ" (State Project) ہے جس پر کنٹرول برقرار نہ رکھا جا سکا اور وہ غلط رخ اختیار کر گیا۔ 1947ء میں پاکستان کا ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے معرض وجود میں

آنا برطانوی ہند میں قیام پذیر مسلمانوں کے کئی عشروں پر محیط مباحث اور قسم بندیوں کا نکتہ عروج تھا جو انہوں نے اپنے اجتماعی مستقبل کے لئے کیں۔ 19 ویں صدی میں جب برطانوی حکمرانی کو استحکام حاصل ہو گیا تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے اس مراعات یافتہ مقام ومرتبے سے محروم ہو چکے تھے جو انہیں مغلیہ دور میں حاصل رہا۔ کچھ مسلمان راہنماؤں نے علاقائی وطن پرستی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور اپنی مجموعی شخصیت کے اظہار کے لئے مذہب کو توسط بنانا پسند نہ کیا۔ انہوں نے برطانوی حکمرانی کی مخالفت کی اور بشمول مسلمانان ہند ہندوستانی عوام سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستانی وطن پرستی کی تحریک میں مکمل شمولیت اختیار کر لیں جس کی راہ نمائی کا فریضہ موہن داس گاندھی اور جواہر لال نہرو سرانجام دے رہے تھے۔ دیگر لوگوں کو احساس ہوا کہ مسلمان جس خصوصی تشخص یا شناخت کے حامل ہیں وہ اس علاقائی اور نسلی وطن پرستی کے ہاتھوں مٹ جائے گی جس نے بنیادی طور پر ہندوستان میں ہندو اکثریت کو اپنا مرکز ومحور مان اور بنا رکھا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو کر محمد علی جناح کی راہنمائی میں مسلمان قوم پرستوں نے موقف اختیار کیا کہ ہندوستان کے مسلمان غیر مسلم ہندوستانیوں سے علیحدہ ایک قوم ہیں اور مطالبہ کیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، انہیں یکجا کر کے ایک علیحدہ ملک بنا دیا جائے۔ برطانوی ہند کے شمال مغربی اور شمال مشرقی صوبے مسلمان اکثریت کے حامل تھے جنہیں ملا کر پاکستان بنا دیا گیا۔ اس طرح دو حصوں یا دو صوبوں پر مشتمل پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ دونوں حصوں کے درمیان بھارت واقع تھا۔ بالآخر دسمبر 1971ء میں مشرقی پاکستان نے ایک نئی ریاست بنگلہ دیش کی شکل اختیار کر لی۔ پاکستان کا معرض وجود میں آ جانا اس امر کی دلیل تھا کہ "دو قومی نظریے" کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کرنے کا رسمی مطالبہ تو 1940ء میں کیا گیا۔ تاہم اس سے بہت پہلے وقفوں وقفوں سے دو قومی نظریے کی وضاحت کی جاتی رہی۔ لیکن کسی مرحلے پر مکمل وضاحت نہ کی گئی کہ اس کا اطلاق کس طرح ہو گا۔ اگرچہ قیام پاکستان کے پس منظر میں یہ ارادہ کارفرما تھا کہ جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کو ایک مستقل اقلیت بننے سے بچایا جائے تاہم یہ ملک جنوبی ایشیاء میں مقیم سبھی مسلمانوں کا وطن نہ بن سکا۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد بھی برصغیر کے ایک تہائی مسلمان ہندو اکثریت کے حامل ملک بھارت میں اقلیت بن گئے۔ باقی ماندہ دو تہائی دو علیحدہ ملکوں یعنی پاکستان اور بنگلہ دیش میں مقیم تھے۔ اس طرح آزادی سے قبل "دو قومی نظریے" کے قابل عمل ہونے کے حوالے سے جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ ان کی تصدیق ہو گئی۔

پاکستان کی جدوجہد آزادی کا دورانیہ نسبتاً مختصر ہے۔ اس کا آغاز 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اس مطالبے سے ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے علیحدہ علیحدہ ریاستیں تشکیل دی جائیں۔ جبکہ جون 1947ء میں تقسیم ہند کے منصوبے کے اعلان کے ساتھ ہی اس جدوجہد کا اختتام ہو گیا۔ اگرچہ مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی ترجمان ہونے کی دعویدار تھی۔ تاہم قومی سطح پر اس کی قیادت کو نسبتاً زیادہ اہمیت ان علاقوں سے حاصل ہوئی جہاں مسلمان اقلیت میں

تھے۔ مسلم لیگ ان صوبوں کے ممتاز مقامی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگئی جنہیں یکجا ہو کر پاکستان کی شکل اختیار کرنا تھی۔ لیکن اس کے قائدین کے مابین اتفاق رائے پیدا نہ ہوسکا کہ مستقبل میں نئی ریاست یعنی پاکستان کی سمت کیا ہو گی؟۔ نئے ملک کا آئین کس طرح تشکیل دیا جائے گا؟۔ پاکستان کے اندر مختلف نسلی اور لسانی گروہوں کا مقام و مرتبہ کیا ہو گا؟۔ ریاستی معاملات میں مذہب اور علماء کیا کردار ادا کریں گے؟ یہ سب معاملات حصول آزادی تک حل طلب رہے۔

مسلم لیگ کے راہنماؤں نے نہ ہی سوچا اور نہ ہی کوئی حکمت عملی تیار کی کہ نئے ملک کو کس طرح چلانا ہے۔ اس " کمی" کی ایک ممکنہ وضاحت تو یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کے پس منظر میں یہ ارادہ کارفرما تھا کہ "سودے بازی کے ذریعے مسلمانوں کے لئے سیاسی مراعات حاصل کی جائیں گی"۔ خصوصاً "1930 میں فلسفی شاعر محمد اقبال نے " آزاد ہندوستان" میں مذہبی اکثریت اور مذہبی اقلیتوں کے درمیان شراکت اقتدار کی جو تجاویز پیش کیں۔ وہ قابل غور ہیں ان تجاویز میں دعویٰ کیا گیا کہ اپنی بے مثل اور جداگانہ تاریخ اور ہندو اکثریت کے ساتھ تہذیبی و ثقافتی اختلافات کی بناء پر ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ علیحدہ قوم ہونے کا دعویٰ علیحدہ ریاست کے مطالبے پر منتج ہوتا۔ ابتداء میں مسلم لیگی قیادت کا ارادہ یہی تھا کہ ایک علیحدہ مسلمان قوم شراکت اقتدار کے خصوصی انتظامات کے تحت ہندوستانی وفاق یا ہندوستانی وفاق حلفی (Confederation) کا حصہ بن کر رہ سکتی تھی۔ اس دلیل کے مطابق "انڈین نیشنل کانگریس" نے شراکت اقتدار کے ایسے کسی فارمولے پر غور کرنے سے انکار کر دیا اور ایک کثیر القومی ریاست کے مبہم تصور کو قبول کرلیا۔ کانگریس کے مذکورہ انکار اور قبولیت کے نتیجے میں (کسی پیشگی ارادے کے بغیر) ہندوستان تقسیم ہوگیا اور ایک آزاد اور اقتدار اعلیٰ کا مالک پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھر آیا۔

جن دنوں جناح کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرلیا جائے، وہ ہندوستان کی مسلمان قیادت کے مختلف عناصر کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مقصد گروہی اتحاد پیدا کرنا تھا۔ تاہم حتمی نصب العین اس وقت تک مبہم اور غیر واضح تھا۔ وہ "پاکستان کے مطالبے کے ذریعے ایک ایسے آئینی سمجھوتے کو ممکن بنانا چاہتے تھے جس کے تحت برطانوی حکمرانوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کو ہندوؤں کے مساوی اختیارات حاصل ہو جاتے"۔ مطلب یہ کہ اقتدار اعلیٰ۔ اختیارات یا حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا حصہ برابر ہوتا۔ معروف مورخ عائشہ جلال نے ان اثرات کو بالوضاحت بیان کیا ہے جو اس دور کے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست نے مطالبہ پاکستان پر مرتب کئے۔ مزید براں انہوں نے مطالبہ پاکستان کی نوعیت اور اس کے اندر پائے جانے والے تضادات پر بھی بحث کی ہے۔ عائشہ جلال رقمطراز ہیں:-

"جب اس اصول کو تسلیم کرلیا گیا کہ مسلمانوں کی اکثریت کے حامل صوبے باہم ملکر ایک علیحدہ ریاست تشکیل دیں گے تو جناح اس بات پر مذاکرات کے لئے تیار تھے کہ ہندوستان گیر سطح اور برابری کی بنیاد پر وہ ریاست ہندو اکثریت کے حامل صوبوں کے اتحاد یعنی ہندوستان کے ساتھ مل کر "وفاق حلفی" (Confederation) تشکیل دیگی یا اقتدار اعلیٰ کی

مالک ایک علیحدہ ریاست کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھے گی؟ اگر جناح اور مسلم لیگ ہندوستان کے آئینی مستقبل کو متشکل کرنے میں کوئی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو انہیں ثابت کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں انہیں رسوخ حاصل ہے۔ ایسی صورت میں مذکورہ نئی ریاست باقیماندہ ہندوستان کے ساتھ معاہداتی طرز پر تعلق قائم کر سکتی تھی۔ کسی یکساں سیاسی پروگرام کے ذریعے ایسے رسوخ کا حصول ممکن نہ تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں قیام پذیر مسلمانوں کے مفادات مختلف بھی تو ہو سکتے تھے۔ کیونکہ مسٹر جناح کے پاس کوئی معقول متبادل موجود نہ تھا۔ لہذا وہ مسلمانوں کے سیاسی ڈھانچے کی توڑ پھوڑ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس مرحلے پر مذہب نجات دہندہ کی شکل میں سامنے آیا۔ تاہم مذہب کی طرف رجوع نہ تو کسی آئیڈیالوجی کے ساتھ مسٹر جناح کی شدید وابستگی کا نتیجہ تھا اور نہ ہی وہ اسے متحارب گروہوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف اپنے حلقہ انتخاب کے منقسم مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق اور استحکام کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ ایک ایسا مبہم سا مطالبہ ان کی ضرورت بن گیا جس کے توسط سے عمومی حمایت کا حصول تو ممکن نہ ہوتا، تاہم مسلمانوں کی حمایت حاصل ہو جاتی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پاکستان کا پر از ابہام مطالبہ تراشا گیا لیکن مسٹر جناح واضح اور غیر مبہم انداز میں نہیں بتا سکتے تھے کہ مطالبہ پاکستان کے پس منظر میں کس مقصد کے حصول کی خواہش کارفرما تھی۔ اگر ان کا مقصد ان علاقوں کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا تھا جہاں وہ اقلیت میں تھے تو ضروری تھا کہ اسے غیر مصالحانہ گروہی شرائط پر پیش کیا جاتا۔ لیکن مذکورہ مطالبے سے گروہی انحراف نے مسلمان اکثریت کے حامل صوبوں بالخصوص پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی سیاست کو نقصان سے دوچار کیا جہاں ان کے رسوخ کا انحصار دیگر عقائد کے مقلدین کے ساتھ صلح صفائی پر تھا۔

مسٹر جناح کی اس محتاط حکمت عملی کا ایک نتیجہ تو یہ برآمد ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے نتائج وعواقب کا ادراک کئے بغیر پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا۔ مسٹر جناح نے جب یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کیا جائے تو اسے تقسیم ہند کا مطالبہ خیال کیا گیا۔ مسٹر جناح کے ناقدین نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہند کا مطلب یہ ہوگا کہ دو بڑے صوبوں یعنی پنجاب اور بنگال کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کر دیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین نے جو بعد میں پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل اور پھر دوسرے وزیر اعظم بنے ایک برطانوی گورنر کے ساتھ بات چیت کے دوران بڑی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ "نہ تو میں جانتا ہوں اور نہ ہی مسلم لیگ میں کسی اور کو معلوم ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے" مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کے طور پر تسلیم کرانے کی کوشش ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی اس توقع کا باعث بن گئی کہ انہیں ایک علیحدہ ملک حاصل ہو رہا ہے۔ وہ علیحدہ ملک جس کے انتظام و انصرام کے لئے مسلمان راہنماؤں نے کوئی تیاری نہیں کر رکھی تھی۔ مئی 1947ء میں مسٹر جناح نے ایک غیر ملکی مہمان کو بتایا۔ "ہمیں سندھ کے صحرا میں بھی پھینک دیا گیا تو ہم ایک علیحدہ اور اقتدار اعلیٰ کے مالک ملک کے مطالبے پر مصر رہیں گے۔"

جناح اور مسلم لیگ میں ان کے دیگر ساتھیوں نے کسی ایسے پاکستان کا تصور بھی نہیں کیا تھا جس میں پورا بنگال اور پورا پنجاب شامل نہ ہو۔ اگر اس ساری منصوبہ بندی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی "سودے بازی کی پوزیشن" (Bargaining Power) کو بہتر بنایا جائے تو ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ایک حصہ ان صوبوں پر مشتمل ہوتا جہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور دوسرے حصے میں وہ صوبے شامل ہوتے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ "ان دو صوبوں (بنگال اور پنجاب) میں ہندو اکثریت کے حامل اضلاع کے بغیر (مسلم) لیگ اس قابل نہیں تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان برابری کے لئے کوئی سودے بازی کر سکے۔

برطانویوں کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم کرنے کی جزوی وجہ تو 46-1945ء میں منعقد ہونے والے قانون ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج بنے۔ مختلف مذہبی گروہوں کے لئے جداگانہ طرز اور محدود حق رائے دہی کی بنیادوں پر انتخابات کا اہتمام کیا گیا۔ ہندوستان میں 1909ء سے ایک ہی طریق انتخاب چلا آ رہا تھا۔ مسلم لیگ نے آئین ساز اسمبلی کی تمام مسلمان نشستیں اور مسلمانوں کے 75 فیصد ووٹ جیت لئے۔ صرف 15 فیصد عوام کو خواندگی۔ جائیداد۔ آمدنی اور مبارزت کی بنیادوں پر حق رائے دہی دیا گیا۔ لہذا ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خواندہ۔ تنخواہ دار اور صاحب جائیداد مسلمانوں کے علاوہ جن مسلمانوں نے برطانوی فوج میں خدمات سرانجام دیں۔ سب نے مسلم لیگ کی حمایت کی لیکن مسلمان کسانوں اور ناخواندہ مسلمانوں کے خیالات واضح نہیں تھے۔

مسلمانوں کی طرف سے ملنے والی حمایت کی مقدار میں اضافے کے لئے مسلم لیگ نے مذہبی اور گروہی جذبات کا سہارا لیا۔ اگرچہ مسٹر جناح (جنہیں اس وقت تک قائداعظم یعنی عظیم راہنما کہا جانے لگا تھا) اور حصول پاکستان کی مہم میں شامل ان کے زیادہ تر مسلم لیگی ساتھی سیکولر تھے۔ تاہم 46-1945ء میں مسلم لیگ نے انتخابی مہم صرف اور صرف مذہب کی بنیاد پر چلائی۔ انڈین نیشنل کانگریس کو "جمعیت علمائے ہند سے تعلق رکھنے والے "قوم پرست" مسلمان مذہبی راہ نماؤں کی معاونت حاصل تھی۔ اسے مسٹر جناح اور ان کے دیگر مسلم لیگی ساتھیوں پر تابڑ توڑ حملوں میں مذکورہ مسلمان راہنماؤں کی مکمل حمایت حاصل رہی۔ نتیجتاً مسلم لیگ کو اپنے مذہبی علماء کو سامنے لانا پڑا۔ لہذا اس مہم کے دوران پاکستان اور اسلام کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہ رہا۔ دیہی مسلمانوں کی صرف اس حد تک حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ ایک مخصوص احساس یا امید پیدا کرلیں۔ وہ احساس کیا تھا؟ کہ مسلمان ریاست کے قیام کے بعد "وہ سب بہتر مسلمان بن جائیں گے" یا "مسلمانوں کے حالات بہتر ہو جائیں گے"۔

اپنی حمایت پیش کرنے سے قبل بعض مسلمان راہنماؤں نے مسٹر جناح سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں یقین دہانی کرائیں "پاکستان میں اسلامی قوانین کی پیروی کی جائے گی"۔ اور مسٹر جناح کو مطلوبہ یقین دہانیاں کرانا پڑیں۔ جیسا کہ پروفیسر خالد بن سعید لکھتے ہیں:-

نومبر 1945ء میں مسلم لیگی راہنما نے آف مانکی شریف کے نام لکھے گئے ایک نامے میں واضح طور پر تحریر کیا کہ "اس امر پر زور غیر ضروری ہوگا کہ جس آئین ساز اسمبلی میں منتخب مسلمان نمائندوں کی اکثریت ہو۔ وہ (یقیناً) اس قابل ہوگی کہ ایسے قوانین منظور کرے جو شرعی قوانین سے متصادم نہ ہوں۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو زیادہ عرصہ غیر اسلامی قوانین پر عمل نہیں کرنا پڑے گا"۔ مسٹر جناح نے جتنے لیگی اجلاسوں سے خطاب کیا بالخصوص وہ تقاریر جو انہوں نے ایسے علاقوں میں کیں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے ان میں اسلامی علامتیں اور نعرے بہت نمایاں اور ممتاز تھے۔ پٹھانوں سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے سوال کیا۔ "آپ لوگ پاکستان کی تخلیق چاہتے ہیں یا نہیں؟" جواباً فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی اگر آپ پاکستان کی تخلیق چاہتے ہیں تو لیگی امیدواروں کو ووٹ دیں۔ اگر ہم نے آج اپنے فرض کو نہ پہچانا تو آپ لوگ شودروں (اچھوت۔ نچلی جاتی کے ہندو) کے مقام پر آگریں گے اور ہندوستان سے اسلام رخصت ہو جائے گا۔ میں مسلمانوں کو کبھی ہندوؤں کا غلام بننے کی اجازت نہیں دوں گا۔ (فضا میں ایک مرتبہ پھر اللہ اکبر کا نعرہ گونج اٹھا"۔

پنجاب کی مسلمان اشرافیہ نیم دلی سے مسٹر جناح کا ساتھ دے رہی تھی۔ لہٰذا وہاں قدامت پسندانہ مذہبی عناصر کو آزمایا گیا۔ ایک پاکستانی دانشور اور سابق سفارتکار نے صورت حال کی وضاحت اس طرح پیش کی ہے:-

1946ء میں پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ کی حیران کن اور ناقابل یقین فتح (مسلم لیگ نے 86 میں سے 79 نشستیں جیت لیں جبکہ 1937ء میں ہونے والے انتخابات میں اسے 86 میں سے صرف 2 نشستیں حاصل ہوئی تھیں)۔ کا باعث قائداعظم کی کرشماتی شخصیت کے سوا اور کسی محرک کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسلام کے مذہبی علماء اور خانقاہوں کے سجادہ نشینوں اور ان کے حامیوں نے جس طرح مذہبی جذبات کو ابھارا۔ اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا پیغام بہت سادہ ہوا کرتا تھا۔ "مسلم لیگ کو ووٹ دینے والے مسلمان ہیں اور وہ اس کارثواب کے بدل میں جنت میں جائیں گے اور مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دینے والے کافر ہیں۔ وہ موت کے بعد جہنم کا رزق بنیں گے اور انہیں مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفنانے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی"۔ اگرچہ قائداعظم اصولی طور پر مذہب اور سیاست کے باہمی ادغام کے خلاف تھے تاہم مسلم لیگ جس طرح مذہب کو استعمال کر رہی تھی۔ وہ اس سے بے خبر بھی نہ تھے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی عوام آج تک ایک ہی زبان میں بات کر رہے ہیں۔ وہ اس کے سوا کوئی دوسری زبان جانتے ہی نہیں کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ اور اسلام کا قلعہ بننا چاہئے تھا۔

پنجاب سے مسلم لیگ کے متعدد راہنماؤں نے پاکستان کی سیاسی قیادت کو مذہب سے منسوب کرنے کے لئے اپنے ناموں کے ساتھ پر مولانا یا سجادہ نشین جیسے لاحقوں کا اضافہ کر لیا تا کہ انہیں نیک و پارسا خیال کیا جائے۔ بالآخر مذہبی پیشواؤں اور موروثی مذہبی راہنماؤں نے تخلیق پاکستان کے حق میں ایک مختصر ترین دلیل تراش لی۔ "اس جنوبی ایشیائی برصغیر میں اسلام کی بقاء ہی تخلیق پاکستان میں مضمر ہے"۔

ان مذہبی راہ نماؤں نے جس منطق کا سہارا لیا مولانا عبدالستار خان نیازی اسے اپنی تقاریر میں انتہائی مختصر مگر جامع انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "ہمارے سامنے دو عدد متبادلات موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں بنیا برہمن راج میں شمولیت اختیار کر لیں بلکہ ان کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں اور یا پھر یکساں مفادات رکھنے والے مسلمانوں کی اکثریت کے حامل صوبوں کے وفاق کا حصہ بن جائیں۔ ہر پٹھان ہندو راج کی اطاعت کو اپنی توہین خیال کرے گا اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں اپنے بھائیوں کے ہمراہ فخر سے بیٹھے گا کیونکہ ہر پٹھان اول تا آخر مسلمان ہے"۔

1946-1945ء کے انتخابات نے مسلم لیگ کو اس قابل بنا دیا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ جناح نے انتخابی نتائج کی توجیہہ اس طرح کی کہ کسی بھی سطح یا فورم پر مذاکرات کے لئے مسلمانوں نے مسلم لیگ کو اپنی نمائندگی کا مینڈیٹ دے دیا ہے۔ انگریزوں کے پاس ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ انتخابی مہم نے مذہبی جوش و خروش کو ابھارا اور انتخابی نتائج نے یہ حقیقت ثابت کر دی کہ مسلمان ہندوؤں کے امکانی تسلط پر نالاں تھے۔ لیکن انتخابی نتائج یہ بتانے سے قاصر تھے کہ ہندوستانی مسلمان دراصل چاہتے کیا تھے۔ عائشہ جلال لکھتی ہیں کہ "محدود حق رائے دہی کا طریق کار بھی کسی خاص پروگرام کی توثیق نہ کر سکا کیوں کہ درحقیقت کسی پروگرام کو مخصوص کیا ہی نہیں گیا تھا۔ پاکستان کی امکانی جغرافیائی سرحدوں کا ادراک تو دور کی بات ہے۔ پاکستان کے معانی ہی کسی پر واضح نہیں تھے"۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان میں سے زیادہ تر میں مسلم لیگ اپنی حکومت نہ بنا سکی۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے اکثریتی اور اقلیتی صوبوں کی تقسیم ممکن نہ ہو سکی۔ نہ ہی یہ صورت حال پیدا ہو سکی کہ سیاسی میدان میں صرف دو سیاسی جماعتیں یعنی مسلم لیگ اور کانگریس موجود ہوں اور نہ ہی برابری کی بنیادوں پر مستقبل کے آئینی انصرام پر مذاکرات کئے جا سکے۔

ہندوستان پر سے اپنی نو آبادیاتی حکمرانی کے خاتمے کا فیصلہ کرنے کے بعد انگریزوں نے تخلیق پاکستان کا مطالبہ بھی منظور کر لیا اور ہندوستان کے علاوہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی متفق ہو گئے۔ جو پاکستان معرض وجود میں آیا وہ گروہی اعتبار سے تو متجانس تھا۔ لیکن اقتصادی اور انتظامی تناظر میں یہ وصف عنقا تھا۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان گروہی فسادات کا آغاز ہو گیا جن کے نتیجے میں بھاری تعداد میں مسلمان بھارت سے اور ہندو پاکستان سے ہجرت کر گئے۔ پاکستان کے بانیوں نے آبادی کی ایسی منتقلی یا ہجرت کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ گروہی بنیادوں پر تقسیم مذہبی جنون پر منتج ہوئی۔ اسی جنون نے نئی ریاست پاکستان میں مذہب کو مرکزی حیثیت دلا دی۔ جس کا بانی پاکستان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو جو بے مثل فتح نصیب ہوئی، اس نے ان ممکنہ مشکلات کو دھندلا دیا جو پاکستان کی تخلیق کے بعد پاکستانی راہنماؤں کے سامنے آئیں۔ اگرچہ مسلمان راہنماؤں نے آزادی کے بعد پیش آنے والے آئینی مسائل کے حل کے لئے فارمولہ کے طور پر اس کا آغاز کیا تھا۔ تاہم حصول پاکستان کے لئے چلائی جانے والی

مہم نے اپنے آخری ایام یا مراحل میں ایک مذہبی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اس طرح پاکستان کی وجہ تخلیق کے حوالے سے ایک الجھاؤ پیدا ہوگیا جسے پاکستانی قیادت نے ایک ریاستی آئیڈیالوجی کے توسط سے دور کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد جب بالغ حق رائے دہی کے بین الاقوامی اصول کو تسلیم کرلیا گیا۔ مسلم لیگ ان علاقوں میں اپنی حمایت یا رسوخ کو برقرار رکھنے میں ناکام ہوگئی جو باہم ملکر پاکستان بنے۔ اس مبہم تصور کے مقابلے میں کئی متبادل تصورات سامنے آگئے کہ پاکستان ایک مسلمان ریاست تو ہوگا لیکن یہاں سخت اور ناقابل تبدل مذہبی اصولوں پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ جن گروہوں کو 1946ء میں محدود حق رائے دہی کی بنیاد پر تقسیم ہند پر منتج ہونے والے انتخابات میں اپنی رائے کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔ انہوں نے وسیع تر حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ داغ دیا۔ جن مذہبی راہنماؤں کو مسلم لیگ کی انتخابی مہم میں دیر سے شامل کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ وہ علمائے دین شامل ہوگئے جنہوں نے حصول پاکستان کے مطالبے کی حمایت نہیں کی تھی اور دونوں نے ملکر نئے ملک کی اسلامائزیشن کا مطالبہ کردیا۔ دوسروں نے چاہا کہ پاکستان کو مسلمان صوبوں پر مشتمل ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بنا دیا جائے۔ تاہم اس دوران انہوں نے نسلی اور علاقائی ثقافتوں پر زور دیئے رکھا۔

جب پاکستان مکمل طور پر معرض وجود میں آگیا تو اسے عدم تحفظ اور دشمنی کی فضا کا سامنا کرنا پڑا اور کئی بھارتی راہنماؤں نے پیشین گوئی شروع کردی کہ یہ نیا ملک جلد ہی زمین بوس ہو جائے گا۔ پاکستان کے ایک سابق وزیر خارجہ نے نصف صدی بعد ان مسائل کی وضاحت کی جن کا اس نوزائیدہ ملک کو سامنا کرنا پڑا۔ وہ رقمطراز ہیں۔

3 جون 1947ء کو پیش کئے جانے والے "تقسیمی منصوبے" (Partition Plan) میں کہا گیا تھا کہ آزادی تک کا عبوری عرصہ صرف 72 دنوں پر محیط ہوگا۔ اس مختصر عرصے میں 3 صوبوں کی تقسیم ہونا تھی۔ ریفرنڈموں کا اہتمام کرنا تھا۔ سول اور فوجی ملازمین کی باہمی علیحدگی بھی ضروری تھی اور اثاثے بھی بانٹنا تھے۔ اس معینہ وقت نے بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے مسائل کو کئی گنا کردیا جس کا نہ تو کوئی دارالحکومت تھا نہ ہی کوئی حکومت اور نہ ہی نئے ملک کے انتظامی۔ اقتصادی اور عسکری اداروں کو ساز وسامان مہیا کرنے کے لئے مالی وسائل موجود تھے۔ تقسیم کے بعد پیچیدہ تر مسائل ابھر آئے۔ گروہی فسادات نے ہزاروں لاکھوں معصوم انسانوں کی جان لے لی۔ لاکھوں مہاجرین کی ایک بڑی لہر پاکستان کے اندر داخل ہوگئی اور اس نوزائیدہ ملک پر ان کی بحالی کا ناقابل برداشت بوجھ آن پڑا۔ معاشی اعتبار سے اس نوزائیدہ ملک کو اس کے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کاوشوں کی صورت میں ایک بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ پاکستان کے حصے میں کوئی صنعت نہ آئی۔ اس کی زرعی مصنوعات کے لئے بڑی منڈیاں بھی بھارت میں واقع تھیں۔ اگرچہ متحدہ ہندوستان کی کپاس کا ایک تہائی پاکستان پیدا کرتا تھا تاہم کاٹن ملوں کا صرف 13 واں حصہ پاکستان میں موجود تھا۔ جن غیر مسلم تجارتی طبقات نے ان علاقوں پر اپنا تسلط جما رکھا تھا جو بعد میں پاکستان کا حصہ ہے۔ انہوں نے اپنا سرمایہ بھارت

منتقل کردیا کیونکہ ابتدائی ایام میں پاکستان کی بقاء ہی مشکوک نظر آرہی تھی۔ کراچی میں قیام پذیر امریکی کونسلر نے جولائی 1947ء میں اندازہ قائم کیا کہ جون کے اوائل میں صرف پنجاب سے 3 ارب روپے بیرون ملک منتقل ہوگئے۔ صوبہ سندھ سے منتقل شدہ سرمایہ 20 سے 30 کروڑ تھا۔ نتیجتاً رسماً وجود میں آنے سے قبل ہی اس نوزائیدہ ملک کی ریونیو کی بنیاد سکڑ گئی۔ پاکستانی حکومت کے مالی اثاثے ریزرو بنک آف انڈیا نے روک لئے۔ نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باہمی تعصب پر مبنی دشمنی کی فضاء میں اثاثوں کی تقسیم اور منتقلی ایک غیر ہموار عمل بن گئی۔ پاکستان کے سرکاری حکام نے خطرہ محسوس کیا کہ معاشی اعتبار سے پاکستان کا گلہ گھونٹا جارہا ہے اور ہندوؤں نے پاکستان کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کررکھی ہے۔

ایک ریاست اور قوم کی حیثیت سے پاکستان کے ارتقاء کو ان معاشی اور سیاسی چیلنجوں اور ابتدائی ایام میں ان چیلنجوں کے مقابلے میں پاکستانی راہنماؤں کے ردعمل نے حد درجہ متاثر کیا۔ جس ابہام نے پاکستان کی آزادی کے حامیوں کو متحد کررکھا تھا وہ اس ملک کے معرض وجود میں آجانے کے بعد قائم نہ رہ سکا۔ اگرچہ جناح دوران تقسیم گروہی اور مذہبی تشدد کے متعدد واقعات پر فکرمند اور افسردہ تھے۔ تاہم وہ خود کو ان مذہبی نعروں سے الگ نہ کرسکے جو پاکستان کی آزادی پر منتج ہوئے۔

پاکستان کی رسمی آزادی کے 3 دن قبل مسٹر جناح کو برطانوی دولت مشترکہ کے ایک نئے خودمختار ملک کا گورنر جنرل مقرر کردیا گیا۔ انہوں نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ پاکستان کے بانی اور قائداعظم توقع رکھتے تھے کہ نیا ملک مسلمانوں کا وطن بنے لیکن یہ نہیں چاہتے کہ اس کی گورننس میں مذہب بھی کوئی کردار ادا کرے۔

"آپ آزاد ہیں۔ اپنے مندروں اور مساجد میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ پاکستانی ریاست میں رہ کر کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کیلئے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب۔ ذات یا نسل سے ہو۔ یہ ریاست کا مسئلہ نہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کچھ عرصہ قبل انگلستان کے حالات ہندوستان کے موجودہ حالات سے بھی بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے پر ظلم ڈھاتے رہے۔ آج بھی کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں کسی مخصوص طبقے سے امتیاز برتا جاتا ہے اور اس پر بعض (ناروا قسم کی) پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ہم اپنا آغاز ان دنوں سے نہیں کررہے۔ ہم ان دنوں سے اپنی زندگی کا آغاز کررہے ہیں جب کسی ذات یا نسل کو کسی دوسری ذات یا نسل پر فوقیت حاصل نہیں۔ ہم اس بنیادی اصول کو مشعل راہ بنا کر اپنی زندگی کا آغاز کررہے ہیں۔ کہ ہم ایک ہی ملک کے شہری ہیں۔ ہر لحاظ سے برابر اور یکساں شہری۔ وقت کے ساتھ ساتھ انگلستان کے عوام کو صورت حال کے حقائق کا سامنا کرنا پڑا انہیں ان ذمہ داریوں اور بوجھ سے عہدہ برآ ہونا تھا جو ان کے ملک کی حکومت نے ان کے کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ وہ اس آگ میں

سے قدم بقدم گزرے۔ اسے عبور کیا اور آج آپ پورے انصاف اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کوئی رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ نہیں۔ ہر فرد ایک شہری ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کا یکساں حقوق کا حامل شہری۔ وہ سب ایک ہی قوم کے ارکان ہیں۔ ہم اگر ان کی مثال آئیڈیل کی شکل میں اپنے سامنے رکھیں تو نہ ہندو ہندو رہے گا اور نہ ہی مسلمان مسلمان۔ مذہب ہر شہری کا انفرادی عقیدہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک ریاست کے شہری ہونے کے ناطے آپ مذہب کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ یعنی مذہب آپ کی سیاسی زندگی میں دخیل نہیں ہوگا"۔

پاکستان کے سیکولر عناصر نے مسٹر جناح کے 11 اگست کے خطاب کی یہ توجیہہ کی کہ انہوں نے پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے کا واضح عندیہ دیدیا ہے۔ کیونکہ ان دنوں تقسیم کے عمل کے ساتھ ساتھ گروہی اور مذہبی فسادات بھی عروج پر تھے۔ لہذا مسٹر جناح کے اس خطاب کی خوب تشہیر کی گئی۔ بعد میں اس کی سرکاری سطح پر قطع و برید کی گئی اور ریاستی معاملات میں مذہب کے کردار کی نفی کے بارے میں خطاب کے حصوں کو اصل متن سے الگ کر دیا گیا آزادی سے ایک سال بعد اپنے جانشینوں کو الجھاؤ کا شکار چھوڑ کر محمد علی جناح چل بسے۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ مذہب کو ملکی سیاست اور ریاستی معاملات سے الگ رکھا جائے یا اس نئے ملک کی بنیاد ان مذہبی جذبات پر رکھی جائے جو تخلیق پاکستان کا محرک بنے۔ زمینی سیاسی حقائق نے ان جانشینوں کی سمت کا تعین کیا۔

پاکستان کو سب سے زیادہ حمایت ان علاقوں میں مقیم مسلمانوں کی طرف سے حاصل ہوئی جو پاکستان کا حصہ بن سکے۔ ان علاقوں نے مسلم لیگ کے لئے غیر متناسب تعداد میں قیادت۔ سینئر فوجی افسران اور پاکستان کی ابتدائی دور کی انتظامیہ کے لئے سول ملازمین بھی مہیا کیے۔ جن دنوں پاکستان کی حیثیت ایک مطالبے سے زیادہ نہ تھی۔ ان دنوں بین الصوبائی رقابتیں۔ فرقہ وارانہ اور لسانی اختلافات اور اشرافیہ کے مختلف گروہوں کے متصادم سیاسی مفادات غیر فعال رہے۔ لیکن جب مطالبے نے ریاست کی شکل اختیار کر لی تو وہی اختلافات آئین کی تحریر اور سیاسی اتفاق رائے کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ بھارت جو پاکستان کے ساتھ ہی آزاد ہوا۔ وہاں 1949ء میں ایک متفقہ آئین منظور کر لیا گیا اور 1951ء میں عام انتخابات کا انعقاد عمل میں آ گیا۔ پاکستان کا پہلا آئین 1956ء سے قبل تشکیل نہ دیا جا سکا اور صرف دو سال بعد ایک فوجی انقلاب کے نتیجے میں آئین کو منسوخ کر دیا گیا۔

بھارت کے برعکس آزادی کے بعد پاکستان میں عام انتخابات کا انعقاد ممکن نہ ہو سکا۔ بلکہ متبادل کے طور پر صوبائی اسمبلیوں کے توسط سے بالواسطہ انتخابات منعقد کرائے گئے۔ 1951ء میں پنجاب اور سرحد میں ہونے والے صوبائی انتخابات میں انتظامیہ کی مداخلت کے الزامات عائد کئے گئے۔ ادھر سندھ کی منتخب قیادت کے ساتھ مرکز کے تعلقات اکثر کشیدگی کا شکار رہے۔ جس مسلم لیگ نے پاکستان کو آزادی دلائی۔ 1954ء میں بنگالیوں کی بیداری کے بعد ملک کے مشرقی حصے میں اسے اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔

جس طرح آزادی سے قبل مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا مشاہدہ کیا گیا۔ جناح کے جانشینوں نے چاہا کہ آزادی کے بعد بھی اسی طرح اندرونی اختلافات پر قابو پایا جائے۔ پاکستان کے قومی تشخص کو مذہبی علامتوں کے ذریعے اجاگر کیا گیا اور مسلم لیگ اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے درمیان تاریخی مخاصمت کو آگے بڑھا کر اسے پاکستان اور بھارت کے مابین دشمنی میں بدل دیا گیا۔ ایک طرف ریاست جموں کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق متنازعہ بن گیا اور دوسری طرف بھارتی سیاستدانوں اور دانشوروں نے نظریہ پاکستان کو اپنی تنقید کا مستقل ہدف بنالیا۔ نتیجتاً یہ خیال پختہ تر ہوتا چلا گیا کہ "بھارت نے تقسیم ہند کو دل سے قبول نہیں کیا اور وہ اس تقسیم کو مرحلہ وار سبوتاژ کرسکتا ہے"۔ اسلامی تشخص کے خاتمے کے جس خوف نے قیام پاکستان کو ممکن بنایا وہی خوف نوزائیدہ پاکستان کا قومی تشخص قرار پایا۔ جسے مختلف ادوار میں تعلیمی نصاب اور پروپیگنڈہ کے ذریعے قوی تر بنایا جاتا رہا۔

بھارت کے ساتھ دشمنی پر توجہ مرکوز کرنے کے بعد نئی پاکستانی ریاست کو جواز وجود اور اتھارٹی حاصل ہوگئی۔ اسی دشمنی نے ملک کے اندر سیاسی مرکزیت کو ممکن بنایا اور اسی نے ریاست اور اس کے شہریوں کے باہمی تعلق کو متاثر کیا۔ پاکستانی عوام کو مسلسل باور کرایا جانے لگا کہ ملک کے وجود کو مسلسل خطرات لاحق ہیں اور ان خطرات کا سرچشمہ یا منبع بھارت ہے۔ حصول آزادی سے چند ہفتے بعد مسلم لیگ کے ترجمان انگریزی اخبار "ڈان" نے ایک اداریہ بعنوان "مکھن نہیں بندوقیں درکار ہیں" (Gun rather than butter) لکھا۔ اس اداریے میں زور دیا گیا کہ پاکستان کی مقدس سرزمین کے تحفظ کے لئے ایک بڑی اور عمدہ ترین اسلحے سے لیس فوج کی ضرورت ہے۔ لہذا ملکی دفاع کے ذمہ دار اس ادارے کو خصوصی مقام دیدیا گیا۔ اس کا ایک اور مطلب بھی تھا کہ جن نظریات یا افعال کی یہ توجیہہ کی جاسکتی تھی کہ وہ پاکستان کے ملی تشخص کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ انہیں باغیانہ قرار دے دیا جائے۔ بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے قیام کی خواہش اور ایک سیکولر آئین کی وکالت کو بغاوت کے زمرے میں شامل کردیا گیا۔ عائشہ جلال لکھتی ہیں:-

"اگر بھارت کے خلاف دفاع نے ایک طرف ریاستی حاکمیت کو قوت محرکہ مہیا کی تو دوسری طرف ایک تضاد کا مشاہدہ بھی کیا جانے لگا۔ وہ یہ کہ نوتشکیل شدہ مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلقات عدم توازن کا شکار ہوگئے۔ ایک مرکزی حکومت کے تصور کے سوا پاکستانی علاقوں کو بھارتی یونین کا حصہ بنا دینے کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ رہ گئی۔ بھارت کے خلاف دفاع مرکزی حکومت کی حاکمیت کو لاحق اندرونی خطرات کے خلاف بھی دفاع ثابت ہوا۔ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد ابتدائی چند سالوں کے دوران دفاعی اسٹیبلشمنٹ پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کی گئی۔ اس توجہ نے پر تسلط جہتیں اختیار کرلیں۔ ایک نوزائیدہ ملک میں اس نوعیت کی پیش رفت غیر معمولی نہیں تھی۔ اقتدار اعلیٰ کی حامل ایک اکائی سے الگ ہونے والی ریاست کی غیر محفوظ مرکزی قیادت نے ملکی سطح پر اپنی سیاسی مخالفت کو ریاست کی سلامتی کے

لئے خطرہ قرار دینے میں ذرہ برابر عار محسوس نہ کیا۔ اس عمل کے دوران ریاست کو لاحق اندرونی اور بیرونی خطرات میں انتہائی اہم امتیاز دھندلا سا گیا"۔

اگرچہ تقسیم سے قبل جناح نے پاکستان کو کبھی ایک نظریاتی ریاست کا نام نہیں دیا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ان کے جانشینوں نے جلد ہی ایک عدد "نظریہ پاکستان" کی خاکہ کشی کر لی۔ اسلام، بھارت سے دشمنی اور اردو زبان نئے قومی نظریے کے اساسی سنگ ہائے میل قرار پائے۔ اسلامی اتحاد کو نسلی یا گروہی وطن پرستی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھ لیا گیا۔ وہ نسلی یا گروہی وطن پرستی جو پاکستان کی سلامتی کے لئے حد درجہ نقصان دہ اور تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی یہ دلیل بھی دی جانے لگی کہ بھارت پاکستانی عوام کے درمیان موجود گروہی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو تقسیم اور تباہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ آزادی کے بعد جلد ہی "اسلامی پاکستان" نے خود کو "ہندو بھارت" کی راہ میں مزاحمت کے عدسے سے ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ مزید براں پاکستان نے اقتصادی اور عسکری تعاون حاصل کرنے کے لئے بڑی طاقتوں کو اپنا اتحادی بنانے کی کاوشیں شروع کر دیں۔

قومی پالیسی میں اسلام کو ایک عنصر کا درجہ ملا تو اس چیز نے مذہبی راہنماؤں کو طاقتور کر دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ "اسلام کے محافظوں یا نگرانوں، ملک کی عسکری اسٹیبلشمنٹ، سول بیوروکریسی اور انٹیلی جنس اپریٹس کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو گیا اور انہوں نے خود کو اس نئے ملک کا سرپرست خیال کرنا شروع کر دیا۔ بھارت کے ساتھ مراسم میں لچک کے فقدان اور اس یقین یا وثوق نے کہ بھارت پاکستان کے لئے مستقل خطرہ ہے ایک بڑی فوج کا جواز پیدا کر دیا۔ جس نے ملک کی زندگی پر اپنے تسلط کو اپنا حق سمجھا۔ ملکی دفاع اور اقتصادی ترقی میں تعاون کرنے والوں کی تلاش نے پاکستان کو مغرب بالخصوص امریکہ کا اتحادی بنا دیا۔

مذہبی وطن پرستی، بھارت کے ساتھ تصادم کی پالیسی اور مغرب کے ساتھ اتحاد ان تینوں عناصر نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ بعض اوقات یہ اثرات ناقابل ادراک رہے۔ بعض اوقات ایک محرک کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے دوسرے کو مسخ یا اس کی پیچیدہ وضاحت کرنا ضروری ہو گیا، پاکستان کے اس خود ساختہ امیج کو تقویت دینے کے لئے کہ وہ اسلام کے قلعے کی ناقابل تسخیر فصیل ہے۔ بھارت کو اسلام کا دشمن بنا کر پیش کرنا پاکستان کے لئے ناگزیر ہو گیا۔ امریکہ سے اسلحے کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ اسے پاکستان کے سٹریٹیجک محل وقوع اور اس کی قدر و قیمت کا ادراک کرایا جائے اور بتایا جائے کہ وہ کمیونسٹوں کا مخالف ہے۔ یہ اسلحہ پاکستان کو بھارت کا مقابلہ کرنے کے لئے درکار تھا۔ پاکستانی تاریخ میں اس کی مرکزی حاکمیت کو سب سے زیادہ خطرات علاقائی خودمختاری، گروہی حقوق اور سیاسی شراکت کا مطالبہ کرنے والوں کی طرف سے لاحق رہے۔ تاہم بعد میں آنے والی پاکستانی حکومتوں نے خطرات کو بھارت کے ایسے منصوبوں سے منسوب کر دیا جو وہ پاکستان کو کمزور کرنے کے لئے تشکیل دیتا ہی رہتا ہے۔ یا پھر ایسے خطرات کا باعث "کمیونسٹوں" کو قرار دیا جانے لگا حالانکہ پاکستان میں کمیونسٹوں کا رسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔

پاکستان کو ایک اسلامی نظریات ریاست میں تبدیل کرنے کے لئے پہلا رسمی قدم مارچ 1949ء میں اس وقت اٹھایا گیا جب ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے آئین ساز اسمبلی میں "قرارداد مقاصد" پیش کی۔ پاکستان نے مستقبل میں جس آئین کو اپنانا تھا۔ قرارداد مقاصد میں اس کے اہم اصول اور خدوخال بیان کئے گئے۔

قرارداد میں درج تھا کہ اسلام میں جمہوریت، آزادی، مساوات، قوت برداشت اور سماجی انصاف کے جو (زریں) اصول بیان کئے گئے ہیں ان کا کامل احترام کیا جائے گا۔ اس طرح اسلام ایک ریاست سے جو تقاضے کرتا ہے ان کے بارے میں مستقبل کیلئے متنازعہ مباحث کا دروازہ کھول دیا گیا۔ قرارداد مقاصد مذہب اور علوم سیاسیات کا ایک عجیب و غریب آمیزہ تھی۔ اس میں درج تھا۔

"اس کائنات پر اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور اس نے جو اختیارات تفویض فرمائے ہیں وہ اسی کی بیان کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک مقدس امانت کے طور پر استعمال کئے جائیں گے۔"

"پاکستانی عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ آئین ساز اسمبلی اقتدار اعلیٰ کی مالک ایک آزاد ریاست پاکستان کے لئے ایک آئین تشکیل دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔"

"ریاست اپنے اختیارات اور حاکمیت عوام کے منتخب نمائندوں کے توسّط سے استعمال کرے گی۔"

"اسلام میں دیئے گئے جمہوریت، آزادی، مساوات، قوت برداشت اور سماجی انصاف کے اصولوں کا مکمل احترام کیا جائے گا۔"

"عوام قرآن عظیم اور سنت میں دیئے گئے اسلامی احکامات اور تعلیمات کے مطابق نجی اور اجتماعی سطح پر زندگی گزار سکیں گے۔"

"جن علاقوں پر پاکستان اس وقت مشتمل ہے یا مستقبل میں جو علاقے مزید اس کا حصہ بنیں یا جن علاقوں کا اس کے ساتھ الحاق ہو۔ سب ملکر ایک وفاق کی شکل اختیار کریں گے۔ وفاق کی اکائیاں اپنی سرحدوں کے اندر رہتے ہوئے (مرکز کے) تفویض کردہ اختیارات اور حاکمیت کے تحت اپنا نظم و نسق چلائیں گی۔ ان کے اختیارات پر مرکز کی طرف سے بعض حدود و قیود بھی نافذ کی جائیں گی۔"

"قانون اور عوامی اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے عوام کو مرتبہ و مقام اور مواقع میں برابری اور قانون کے مطابق مساوات، سماجی، معاشی اور سماجی انصاف، سوچ، اظہار رائے، عقیدے، عبادت اور (کسی بھی سیاسی جماعت کے ساتھ) وابستگی کی آزادی سمیت تمام بنیادی حقوق دیئے جائیں گے۔"

"اقلیتوں اور پس ماندہ ومحروم طبقات کے جائز مفادات کے تحفظ کے لئے آئینی شقوں میں اضافہ کیا جائے گا۔"

"عدلیہ کی مکمل آزادی کی ضمانت فراہم کی جائے گی"۔

"وفاق کی علاقائی سالمیت، آزادی اور زمین پر اور سمندر وفضا میں اقتدار اعلیٰ کے حقوق سمیت تمام حقوق کا تحفظ کیا جائے گا"۔

"تاکہ پاکستان کے عوام خوشحال ہوں۔ اقوام عالم میں اپنا باعزت اور جائز مقام حاصل کرسکیں اور امن عالم۔ عالمی ترقی اور بنی نوع انسان کی خوشی کے حصول کے لئے اپنے حصے کی ذمہ داریاں نبھاسکیں۔"

اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے اور اسلامی ضروریات کو پورا کرنے میں غیر مسلم ارکان اسمبلی اور ایک تن تنہا مسلمان پارلیمنٹیرین نے اس نئی ریاست کے کردار پر شدید اعتراضات کیے۔ لیکن لیاقت علی خان نے آئین ساز اسمبلی کے اس اجلاس کو آزادی کے بعد ملکی زندگی کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔ ایک طرح سے ان کی بات درست تھی۔ قرارداد مقاصد کے بعد ایسا کوئی مقام یا موڑ نہیں آیا کہ پاکستان کو اسلامی نظریاتی ریاست سے کمتر خیال کیا گیا ہو۔

بعدازاں، جلد ہی حکومت میں شامل بعض نمایاں اور ممتاز اصحاب نے تجویز پیش کی کہ عربی کو قومی زبان کے طور پر اپنا لیا جائے اور بنگالی زبان کے سنسکرت رسم الخط کے لئے عربی یا فارسی کو بنیاد مان لیا جائے۔ مسلم لیگ کے صدر چوہدری خلیق الزماں نے اعلان کیا کہ پاکستان جملہ مسلمان ممالک کو اسلامائزیشن کے عمل میں شامل کرے گا اور "پین اسلامک" تشخص تشکیل دیا جائے گا۔ اسلام کی بین الاقوامیت کو فروغ دینے کے لئے حکومت پاکستان نے کراچی میں 1949ء میں "مسلم کانفرنس" کے انعقاد کا اہتمام بھی کیا۔ وہ کانفرنس "موتمر عالم الاسلامی" کی تشکیل پر منتج ہوئی۔ "موتمر عالم الاسلامی" نام کی تنظیم نے عالمی سطح پر مسلمانوں کی مظلومیت کو اجاگر کیا۔ مظلومیت کے اسی احساس کو عالمی اسلامی تحریکوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ 1949ء کے اواخر میں حکومت پاکستان نے ایک اسلامی کانفرنس کی تشکیل کے لئے دیگر مسلمان ممالک کی حکومتوں سے رابطہ کیا۔ صرف مصر اور سعودی عرب نے دل چسپی کا اظہار کیا۔

نومبر 1949ء میں کراچی میں جس "عالمی اسلامی اقتصادی کانفرنس" کا اہتمام کیا گیا، اس میں 18 ممالک کے مندوبین شریک ہوئے۔ وزیر خزانہ غلام محمد جو بعد میں گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کے ایک اہم معمار تھے۔ انہوں نے "مسلمان ممالک کے اجتماعی سوداکاری اور اجتماعی تحفظ کے نظام" کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔

تاہم اس دور کی مسلمان حکومتوں نے پاکستان کی " کل اسلامی"(Pan Islamic) خواہشات میں شرکت یا ان کی حمایت نہ کی۔ مسلمان دنیا کے باقی ماندہ حصوں میں وطنیت کی بنیاد گروہی، لسانی یا علاقائی تھی۔ زیادہ تر عرب حکومتیں اور ترکی جیسی سیکولر ریاستیں تجدید مذہب کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ پاکستان کے ابتدائی چند سالوں پر مغربی ماہر اور دانشور کیتھ کیلرڈ لکھتا ہے۔" پاکستانی مسلمان دنیا کے مقصد اور سوچ کی جہت کے لازمی اشتراک پر یقین رکھتے تھے"۔

پاکستان " مسلم کاز" کے فروغ کے لئے بنایا گیا تھا۔ دیگر مسلمانان عالم سے امید کی گئی کہ وہ مذکورہ کاز کے لئے ہمدردی ہی نہیں جوش وخروش کا مظاہرہ بھی کریں گے لیکن دیگر ممالک میں سیاسی بیداری کی بنیاد زیادہ تر علاقائی اور نسلی وطن پرستی اور مغرب اور سفید فاموں کی مخالفت پر رکھی گئی۔ اس سیاسی بیداری میں مذہب نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ تاہم اس کردار کی مقدار رنگ، زبان، نوآبادیاتی نظام اور استعماریت کی متشدد مخالفت کے نظریے سے کم تھی۔ اگر دیگر مسلمان ریاستوں کے پاس چوائس ہوتا کہ وہ پاکستان اور بھارت میں سے کسی ایک کی دوستی کا انتخاب کریں تو زیادہ طاقتور، زیادہ مستحکم اور زیادہ بارسوخ ہونے کی بناء پر توقع کی جاسکتی تھی کہ ان کا انتخاب بھارت سے دوستی ہوتا۔

اگرچہ ابتداء میں پاکستان کی " کل اسلامی "خواہشات کے ساتھ مسلمان حکومتوں کا رویہ غیر ہمدردانہ رہا۔ تاہم دنیا بھر کے اسلام پسند پاکستان میں اکٹھے ہو گئے۔ نازیوں کے حامی سابق مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی جیسی شخصیات اور عرب اخوان المسلمین جیسی اسلامی سیاسی تحریکوں کے راہنماؤں نے نسبتاً کم وقفوں سے پاکستان آنا جانا شروع کر دیا۔ پاکستان نے "اسلامی ملکوں کی عالمی تنظیم" کے قیام کی جو خواہش کی تھی وہ 1970ء کی دہائی میں پوری ہو گئی۔ پاکستان کے تشکیلی سالوں کے دوران اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کی کوششوں میں اس کی " کل اسلامی " سوچ اس کی خارجہ پالیسی کے مستول سے کہیں زیادہ اہم تھی۔

اس نوزائیدہ ملک پر اسلام کے نظریاتی تسلط کے خلاف پہلا قابل ذکر اور طاقتور اعتراض ملک کے مشرقی بازو یعنی بنگالی بولنے والے مسلمانوں کی طرف سے موصول ہوا جسے اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے۔ انہوں نے نظریہ پاکستان کی حمایت اس لئے کی تھی اپنی زیادہ آبادی کے باعث انہیں نئے ملک کے انصرامی معاملات میں اہمیت دی جائے گی۔ اگرچہ ان کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی تاہم وہ برابری سے زیادہ کی امید نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی سیاستدان اور سرکاری ملازمین پاکستانی حکومت پر چھا گئے۔ آزادی حاصل کئے بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہماری زبان یعنی "بنگالی" کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ تھوڑا عرصہ بعد ملک کے مغربی بازو میں نسل پرست سندھی، پشتوں (جنہیں پٹھان بھی کہا جاتا ہے) اور بلوچ بھی شکایت کرنے لگے کہ سرکاری ملازمین اور فوجی افسران کی اکثریت پنجابیوں اور ان اردو بولنے والے مہاجرین کی ہے جو شمالی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔

لیاقت علی خان خود بھی کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے۔ مزید براں آئین ساز اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کا تعلق ملک کی سیکولر اشرافیہ سے تھا۔ انہوں نے پاکستان کے ایک اسلامی ریاست ہونے کا باضابطہ اعلان اس احساس کے زیر اثر کیا کہ پاکستانی قوم کثیر الجہی تشخصات کی حامل ہے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے لسانی فسادات کا تجربہ یہ سبق دے گیا کہ نسلی تشخصات کو نئے پاکستانی تشخص میں مدغم کرنا ایک دشوار کام ہے۔ تحرک پیدا کرنے کے لئے مذہب نسبتاً آسان ذریعہ تھا۔ ایک "پاکستانی" اور ایک "اچھے مسلمان" کو ایک دوسرے کے مترادف ثابت کرنا نسبتاً سہل الحصول نصب العین تھا۔ کیونکہ مختلف لوگ اسلام کی مختلف توجیہات کر رہے تھے۔ لہذا ایک نظریاتی ریاست کی تعمیر و ترقی کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ریاستی اداروں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک نئے ملک کی تعمیر کے عمل کو کنٹرول کریں۔ ان ریاستی اداروں کی برتری ثابت کرنے لے لئے حاکمیت کی وسیع تر مرکزیت ناگزیر تھے۔

سیکولر اشرافیہ نے یہ فرض کر لیا کہ اپنی حکمرانی کے تسلسل کے لئے وہ "اسلامی نظریے (Islamic Ideology)" پر لوگوں کو اکٹھا کریں گے۔ انہوں نے سوچا کہ "مجلس احرار" اور "جمعیت العلمائے اسلام" جیسی تنظیموں سے وابستہ علمائے دین اور مذہبی اعتبار سے فعال لوگوں کو استعمال کرتے رہیں گے۔ پاکستان کو ہندوستان میں فعال "برٹش انٹیلی جنس سروس" کے "مذہبی حصے" بھی ورثے میں ملے۔ انہیں متشکل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ "نوآبادیاتی حکمرانی" کے دور میں وہ مختلف مذہبی گروہوں پر اثر انداز ہوتے رہیں برطانوی حکمرانوں نے "ان مذہبی گروہوں" کو "آزادی ہند" کے دباؤ کو زائل کرنے کیلئے اکثر استعمال کیا" تقسیم کرو اور حکومت کرو" یا زیادہ واضح لفظوں میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" (Divide and Rule) جیسی روایتی سوچ کو اپناتے ہوئے "برطانوی راج" کے راہ نماؤں نے فرض کر لیا کہ مختلف مذہبی حلقوں، خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کو فرقہ وارانہ مسائل و معاملات میں الجھا کر وہ انتظامی اعتبار سے بہتر کنٹرول حاصل کر سکیں گے۔ آزادی کے بعد ملک کو لاحق فرضی اور حقیقی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے پاکستانی انٹیلی جنس کی تنظیموں نے بھی امید رکھی کہ وہ یہی حیلے حربے استعمال کر سکیں گی۔ ایک تو مذہبی تنظیموں کی تعداد کم تھی۔ دوسرے ان پر آزادی سے قبل تخلیق پاکستان کی مخالفت کا دھبہ لگا ہوا تھا۔ لیکن جس قسم کے بیانات انہوں نے داغے۔ سیکولر حکام نہ دے سکے۔ خصوصاً وہ پالیسیاں جو عوام کی سمجھ میں نہ آئیں یا عوام کی توجہ نہ حاصل کر سکیں حکومت نے علمائے دین کو اس انداز میں استعمال کیا کہ تاثر پیدا ہو گیا مذکورہ پالیسیوں کو اپنانے کے لئے عوام نے بے پناہ دباؤ ڈال رکھا ہے۔ جس طرح 1953ء میں لاہور میں احمدیوں کے خلاف ہنگاموں اور فسادات کے دوران ہوا۔ حکومت مذہبی گروہوں کی مدد بھی حاصل کر سکتی تھی۔ احمدی (جنہیں قادیانی یا مرزائی بھی کہا جاتا ہے) مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ ۱۹ ویں صدی کے مرزا غلام احمد کو مسیح مانتے ہیں۔ اور اسی کی تعلیمات کی پیروی کرتے ہیں۔ مرزا غلام احمد جسے وہ (نعوذ باللہ) نبی خیال کرتے ہیں۔ اس کی تعلیمات کے مطابق

جہاد فرض نہیں۔ راسخ العقیدہ مسلمان احمدیوں کو ایک غیر اسلامی مسلک سمجھتے ہیں کیونکہ وہ محمد ﷺ کو خدا کا آخری نبی یعنی آخر الزمان نہیں سمجھتے۔ 1951ء میں پنجاب میں منعقد ہونے والے انتخابات کے بعد وزیر اعلیٰ پنجاب نے جو کہ مسلم لیگ کے رکن بھی تھے۔ اسلام پسند گروہوں کے ساتھ اپنی صوبائی سیکرٹ سروس کے روابط سے استفادہ کرتے ہوئے عوامی ایجی ٹیشن کا اہتمام کیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب چاہتے تھے مظاہرین مطالبہ کریں کہ قانونی مقاصد کے لئے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیدیا جائے۔

اصل منصوبہ یہ تھا کہ سڑکوں پر نکل آنے والے تشدد پسند مظاہرین پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان سے مستعفیٰ ہونے کا مطالبہ کریں گے۔ کیونکہ وہ احمدی تھے۔ ان کے مستعفیٰ ہونے سے وفاقی حکومت گر جائے گی۔ جس سے فائدہ اٹھا کر پنجاب کے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ وزیر اعظم پاکستان بن جائیں گے۔ وہ ہنگامے، فسادات اور اجتماعی مظاہرے تو کامیاب نہ ہوئے تاہم امن امان کی صورت حال ناگفتہ بہ ہوگئی۔ جس پر قابو پانے کے لئے فوج بلانا پڑی اور پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

اس سال رونما ہونے والے واقعات کے نتیجے میں تین اہم مسائل ابھر کر سامنے آئے جو باہم مربوط تھے۔ وہ مسائل تک آج پاکستان کی اندرونی سیاست پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ حکومتی مشینری کے ایک حصے نے جزوی طور پر مذہب، مذہبی گروہوں کے رسوخ اور اس رسوخ کی مدد سے ابھارے جانے والے جذبات سے فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی لیکن ایک مرحلے پر آ کر وہ جذبات بے قابو ہو گئے۔ مذہبی و سیاسی سطح پر احتجاج جس افراتفری اور انتشار پر منتج ہوا۔ اس سے نمٹنے کے لئے فوج آگے بڑھ آئی۔ تاہم مذکورہ انتشار کی وجوہ سے نمٹنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔

احمدیوں کے خلاف فسادات نے مولانا سید الوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت اسلامی کو عوام کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ جماعت اسلامی جس کی بنیاد 1941ء میں رکھی گئی۔ دیگر مذہبی گروہوں سے مختلف تھی۔ نہ ہی اس میں فرقہ واریت موجود تھی اور نہ ہی اسے کسی مخصوص اسلامی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کی تنظیم کہا جا سکتا تھا۔ جماعت اسلامی عرب اخوان المسلمین (Arab Muslim Bortherhood) کی طرز پر ایک اسلام پسند جماعت تھی۔ اس کے بانی مولینا مودودی نے روایتی ملاؤں کی بجائے متوسط پیشہ ور طبقے اور سرکاری ملازمین کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اسلام کی تجدید کو انہوں نے اپنا مقصد بنا لیا۔ انہوں نے نہ صرف تحریک آزادی پاکستان میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ تقسیم ہند سے قبل مسلم لیگ کی "غیر اسلامی" قیادت پر تنقید کے تیر بھی برساتے رہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس نظریے کی حمایت کی کہ مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ہی مختلف قوم ہیں۔ ولی نصر اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے لئے گروہی حقوق" دونوں تنظیموں کا مشترکہ مرکزی خیال تھا۔ جماعت اسلامی نے "گروہی کاز" کو جائز قرار دیتے ہوئے ملک کی مذہبی شخصیات سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ کیلئے حمایت کو بنیاد مہیا

کرنے میں ممد ثابت ہوں۔ مسلم لیگ نے جواباً "پاکستان میں جاری سیاسی عمل کو تیزی سے اسلامائز کیا تا کہ جماعت اسلامی اس تبدیلی سے استفادہ کر سکے اور ملک کے سیاسی میدان میں داخلے کیلئے جماعت کو ایک مناسب اور موزوں دروازہ مل جائے۔

تخلیق پاکستان سے قبل مولانا مودودی مذہبی اور روحانی تجدید پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے سیاست میں حصہ لئے بغیر سیاست پر تبصرے کئے۔ انہیں توقع تھی کہ وہ متقی اور پرہیز گار مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ تشکیل دے لیں گے جس کے ارکان کے دل میں اقتدار کی خواہش نہیں ہوگی اور وہ خود کو ایک مثال بنا کر لوگوں کی راہ نمائی کریں گے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حصول آزادی کے عمل نے ان کا ذہن تبدیل کر دیا۔ اگر شعائر اسلامی سے دور اور مغرب سے تعلیم یافتہ جناح ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر انہیں ایک ریاست کے حصول کی کاوشوں پر آمادہ کر سکتے تھے تو مولانا مودودی کی دلیل کے مطابق عملی مسلمانوں کا ایک گروہ بھی امکانی طور پر اس ریاست کا انتظام وانصرام سنبھال سکتا تھا۔

مولانا مودودی (1903ء سے 1979) ایک بسیار نویس لکھاری تھے۔ ان کا موقف تھا کہ اسلام جس قدر ایک مذہب ہے اسی قدر ایک نظریہ ہے۔ مولانا مودودی کے خیال کے مطابق اسلامی نظریے نے پیغمبروں کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ان کی پیش کردہ صراحت درج ذیل ہے۔

(1) دانشوروں اور بنی نوع انسان کی ذہنی سوچ میں انقلاب بپا کر دیا جائے۔ زندگی کے بارے میں ان کی سوچ رفتہ رفتہ اسلامی ہو جائے۔ انہیں اس حد تک اخلاقیات کا مقلد بنا دیا جائے کہ ان کی سوچ کا انداز۔ زندگی میں ان کا آئیڈیل رویہ اور اقدار کے معیارات اسلامی ہو جائیں۔

(2) جو لوگ اسلامی تصورات کو قبول کر چکے ہوں اور تمام دستیاب ذرائع اور ساز وسامان کو استعمال کرتے ہوئے اقتدار اور اس کے حصول کی جدوجہد کے خیال سے اپنی زندگی کو اسلامی طرز پر ڈھال چکے ہوں۔ ان کی جماعت بندی کر دی جائے۔

(3) اسلامی حاکمیت کے قیام کو (ہر صورت) ممکن بنایا جائے۔ سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اسلامی بنیادوں پر منظم کیا جائے۔ ایسے ذرائع اپنائے جائیں جو عالمی سطح پر اسلام کے حلقہ رسوخ میں وسعت کا باعث بن سکیں۔ جو لوگ وقتاً فوقتاً دائرہ اسلام میں داخل ہوں ان کے ساتھ رابطہ کر کے یا ان کے لئے مثال بنکر ان کی اخلاقی اور دانشورانہ تربیت کا اہتمام کیا جائے۔

جماعت اسلامی نے کیمونسٹ جماعتوں کی طرز پر دستہ سازی پر مبنی طریق کار اپنایا۔ اس نے دوسرے ملکوں کی اسلام پسند جماعتوں سے اتحاد کئے۔ سکولوں کے نیٹ ورک سے رکنیت سازی کی اور مرحلہ وار اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ بننے

کی امید باندھ لی۔ جماعت اسلامی نے اسلامی انقلاب کی جو آواز بلند کی اسے عوامی سطح پر پذیرائی نہ مل سکی۔ تاہم تقسیم ہند سے چند سال بعد ہی سماجی خدمات کے حوالے سے جماعت اسلامی احسن انداز میں منظم کردہ ایک ملک گیر تنظیم بن گئی۔ جماعت نے دیکھا کہ اسے ملک کی نئی اشرافیہ کے ساتھ ملکر کام کرنے کا موقع مل رہا ہے تو اشرافیہ نے تعمیر ملک کے جو منصوبے تشکیل دیئے۔ جماعت اسلامی نے مذہبی بنیادوں پر انہیں عقلی اور منطقی جواز مہیا کیئے۔ جماعت اسلامی نے طلباء، ٹریڈ یونینوں اور پیشہ وارانہ تنظیموں میں دستہ سازی کی۔ اپنے اسلامی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے اس نے اپنے میڈیا کی تعمیر پر توجہ مرکوز کی اور حکومت میں موجود ان لوگوں کی فطری اتحادی بن گئی جو سمجھتے تھے کہ ایک ریاست کے طور پر پاکستان کو اپنی بقاء کے لئے مذہبی سہارا درکار ہے۔

تقسیم کے فوراً بعد پاکستانی اسٹیبلشمنٹ مولانا مودودی کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار ہوگئی۔ انہوں نے پرہیزگار قیادت کا جو تصور پیش کیا بعض لوگوں کو اس میں مرکزی مطلق العنانیت کی مبادیات نظر آئیں جبکہ باقی جماعت اسلامی کے انقلابی بیانات کو خطرناک خیال کرنے لگے۔ مسلم لیگی راہنماؤں نے سمجھا کہ مولانا مودودی عوامی حمایت کے ایک حریف دعویدار ہیں۔ کچھ لوگ اس بات پر فکر مند ہوئے کہ جن لوگوں نے حصول پاکستان کی مہم میں حصہ نہیں لیا تھا وہ قیادت کے دعویدار بن کر سامنے آرہے ہیں۔ لیاقت علی خان نے سرکاری ملازمین اور فوجی افسران کو ہدایت جاری کردی کہ وہ جماعت اسلامی میں مت شامل ہوں۔ حتیٰ کہ 1948ء میں اس تنظیم کو بزور کچلنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے اخبارات پر پابندی عائد کردی گئی اور اس کے راہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔

لیاقت علی خان کی تنبیہہ رائیگاں گئی۔ ریاستی مشینری کے جو وابستگان تعمیر ملک کی مہم میں سرگرم تھے انہوں نے مولانا مودودی کے کچھ خیالات کے مطابق خود کو ڈھال لیا اور کچھ کو اپنا لیا۔ جماعت اسلامی نے وزیر اعلیٰ پنجاب افتخار ممدوٹ جیسے مسلم لیگی راہنماؤں کے ساتھ قریبی تعلقات سے فائدہ اٹھایا۔ وہ ان راہنماؤں میں سے تھے جو سیاسی حریفوں کے خلاف جنگ کے دوران جماعت اسلامی جیسے اسلامی گروہوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ مغرب نواز وزیر داخلہ میجر جنرل سکندر مرزا اور آرمی چیف جنرل ایوب خان مولانا مودودی کو مسلسل ناپسند کرتے رہے۔ دونوں بعد میں صدر پاکستان کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ مستقل ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے ان ارکان نے ایسے مزید اسلامی گروہوں کی تخلیق کی حوصلہ افزائی کی جو سرکاری کنٹرول کو قبول کرنے کے لئے نسبتاً زیادہ آمادہ رہتے تھے۔ ان مذہبی گروہوں نے بعد ازاں جماعت اسلامی کی سیاست کو متاثر کیا۔

مولانا مودودی نے مسلمانوں کی جماعت بندی اور ان کی سوچ میں نظام عقیدہ کو قطرہ قطرہ اتارنے کا جو نظریہ پیش کیا وہ پاکستان کے ان بڑے یا چھوٹے قومی معماروں کے مقاصد سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ جنہوں نے جماعت بندی کو ایک ایسی قومی ریاست کے ابتدائی خاکے کی سلوٹیں دور کرنے کے لئے ضروری خیال کیا جو بنیادی طور پر اپنے شہریوں کے

مذہب کے باعث متحد تھی۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں کی اشرافیہ نے اگرچہ پیغام بر کی مخالفت کی۔ تاہم پیغام کو پذیرائی دی۔ ان کے لئے ایک مذہبی ریاست کا تصور اس وقت تک قابل قبول تھا جب تک اختیارات مذہبی علماء کے ایک گروہ کو اپنا محور نہ مان لیں۔ دوسری طرف مولانا مودودی چاہتے تھے کہ اقتدار اور اختیارات "صالحین" (پرہیز گاروں اور متقیوں) کے پاس ہونے چاہئیں۔ جماعت اسلامی نے اپنے فلسفے کو اس نعرے میں سمو دیا کہ "ملک خدا کا ہے۔ (لہذا) ضروری ہے کہ اس پر حاکمیت بھی خدائی قانون کی ہو۔ اس پر خدا کے پرہیز گار اور متقی بندوں کی حکومت ہونی چاہئے"۔

دسمبر 1947ء میں مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر ہو کر "اسلامی جمعیت طلباء" تشکیل دی گئی۔ جسے بعد میں صرف "جمعیت" اور "آئی جے ٹی" کے مخفف سے بھی پکارا گیا۔ جماعت اسلامی کی سٹوڈنٹ ونگ آئی جے ٹی مصر کی "اخوان المسلمین" کے طریقہ ہائے کار سے بہت متاثر تھی۔ وہ اس آئینی مرحلہ واریت سے زیادہ انقلابی تھے جس کی جماعت اسلامی وکالت کرتی تھی۔ "اسلامی جمعیت طلبہ" طالب علموں کی سیاست میں ملوث ہوگئی۔ اس طرح وہ اس قابل ہوگئی کہ پاکستان بھر کے کالجوں میں مارکس کے حامی طلباء کے گروہوں کے مقابلے میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلباء کو ایک بڑا سائبان مہیا کر سکے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلباء پر مشتمل حریف گروہوں کے ساتھ آئی جے ٹی کے متشدد تصادم بھی ہوئے۔ جو معاملات طالب علموں کو منفی طور پر متاثر کرتے تھے ان کے خلاف آئی جے ٹی نے مظاہرے کئے۔ اسلامی جمعیت طلباء نے ایک طرف تو جماعت اسلامی کی بھرتی کے لئے دستے فراہم کئے اور دوسری طرف پاکستان کے تعلیمی نظام۔ سرکاری ملازمین اور فوجی افسران میں ہمسفروں کا ایک حلقہ قائم کر لیا۔ جب اسلامی جمعیت طلبہ کے ارکان مطلوبہ مقررہ استعداد حاصل کرنے کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تو آخرالذکر نسبتاً زیادہ علانیہ طور پر سیاست میں سرگرم ہوگئی۔ جماعت نے خود کو صرف ایک مقصد تک محدود رکھنا ترک کر دیا اور اپنے رسوخ اور نظریے کو وسعت دینے کے لئے تمام ممکنہ طریقہ ہائے کار کی تلاش میں مصروف ہوگئی۔

مولانا مودودی نے تجدید اسلام کے لئے ایک 9 نکاتی ایجنڈے کے خدوخال پیش کئے۔ مذکورہ نکات میں سے کچھ۔ مثلاً "غیر اسلام کی طاقت کو توڑ کر اسلام کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے" ایسے بھی تھے جو حکمران اشرافیہ کے مزاج پر گراں گزرے۔ دانشورانہ انقلاب اور دفاع اسلام جیسے نکات پاکستان کے اسلامی قومی تشخص کی تعمیر میں ممد اور مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ مولانا مودودی نے دانشورانہ انقلاب کی تعریف پیش کرتے ہوئے اسے ایک ایسی کوشش قرار دیا جس کے توسط سے "لوگوں کے تصورات" عقائد اور اخلاقی نقطہ ہائے نظر کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ تعلیمی نظام کی اصلاح کی جا سکے اور اسلامی علوم اور عمومی رویوں کی تجدید ممکن ہو جائے" عوامی خیالات کو ایک مخصوص انداز میں متشکل کرنے اور اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے اس منصوبے نے بعد میں پاکستان کو ایک ایسے قومی کلچر اور تاریخ کی تخلیق کے لئے بنیاد مہیا کر دی۔ جس نے پاکستان کے نقطہ آغاز کو جنوبی ایشیاء میں اسلام کی آمد سے منسلک کر دیا۔

ریاستی مرکزیت کے مخالف گروہی وطن پرستوں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کے خلاف متعدد مہمات کے دوران پاکستانی ریاست نے مولانا مودودی کے ان افکار سے استفادہ کیا جو انہوں نے دفاع اسلام کے لئے پیش کئے تھے۔ مذکورہ افکار ان سیاسی قوتوں کے خلاف پیش کئے گئے تھے جو اسلام کو دبانا اور ختم کرنا چاہتی تھیں۔ ان افکار کا مقصد ان قوتوں کی طاقت کو توڑنا اور اسلام کو ایک زندہ قوت بنانا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک اس پر "پرہیز گار اور متقی اشرافیہ" کی حکمرانی کا آغاز نہ ہوا تھا تاہم پاکستان اسلام کا قلعہ اور اسلامی ریاست بن چکا تھا۔ ریاست کے نقادوں اور دشمنوں کو اب اسلام کے دشمن کہا جاسکتا تھا اور ان کے خیالات ایک زندہ قوت کے طور پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے خطرہ تھے۔

پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مولانا مودودی کے ابتدائی رابطوں میں سے ایک مولانا ظفر احمد انصاری تھے۔ وہ مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے تھے اور مولانا مودودی کی اس سوچ سے متفق تھے کہ پاکستان میں مذہب کو نسبتاً زیادہ کردار ملنا چاہئے۔ پاکستان کی سول سروس کے پہلے سربراہ چوہدری محمد علی نے مولانا انصاری اور مولانا مودودی دونوں سے مشاورت کی۔ چوہدری محمد علی بعد میں پاکستان کے وزیراعظم بھی بنے۔ اپنے اسلامی ریاست کے تصور کی وضاحت کے لئے مولانا مودودی کو ریڈیو پاکستان پر قوم سے خطاب کی دعوت بھی دی گئی۔ اسلامی آئین کی تشکیل کے لئے علمائے دین کو متحرک کرنے میں جماعت اسلامی نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس نے بھارت کے خلاف سخت رویہ اپنائے رکھا اور بائیں بازو والوں، سیکولر ذہن کے حاملین اور گروہی وطن پرستوں کو "اسلام دشمن کفار" قرار دیکر ریاست کی مدد کی۔ بالآخر جب محمد علی نے بطور وزیراعظم 1956ء میں پاکستانی آئین کی اچھی طرح چھان بین کر لی تو اس کے دیباچے میں "قرارداد مقاصد" شامل کی گئی۔ آئین ساز اسمبلی کو قومی اسمبلی میں تبدیل کیا اور پاکستان کا سرکاری نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار دیدیا گیا۔ اس طرح پاکستان دنیا کا پہلا مسلمان ملک بن گیا جس نے اپنے آئینی نام میں مذہبی لقب کو جگہ دی۔ مولانا مودودی کے مقلدین نے اس کامیابی کو اپنے راہنما کے رسوخ سے منسوب کیا۔ اس وقت سے لیکر آج تک جماعت اسلامی پاکستان کی منظم ترین جماعت چلی آرہی ہے۔ عالمی سطح پر بھی یہ جماعت دکھائی دیتی ہے۔ تاہم ملکی آبادی اور اس کے مقلدین کی تعداد کا باہمی تناسب زیادہ خوشگوار نہیں۔

مولانا مودودی ابتداء میں امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کے خلاف تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے رویے کو کم تنقیدی بنایا اور اپنی توجہ کمیونزم کے خلاف جنگ پر مرکوز کردی۔ تاہم جماعت اسلامی اُس وقت تک مغربی تہذیب اور اقدار پر جو تنقید کر چکی تھی۔ اس کے باعث بعد میں پاکستان نے بطور ریاست امریکہ کو شک کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پاکستانی راہ نماؤں نے امریکہ کے تعاون سے اپنی معیشت اور فوج کی تعمیر کا جو منصوبہ بنایا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے اسے چیلنج تو نہ کیا۔ تاہم وقفے وقفے سے امریکی نیت اور ارادوں پر شک کا اظہار کرتے رہے۔ شک کے اس اظہار نے پاکستانی حکمرانوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ امریکی اتحادی بنتے وقت دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں کی مخالفت کا

حوالہ دے سکیں۔ پاکستان کے تشکیلی برسوں کے دوران ایک متوازی پیش رفت بھی دیکھنے میں آئی۔ وہ یہ کہ فوجی اور سول بیوروکریسی نسبتاً زیادہ بااختیار ہوگئی۔ مسلم لیگ سے وابستہ سیاستدانوں کا انتظامی تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ لہذا وہ ان سول ملازمین پر ضرورت سے کہیں زیادہ انحصار کرنے پر مجبور تھے جو انہیں برطانوی راج سے ورثے میں ملے تھے۔ تنازعہ کشمیر اور نظریاتی پروجیکٹ نے بھارت کے ساتھ دشمنی کی آگ کو ایندھن فراہم کیا اور ایک مضبوط فوج اس نئے ملک کی نسبتاً زیادہ ضرورت بن گئی۔ لہذا فوج اور بیوروکریسی پاکستان کی زندگی میں نسبتاً زیادہ فیصلہ کن کھلاڑیوں کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ اگر پاکستان نے عام حالات میں جنم لیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ برطانیہ کی ہندوستانی فوج کے اعلیٰ افسران اور سول سروس میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ابتدائی چند سالوں کے دوران پاکستانی فوج کی کمان انگریز جرنیلوں کے ہاتھ میں رہی اور سول سروس کے بعض انتہائی اہم عہدوں پر بھی برطانوی افسران ہی فائز رہے۔ درمیانے عہدوں پر فائز اور ترقی کے لئے بیتاب مسلمان افسران نے انگریز افسروں پر بھارت کی حمایت کا الزام لگایا اور مذہبی کارڈ استعمال کرتے ہوئے اُنہیں نکال باہر کیا۔

تقسیم ہند کے وقت پاکستان کو برطانوی ہندوستان کی بری فوج کا 30 فیصد، بحریہ کا 40 فیصد اور فضائیہ کا 20 فیصد وصول ہوا۔ جبکہ محاصل میں سے اسے صرف 17 فیصد ملا۔ نتیجتاً اس نئی ریاست کے لئے مسلح افواج کی تنخواہوں کی ادائیگی ایک کار دشوار بن گیا۔ آزادی کے بعد چند دنوں کے اندر پاکستان کو اپنے اثاثوں کے حصے کی فکر لاحق ہوگئی۔ اثاثوں کی نوعیت مالی بھی تھی اور عسکری بھی۔ بھارت کی طرف سے اثاثوں کے پاکستانی حصے کی منتقلی میں کی جانے والی تاخیر نے تقسیم ہند کی تلخی میں اضافہ کر دیا۔ جدید بھارت کے بانی موہن داس گاندھی کو پاکستان اور بھارت کے باہمی تعلقات میں پیدا ہونے والی تلخی کی اہمیت کا ادراک تھا۔ انہوں نے جنوری 1948ء میں مرن برت رکھ لیا اور مطالبہ کیا کہ پاکستان کو اثاثوں میں اس کے حصوں کی ادائیگی کی جائے۔ لیکن جن شرائط پر تقسیم ہند عمل میں آئی۔ پاکستانی ان پر مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے شدت سے محسوس کیا کہ بھارتیوں اور انگریزوں نے (مل کر) اس نوزائیدہ ملک کے لئے اضافی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اثاثوں کی تقسیم اور سرحدوں کی نشاندہی، دونوں مواقع پر یہی کچھ ہوا۔

اگر بھارتی تخلیق پاکستان کے نظریے کے کھلے دشمن تھے تو اس حوالے سے عالمی رائے عامہ میں بھی گرم جوشی مفقود تھی۔ "ٹائم" میگزین نے بھارت اور پاکستان کی آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ۔ "پاکستان ایک چالاک شخص جناح کی تخلیق تھا"۔ اور بے انصافی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھارت کی آزادی کو "عوامی تحریک" کا نتیجہ قرار دیا۔ تقسیم ہند کے بارے میں بھارتی موقف کو درست اور وزنی جانا گیا۔ مزید برآں بھارت نے جناح کی شخصیت کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت کیا اور قیام پاکستان کو ایک المیے سے موسوم کیا۔ بھارتی دانشور اور حکام اکثر و بیشتر قیاس آرائیاں کرتے رہتے تھے کہ بھارت اور پاکستان دوبارہ ایک ملک بن جائیں گے۔ امریکہ میں بھارت کی سفیر اور بھارتی وزیر اعظم نہرو کی بہن

وجے لکشمی پنڈت نے 1951ء میں ایک امریکی اخبار نویس کو بتایا کہ۔ "ہم نے تقسیم صرف اس لئے قبول کی کہ اگر ایسا نہ کرتے تو غیر ملکی بدستور ہم پر حکمران رہتے۔"

ایک نئے ملک کی تخلیق کے پس منظر میں کارفرما منطق کے بارے میں جب مسلسل سوال اٹھائے جانے لگے تو پاکستانیوں کے اذہان میں پاکستان کے قابل عمل ہونے کے حوالے سے عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا۔ تخلیق پاکستان کا جواز پیش کرنے کے لئے انہوں نے ایک متوازی موقف اپنا لیا۔ انہوں نے کانگریس کی ہندو قیادت پر الزام عائد کیا کہ وہ مسلمانوں کے تشخص اور کلچر کے لئے بہت بڑا خطرہ بن چکی تھی اور اسی چیز نے علیحدگی کو ناگزیر کر دیا۔ پاکستانیوں نے اپنے بانی کا دفاع بھی کیا جنہیں وہ قائداعظم کہتے اور سمجھتے تھے۔ ممکن ہے تخلیق پاکستان کے بارے میں زیادہ سوچ بچار سے کام نہ لیا گیا ہو۔ تاہم اس کی توضیح، جواز قیام اور تحفظ کے لئے قابل ذکر کاوشیں کی جانے لگیں۔ جب کبھی بھارتی یا دیگر غیر ملکی تخلیق پاکستان کو بے فائدہ گردانتے۔ پاکستانیوں کے احساس عدم تحفظ میں اضافہ واقع ہو جاتا تھا۔ وہ بھارت کی طرف سے لاحق تقسیم کو منسوخ اور غیر موثر کر دینے کے امکانات اور آزادی کے بعد بھارتی اشرافیہ کے رویے پر فکر مند تھے۔ بھارتی راہ نما اکثر و بیشتر بیانات داغتے رہتے تھے کہ دونوں ملکوں کا دوبارہ ایک ہو جانا ناگزیر ہے۔ ان کے اسی نوعیت کے بیانات پاکستانی خدشات میں اضافے کا سبب بنتے رہے۔

تقسیم ہند کے بطن سے جنم لینے والے بنیادی تنازعات میں سے ایک شاہی ریاست جموں و کشمیر کا تنازعہ تھا۔ برٹش راج کے دوران 562 شاہی ریاستوں نے نوآبادیاتی حکمرانوں کے ساتھ مختلف سطوح پر انتظامی اختیارات اپنے پاس رکھنے کے معاہدے کر رکھے تھے۔ ریاست جموں و کشمیر بھی انہی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ اس نوعیت کے معاہداتی تعلقات میں افضلیت برطانویوں ہی کو حاصل تھی۔ زیادہ تر ریاستوں کے امور دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے شعبوں کا کنٹرول انہی کے پاس ہوتا تھا۔ راج کے خاتمے کے ساتھ ہی اس افضلیت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ تقسیم ہند کے وقت برطانوی حکمرانوں نے ان ریاستوں کے فرمانرواؤں سے کہا کہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور اپنی رعایا کی خواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھارت اور پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔

کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت نے امید پیدا کر دی کہ اسے نئے مسلمان ملک میں شامل کر دیا جائے گا۔ تقسیم ہند کے وقت کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی ریاست کو بدستور آزاد رکھنا چاہا حالانکہ اس کی مسلمان رعایا کا ایک قابل ذکر حصہ پاکستان کے ساتھ کا الحاق چاہتا تھا۔ بھارت کے وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے شاہی ریاستوں کے بارے میں ایک وسیع تر حکمت عملی کے تحت چاہا کہ آزاد بھارتی ریاست میں جموں و کشمیر کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے۔

زیادہ تر پاکستانی راہنماؤں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ بعض مغربی لکھاری بھی ہندوستان میں برطانیہ کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اوران کے سٹاف کے ارکان پر الزام عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے سازشاً سرحدی حدود کا اس طرح تعین کیا کہ کشمیر کا بھارت اور پاکستان دونوں کے ساتھ الحاق ممکن ہو جائے۔ تقسیمی منصوبے کے تحت جغرافیائی محل وقوع اور اکثریت کی مذہبی وابستگیوں کی بناء پر پنجاب کو پاکستان اور بھارت کے درمیان تقسیم ہونا تھا۔ برطانوی جج سر سائرل ریڈکلف کی سربراہی میں تشکیل شدہ "باؤنڈری کمیشن" نے ضلع گورداسپور کی وہ دو تحصیلیں بھارت کے حوالے کر دیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس طرح بھارت کو زمینی راستے سے کشمیر تک رسائی حاصل ہوگئی۔ اگر پنجاب کا نقشہ مختلف کھینچا جاتا تو زمینی راستے سے صرف پاکستان کو کشمیر تک رسائی حاصل ہوتی اور یہ ریاست پاکستان اور بھارت کے درمیان پہاڑوں پر مشتمل قدرتی سرحد کا کام دیتی۔ اس طرح ریاست پر بھارت کا کوئی موثر دعویٰ بھی باقی نہ رہتا۔

نوزائیدہ ملک پاکستان کی حکومت میں پائی جانے والی انتشار کی کیفیت نے کسی بڑی حکمت عملی پر غور کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہنے دی۔ پاکستانیوں کوادراک ہوگیا کہ باؤنڈری کمیشن کے نام پر انہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں تشویش کو پاکستان کی حامی "آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس" کو ملنے والی حمایت نے کم کیا۔ مسلم کانفرنس نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز کر دیا۔ پشتون قبائلیوں کو کشمیر میں داخل کرنے کیلئے انتہائی سرعت سے تربیت دی گئی۔ انہیں پاکستانی فوج کے افسران کی حمایت حاصل تھی۔ اس حقیقت نے برطانیہ کے ایک اتحادی مہاراجہ کی ناقص ساز و سامان سے لیس افواج کے خلاف اعلان جنگ کے امکان کو محدود کر دیا کہ نوزائیدہ ملک پاکستان کی بری فوج کا سربراہ ایک برطانوی جرنیل تھا۔

کشمیر میں پاکستان کا پہلا تحرک ایک غیر روایتی جنگ کی صورت میں سامنے آیا جس کا آغاز اس مفروضے کی بناء پر کیا گیا کہ کشمیری عوام حملہ آور قبائلی لشکر کی مدد کریں گے اور مہاراجہ کی فوجوں کو بڑی آسانی سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ نہ تو شکست کے امکانات پر غور کیا گیا اور نہ ہی یہ سوچا گیا کہ اگر کشمیری مہاراجہ کے خلاف پاکستانی اقدام کی راہ میں حائل ہونے کیلئے بھارتی فوج اس جنگ میں ملوث ہوگئی تو کیا صورت حال ہوگی۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت سے عسکری مدد طلب کر لی اور فوجی معاونت کے عوض بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ بھارتی وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے آزاد کشمیر کی فوج کی راہ روکنے کے لئے بھارتی فوج بھیج دی۔ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ کشمیر کا جو الحاق کیا۔ پاکستان آج کے دن تک اسے متنازعہ خیال کرتا ہے۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ الحاق کسی رضا کارانہ فیصلے کا نتیجہ نہ تھا۔ دوسرے مہاراجہ قانوناً بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا مجاز ہی نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ پاکستان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کر چکا تھا کہ صورت حال کو جوں کا توں رکھا جائے گا۔

فائر بندی کے اعلان اور اقوام متحدہ کی امن فوج کے دستوں کی آمد سے قبل بھارتی فوج نے دارالحکومت سری نگر کو فتح کرنے کے بعد وادی کشمیر اور جموں ولداخ کے بڑے حصوں پر کنٹرول قائم کر لیا۔ 48-1947ء میں ہونے والی جنگ اور بعدازاں فائر بندی کے فیصلہ کن نتائج یہ برآمد ہوئے کہ بھارت ایک ایسی قوت بن گیا جس نے دارالحکومت سری نگر سمیت جموں وکشمیر کے قابل ذکر علاقوں اور آبادی کے بیشتر حصے پر تادم تحریر قبضہ کر رکھا ہے۔ کشمیر پاکستان اور بھارت کے باہمی تعلقات پر مسلسل آسیب کی طرح سایہ فگن ہے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد شروع ہونے والے اس تنازعے نے پاکستان کے نظریاتی ارتقاء میں جو کردار ادا کیا وہ اس کتاب کے موضوع سے قریب ترین اور سب سے زیادہ متعلقہ ہے۔ 48-1947ء میں کشمیر کے اندر کی جانے والی فوجی کاروائی میں پاکستانی فوج کے جن مسلمان افسروں نے حصہ لیا انہوں نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے قبائلیوں کو بطور چھاپہ مار بھرتی کیا۔ انہیں متحرک کرنے کے لئے وہ اسلامی اصطلاح "جہاد" کو استعمال میں لائے۔ اکبر خان کو جنہیں 1051ء میں حکومت وقت کے خلاف ایک سازش کے جرم میں ملوث کر لیا گیا۔ اس وقت تک میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی جا چکی تھی۔ انہوں نے "کشمیر بریشن فورسز" کی کمان کی اور فاتح سپین طارق بن زیاد کے نام پر "طارق" نام اپنا لیا۔ حکومت نے علمائے دین کو یہ فتاویٰ حاصل کرنے کے لئے مدعو کیا کہ قبائلی کشمیر میں جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ جہاد ہے۔ مزید برآں جنگ لڑنے والے قبائلی اور پاکستانی فوج کے وہ افسران جوان کی معاونت کر رہے ہیں سب مجاہدین ہیں۔ اگرچہ پاکستانی فوج کچھ عرصہ پہلے تک برطانیہ کی ہندوستانی فوج کا حصہ تھی اور اس کی تمام پیشہ وارانہ صلاحتیں اسے اس کے نوآبادیاتی پیش رو سے ورثے میں ملی تھی تاہم آزادی کے بعد چند مہینوں کے اندو وہ اسلامی نظریاتی رنگ اپنانے کی سمت رواں دواں تھی۔

کشمیر میں جاری جنگ اور جو فوج پاکستان کے حصے میں آئی تھی دونوں پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے پاکستان کی مرکزی حکومت نے ایک سال کے ترقیاتی بجٹ کا 70 فیصد مختص کر دیا۔ یعنی کل بجٹ کا 70 فیصد دفاعی بجٹ قرار پایا۔ ایک ایسے بڑے ہمسائے کے ساتھ تنازعے کے امکانات نے ملک کی انٹیلی جنس سروسز کو مضبوط کرنے پر مجبور کر دیا جو پاکستان کے حق وجود سے ہی انکاری تھا۔ پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز نے ملک کی ان سیاسی قوتوں پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز کر رکھی تھی جو امکانی طور پر ملک کے غیر ملکی دشمن کے ساتھ تعاون کر سکتی تھیں۔ جیسا کہ زیادہ تر غیر محفوظ ریاستوں میں ہوتا ہے۔ ملک و قوم کو نقصان سے دوچار کرنے والے دشمنوں اور حکومت وقت سے عدم اتفاق کرنے والوں کے درمیان کھینچا جانے والا خط امتیاز دھندلا سا گیا۔ مزید برآں۔ پاکستان کے ہر صوبے کی پولیس فورس میں "انٹیلی جنس بیورو" (آئی بی) اور ایک سپیشل برانچ موجود تھی۔ ان سویلین تنظیموں کا بنیادی کام مقامی انٹیلی جنس کا حصول تھا، بری۔ بحری اور فضائی فوج کی اپنی اپنی انٹیلی جنس سروس تھی۔ 1948ء میں انٹر سروسز انٹیلی جنس کا ڈائریکٹوریٹ قائم کیا گیا جس کا بنیادی فرض حاصل شدہ سٹریٹیجک انٹیلی جنس کو مربوط، منضبط اور ہم آہنگ کرنا تھا۔ آئی بی اور صوبائی سپیشل برانچیں برٹش راج کے وقت سے سیاست میں

ملوث چلی آرہی تھیں۔ یہ دونوں ادارے حکومت وقت سے اختلاف رکھنے والوں کی جاسوسی اور مقامی گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑانے پر مامور تھے۔ ملٹری انٹیلی جنس سروسز نے جب معاشی اور عسکری اعتبار سے کمزور پاکستان کے لئے کسی بڑی طاقت کو سرپرست کے طور پر تلاش کرنے کی کوشش کی تو ان میں سیاست در آئی۔

ایک طرف قومی تشخص کے بارے میں لاحق تشویش نے مذہبی نظریات کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیا جب کہ دوسری طرف فوج کو اچھے ساز و سامان سے لیس کرنے کی ضرورت امریکہ سے اتحاد پر منتج ہوئی۔ جناح نے تقسیم ہند سے قبل ہی اشارہ دے دیا تھا کہ "پاکستان کی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ مسلمان دنیا کی طرف ہوگا لیکن ساتھ ساتھ امریکہ سے توقع کی جائے گی کہ وہ ہماری مدد کرے۔ کسی بھی ممکنہ روسی جارحیت کے مقابلے میں مسلمان ممالک شانہ بشانہ نہ کھڑے ہوں گے اور حمایت کے لئے ان کی نظر امریکہ پر ہوگی۔ یہ بات مسٹر جناح نے ایک مہمان امریکی سفارت کار سے کہی۔ آزادی کے بعد جناح امریکہ کے ساتھ اتحاد پر زیادہ زور دینے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ اتحاد کرنے کے بعد اپنے سٹریٹیجک محل وقوع کی اچھی قیمت وصول کرے گا۔ لائف میگزین کی رپورٹر فوٹو گرافر مارگریٹ بورک وہائٹ لکھتی ہے کہ اس سے مسٹر جناح نے کہا" جتنی پاکستان کو امریکہ کی ضرورت ہے امریکہ کو پاکستان کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ پاکستان دنیا کا محور ہے، جس کی وجہ ہمارا محل وقوع ہے۔ ہم اس سرحد پر واقع ہیں جس کے گرد دنیا کا مستقبل گھومتا ہے"۔

تقسیم کے بعد بورک وہائٹ نے جناح سے جو انٹرویو کیا اس کا اپنی اس کتاب میں حوالہ دیا جو تخلیق پاکستان کے بعد دو سال کے اندر شائع ہوگئی۔ 1947ء میں کئے جانے والے اس انٹرویو اور 48-1947ء کے دوران پاکستانی حکام سے ہونے والی گفتگو پر مبنی بورک وہائٹ کے مشاہدات ان خفیہ مفروضوں کو منکشف کرتے ہیں جو پاکستان نے امریکہ کے ساتھ آئندہ پانچ عشروں پر محیط اپنے تعلقات کے بارے میں قائم کر رکھے تھے۔

مسٹر جناح نے بورک وہائٹ سے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا تھا "روس بھی ہم سے زیادہ دور نہیں"۔ یہ ایک معمول کی تنبیہہ تھی۔ مسٹر جناح کے خیال میں اس نئی اور بہادر قوم کا امریکہ کے ساتھ دوستی کے لئے اور کوئی دعویٰ نہیں تھا کہ "پہاڑوں کے اس بے ترتیب، وسیع و عریض، بے راستہ اور بلند و بالا پہاڑوں کے سلسلے کی دوسری جانب بالشویکوں کی سرزمین ہے۔ بورک لکھتی ہے۔ جناح اپنی نئی ریاست کو صرف ایسی مسلح "بفرسٹیٹ" سمجھتے تھے جو دو بڑی اور متحارب قوتوں کے درمیان موجود ہو اور جو ان کے باہمی تصادم کے امکانات کو کم کر سکے۔ وہ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی امریکہ کی عسکری دل چسپی پر زور دے رہے تھے۔ انہوں نے ایک آسودہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "امریکہ اب بیدار ہوا ہے کیونکہ امریکہ یونان اور ترکی کو قوی تر بنا رہا تھا۔ وہ پاکستان کو روپیہ اور اسلحہ مہیا کرنے میں کہیں زیادہ دل چسپی لے گا۔" مسٹر جناح نے کہا تھا"۔ "اگر روس یہاں گھس آیا تو ساری دنیا خطرات سے دوچار ہو جائے گی" بورک کہتی ہے کہ اس سے چند ہفتے بعد ہی اس نے پاکستان بھر کے سرکاری افسران کے منہ سے مسٹر جناح کے ایک مقالے کی بازگشت سنی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ

۔"روس کی راہ روکنے کے لئے امریکہ ہمیں یقیناً قرضے دے گا" لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ روسی دراندازی کی کوئی علامات نظر آرہی ہیں تو افسران نے تقریباً افسردہ سے لہجے میں جواب دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں جیسے وہ اس بارے میں کوئی دلیل پیش نہ کرسکتے ہوں۔ان کا جواب تھا" نہیں "روس کی طرف سے ابھی تک کوئی اشارہ موصول نہیں ہوا جس کی بناء پر کہا جاسکے کہ وہ پاکستان میں کوئی دل چسپی رکھتا ہے۔امریکی خزانے کے دروازے پر اس مسلسل دستک نے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ آیا مقصد باشدیکوں کے خلاف دنیا کو قوی تر بنانا تھا یا پاکستان اپنے نئے سیاسی تشخص کی غیر یقینی صورت حال کو بہتر بنانے کا خواہاں تھا؟

بانی پاکستان کی امور خارجہ میں دل چسپی کو وہائٹ "ایک نئی مسلمان ریاست میں خیالات کے دیوالیہ پن" پر محمول کرتی ہے۔وہ کہتی ہے کہ دوسرے ملکوں کے باہمی تنازعات سے فائدہ اٹھانا پاکستان کی پالیسی ہوا کرتی تھی۔وہ دو بڑی طاقتوں کے باہمی کھنچاؤ سے فائدہ اٹھانے کی خواہش اور متنازعہ فلسطین کی جانب پاکستان کے جلد متوجہ ہو جانے کو اپنے موقف کے ثبوت کے طور پر پیش کرتی ہے۔وہ لکھتی ہے "پاکستان اپنے اندرونی اور سنگین مسائل میں الجھا ہوا تھا۔اس کے باوجود وہ مقدس سرزمین کو آزاد کرانے میں عربوں کی مدد کے لئے اپنی فوج فلسطین بھجوانے کی بات بڑے جوش وخروش سے اور بار بار کرتا رہا۔مسلمان علمائے دین نے وکالت شروع کردی کہ اس مقدس مقصد کے حصول کے لئے تربیت یافتہ سابق فوجیوں کو بھجوایا جائے۔" حکومت کے ترجمان اخبار "ڈان" نے "یہودی ریاست" کی مذمت کی اور اس کے خلاف عسکری اور روحانی اعتبار سے مسلمان ممالک کے متحدہ محاذ کی ضرورت پر زور دیا۔کیونکہ "اسی میں اسلام کا تحفظ مضمر ہے"۔

جناح کے جانشین اور پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ان تین بنیادی مفادات کی وضاحت کی جو اس نوزائیدہ ملک کے خارجہ تعلقات کا رخ متعین کریں گے۔(1) پاکستان کی سالمیت (2) اسلامی کلچر (3) اقتصادی ترقی کی ضرورت۔پاکستان کی سالمیت کا مطلب یہ تھا کہ امور دفاع اور فوجی تیاریوں کو اہم خیال کیا جائے۔اس مقصد کے لئے پاکستان کو سرپرست کے طور پر ایک بڑی طاقت درکار تھی جو اس کے دفاعی اخراجات برداشت کرسکے۔جس تقریب میں لیاقت علی خان نے اپنی مذکورہ تین ضروریات یا مفادات کا ذکر کیا اس میں وہ مغربی سامعین سے خطاب کررہے تھے۔لہٰذا انہوں نے اسلامی آئیڈیالوجی کی بجائے اسلامی کلچر پر زور دیا۔تاہم ملک کے اندر بدستور "اسلامی نظریے" کا ذکر ہی کرتے رہے۔تاکہ اسلام پسند نظریہ پرست اس نظریے کی توجیہہ وتوضیح میں اپنے کردار کا تعین کرسکیں۔

امریکہ ایک بڑی طاقت اور سرپرست کے طور پر پاکستان کا اپنا چوائس اور اسلحے اور اقتصادی مدد کی فراہمی کا ایک فیصلہ کن اور اہم ذریعہ تھا۔پاکستانی قوم اور ریاست کو مجتمع رکھنے کیلئے جتنا ضروری اسلام اور بھارت کی مخالفت تھے۔امریکہ کے ساتھ اتحاد بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ایک مرحلے پر تو لیاقت علی خان نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر امریکہ پاکستان کی سرحدوں کی ذمہ داری اٹھالے یا ان کے "تحفظ کی ضمانت" فراہم کردے تو "ایک بڑی فوج" تو دور کی بات ہے۔اس فوج

کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ پاکستانی انٹیلی جنس نے اپنے ابتدائی سیاسی اقدامات میں ایک یہ قدم بھی اٹھایا کہ امریکہ کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک فرضی شہادت تراش لی گئی کہ پاکستان کو کمیونسٹوں کی طرف سے خطرات لاحق ہیں۔

کشمیر میں فائر بندی ہوتے ہی جوائنٹ سروسز انٹیلی جنس نے عجیب وغریب فرضی رپورٹیں مرتب کرنا شروع کر دیں کہ ایک انتہائی کمزور مقامی کمیونسٹ پارٹی نے ریاست کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ لندن اور واشنگٹن سے توجہ حاصل کرنے کے لئے ابتدائی کوشش کے طور پر ایک اشتہاری ورق کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں درج تھا کہ اچانک اور ناگہانی حملے کے لئے سدھائے گئے فوجی دستوں پر مشتمل زیرزمین فوجیں ظلی حکومتوں کے اعصابی مراکز پر حملے کے لئے بالکل تیار کھڑی تھیں۔ اس اشتہاری ورق کے مندرجات رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھے۔ 1949ء کے موسم گرما تک ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر شاہد حمید نے بھوتوں اور آسیبوں کو چشم تصور سے دیکھنے کا آغاز کر دیا۔ بیداری کے بیشتر لمحات کے دوران انہوں نے ایک بڑی سویلین انٹیلی جنس ایجنسی کے قیام کے لئے سینئر بیورو کریٹس کے ایک حساس عصبے تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ وزیر خزانہ نے خود بھی اس معاملے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور روسیوں کے خلاف ایک "اسلامی رکاوٹ" کھڑی کرنے کے لئے امریکی انٹیلی جنس کی طرف سے معاونت کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

مئی 1950ء میں لیاقت علی خان صدر ہیری ٹرومین کی دعوت پر واشنگٹن گئے جہاں ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اپنے اس دورے کے دوران انہوں نے پاکستانی پالیسیوں کو امریکی پالیسیوں کے مطابق ڈھالنے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ فوجی اعتبار سے سب سے بڑی تشویش بھارت تھا۔ تاہم پہلے وزیراعظم پاکستان نے کمیونسٹ خطرے کا سامنا کرنے کا ارادہ بھی کر لیا۔ انہوں نے کوریا میں امریکی اقدامات کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مقصد "جنوبی ایشیاء کو عالمی کمیونزم کے خطرات سے بچانا تھا" لیاقت علی خان کے دورہ واشنگٹن کے بعد جلد ہی امریکی اقتصادی امداد پاکستان پہنچنا شروع ہو گئی۔ لیاقت علی خان نے اپنی مغرب نواز پالیسی کو متوازن کرنے کے لئے پاکستان کے امریکہ کی جانب مکمل جھکاؤ کو اس امر سے مشروط کر دیا کہ امریکہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے دفاع کی ضمانت مہیا کرے۔

کیونکہ فوج بہترین اسلحے اور ساز وسامان سے لیس ہونا چاہتی تھی۔ لہذا اس نے زور دیا کہ اگر امریکہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کو مخصوص دفاعی ضمانت نہ بھی فراہم کرے تو بھی اس کے ساتھ معاہداتی تعلق قائم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ 1951ء میں جنرل ایوب خان پاکستان کی بری فوج کے پہلے کمانڈر چیف بن گئے۔ اس طرح فوج میں برطانوی افسران کا عبوری دور ختم ہو گیا اور پاکستانی فوج میں مقامیت پیدا ہو گئی۔ اسی سال لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا۔ ان کی شہادت سے قبل لیاقت علی خان ان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور جنرل ایوب خان امریکہ کے ساتھ فوجی تعاون کے بارے میں گفت وشنید کا آغاز کر چکے تھے۔ ستمبر اکتوبر 1953ء میں جنرل ایوب خان نے اپنے سویلین سربراہ مملکت

اور وزیر خارجہ سے قبل اپنے طور پر واشنگٹن کا دورہ کیا۔ وہ کوئی ایسا معاہدہ چاہتے تھے کہ پاکستان "اچھی قیمت پر" مغرب کے لئے مشرق میں اس کا قابل اعتماد اتحادی بن جائے۔

صدر آئزن ہاور کی سربراہی میں نئی امریکی انتظامیہ نے چاہا کہ پاکستان، ایران، ترکی اور عراق جیسی "فرنٹ لائن ریاستوں" کی عسکری صلاحیت کو بڑھا کر کوریا جیسی جنگی کاروائیوں میں اپنا عمل دخل کم کرے۔ اس وقت توسیع پسندی کی راہ میں حائل ہونے کے لئے "دفاع کی مجوزہ شمالی صف" کی تشکیل کے منصوبے میں پاکستان کی شمولیت درکار تھی۔ اس وقت کے پاکستانی راہ نماؤں نے فوج کو ہر قسم کے سامان اور اسلحے سے لیس کرنے کے لئے موقع غنیمت جانا۔ اپنے نجی دورہ واشنگٹن کے دوران امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلاس اور فوجی مشیر اعلیٰ ایڈمرل آرتھر ڈبلیو جے ریڈفورڈ پر جنرل ایوب خان نے اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ اس وقت تک واشنگٹن میں شاندار جنگی روایات کے حامل پشتونوں کی پراسرار اور حیران کن جنگجویانہ صلاحیتوں کے اعتراف کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایوب خان خود بھی پٹھان اور بلاشبہ ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں فوراً ہی وہاں ان صلاحیتوں کے حوالے سے ایک مثالی نمونہ سمجھا جانے لگا۔ مزید برآں وہ اس پوزیشن میں تھے کہ امریکہ کے لئے سودمند ثابت ہوسکیں اور وہ اس پر برضا و رغبت رضامند بھی تھے۔

1954ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ ایک مشترکہ دفاعی معاہدہ کرلیا اور "جنوب مشرقی ایشیائی معاہداتی تنظیم (Southeast Asian Treaty Organization -" SEATO) کا حصہ بن گیا۔ پاکستانی نقطہ نظر کے مطابق وہ "ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو" کی قسم کا تعلق تھا۔ پاکستان کو امریکہ سے اسلحے کے علاوہ اپنی معاشی ترقی کے لئے ٹھوس اور قابل ذکر قدر و قیمت کی حامل امداد حاصل کرنا تھی۔ لہذا وہ ایک ایسے معاہداتی اتحاد کا رکن بن گیا جو امریکہ کی نظر میں اہم اور ضروری تھا۔ بعد ازاں پاکستان "معاہدہ بغداد" (Baghdad) Pact) اور "مرکزی معاہداتی تنظیم" (Central Treaty Organization - CENTO) میں بھی شامل ہوگیا۔ اس طرح پاکستان کی سالمیت کے تحفظ اور اقتصادی ترقی کے لئے درکار وسائل کا حصول یقینی ہوگیا۔ لیاقت علی خان نے پاکستان کے جن تین بنیادی مفادات کی نشاندہی کی تھی۔ ان میں سے دو حاصل ہو گئے۔

تیسرا عنصر یعنی "اسلامی نظریہ" قابل حصول مفادات میں شامل تو رہا۔ تاہم وقتی طور پر اس کی ترجیح کم کر دی گئی۔ بے دین کمیونسٹوں کے خلاف اتحاد میں پاکستان کی شمولیت کے وقت اسلامی جذبات نے اپنا کام تو دکھایا لیکن جیسا کہ خود لیاقت علی خان نے بھی محسوس کیا۔ امریکیوں کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت اسلامی نظریے کے حوالے سے ایک خاص حد سے آگے جانا قرین مصلحت نہ تھا۔ مطلب یہ کہ اسلامی کلچر یا بنیادی اسلامی اقدار کی اہمیت کا ہلکا پھلکا حوالہ تو دیا جاسکتا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ امریکہ نے اپنے ایک پالیسی بیان میں واضح کر دیا تھا کہ کمیونزم کے علاوہ امریکی

مفادات کے لئے بڑا خطرہ پاکستان میں موجود زمینداروں کے انتہا پسند گروہ اور ان پڑھ مذہبی راہ نما تھے جو موجودہ اس وقت کی نواز پاکستانی حکومت کے خلاف تھے اور ازمنہ اولی کے اسلامی اصولوں کی طرف مراجعت کے خواہاں تھے۔

تاہم پاکستان کی حد تک یعنی ملکی سامعین کو "اسلامی نظریے" کی "مکمل خوراک" بدستور دی جاتی رہی۔ اس طرح پاکستانی عوام کی آراء منقسم سی ہوگئیں۔ ایک طرف انہیں بھارت کے ساتھ اپنے طرز عمل اور باقی ماندہ مسلمان دنیا میں ہونے والے پیش رفتوں پر اپنے رویے سمیت مختلف معاملات میں امریکہ کی توقعات پر پورا اترنا تھا۔ دوسری طرف ان مضطرب اسلام پسندوں کی مخالفت سے بزدآزما ہونا تھا جو امریکہ کے ساتھ قریبی تعلقات کو پاکستان کی نظریاتی نشوونماء کی راہ میں رکاوٹ خیال کر رہے تھے۔ اگرچہ امریکہ نے کشمیر کے بارے میں کوئی واضح ضمانت مہیا نہیں کی تھی تاہم ملک کے اندر امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کو باجواز بنا کر پیش کرنے کے لئے ایک تو یہ کہا گیا کہ وہ ہمیں بھارت کے خلاف تحفظ فراہم کرے گا اور دوسرے حصول کشمیر میں ممد ثابت ہوگا۔ امریکہ کے ساتھ اتحاد کی شدید خواہش کے زیر اثر پاکستانی حکام نے کمیونزم کے خلاف لڑنے کے مبالغہ آمیز وعدے وعید بھی کیے اور امریکیوں کے ساتھ یہ عہد بھی کیا کہ اس کی طرف سے ملنے والی عسکری امداد کو بھارت کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔

پاکستان کے "سیٹو" اور "سینٹو" میں شامل ہو جانے کے بعد امریکہ نے اسے اسلحہ بھی فراہم کر دیا اور اقتصادی مدد کا مطالبہ بھی پورا کر دیا۔ امریکی مدد کے حصول کی خاطر ایوب خان نے ایک امریکی افسر سے یہ تک کہہ ڈالا "اگر آپ چاہیں تو ہماری فوج آپ کی اپنی فوج بن سکتی ہے"۔ تاہم امریکہ نے جو یہ توقع قائم کر رکھی تھی کہ روس اور چین کے خلاف کسی بھی ممکنہ کاروائی کے موقع پر حملے کے آغاز کے لئے پاکستان ایک مرکزی پوزیشن کا حامل ہوگا۔ وہ پوری نہ ہوسکی۔ شیریں طاہر خیلی امریکہ پاکستان تعلقات کے اسی پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"واشنگٹن اور اسلام آباد کے درمیان طاقت کے انتہائی بھدے تناسب کے باوجود امریکہ ایوب خان کو قائل نہ کر سکا۔ جو بری فوج کے کمانڈر انچیف کے طور پر کلیدی اور متعلقہ ترین شخصیت تھے۔ ایوب خان نے مکمل دسترس کے حقوق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ایوب امریکہ کو پرکشش سہولیات اور افرادی قوت کی ممکنہ پیش کش دور ہی سے دکھا کر للچانے پر مجبور کرتے رہے۔ وہ امریکہ سے صحیح قیمت وصول کرنا چاہتے تھے اور تین عدد وجوہات کی بناء پر زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر تلے ہوئے تھے"۔

"ایک تو ایوب کو فوج کی توسیع پر اٹھنے والے بھاری اخراجات کا مکمل ادراک تھا۔ ملکی سطح پر اتنے وسائل نہ تھے کہ اتنی بھاری رقوم کا حصول ممکن ہو جائے۔ دوسرے انہیں اس امر کا بھی شدید احساس تھا کہ فوج کی توسیع کے لئے درکار مالی وسائل کے خلاف سویلین شعبے کی طرف سے شدید رد عمل کا خدشہ موجود تھا۔ واشنگٹن ہی ان ممکنہ پریشانیوں سے نکلنے کا واحد

اور ممکنہ ذریعہ تھا۔ مزید براں، صرف عسکری اخراجات ہی نہیں، امریکہ سے اس کے علاوہ بھی اقتصادی مدد متوقع تھی۔ لہذا کہا جاسکتا ہے کہ ایوب نے بندوق اور مکھن کا جو دانشمندانہ استعمال کیا اس پر وہ قوم کے ہیرو ہیں۔ تیسرے ایوب خان کو اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ پاکستان کو بھارت کے مقابلے میں دفاع کے لئے فوج چاہئے لہذا محض امریکہ کے کہنے پر یا امریکی ترجیحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فوج میں کمی لانا ممکن نہ تھا۔ تاہم ایوب خان پاکستان کے "پراکسی" کردار پر بھی رضامند تھے۔ بشرطیکہ امریکہ انہیں بھارت کے مقابلے میں دفاع کی مکمل ضمانت فراہم کردیتا"۔

کیونکہ پاکستان نے امریکہ کو وہ عسکری سہولیات مہیا نہ کیں جو اسے کمیونزم کی راہ روکنے کے لئے حکمت عملی کے طور پر درکار تھیں۔ لہذا اس نے فوجی نقطہ نظر سے دشمن کا کھوج لگانے کے لئے "یوٹو" پروازوں کی اجازت دیدی۔ "یوٹو" ایک جاسوس طیارہ تھا۔ یہ سب کچھ روس کو ایک حد تک محدود کردینے کے لئے کیا جارہا تھا۔ روس کے بارے میں بھیجی گئی معلومات کو وصول کرنے اور سننے کے لئے متعدد چوکیاں بھی قائم کی گئیں۔ روس کے سوا کوئی ہدف نہیں تھا۔ امریکہ نے پاکستان میں جو سرمایہ کاری کی۔ اس کے ثمرات تک پہنچنے کے لئے وقت درکار تھا۔ ایوب خان نے وسیع تر فوج کی تشکیل اور اقتصادی معاونت کے حصول کے لئے جو سودے بازی کی وہ ان کے جانشینوں کے لئے ایک روایت بن گئی۔ 1979ء میں امریکہ نے افغانستان پر سودیت حملے اور کمیونزم کے خلاف بغاوت کو وسعت دینا چاہی تو جنرل ضیاء الحق نے ایسی ہی سخت سودے بازی کی۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خلاف تعاون کی جنرل مشرف نے امریکہ سے صحیح قیمت چاہی۔ انہوں نے بھی ایوب خان کی تقلید کی اور پاکستان نے فوجی امداد اور اقتصادی تعاون کے ضمن میں امریکہ کے ساتھ بہترین سودے بازی کی تاہم امریکہ پاکستان سے جو حاصل کرنا چاہتا تھا اس میں اسے اعتدال برتنا تھا۔ "ادلے کا بدلہ" کی طرز پر پاکستان نے امریکہ کے ساتھ جتنے سمجھوتے کئے۔ ان پر عمل درآمد کے دوران امریکی توقعات کو محدود کرنے کے لئے پاکستان کی حقیقی اور اضافہ شدہ حدود و قیود اور دیگر مجبوریوں کا بار بار خیال رکھا جانے لگا۔

امریکہ کے ساتھ پاکستان کے معاہداتی تعلق کا قابل ذکر ترین نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پاکستان کی حکمران اشرافیہ میں ایوب خان کو قابل رشک مقام حاصل ہوگیا اور بعد میں ملکی سطح پر جتنی پیش رفتیں ہوئیں ان میں فوج کو نسبتاً زیادہ کردار ملنے لگا۔ فوج پہلے ہی ایک اہم ادارہ تھا۔ جو پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے قبل بھی موجود تھا۔ 1947-1948ء میں ہماری فوج نے بھارت کے ساتھ جنگ کی۔ مہاجرین کی بحالی میں ممد و معاون ثابت ہوئی اور سیلاب جیسے قومی مصائب کے موقع پر فیصلہ کن تعاون پیش کیا۔ اس وقت تک پاکستانی فوج پاکستان میں امریکہ کے لئے دلچسپی کا سبب بن چکی تھی۔ دوسری طرف سیاسی قیادت اندرونی کشمکش میں دھنس چکی تھی۔ فوج اور بیوروکریسی کی نظر میں اس دور کی پاکستانی سیاسی قیادت ملک کی بقاء کیلئے ایک بڑا خطرہ بن چکی تھی۔ جس سال ایوب خان امریکہ اور پاکستان کے درمیان باہمی مراسم پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے اسی سال انہوں نے "پاکستان کے حالیہ اور آئندہ مسائل کا مختصر جائزہ (A short

(Appreciation of Present and" Future Problems of Pakistan کے عنوان سے ایک یادداشت تحریر کی۔ کیونکہ وہ ان دنوں پاکستان میں فوجی انقلاب لانے کی تیاریوں میں مصروف تھے لہذا وہ یادداشت ان کے لئے گورننس کے بلیو پرنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔

اگرچہ وہ پارلیمانی جمہوریت کی نوک پلک بھی درست کرتے رہے تاہم پاکستان کے مستقل سیاسی ڈھانچے کے ارکان یعنی سول سروسز اور فوج نے ملکی اختیارات میں اپنا حصہ بڑھالیا۔ 1951ء میں لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد جلد ہی سول ملازم سے وزیرخزانہ بننے والے غلام محمد پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے۔ غلام محمد کی جگہ میجر جنرل سکندر مرزا نے لی جو رائل ملٹری اکیڈیمی سینڈھرسٹ کے گریجویٹ تھے اور ماضی میں "برٹش انڈین پولیٹیکل سروس" کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ اس دوران جنرل ایوب خان کو مسلسل جوڑتوڑ کے ذریعے سیاسی توازن پر اثر انداز ہونے والے شخص کی حیثیت حاصل رہی اور وہ پس پردہ سیاسی کردار ادا کرتے رہے۔ 1953ء میں انہیں وزیر دفاع نامزد کر دیا گیا۔ یہ بات پارلیمانی حکومت کی روایات سے متصادم تھی جن کی رو سے پارلیمنٹ کا رکن ہی کابینہ میں بطور وزیر لئے جانے کا اہل ہے۔ 1951ء اور 1958ء کے درمیان پاکستان کے حلقہ اقتدار میں انہیں ایک مستقل محرک کی حیثیت حاصل رہی۔ حالانکہ سیاسی بے یقینی کے اس طویل دور میں 7 وزرائے اعظم آئے اور متعدد کابینائیں تشکیل دی گئیں۔

پاکستان کی سمت کے تعین کے لئے جس سیاسی سودے بازی کا عمل جاری تھا وہ اس وقت ختم ہو گیا جب سول بیورو کریسی اور فوج اقتدار میں آ گئے۔ برطانیہ کے تربیت یافتہ ان افراد نے ماہرین کو ایک طرف کرتے ہوئے ریاستی معاملات میں نہ صرف سیاستدانوں کا کردار کم کر دیا بلکہ مذہبی راہنماؤں کو بھی الگ تھلگ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہ کیا جائے انہوں نے انتظامی اجارہ داری اور ایک نظریے کی مدد سے تعمیر قوم کے تصور کو بھلا دیا۔ بیوروکریٹس نے، جنہیں فوج کی پشت پناہی حاصل تھی، ملکی سطح پر مذہب کے کردار کو کم کرنے کی کاوشیں کیں۔ مثلاً شرعی قوانین کے نفاذ کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا لیکن بھارتی خطرے کے ردعمل کے طور پر مذہبی جذبات کو مسلسل ابھارا جاتا رہا۔ "سول ملٹری امتزاج" نے نظریہ پاکستان کو اس انداز میں ڈھالا کہ اس کا مطلب بھارت کے برہمن ہندوازم کی نفی اور مقصد اسے ایک شیطانی تجسیم ثابت کرنا اور بھارت کے ساتھ "پرجوش دشمنی" کا قیام رہ گیا۔ اندرون ملک صوبائی خودمختاری یا گروہی حقوق کے مطالبات کرنے والوں کو موردالزام ٹھہرایا جانے لگا کہ وہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے یا کمزور کرنے کے بھارتی ایجنڈے کو فروغ دے رہے تھے۔

بطور ایک سیکولر شخص، سکندر مرزا نے مغربی سیاستدانوں اور سفارت کاروں کو خاصا متاثر کیا لیکن جب بات بھارت کی آئی تو ان کا غیر شعوری ردعمل مذہب کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھنے والے سیاستدانوں اور بیوروکریٹس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ انہوں نے 1956ء کے آئین کو منسوخ کرنے اور 1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے متعلق اپنی نیت اور ارادے

سے برطانیہ کے ہائی کمشنر سر الیگزینڈر رسائمن کو رازدارانہ انداز میں آگاہ کر دیا۔ فوجی انقلاب کی صورت اختیار کر جانے والی اس کاروائی کے فوراً بعد سر الیگزینڈر رسائمن نے سکندر مرزا کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً ہی ایک ایسا بیان جاری کر دیں جس میں بھارت کے لئے پرامن ارادوں کا اظہار کیا گیا ہو۔ لیکن مرزا نے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا۔

7 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ جس کا سبب بظاہر یہ بتایا گیا کہ ملک سیاسی طور پر غلط راستے کا مسافر بن گیا تھا۔ لہذا اسے بچانا ضروری سمجھا گیا۔ اگرچہ سکندر مرزا کے بپا کردہ انقلاب کی منصوبہ بندی بہت عرصہ پہلے کی گئی تھی، تاہم اس سخت اور شدید اقدام کی فوری وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے اندر مختلف سیاسی دھڑوں کے درمیان اختلافات نے باقاعدہ تصادم کی صورت اختیار کر لی اور یہ تصادم اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر کی ہلاکت پر منتج ہوا۔ اگست 1958ء میں یعنی پاکستان کے اندر پہلے براہ راست فوجی انقلاب سے دو ماہ قبل کراچی میں مقیم برطانیہ کے ہائی کمشنر نے ایک رپورٹ میں اس امر کی نشاندہی کر دی تھی کہ فوج کے براہ راست اختیارات سنبھال لینے کا امکان بدرجہ اتم موجود تھا۔ اگرچہ عوامی سطح پر عام انتخابات کے انعقاد کی منصوبہ بندی نہ صرف مکمل کی جا چکی تھی بلکہ اس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ تاہم سکندر مرزا نے ہائی کمشنر کے ان خیالات سے اتفاق کیا کہ پاکستان جیسے ملک کے لئے جمہوریت غیر موزوں تھی۔ ہائی کمشنر نے صاف بتا دیا تھا کہ صدر پاکستان انہیں مداخلت کے ارادے سے آگاہ کر چکے تھے۔ سکندر مرزا نے ان سے کہا تھا کہ۔ "اگر انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت میں ناپسندیدہ عناصر کے تسلط کا امکان ہوا تو مداخلت کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوگا"۔ سکندر مرزا نے "ناپسندیدہ" نامی اصطلاح کی تعریف نہیں کی تھی۔ سر الیگزینڈر کہتے ہیں کہ "اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ گیا کہ ناپسندیدہ لوگوں میں وہ اشخاص شامل ہو سکتے تھے جو دوران انتخابات صدر سکندر مرزا کو بدستور صدر رکھنے کے حق میں ووٹ نہیں دینا چاہتے تھے"۔

ستمبر 1958ء میں برطانیہ کے ہائی کمشنر نے ایک رپورٹ کی شکل میں اپنے اس شک کا واضح اظہار کر دیا کہ ممکن ہے تشدد کے فروغ میں صدر پاکستان کا اپنا ہاتھ بھی ہو۔ تاکہ فوج کی مداخلت اور انتخابات کے التواء کی راہ صاف ہو جائے۔ بعد ازاں 27 ستمبر کو سکندر مرزا نے بڑے رازدارانہ انداز میں سر الیگزینڈر کو اپنی اس سوچ سے آگاہ کر دیا کہ پاکستان میں جمہوریت پر عملدرآمد یا اس کا فروغ ممکن ہی نہیں اور مناسب وقت آن پہنچا ہے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کریں۔

سر الیگزینڈر لندن میں واقع "دولت مشترکہ کے دفتر تعلقات" کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں۔ "سکندر مرزا کے ذہن میں یہ تھا کہ جب فوجی مداخلت کے باعث زمین صاف اور ہموار ہو جائے تو 20 سے 30 تک ایسے اچھے لوگوں کو نامزد کر دیا جائے (دستیابی شرط ہے) جو آئین کو از سر نو متشکل اور ملک پر حکومت کریں۔ لیکن مارشل لاء کے نفاذ نے طاقت کا توازن کاملاً فوج کے حق میں کر دیا اور سکندر مرزا کے لئے ممکن نہ رہ گیا کہ وہ عہدۂ صدارت بدستور اپنے پاس رکھ سکیں۔ ٹھیک 20 دن بعد یعنی 27 اکتوبر 1958ء کو آرمی چیف جنرل ایوب خان نے صدارت سنبھال لی"۔

ایوب خان نے اصلاحات کے ایک جامع پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے خود کو ایک انقلابی راہ نما کے طور پر پیش کیا۔ ان اصلاحات میں سے اکثر کی نوعیت دنیوی تھی۔ تاہم نظریہ پاکستان پر سے توجہ نہ ہٹائی جا سکی۔ 1960ء میں ایوب خان نے "فارن افیئرز" میں ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے پاکستان کے فیصلہ کن مفادات کی اس تعریف کی توثیق کی جو لیاقت علی خان نے کی تھی۔ ایوب خان نے اس عجیب وغریب دباؤ کا تذکرہ بھی کیا جس کا پاکستان کو ایک آزاد ریاست کے طور پر معرض وجود میں آجانے کے فوراً بعد سامنا کرنا پڑا۔ پہلے دباؤ کو نظریاتی قرار دیتے ہوئے ایوب خان نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ "ہمارے نظریے کے بنیادی تصور کو ابہام کی گرد سے آزاد کرائیں گے"۔ انہوں نے اپنی ترجیحات میں سرفہرست ترجیح یعنی پاکستانی قوم کی تعمیر کے لئے اپنے منصوبے کی وضاحت پیش کی۔ ایوب خان لکھتے ہیں۔ " درحقیقت پاکستان کے معرض وجود میں آجانے سے قبل ہم میں سے کوئی بھی پاکستانی نہیں تھا۔ کیونکہ پاکستان نام کے کسی علاقائی تشخص کا کوئی وجود نہ تھا"۔

1947ء سے قبل ہماری وطنیت کا تعلق علاقائی حدود سے زیادہ تصور یا نظریے سے تھا۔ اس وقت تک ہم نظریاتی اعتبار سے مسلمان تھے۔ علاقائی لحاظ سے ہم ہندوستانی تھے اور آبادی کے اعتبار سے ہم گیارہ چھوٹے صوبوں کے مجموعے کا حصے تھے جن کے ساتھ ہماری وفاداریاں وابستہ تھیں۔ ایوب خان اپنے فوجی انقلاب کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ انقلاب اس نوعیت کے تضادات کا حل فراہم کرے گا"۔

اپنے اسی مضمون میں ایوب خان لکھتے ہیں کہ " پاکستان کمیونزم کی تیز اور بلند و بالا لہر میں مدغم ہو سکتا ہے لہذا ہم مغربی ممالک سے مزید امداد کے طلبگار اور دعویدار ہیں۔ بالخصوص بعض تاریخی وجوہ کی بناء پر پاکستان سمجھتا ہے کہ امریکہ پر اس کا نسبتاً زیادہ استحقاق ہے۔ کیونکہ پاکستان نے کھلم کھلا اور بیک آواز ہو کر مغرب کے ساتھ اپنی تقدیر منسلک کر دی تھی۔ لہذا مغربی اقوام پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اس کو خوش آمدید کہیں اور اسے پذیرائی دیں"۔ ایوب خان کے نزدیک ملکی سلامتی کا راز نظریے اور معاشی ترقی کے امتزاج میں مضمر تھا۔ وہ ترقی جو مغربی اقوام کے تعاون کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہو۔ آزادی کے بعد پاکستان کے مقبول ترین سیاسی راہ نما حسین شہید سہروردی نے ایک متبادل حکمت عملی کا اظہار بھی کیا۔ وہ 1957-1956ء میں پاکستان کے وزیراعظم بھی رہے اور بعد ازاں انہیں "سول ملٹری امتزاج" نے نکال باہر کیا۔ سہروردی کی سیاست پر ایوب خان نے پابندی عائد کر دی تھی۔ انہوں نے پاکستان کے نظریاتی ریاست ہونے کے تصور کو ہی چیلنج کر دیا تھا۔ سہروردی کہتے ہیں۔ " نظریے پر زیادہ زور دینے اور اس پر اصرار کرنے سے پاکستان کے اندر تقسیمی اور گروہی جذبات زندہ رہیں گے۔ وہ جذبات جن کے باعث آزادی سے قبل پورا برصغیر تقسیم کے عمل سے دوچار تھا"۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو ایک "قومی ریاست" سمجھا جائے۔ ایسی قومی ریاست جہاں حکومت اور عوام کے درمیان ایک پائیدار تشخص یا شناخت موجود رہے اور اس تشخص یا شناخت کا ماخذ عوام کی رائے۔ خواہش یا رضا ہو۔

سہروردی نے پاکستان کی مغرب نواز پالیسی کی حمایت کی لیکن ساتھ ساتھ ان کا یہ موقف بھی تھا کہ پاکستان "پان اسلام ازم" (کل اسلامی) کی ناقابل عمل سوچ کو اپنا کر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مزید برآں وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو خفیہ کاروائیاں کرنے کی بجائے عوام کو اپنے غیر ملکی تعلقات میں کارفرما منطق سے آگاہ کرے اور پوری دنیا میں پاکستان جس ملک کے ساتھ بھی اتحاد کرے۔ حکومت کی سرتوڑ کوشش ہونی چاہئے کہ اسے عوامی حمایت حاصل ہو جائے۔

وہ ایوب خان ہی کی سوچ تھی جو کامیاب و کامران رہی اور پاکستان کی فوج نے اپنا سارا وزن نظریاتی ریاست کے تصور کے پلڑے میں ڈال دیا۔ امریکہ کے ساتھ قریبی تعلقات پر مبنی پالیسی اور ایوب دور کی اقتصادی ترقی نے اس دور کے مبصرین کو کافی متاثر کیا۔ ایوب خان نے خود کو فیلڈ مارشل کے عہدے پر ترقی دیدی۔ ایک اصلاح پسند۔ مثبت سوچ کے حامل اور روشن خیال آمر کے طور پر ان کی ہمیشہ تعریف کی گئی۔ ایوب دور میں ہی تعلیم اور میڈیا پر ریاست کو اجتماعی کنٹرول حاصل ہوا۔

ان دنوں مطالعہ اسلام یا اسلامیات پر زیادہ توجہ مرکوز کی جانے لگی۔ پرائمری اور میٹرک کی سطح پر تاریخ۔ جغرافیے اور شہریت کو ملا کر ایک ہی مضمون بنا دیا گیا جسے "معاشرتی علوم" کہا جاتا تھا۔ نصاب اور نصابی کتب اس طرح مرتب کی گئیں کہ تاریخ نے تخلیق پاکستان کو ہندوستان سے نوآبادیاتی حکمرانوں کی رخصتی کے بعد پیدا ہونے والے اختلافات کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے برصغیر میں آمد اسلام سے منسلک کر دیا۔ تاریخ اسلام کو کسی مذہب یا تہذیب کی تاریخ کی بجائے قیام پاکستان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا۔ مسلمان فاتحین کی شان و شوکت کے قصیدے پڑھے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی دشمنوں کے طور پر تصویر کشی کی گئی اور پاکستانیوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ کسی جمہوری حکومت کو چلا ہی نہیں سکتے۔ ایوب خان کے انقلاب کو پاکستان کی سالمیت اور یک جہتی کی سمت ایک اہم قدم قرار دیا گیا۔ فیلڈ مارشل کے جانشینوں کے ادوار حکومت میں بھی انڈر گریجوایٹ سطح تک وہی چیزیں "مطالعہ پاکستان" کے نام سے پڑھائی جاتی رہیں۔ بعد میں ایوب خان کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف پر مشتمل ابواب کو کسی حد تک حقیقت پسندانہ ضرور بنایا گیا۔ تاہم فرضی تاریخی مفروضے اور موقف جوں کے توں رہے اور اسلام پر توجہ کو بھی وسعت دی گئی۔ وزارت اطلاعات اور تعمیر نو بیورو نے یقین دہانی کرائی کہ سکول کی سطح پر طلباء کو سنایا اور پڑھایا جانے والا پیغام ریڈیو۔ ٹیلی ویژن۔ فلموں۔ رسائل و جرائد۔ کتابوں اور اخبارات کے توسط سے بالغوں کو بھی دستیاب ہو گا۔

ایوب خان کے قریبی ساتھی اور ان کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوھر نے ان کی وفات سے بھی کئی سال بعد انکشاف کیا کہ 1959ء میں ایوب خان نے "پاکستان میں اسلامی نظریہ" کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا جو دوسروں کے علاوہ فوجی افسران تک بھی پہنچایا گیا۔ ایوب خان نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں بھی "آئیڈیالوجی" کے موضوع پر اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "بطور حیوان۔ اپنی بنیادی جبلتوں کے تحت انسان اپنی زندگی کی بقاء اور نسلی تسلسل کی کاوشیں کرتا ہے۔ لیکن قوت متخیلہ کا مالک ہونے کے باعث وہ اپنی جبلتوں پر قابو بھی پا سکتا ہے اور انہیں تبدیل

کرنا بھی اس کے لئے ناممکن نہیں۔ اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایک ایسی آئیڈیالوجی میسر آجائے جس کے تحفظ کے لئے وہ اپنی جان قربان کر سکے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کوئی آئیڈیالوجی جتنی اچھی اور ابدی ہوگی اس کے حاملین بھی اتنے ہی بہتر انسان ہوں گے۔ ان کی زندگیاں زیادہ بھرپور اور زیادہ تخلیقی ہوں گی۔ ان میں ہم آہنگی اور مزاحمت کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوگی۔ اس قسم کے معاشرے کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اسے جھکایا تو جاسکتا ہے۔ توڑا نہیں جاسکتا۔ ان صفات سے متصف اسلام کے سوا کوئی آئیڈیالوجی ہو ہی نہیں سکتی جس کے ہم حامل ہیں۔ اسی آئیڈیل کی بنیاد پر ہم نے پاکستان کے حصول کی جدوجہد کی اور حاصل بھی کر لیا لیکن اس کی سادہ اور قابل فہم تعریف کرنے میں ناکام رہے۔ اپنی بے خبری اور جہل کے باعث ہم نے اسلامی آئیڈیالوجی کو مذہبی کٹڑ پن اور مذہبی حکومت کا مترادف خیال کرنا شروع کر دیا اور لاشعوری طور پر اس پر شرمساری محسوس کرنے لگے۔ وقت آن پہنچا ہے کہ ہم اس شرمساری پر قابو پائیں۔ مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور اس آئیڈیالوجی کی سادہ مگر جدید اصطلاحات میں تعریف کریں۔ پھر اسے لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ اسے اپنی راہنمائی کے لئے ضابطہ بنالیں۔

اس کے بعد ایوب خان نے ایک سادہ اور سلیس اسلامی نظریے کی تعریف اور اس کے خدوخال بیان کرتے ہوئے لکھا "یہ درست ہے کہ اسلام میں علاقائی وطن پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جو لوگ ایک مخصوص علاقے میں رہائش پذیر ہیں انہی پر اس کی حفاظت۔ دفاع اور ترقی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جو ہمیں ذرائع معاش مہیا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وابستگی ہر چیز سے مقدم اور افضل ہے۔ پاکستانی عوام مختلف نسلوں کا مجموعہ ہیں اور ہر نسل کا اپنا اپنا پس منظر ہے تو پھر انہیں متحد اور یکجا کس طرح رکھا جائے؟ وہ بھی اس طرح کہ ان کے مقامی تفاخر۔ کلچر اور روایات کو زک نہ پہنچے"۔

عام تاثر کے برعکس ایوب خان سیکولر ذہن کے مالک نہیں تھے۔ نہ ہی وہ اس سوچ کے خلاف تھے کہ پاکستان ایک نظریے کی حامل ریاست ہے۔ ایک صاف گو اور سیدھا سادہ فوجی ہونے کے ناطے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا کہ وہ مولانا مودودی کی سوچ کے مطابق ایک اسلامی ریاست کی جزئیات اور تفصیلات جان سکتے۔ ایوب خان ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار رہتے تھے جو ریاست کے لئے مفید ہو اور وہی ان کے نزدیک اسلامی تھا۔

ایوب خان علما کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور تعلیم یافتہ طبقات کے ساتھ ان کے تنازعات کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ علمائے دین اسلام کی جو پیچیدہ اور باہم متضاد توجیہات پیش کرتے تھے وہ بھی انہیں ناپسند تھیں۔ وہ حکومت میں علماء کے کردار کے واضح طور پر خلاف تھے۔ ایوب خان چاہتے تھے کہ مذہب کی توجیہہ و توضیح ریاست کرے۔ وہ ایسی اسلامی آئیڈیالوجی چاہتے تھے جو ملکی دفاع اور ترقی کو یقینی بنانے میں ممد ثابت ہو۔ وہ اسلامی آئیڈیالوجی جو پاکستان میں مقیم مختلف رنگ و نسل کے انسانوں کو ایک وحدت میں بدل دے۔ اسلام کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ ملکی تعمیر میں ایک ہتھیار کا کام دے سکتا ہے۔ ایسا ہتھیار جو مذہبی راہنماؤں اور پیش واؤں کی بجائے کسی روشن خیال فوجی

افسر کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ اگرچہ ان کے ساتھی فوجی افسران نے مودودی اور اسلامی ریاست کے دیگر علمبرداروں کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم انہیں ایوب خان کے موقف سے کامل اتفاق تھا۔ بعض فوجی افسران نے مذہبی سکالرز کے ساتھ قریبی تعلقات کے قیام کا آغاز کر دیا۔ ایوب خان کے خیالات کا ایک عنصر مذہبی سیاسی راہنماؤں کے خیالات پر منطبق ہو گیا۔ وہ بھارت کو ایک ہندو ریاست سمجھنا اور ہندوؤں کو اسلام اور مسلمانوں کے ایسے دشمن خیال کرنا تھا جن کے ساتھ مصالحت کی کسی دور میں کوئی امید نہ ہو۔ ایوب خان کے خیال کے مطابق "وہ برہمن شاؤنزم" اور ہندوؤں کا متکبرانہ اور نخوت زدہ رویہ ہی تو تھا جس نے ہمیں اپنا علیحدہ ملک حاصل کرنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں ہم اپنی سوچ اور عقیدے کے مطابق زندگی گزار سکیں"۔ (فرینڈز ناٹ ماسٹرز)

"ہندو نظریہ سازوں کا دعویٰ تھا کہ آکسس سے میکانگ تک ان کی سرحدیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بھارت اپنے موجودہ دائرہ اثر پر قانع نہیں۔ اسے معلوم تھا پاکستان چاہتا بھی ہے اور اہل بھی ہے کہ اس کے توسیع پسندانہ منصوبوں کی راہ میں مزاحم ہو سکے۔ وہ ہمیں دھمکا کر اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ ہم بقائے باہمی کے اصول کے تحت برابری کی بنیاد پر بھارت کے باعزت ہمسائے بن جائیں لیکن بھارت اس پر کبھی رضامند نہ ہوتا۔ پاکستان اور بھارت کے نظریات میں یہی بنیادی اختلاف تھا۔ بھارت طبقات میں منقسم تھا۔ جہاں نچلی جاتی کے کسی فرد کا سایہ بھی اعلیٰ نسل کے ہندو کو ناپاک کر سکتا تھا۔

ایوب خان نے نہ تو کبھی پارسائی پر زور دیا اور نہ ہی مذہبی علوم کے باریک نکات کا مطالعہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستانی وطن پسندی میں سے "اسلام کی عالمگیریت"(Pan Islamism) جھلکے۔ مزید براں اسی وطنیت یا وطن پسندی میں ہندوؤں اور بھارت کے (ممکنہ) تسلط سے خوف کا عنصر بھی شامل ہو وہ لکھتے ہیں:-

"کاسابلانکا سے لیکر جکارتہ تک مسلمان ممالک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی طاقتیں ان کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار ہیں کیونکہ ان میں سے زیادہ تر اپنے عقیدہ اسلام کا علانیہ اظہار کرتے ہیں۔ ملک کے اندر اسلام کے حوالے سے جتنے اختلافات بھی ہوں۔ اسلام کے بارے میں وہ جو سوچ بھی رکھتے ہوں اور اسلام کو انہوں نے جس انداز میں بھی اپنا رکھا ہو۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کمیونسٹ، عیسائی دنیا اور ہندو بھارت انہیں مسلمان ممالک ہی سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ ویسا ہی رویہ رکھتے ہیں"۔

"بالخصوص بھارت کے دل میں مسلمانوں کے لئے نفرت ایک مرض کے طور پر موجود ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ہمسائیگی میں ایک مسلمان طاقت کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح بھارت اپنی سرحدوں سے قریب یا دور مسلمان ممالک کی جمعیت سازی بھی برداشت نہیں کر سکتا"۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایوب خان عالمی سطح کے وہ پہلے پاکستانی راہ نما تھے جنہوں نے مذہبی تعصبات کو ترک کیے بغیر اقوام عالم کو یقین دلایا کہ وہ انتہائی اخلاص مندی اور نیک نیتی سے اسلام کو جدیدیت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں۔ بظاہر وہ شعائر اسلامی سے دور تھے۔ اپنے اور علماء کے درمیان ایک فاصلہ بھی رکھتے تھے۔ مزید براں بیرون ملک خطاب کے دوران وہ محتاط الفاظ استعمال کرتے تھے۔ انہی اوصاف کی بناء پر عالمی سطح پر ان کے بارے میں یہ تاثر متشکل ہوا کہ وہ اپنے دور کے اتاترک یا "مسلمان ڈیگال" ہیں تاہم انہوں نے ملک کو ریاستی سرپرستی میں پیش کیے جانے والے نظریے کی راہ پر چلایا۔ کیونکہ فوجی قیادت نے مفروضہ قائم کر رکھا تھا کہ ملک کی باگ دوڑ انہی کے ہاتھ میں رہیگی۔ لہذا ان کے نزدیک ریاست کو اسلام پسندوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن جب پاکستان کو ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے طور پر قبول کرلیا گیا تو اسلام پسندوں کا یہ ناگزیر دعویٰ سامنے آگیا کہ وہ اس ریاست کے خدوخال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔

پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد ابتدائی چند سالوں کے دوران جو سہ جہتی پالیسی وضع کی گئی۔ ایوب خان اس پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے بھارت کو اپنا غیر ملکی دشمن سمجھا، اسلام کو قومی سطح پر اتحاد کا ضامن خیال کیا اور امریکہ کو اسلحے اور مالی وسائل کے فراہم کنندہ کا مقام دیا۔ تاہم انہوں نے ریاستی پالیسی کے ان تین کلیدی عناصر کا جو مخصوص آمیزہ بنایا اس میں بھارت سے دشمنی اور امریکہ سے دوستی قومی سطح پر اتحاد کے محرک یعنی اسلام پر بازی لے گئیں۔

ایوب دور کے ابتدائی چند سالوں کے دوران مذہبی جماعتوں کو عمومی طور پر اقتدار کے مدار سے دور رکھا گیا۔ جس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ ایوب خان مغربی ممالک کی نظر میں اپنے آپ کو ایک روشن خیال مسلمان راہنما ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس رجحان نے جماعت اسلامی کو مجبور کر دیا کہ وہ فوجی حکمرانی کی مخالف سیکولر جماعتوں کے ساتھ مل جائے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ ایوب خان نے سیاسی جماعتوں کی تحدید کے ایک قانون کے تحت جماعت اسلامی پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن عدالت عظمیٰ نے انہیں پابندی اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ تاہم جماعت اسلامی اور ایوب دور کے کچھ افسران نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔ تاکہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے جماعت اسلامی عرب ممالک کے ساتھ اپنے ان روابط سے استفادہ کر سکے جو اس نے ایک اسلام پسند جماعت ہونے کے ناطے استوار کر رکھے تھے۔

1962ء میں جب ایوب خان نے صدارتی طرز حکومت اور صدر کے بالواسطہ انتخاب پر مشتمل آئین پیش کیا تو اس کے ابتدائی مسودے میں پاکستان کے سرکاری نام میں سے لفظ "اسلامی" حذف کر دیا گیا اور "جمہوریہ پاکستان" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ مذہبی جماعتوں کے احتجاج پر بالواسطہ طور پر منتخب قومی اسمبلی نے پاکستان کو اس کا ابتدائی "خطاب" یعنی "اسلامی جمہوریہ پاکستان" واپس لوٹا دیا۔ اگرچہ نیا آئین عوامی سطح پر غیر مقبول ٹھہرا اور اسے ملک پر شخصی حکومت کے قیام کے لئے ہتھیار خیال کیا گیا، تاہم اس کے نافذ العمل ہوتے ہی مارشل لاء رخصت ہوگیا۔ ایوب خان کے الفاظ میں اس وقت ملک "اس جنگلی گھوڑے کی مانند تھا جس پر قابو تو پالیا گیا ہو لیکن ابھی تک سدھایا نہ گیا ہو"

"جنگلی اور منہ زور گھوڑے" کو سدھانے اور اختلاف رائے کے لئے ایوب خان نے ریاستی مشینری کو متحرک کر دیا۔ یہ استیصالی دباؤ وطن پسندوں کے نسلی گروہوں اور ملک گیر سیاسی جماتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ کیونکہ نئے آئین کی "خلاف ورزی" کرتے ہوئے جماعت اسلامی نے بھی خود کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا تھا۔ لہٰذا اسے بھی نہ بخشا گیا۔ جب ایوب خاب نے یکم جنوری 1965ء کو اس آئین کے تحت پہلا بالواسطہ صدارتی انتخاب منعقد کرایا۔ حزب اختلاف نے بانی پاکستان ہمشیرہ فاطمہ جناح کو اپنا مشترکہ اور متفقہ صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ مذکورہ انتخابات کے دوران سب سے بڑا "انتخابی ایشو" تھا "پارلیمانی جمہوریت بمقابلہ ایوب خان کا اختیاری طرز حکمرانی"۔ ایوب خان نے بین الاقوامی تعلقات اور اقتصادی شعبے میں اپنی کامیابیاں گنوائیں لیکن ملکی پالیسیوں کے حوالے سے انہوں نے شورانگیز حزب اختلاف اور ان سیاستدانوں کو خود پر حاوی محسوس کیا جنہیں وہ پہلے ہی بدنام و رسوا کر چکے تھے۔ ایوب خان ایک ایسے جرنیل کے طور پر خود کو مسابقتی سیاست سے ہم آہنگ نہ کر سکے جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ اس نے قوم کو متحد رکھنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی انتظامی اور انٹیلی جنس مشینری کو حکم دیا کہ وہ حزب اختلاف کے حملوں کا مقابلہ کریں۔

اس مہم کے دوران ایوب خان کی وزارت داخلہ (جس کے پاس ملکی انٹیلی جنس سروس کا کنٹرول تھا) نے جتنی حکمت عملیاں اپنائیں۔ ان میں وہ فتویٰ بھی شامل تھا کہ اسلام کسی خاتون کو ریاست کی سربراہ بننے کی اجازت نہیں دیتا۔ مودودی فاطمہ جناح کی امیدواریت کے شدید حامی تھے۔ انہوں نے (فتوے کے جواب میں) کہا کہ عورت اسلامی ریاست کی سربراہ بن تو سکتی ہے تاہم یہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ اس مسئلہ متنازعہ فیہ کے نتائج سے استفادہ کرنے کے لئے حکومت نے کئی مذہبی علماء کو ترغیب دی اور رشوت پیش کی۔ جنرل ایوب کے ایک حامی اور مقدس شخصیت پیر صاحب دیول شریف نے دعویٰ کیا کہ دوران غور و فکر اللہ رب العزت نے انہیں رابطے کی سعادت بخشی اور متحدہ حزب اختلاف کے ساتھ اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس واقعے نے ایوب خان کے اس ابتدائی منصوبے کو سبوتاژ کر دیا جس کے تحت وہ علمائے دین کو ایک فاصلے پر رکھنا چاہتے تھے۔

1960ء میں بطور صدر امریکہ جان ایف کینیڈی کے انتخاب کے بعد ایوب خان کی خارجہ پالیسی بھی مشکلات کا شکار ہوگئی۔ نئی امریکی حکومت نے بھارت کے ساتھ اپنے مراسم کو مضبوط بنانا چاہا۔ صدر آئزن ہاور اور سیکرٹری آف سٹیٹ ڈلاس اپنی "شمالی دفاعی صف" میں پاکستان کی شمولیت کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ ڈلاس نے امریکی کانگریس کو اپنے اس یقین اور وثوق سے آگاہ کر رکھا تھا کہ "پاکستانیوں کو کسی کمیونسٹ حملے کے خلاف لڑنا پڑ گیا تو وہ خالی مکوں کے ساتھ لڑنے سے بھی گریز نہیں کریں گے"۔ امریکی سرپرستی میں طے پانے والے معاہدوں میں شرکت سے بھارت کے انکار نے ڈلاس کی نظروں میں پاکستان کی منزلت بڑھا دی تھی۔ امریکہ اپنی سرپرستی میں بننے والے اتحادوں سے جس نوعیت کی حمایت کی توقع رکھتا تھا۔ پاکستان وہ پیش نہیں کر سکا تھا۔ دوسری طرف پاکستان محسوس کر رہا تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حل میں اسے

نسبتاً زیادہ امریکی مدد درکار تھی۔ اس وقت کینیڈی اپنا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ مزید براں دونوں فریقین کو احساس ہو گیا کہ وہ باہمی تعلقات سے جو حاصل کرنا چاہتے تھے اب نہیں کر سکیں گے۔

جب کینیڈی جانسن انتظامیہ نے بھارت کے ساتھ قریبی اور خوشگوار تعلقات قائم کرنا چاہے تو ایوب خان نے چین کو جوش دلانا شروع کر دیا۔ جولائی 1960ء کے "فارن افیئرز" میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان خوشگوار تعلقات پر زور دیا۔ لکھتے ہیں۔ "جنگ اور حکمت عملی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اس دھکے کا مشاہدہ کر سکتا ہوں جو شمال کی جانب سے بحر ہند کے پانیوں کی سمت لگایا جا رہا ہے۔ اگر بھارت اور پاکستان بدستور برسر پیکار رہے تو اس دھکے کی شدت یقیناً "بڑھے گی" لیکن صرف چار سال بعد ایوب خان بھارت پر برتری کے حصول کے لئے چین کو محدود کرنے کے عمل کو ترک کرنے پر آمادہ نظر آئے۔ امور خارجہ ہی کے موضوع پر ان کا ایک مضمون بعنوان۔ "پاک امریکہ اتحاد۔ ایک بوجھ اور دباؤ"۔ جنوری 1964ء میں "فارن افیئرز" کے صفحات پر شائع ہوا جس میں پاکستانی راہنما نے وضاحت کی کہ پاکستان بھارت کے خلاف اپنے دفاع کو یقینی کیوں بنانا چاہتا ہے اور اسے اس قدر ترجیح کیوں دیتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اس شکوے کو بآواز بلند امریکہ تک پہنچایا کہ وہ مذکورہ محاذ پر اول الذکر کی مدد نہیں کر رہا۔

پاکستان اور امریکہ کے درمیان اتحاد کے حوالے سے دونوں ملکوں کی ترجیحات میں موجود فرق 1962ء میں بھارت اور چین کے مابین ہونے والی جنگ کے دوران ابھر کر سامنے آیا۔ اس جنگ میں امریکہ نے بھارت کو عسکری تعاون پیش کیا۔ پاکستان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بھارت کو اسلحے کی فراہمی کو مسئلہ کشمیر کے حل کے ساتھ منسلک یا مشروط کر دیا جائے ورنہ بھارت امریکی اسلحہ امریکہ ہی کے ایک اتحادی پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا۔ پاکستان نے اس امریکی تجویز کو بھی مسترد کر دیا کہ اول الذکر بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنائے اور جمہوریہ چین کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھانے سے باز رہے۔ اس علاقے سمیت جو رسماً جموں و کشمیر کی متنازعہ ریاست کا حصہ تھا۔ پاکستان نے چین کے ساتھ سرحد کی نشاندہی کے معاملات طے کر لئے۔ مزید براں پاکستان وہ پہلا غیر کمیونسٹ بن گیا جس نے جمہوریہ چین کے ساتھ کمرشل پروازوں کا رابطہ قائم کیا۔

پاکستانی راہنماؤں پر ابتداء سے ہی واضح تھا کہ امریکہ کے ساتھ ان کے اتحاد کا باعث صرف اور صرف وسائل کے اس عدم توازن سے نمٹنا ہے جو تقسیم کے وقت پاکستان کو ورثے میں ملا۔ ورنہ پاکستان امریکہ کے فلسفۂ زندگی سے کاملاً متفق نہیں تھا۔ عہدہ صدارت پر فائز ہونے سے قبل جولائی 1958ء میں جنرل ایوب نے پاکستان کی دفاعی ضروریات کے موضوع پر "ایشین ریویو" کے لئے ایک مضمون تحریر کیا۔ لکھتے ہیں "ہم نے ثابت کر دیا ہے اور ہمیں بھروسہ ہے کہ ہماری افرادی قوت لڑنے کا فن جانتی ہے۔ لیکن جب تک اسے ضروری اور جدید ساز و سامان اور اسلحہ مہیا نہ کیا جائے۔ وہ بے فائدہ رہے گی اور امریکہ ہی وہ واحد ملک ہے جو ہمیں مطلوبہ ساز و سامان مہیا کر سکتا ہے"۔ اس وقت تک ایوب خان

امریکہ سے کچھ عسکری سامان حاصل کر چکے تھے۔ لہذا پہلے داؤ کے طور پر انہوں نے چاہا کہ امریکہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لئے بھارت پر اپنا دباؤ بڑھائے۔ انہوں نے اپنے ماہر مشیروں سے بھی کہا کہ کشمیر میں تعطل دور کرنے کے لئے کوئی منصوبہ تشکیل دیں۔

ایوب خان کے انٹیلی جنس اور تحقیق کے شعبے "قومی تعمیر نو بیورو" نے پاکستان کی دفاعی ضروریات کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کرائی اور سفارش کی کہ دفاع کو یقینی بنانے کے لئے وہ امریکہ کے ساتھ اتحاد سے آگے بھی نظر دوڑائے۔ مضمون میں یہ بھی درج تھا کہ بھارتی خطرے کے علاوہ برطانوی ہند کے تمام دفاعی مسائل بھی پاکستان کو ورثے میں ملے۔ ان میں سے ایک مسئلہ تو ملک کے شمال مغرب میں واقع پشتون قبائلی علاقوں پر افغانستان کا دعویٰ ملکیت تھا۔ دوسرے اس امر کا امکان بھی تھا کہ گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے روس افغانستان اور پاکستان کو روند کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا۔ مذکورہ مقالے میں درج تھا۔

"پاکستان اپنے آپ کو اس دن کے لئے تیار رکھے جب امریکہ کے ساتھ اس کے مراسم یا تو ختم اور یا پھر سرد مہری کا شکار ہو جائیں گے۔ اس وقت ہماری آزمائی ہوئی اور قابل اعتماد افرادی قوت کو اس قابل ہونا چاہئے کہ اپنی سرزمین کا دفاع کر سکے۔ ایسی کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لئے پاکستان کو چاہئے کہ اپنی آئیڈیالوجی اور فطری وودیعت شدہ قوت کی طرف لوٹ آئے۔ اسلام کی طرف سے عائد کردہ اپنے دفاع کا فریضہ (جہاد) ہر شخص پر لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ ملکی دفاع میں اپنا کردار ادا کرے۔ یہ ان انفرادی کوششوں اور اقدامات کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے جو جنگ وجدل کے جدید طریقوں میں حد درجہ اہم ہو چکے ہیں"۔

"قومی تعمیر نو بیورو" نے بے قاعدہ اور غیر منظم جنگ وجدل کو پاکستان کے دفاعی مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا۔

"افرادی قوت کے اعتبار سے پاکستان ایک خوش قسمت ملک ہے۔ بعض علاقوں میں بے قاعدہ یا غیر منظم لڑائی لوگوں کی قدیم روایات میں شامل ہے۔ اب انہوں نے ایک ملک حاصل کر لیا ہے۔ انہیں ان کے اپنے ہی نظریے پر مبنی ایک ریاست مل گئی ہے۔ اب ان کا فرض بنتا ہے کہ حد درجہ جرات اور عزم صمیم کے ساتھ اس کا دفاع کریں۔ تو پھر ان بے قاعدہ اور غیر منظم لڑاکوں کو تربیت کیوں نہ دی جائے جنہیں پاکستان کی اپنی دفاعی صنعت بھی ساز و سامان اور اسلحے سے لیس کر سکتی ہے بلاشبہ انہیں سیاسی طور پر بیدار ہونا ہوگا۔ انہیں جنگ وجدل (کے طور طریقوں) کی وقت طلب اور وسیع تربیت درکار ہے۔ مذکورہ خطرات طویل المیعاد ہیں۔ غیر منظم لڑاکوں کا ذی فہم اور ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ انہیں آب و ہوا کے مقامی محرکات کا علم ہونا چاہئے۔ ان پر لازم ہے کہ اپنے لوگوں اور دشمن کی نفسیات سے واقف اور اپنی جدوجہد کے سیاسی عواقب سے باخبر ہوں"۔

غیر منظم جدوجہد پاکستان کی ابتدائی لڑائیوں کی سنگینی کو کم کرنے میں ممد ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ طوالت پذیر اقدامات کو وسعت دینے میں مدد دے سکتی تھی۔ غیر منظم جنگ وجدل کی روح یہ تھی کہ دشمن کو کوئی ہدف نہ دیا جائے۔ اور خود آگے بڑھکر ایسے مقامات پر بار بار حملے کئے جائیں جو اس کے لئے غیر متوقع ہوں۔

ایک طویل عرصے تک بطور بھارتی وزیر اعظم خدمات سرانجام دینے والے پنڈت جواہر لعل نہرو کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک ایسے وقت پر پرلوک سدھارے جب بھارتی مقبوضہ کشمیر کے مختلف حصوں میں مقیم مسلمانوں میں شدید بے چینی اور اضطراب پایا جاتا تھا۔ پاکستان کے بھارت مخالف انتہا پسند عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ غیر منظم اور بے قاعدہ جنگ وجدل کی حکمت عملی کو آزما لیا جائے۔ اگست 1965ء میں کشمیر میں مداخلت کار بھیجے گئے۔ ان سے توقع کی گئی کہ وہ بغاوت کے شعلوں کو ہوا دیں گے۔ 6 ستمبر کو بھارت نے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے جنگ کو پاکستان کی بین الاقوامی سرحدوں تک وسعت دے دی۔ امریکہ نے پاکستان اور بھارت دونوں کو اسلحے کی فراہمی روک دی۔ کیونکہ پاکستان کا زیادہ تر انحصار امریکی اسلحے پر تھا۔ لہذا اسے سخت مایوسی ہوئی۔ تعطل کی حالت میں جنگ ختم ہوگئی اور پاکستان جس عسکری برتری کی توقع رکھتا تھا وہ حاصل نہ ہو سکی۔

1965ء میں بھارت کے ساتھ ہونے والی جنگ کے متعدد نتائج برآمد ہوئے جن میں سے ہر نتیجہ پاکستان کے مستقبل کے لئے اہم تھا۔ پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ پاکستانیوں کے اذہان میں امریکہ مخالف سوچ ابھر آئی۔ اس سوچ کی بنیاد یہ حقیقت بنی کہ اتحادی ہونے کے باوجود امریکہ پاکستان کی مدد کو نہ پہنچا۔ امریکی اسلحے پر ضرورت سے زیادہ انحصار نے پاکستان کے اندر شدید مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی۔ دوسرے اس جنگ نے پاکستانی فوج کو "اسلامی نظریے" سے قریب تر کر دیا۔ فوج اور عوام کے مورال کی تعمیر کے لئے مذہبی علامات اور جہادی اپیلوں کو توسط کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تیسرے بنگالیوں نے محسوس کیا کہ ایوب خان کی فوجی حکمت عملی نے انہیں کاملاً غیر محفوظ کر دیا ہے۔ اس احساس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان خلیج کو وسیع تر کر دیا۔ چوتھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس جنگ نے ایوب خان کو کمزور کر دیا جو بھارت کے ساتھ جنگ کر کے یقینی فتح میں ناکام رہ کر اپنے عوام کا اعتماد کھو چکے تھے۔

جس دن بھارت نے پاکستان کی سرحد پر حملہ کیا اسی روز ایوب خان نے قوم سے خطاب کیا اور آنے والے کئی سالوں کے لئے پاک بھارت تعلقات کی نوعیت کا تعین کر گئے۔ کشمیر میں بھارتی جارحیت پاکستان پر حملے کی تیاری تھی۔
" آج بھارت نے اپنی اس بدنیتی اور دشمنی کا حتمی ثبوت پیش کر دیا جس کی وہ پاکستان کے خلاف اس کے معرض وجود میں آجانے کے فوراً بعد سے پرورش کرتا چلا آرہا تھا۔ بھارتی حکمران ایک ایسی آزاد ریاست کے قیام سے کبھی سمجھوتہ نہ کر سکے جس کی مسلمانان برصغیر اپنی مادر وطن کے طور پر تعمیر کر سکیں۔ گزشتہ 18 برس سے انہوں نے ہمیں اپنی عسکری تیاریوں کا ہدف بنا رکھا ہے"۔

"مغرب میں ہمارے چند دوستوں سے بھاری مقدار میں اسلحہ بٹورنے کے لئے بھارت نے چین کا کارڈ استعمال کیا۔ ہمارے وہ دوست بھارتی حکمرانوں کی ذہنیت سے آگاہ نہیں تھے۔ وہ بھارتیوں کے اس جھانسے میں آگئے کہ جب وہ پوری طرح مسلح ہو جائیں گے تو چین کے خلاف جنگ کریں گے۔ ہمیں پہلے دن سے علم تھا کہ یہ اسلحہ ہمارے خلاف استعمال ہوگا اور وقت نے بھی ثابت کر دیا کہ ہمارا اندازہ درست تھا"۔

"اب بھارتی حکمرانوں نے اپنی روایتی بزدلی اور منافقت کے زیر اثر اپنی فوج کو حکم دیا ہے کہ کسی رسمی اعلان جنگ کے بغیر پاکستان کی مقدس سرزمین میں گھس جائے۔ ہمیں چاہئے کہ بھارت کی اس سامراجی مہم کو ناکام بنانے اور کچلنے کے لئے اسے منہ توڑ جواب دیں۔ پاکستان کے 10 کروڑ مسلمان جن کے دل لَآاِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ اللّٰہ (خدا کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں) کی آواز کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ وہ بھارتی توپوں کو خاموش کرانے سے پہلے سکھ کا سانس نہیں لیں گے"۔

ریاستی سرپرستی میں چلنے والے پاکستانی میڈیا نے اسلام کے پاکستانی سپاہیوں کی اس قدر مدح سرائی کہ ان میں جنون کی حد تک جہاد کا شوق پیدا ہوگیا۔

پاکستان کے آئی ایس پی آر کے ایک افسر نے کئی سال بعد لکھا:-

شجاعت اور دلیری کی داستانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خدائی مدد کی کہانیاں بیان کی جانے لگیں۔ پاکستانی فوج کو بہترین پیشہ وارانہ مہارت کی حامل قرار دیا گیا۔ فوج کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ وہ رکاوٹوں کو عبور کرنا جانتی ہے۔ اس خودکش فوجی دستے کی باتیں ہونے لگیں جس میں شامل فوجیوں نے سیالکوٹ کے محاذ پر بھارتی ٹینکوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے اپنے جسموں پر بم باندھ لئے اور چلتی پھرتی اور زندہ بارودی سرنگیں بن گئے۔ یہ کہانی مقبول ترین جنگی حکایت بن گئی۔ کہانیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ فوجیوں اور شہریوں دونوں نے "واقعتاً" اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دشمن کی طرف سے فائر کئے جانے والے گولوں کو راستے ہی میں پکڑ لیا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے ہدف پر نہیں بلکہ دور جا گرتے تھے اور یہ سب کارروائی "سبز چوغوں میں ملبوس فرشتے" کر رہے تھے۔ اس طرح "نادیدہ ہاتھ" کی فقط ایک جنبش سے پل، زیرزمین آبی گزرگاہیں اور مساجد محفوظ رہیں۔ پاکستان کے فوجی مبینہ طور پر اپنی تھری ناٹ تھری رائفلوں سے دشمن کے جنگی طیاروں کو نشانہ بناتے رہے۔

متعدد جونیئر اوران افسران نے جو دوران جنگ یا جنگ کے فوراً بعد جرنیل بن گئے یہ سب کچھ دیکھ سن کر اس جنگ کو "اسلام اور کفر کے درمیان کشمکش اور جدوجہد" قرار دیدیا۔ مطلب یہ کہ فوجی افسران بھی وہی اصطلاحات استعمال کرنے لگے جو اس سے قبل سید مودودی جیسے مذہبی نظریہ پرست کرتے تھے۔

پاکستانی قوم کو بتایا گیا کہ ان کا ملک جارحیت کا شکار ہوا۔لیکن خدا کی نصرت سے اس جارحیت کی راہ میں کامیاب مزاحمت کی گئی۔اس نقطہ نظر کو ملک بھر میں پھیلانے کے لئے مذہبی راہنماؤں اور گروہوں کی ضرورت پیش آئی۔اس طرح "جہاد" کی جو فضا متشکل ہوئی اسے روایتی علماء اور اسلام پسندوں نے اپنے ایجنڈے کے فروغ کے لئے استعمال کیا۔اس ایجنڈے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ علمائے دین اور اسلام پسندوں کو نظریہ پاکستان اور پاکستان کی پہچان کے نگہبانوں اور محافظین کے طور پر قبول کیا جائے۔جنگ کے بعد سرکاری سرپرستی میں وافر مقدار میں اشاعتی مواد عوام کو یہ باور کرانے کے لئے پھیلایا گیا کہ ایک مسلمان سپاہی پانچ ہندوؤں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

تاہم امریکی سفارت کاروں کے ساتھ گفتگو کے دوران ایوب خان نے تسلیم کیا کہ وہ جنگ کشمیر میں پاکستانی فوج کی کاروائیوں کا نتیجہ تھی۔لیکن یہ بات ایوب خان کو پاکستان کے حق میں امریکی مداخلت کے مطالبے سے نہ روک سکی اور جب امریکی مدد میسر نہ آئی تو امریکہ کے خلاف پاکستانی عوام کے گلے شکوے بڑھ گئے۔ان دنوں کینیڈا کے ہائی کمشنر کے ساتھ ایوب خان کی گفتگو نے پاکستان کے سرکاری رویے اور موقف کو بھی ظاہر کر دیا۔دوران جنگ کینیڈا کے مذکورہ سفارت کار نے پاکستانی صدر سے دریافت کیا کہ آخر الذکر کیا چاہتے تھے۔ایوب خان نے جواباً کہا۔"ہمیں کشمیر چاہئے لیکن ہم جانتے ہیں کہ فوجی کاروائی کے ذریعے اسے نہیں جیتا جا سکتا۔البتہ آپ لوگ تھوڑی بہت جراتمندی کا مظاہرہ کریں تو ہم کشمیر حاصل کر سکتے ہیں"۔

17 روز بعد اقوام متحدہ کی تجویز کردہ فائر بندی کے نتیجے میں جنگ ختم تو ہوگئی لیکن فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکی۔سرکاری پروپیگنڈہ کے ذریعے پاکستانی عوام کو باور کرا دیا گیا کہ ان کی فوج میدان جنگ میں فتحیاب رہی۔پاکستان نے بھارت کے 1600 مربع میل علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔جس میں سے 1300 مربع میل صحرا پر مشتمل تھا۔جبکہ بھارتی پاکستان کے 350 مربع میل سرسبز اور زرخیز علاقے پر قابض ہو گئے۔پاکستان کے جس علاقے پر قبضہ کیا گیا۔وہ سٹریٹیجک اعتبار سے زیادہ اہم اور مغربی پاکستان کے صوبائی دارالحکومت سے بہت قریب بلکہ متصل تھا۔بھارتی فوج نے صنعتی شہر سیالکوٹ اور کشمیر میں بھی پیش قدمی کی۔مزید براں پاکستان نے نسبتاً بڑی فوج کا مقابلہ تو کیا لیکن جنگ نے اسے کمزور ملک بنا دیا۔پاکستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات میں پہلے جیسی گرم جوشی نہ رہی اور مسئلہ کشمیر بھی بدستور حل طلب رہا۔مرکزی حکومت کی بے توجہی کے باعث مشرقی پاکستان کے بنگالی بھی ہمیشہ سے زیادہ مضطرب ہو گئے۔ادھر سندھ اور بلوچستان میں بھی بعض اندرونی محرکات بے چینی اور بدامنی کا باعث بن گئے۔

1965ء کی جنگ کے فوراً بعد جو صورت حال پیدا ہوئی۔اس نے ملک وقوم کی تعمیر اور اس تعمیر کی حدود وقیود کا تعین کرنے کے لئے سویلین راہنماؤں اور فوج کو مل بیٹھنے کا موقع فراہم کر دیا۔بھارت دشمنی پر مبنی پاکستانی وطنیت یا وطن پسندی نے ملک کو ایک ایسی جنگ میں جھونک دیا جو پاکستان کے جنگی مقاصد میں سے ایک بھی حاصل نہ کر سکی اور جو قیمتی وسائل

پاکستان کی اقتصادی ترقی پر صرف ہو رہے تھے، اس جنگ نے ان کا رخ ہی تبدیل کر دیا اور ملک کے دونوں بازوؤں ایوب خان اور ان کے نائبین کو احساس نہ ہوا کہ نظریاتی مثلث سے دور ہٹنے کے لئے وہ وقت مناسب اور سازگار تھا۔ اس وثوق کا تسلسل جاری رہا کہ پاکستان کی کامیابی اسلامی وطن پسندی اور بھارت کے ساتھ مقاومت پر منحصر ہے۔ اور اسلحے اور ترقی کے لئے وسائل صرف بیرونی اتحادوں ہی سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس مفروضے کے برعکس جو شواہد ملے یا تو انہیں نظر انداز کر دیا گیا اور یا پاکستانی قوم سے چھپا لیا گیا۔ جنوری 1966ء میں جب فیلڈ مارشل ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی تاشقند میں ملاقات ہوئی تو دونوں اس امر پر متفق ہو گئے کہ حالیہ جنگ کے دوران پاکستان اور بھارت نے ایک دوسرے کے جن علاقوں پر قبضہ کیا وہ خالی کر دیئے جائیں گے۔ پاکستانی عوام کو باور کرایا گیا تھا کہ جنگ میں ان کا ملک فتحیاب رہا۔ پاکستانیوں کے لئے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ ایک "واضح زمینی حقیقت" کی موجودگی میں وہ ناپسندیدہ سمجھوتہ پاکستان پر کیوں مسلط کیا گیا۔ معاہدہ تاشقند میں پاکستان کے اس مطالبے کا تذکرہ بھی موجود نہ تھا کہ کشمیر میں رائے شماری کرائی جائے۔ لوگ حیران تھے کہ پاکستان نے اپنی "عسکری فتح" سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟ فتح کے عوض اسے کچھ علاقہ ہی مل جاتا یا کم از کم بھارت سے مستقبل میں کسی پسندیدہ سمجھوتے کا وعدہ ہی لے لیا جاتا۔ ایوب خان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کابینہ سے مستعفیٰ ہو گئے۔ وہ ایسے ناقدین کے راہبر و راہنما بن گئے جن کے خیال میں تاشقند میں "سیاسی پسپائی" نے فوجی فتح کو شکست میں بدل دیا تھا۔ اپنی حکومت کے خلاف کئی ماہ پر محیط متشدد احتجاجی مظاہروں کے بعد مارچ 1069 میں ایوب خان نے عہدہ صدارت سے استعفیٰ دیدیا۔ ایوب خان کے اپنے بنائے ہوئے 1962ء کے آئین کے مطابق ان کے مستعفی ہو جانے کے بعد صدارتی اختیارات قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل ہونا تھے جو ایک بنگالی تھا۔ لیکن انہوں نے ملک کو دوبارہ مارشل لاء کے حوالے کر دیا۔ اس طرح آرمی چیف جنرل محمد یحییٰ خان صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے اور کسی آئین کے بغیر محض فرامین کے ذریعے ملکی نظم و نسق چلانے لگے۔

نظریاتی سرحدوں کا دفاع

جنرل یحیٰی خان کی سربراہی میں پاکستان کی دوسری فوجی حکومت نے نسبتاً کم عمر پائی۔ (1971-1969) لیکن اس نے ملک پر طویل المیعاد اثرات مرتب کیے۔ پاکستان کی حکمران اشرافیہ کی اب واحد مصروفیت یہ رہ گئی تھی کہ سیاسی جماعتوں کی طرف سے اپنے تسلط کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرتی رہے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ (وہ عوامی لیگ جس کے بانی حسین شہید سہروردی تھے جو اس سے قبل پاکستان کو ایک سیکولر قومی ریاست بنانے کا واضح تصور پیش کر چکے تھے) نے ان ثقافتی اور اقتصادی زیادتیوں کا حساب مانگنا شروع کر دیا جو مرکزی حکومت نے بنگالی اکثریت کے ساتھ کی تھیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں زیادہ خود مختاری دی جائے۔ عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے 6 نکاتی پروگرام کی مہم چلائی۔ جن پر عملدرآمد کی صورت میں پاکستان دو صوبوں پر مشتمل ایک "ڈھیلے ڈھالے وفاق حلفی" کی شکل اختیار کر لیتا۔ شیخ مجیب الرحمٰن مضبوط مرکز کی حامل ریاست کے حق میں نہیں تھے۔ نہ ہی وہ ملک پر ایسی فوج کا تسلط چاہتے تھے جس میں پنجابیوں کی اکثریت ہو۔ بنگالیوں کی یہ خواہش بھی تھی کہ بھارت کے ساتھ تعلقات میں کشیدگی کی مقدار اور دفاعی اخراجات میں کمی کو ممکن بنایا جائے۔ بنگالیوں کے تفکرات کا ادراک کرنے کی بجائے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے عوامی لیگ پر الزام عائد کر دیا کہ اسے بھارت نے پاکستان کو نقصان سے دوچار کرنے پر مامور کیا ہے اور وہ ملک توڑنا چاہتی ہے۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں پاکستان پیپلز پارٹی نے اقتصادی اصلاحات کے نفاذ اور بھارت کے خلاف چین کی طرف زیادہ جھکاؤ کا مطالبہ کر دیا۔ دونوں جماعتوں نے پاکستان کے نظریاتی تصور کو نظرانداز کر دیا اور آزادی کے بعد سے قومی بقاء کے لئے جس حکمت عملی کو پروان چڑھایا جارہا تھا دونوں اس کے لئے خطرہ محسوس ہونے لگیں۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد جلد ہی یحیٰی خان نے پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی محافظ اور نگہبان کے طور پر فوج کا کردار بڑھا دیا۔ "نظریاتی سرحدوں" کا تصور ابتداء ہی سے ذہن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ یحیٰی خان نے بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ لیکن در پردہ لسانی سیاسی جماعتوں اور بائیں بازو کے

اثرات کو کم کرنے اور مذہبی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے رہے۔ جس قانون کے تحت انتخابات منعقد کرائے گئے ۔ اس کے مطابق پاکستان کے متوقع آئین میں اسلامی نظریے کو بنیادی کردار ادا کرنا تھا۔ خارجہ امور میں یحیٰی خان نے بطور صدر امریکہ رچرڈ نکسن کے انتخاب سے فائدہ اٹھایا۔ نکسن کو پاکستان " آئزن ہاور ڈلاس دور " کے امریکی اتحادی کے طور پر یاد تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ یحیٰی خان امریکہ اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کی تجدید نے پاکستانی حکمرانوں کو باور کرادیا کہ انہوں نے اسلام۔ بھارت دشمنی اور غیر ملکی (خصوصاً امریکی) اقتصادی اور عسکری تعاون کی بنیاد پر ملکی تعمیر کی جو حکمت عملی تشکیل دی تھی وہ ابھی تک قابل عمل ہے اور امریکہ بھی اسے چیلنج نہیں کرے گا۔

اگرچہ ایوب خان کے عشرہ اقتدار کے دوران فوج کی نگرانی میں محتاط رہ کر ان کی تعمیر کی گئی تھی ۔ تاہم جب ایوب دور یحیٰی دور میں بدلا تو سویلین اداروں پر فوج کا عدم اعتماد کھل کر سامنے آگیا۔ ایوب حکومت کے آخری چند مہینوں کے دوران ملک کے دونوں حصوں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں حجم کے اعتبار سے بڑے تشدد آمیز احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مظاہرین نے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پر شدید اعتراضات کئے ۔ بنگالی ملکی "پاور سٹرکچر" میں اپنے جائز حصے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان مختلف النوع اور غیر متجانس گروہوں میں واحد قدر مشترک یہ تھی کہ سب جمہوریت کی نسبتاً زیادہ ضرورت پر متفق تھے۔

ایوب خان کے بس میں تھا کہ وہ مستعفی ہو جانے کے بعد آئین کے مطابق اقتدار منتقل کر دیتے ۔ اس طرح صدر اور قومی اسمبلی کے تازہ انتخابات کی راہ ہموار ہو جاتی۔ ممکن ہے آزادانہ انتخابات کے نتیجے میں تشکیل پانے والی مقننہ ایوب خان کے نافذ کردہ بالواسطہ انتخابات کے طریقے کو منسوخ اور نا قابل عمل قرار دے دیتی ۔ سیاستدان واضح طور پر صدارتی نظام کی جگہ پارلیمانی طرز حکومت چاہتے تھے۔ ایوب خان اور فوج کے لئے فکرمندی کا سب سے بڑا باعث وہ علاقائی جماعتیں بن گئیں جو زیادہ صوبائی خودمختاری کی طالب تھیں۔ جرنیلوں نے علاقائی خودمختاری اور گروہی ولسانی شناخت مانگنے والوں کو " بھارت نواز " قرار دے دیا۔ انہیں فکر لاحق ہوگئی کہ علاقائیت کا راگ الاپنے والے مرکزی حاکمیت کو کمزور کر دیں گے اور ایک اسلامی پاکستان کے تصور کو گہنا دیں گے۔

ایک عشرے تک یہ دعویٰ کرنے کے بعد کہ پاکستانیوں کے میلانات کے مطابق نظام دیا جا چکا ہے۔ جرنیل حضرات نے ایک براہ راست فوجی مداخلت کی ضرورت محسوس کی۔ 24 مارچ 1969ء کو ایوب خان نے آرمی چیف جنرل یحیٰی خان کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں آخر الذکر سے مارشل لاء کے نفاذ کی رسمی درخواست کی گئی۔ ایوب خان نے اس خط میں لکھا کہ فوج کا کام صرف غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا ہی نہیں۔ ملکی سطح پر انتشار اور افراتفری پر قابو پانا بھی اسی کی قانونی اور آئینی ذمہ داری ہے۔ ایک جرنیل سے اقتدار کی دوسرے جرنیل کو منتقلی نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ سیاسی

معاملات میں حتمی رائے فوج کی ہوتی ہے۔ مزید براں فوج کو ماورائے آئین اختیارات حاصل ہیں۔ ہربرٹ فیلڈ مین لکھتا ہے کہ اقتدار کی منتقلی کے انداز نے سویلین باشندوں کو یہ رائے اپنانے پر مجبور کر دیا کہ جنرل ہیڈ کوارٹر کے سینئر افسران جب بھی محسوس کریں کہ ملکی نظام ان کی رائے اور ذوق کے مطابق نہیں چل رہا تو مسلح افواج (درحقیقت صرف بری فوج) یا تو اقتدار خود سنبھال لیتی ہیں اور یا پھر نظام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی تدبیر کر لیتی ہیں۔ "اکانومسٹ" نے ایوب خان کی رخصتی اور یحییٰ خان کی آمد پر جو اداریہ لکھا اس کا عنوان تھا۔ "ایک خان گیا۔ دوسرا خان آ گیا"۔

یحییٰ خان نے ایوب خان کی طرح خود کو سیاسی مصلح کے طور پر پیش نہیں کیا۔ نہ وہ ایک نئے آئین کے مصنف بنے۔ انہوں نے علانیہ بتا دیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ انتخابات میں تمام سیاسی جماعتیں حصہ لے سکیں گی۔ عوامی سطح پر یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ وہ سیاست دانوں سے پاکستان کی سلامتی کے تحفظ اور اسلامی وقار کو برقرار رکھنے کی امید رکھتے ہیں اور وہ اقتدار سویلین نمائندوں کو منتقل کرنے کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ تاہم سینئر کمانڈروں نے نجی محفلوں میں تسلیم کیا کہ وہ "اس کوشش میں تھے کہ ایک منقسم آئین ساز اسمبلی معرض وجود میں آئے تاکہ آئین کی تشکیل ناممکن ہو جائے"۔ فوج عوام کو باور کرانا چاہتی تھی کہ سیاستدان متفق اور متحد ہو کر کام نہیں کر سکتے۔ تاکہ فوجی حکومت کے تسلسل کو جواز مل جائے۔

یحییٰ خان نے میڈیا اور سیاسی جماعتوں کو نسبتاً زیادہ آزادی دی۔ لیکن ان کی انتخابی سکیم سے جھلکتا تھا کہ وہ فوج کو اقتدار اور سیاست سے الگ کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ سینئر فوجی کمانڈر ایوب خان کے خلاف ان عوامی جذبات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے جن کا اظہار سڑکوں پر اور گلیوں میں ہونے والے مظاہروں کے دوران کئی ماہ کیا جاتا رہا۔ دیگر ذرائع سے فوج کی برتری اور تسلط کو برقرار رکھنے کا منصوبہ جنرل شیر علی خان نے تیار کیا جو متحدہ ہندوستان میں پٹودیوں کے شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں بطور سفیر ملائشیا میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ یحییٰ خان نے اپنے مارشل لاء کے دور میں انہیں واپس بلا کر اطلاعات اور قومی امور کی وزارت کا قلمدان سونپ دیا۔ اس دور کے سیکرٹری اطلاعات اور سینئر سول بیوروکریٹ روئیداد خان رقمطراز ہیں:-

شیر علی خان کی سوچ کا مرکزی تصور یہ تھا کہ ایوب خان کی رخصتی کے بعد فوج نے سیاستدانوں سے اقتدار چھیننے کا جو اقدام کیا اس کی وجہ فوج کی "فائر پاور" نہیں تھی۔ انہوں نے یحییٰ خان کو لکھا "اگر ہم نواب پور روڈ (ڈھاکہ کی بڑی سڑک) کے راستے شہر سے (بچکر) نکلنا چاہیں تو ہمیں جتنی بھی قوت دستیاب ہو محض فائر پاور کے بل بوتے پر وہاں سے نہیں نکل سکتے"۔

جس قوت کو بروئے کار لا کر فوج نے مارچ 1969ء میں نااہل سیاستدانوں سے فوقیت کا امتیاز چھینا۔ وہ فوج کی ذاتی کشش اور کرشمہ زائی میں مضمر تھی۔ یہ ایک ایسا قیمتی سیاسی اثاثہ ہے جو ایک مرتبہ کھو جائے تو انتہائی مشکل سے واپس ملتا

ہے۔اس کشش یا کرشمہ زائی کا وجود اس لئے برقرار تھا کہ عوام کا فوج کے ساتھ براہ راست کوئی رابطہ نہیں تھا۔ان کے نزدیک فوج ایک پراسرار تشخص کی حامل ایسی جادوئی قوت تھی کہ جب دیگر تمام ذرائع بے نتیجہ اور ناکام ہو جائیں تو فوج ان کی نجات دہندہ ثابت ہوسکتی تھی۔ بیوروکریسی اور سیاستدانوں کا عوام کے ساتھ روزمرہ بنیادوں پر رابطہ رہتا تھا۔ وہ انہیں بدعنوان اور بے انصاف سمجھتے تھے۔لیکن فوج کے بارے میں عوامی ذہن یہ تھا کہ وہ پاکستان اور پاکستان کی فلاح کی حتمی اور قطعی ضامن تھی۔

شیر علی خان بڑے پرزور انداز میں کہتے ہیں کہ فوج کے بارے میں یہ کرشماتی تاثر اور تصور جھوٹے مفروضوں پر مبنی تھا۔لہذا اس کے " کمزور اور بھربھرا" ہونے پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔اصل وجہ یہ تھی کہ فوج کے ساتھ عامتہ الناس کا براہ راست واسطہ اور رابطہ نہیں رہتا ورنہ خدا نے فوجیوں کو بھی اسی مٹی سے تخلیق فرمایا جس سے عام آدمیوں کو بنایا۔فوج کے ساتھ براہ راست رابطہ لوگوں کو مایوس کر دیتا اور ان کے خوبصورت تصورات بکھر جاتے۔تاہم حسین تصورات کے اس قیمتی اثاثے کو بحرانی ایام کے لئے بچا کر رکھا جاسکتا تھا۔

شیر علی کی حکمت عملی کی یہ منطق ہرگز نہ تھی کہ فوج کو اقتدار سے دست بردار ہو جانا چاہئے بلکہ یہ ریاستی اور قومی معاملات میں فوج کے اختیارات کے تسلسل اور تحفظ کے لئے ایک (مجرب) نسخہ تھا۔شیر علی کا یہ فارمولہ صرف امراء شاہی کے مفادات کی حفاظت کرسکتا تھا۔اس پر عملدرآمد کے لئے ایک تو شدید منقسم پارلیمنٹ ضروری تھی دوسرے ایک دوسری سے لڑتی جھگڑتی سیاسی جماعتیں درکار تھیں تاکہ فوج ریفری کا کردار سنبھال سکے۔فوجی کوششوں کا معتدبہ حصہ کمزور سیاسی جماعتوں کے لئے مختص کر دیا گیا تاکہ وہ (بظاہر) اچھی اور بڑی نظر آئیں۔

"شیر علی فارمولہ" کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ سیاسی عمل کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لئے پس پردہ کاوشیں کی جائیں۔سیاسی اعتبار سے متحارب فریقین کی تعداد بڑھائی جائے۔علاوہ ازیں چند طبقوں یا گروہوں کو محب وطن اور باقیماندہ کو غیر محب وطن قرار دے دیا جائے۔ برسر اقتدار طبقے کی سیاسی حکمت عملی تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ پہلا حصہ نیشنل سیکیورٹی کونسل پر مشتمل تھا جس کے سربراہ میجر جنرل غلام عمر تھے۔کونسل نے ایک کام تو یہ کیا کہ وقفے وقفے سے بڑی سیاسی جماعتوں کا وزن کرتی رہی کہ کتنے پانی میں تھیں۔دوسرے اس نے وسائل کا رخ مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں اور مذہبی جماعتوں کی طرف موڑ دیا۔تیسرے کونسل نے ریاستی پالیسیوں کے لئے ایسی سفارشات مرتب کیں جو نظریہ پاکستان سے وابستہ جماعتوں کے لئے مفید ثابت ہوسکتی تھیں۔مذکورہ بالا سیاسی حکمت عملی کا دوسرا حصہ انٹیلی جنس سروسز تھیں۔فوج کی انٹر سروسز انٹیلی جنس اور سویلین انٹیلی جنس بیورو نام کے دونوں ادارے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی اور علاقائی جماعتوں کی نگرانی بھی کرتے رہے اور ان کے اندر دراندازبھی بھیجتے رہے۔ان کے خلاف ڈس انفارمیشن پھیلائی گئی۔ان کے غیر اسلامی اور غیر ملکی نظریات سے متاثر ہو کر متشکل ہونے والے عقائد پر مذہبی گروہوں کی طرف سے حملوں

کا اہتمام کیا گیا۔ حکومتی حکمت عملی کا تیسرا جزو وزارت اطلاعات تھی۔ اس وزارت نے اسلام کا بھوت تخلیق کرنے اور یہ باور کرانے کے لئے باقاعدہ پروپیگنڈہ مہم چلائی کہ "اسلام خطرے میں ہے" اس نے ملک کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ اسلام پسندوں پر مشتمل تھا اور دوسرے میں کمیونسٹ، سوشلسٹ اور سیکولر عناصر شامل تھے۔

اگرچہ اس کا اصل ہدف سویلین عوام ہی تھے۔ تاہم یحیٰی دور میں نظریاتی آموزش نے فوج پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس آموزش کا دورانیہ تین سال تھا۔ اس دور میں فوج کے "تعلقات عامہ" کے شعبے کے سربراہ بریگیڈیئر اے آر صدیقی کے خیال میں سیاسی و نظریاتی امیج نے فوج کے پیشہ وارانہ امیج کی جگہ لے لی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"فوج کی ہائی کمان میں بھی "نظریہ پاکستان" اور "اسلام کی شان و شوکت" یا "اسلام کا تزک و احتشام" جیسی اصطلاحات کا استعمال روز بروز بڑھ رہا تھا۔ "یوم دفاع" کے موقع پر صدر اور تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کے درمیان پیغامات سے بھی نظریاتی مفہوم ہی جھلکتا تھا۔ ان کی باہمی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ فوجی نہیں بلکہ جدید قسم کے مذہبی پیشوا یا مبلغ تھے جو اپنے آدمیوں کو ملکی سلامتی، یک جہتی، اتحاد اور نظریے کے تحفظ کو یقینی بنانے کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ عزم صمیم۔ جرأت اور اسلام کی بہترین روایات کے مطابق بے مثل نظریات کے حاملین کی تعریف و توصیف کرتے تھے۔ جنرل شیر علی نظریاتی جھکاؤ اور رجحان کے راستے پر حکومت کو اس مقام تک لے گئے جہاں سے واپسی ممکن نہ رہی۔ انہوں نے کسی روحانی پیشوا کی طرح نظریہ اسلام کی جگہ جگہ تبلیغ کی۔ حتیٰ کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے ذاتی تعلق کا ذکر بھی کرتے تھے۔ وہ مزاحیہ انداز میں کہتے تھے کہ "دن میں پانچ مرتبہ کسی کی معاونت۔ توسط یا مدد کے بغیر ان کا خدا سے "ڈائریکٹ لائن" پر رابطہ ہو جاتا تھا۔ شیر علی خود کو ایک نظریاتی انسان کہا کرتے تھے اور یقیناً یحیٰی خان خود بھی شیر علی خان کے نظریاتی تعلقات عامہ کو پسند اور ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے"۔

اس دور میں یحیٰی خان اور شیر علی جیسے زیادہ تر سینئر فوجی افسران برطانویوں کے تربیت یافتہ تھے اور مذہبی شعائر کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ ان میں سے جو حکومت کی خفیہ سیاسی حکمت عملی سے آگاہ نہیں تھے انہوں نے اس متعصبانہ نظریاتی جھکاؤ کو غیر جانبداری کے حکومتی وعدوں کی نفی خیال کیا۔ کچھ کا خیال تھا کہ وزیر اطلاعات اپنے ذاتی عقائد کے اسیر ہیں۔ جب یحیٰی خان کو ان افسران کے خیالات سے آگاہ کیا گیا تو بقول صدیقی، صدر نے وضاحتاً کہا کہ وہ حکومت کی پالیسی تھی:-

صدر کا خیال تھا کہ اگر شیر علی محض اسلامی نظریے کو وسعت اور فروغ دینے کی کوشش کر رہے تھے تو ان کا یہ فعل کاملاً باجواز تھا۔ کیونکہ اسلام کی تبلیغ کوئی جرم نہیں تھا۔ کیا یہ ہر مسلمان بالخصوص اس مسلمان کا فرض نہیں جو بااختیار بھی ہو؟ یحیٰی خان نے تسلیم کیا کہ ان کی حکومت غیر جانبدار بھی تھی اور عبوری بھی۔ لیکن یہ چیز انہیں یا ان کے کسی سینئر وزیر کو اسلام کی تبلیغ سے تو نہیں روک سکتی تھی۔ جہاں تک پاکستان کی سالمیت اور اسلام کی شان و شوکت کا تعلق تھا وہ غیر جانبدار ہرگز نہیں تھے۔

یحییٰ خان نے بڑی کامیابی سے اپنے اس وثوق کی وضاحت کی کہ اگر قومی نظریے کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی ہے تو اس کا کسی کی ذاتی پارسائی اور پرہیزگاری یا ان اوصاف کے فقدان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو قومی سالمیت کی حکمت عملی تھی جسے فوج نے ایک ادارے کے طور پر اپنا رکھا تھا۔ یحییٰ خان سمجھتے تھے کہ جب فوج نے اسلامی نظریے کو اپنا لیا تو پاکستان پر اسکے حق حکمرانی کو جواز مل گیا۔ یحییٰ خان کے ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا۔ یہ لوگ ملک کی سیاسی زندگی میں فوج کی افضلیت کے تسلسل کی کلید تھے۔ کسی بھی مذہبی نظریے پر اصرار کی اہمیت وحیثیت محض علامتی نہیں تھی۔

دوسری مرتبہ مارشل لاء کے نفاذ (جو مارشل لاء یحییٰ خان نے نافذ کیا) کے بعد جلد ہی نمایاں طور پر جہل اور ضلالت پر مبنی رجحان کا آغاز ہو گیا۔ یہ اسلام پر غیر ضروری اور غیر تعمیراتی انحصار کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد چند ماہ تو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے لوگوں کے پاس اسلام کے سوا کوئی موضوع بحث ہی نہیں تھا۔ جولائی 1969 میں مارشل لاء کا ضابطہ نمبر 51 منظر عام پر آیا جس کے مطابق اسلام کے خلاف نفرت انگیز کتاب یا پمفلٹ وغیرہ شائع کرنا یا ایسا مواد اپنے قبضے میں رکھنا جرم قرار دے دیا گیا اور اس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات سال قید بامشقت مقرر کی گئی۔ اس امر پر غور نہیں کیا گیا کہ کسی مواد کے اسلام کے خلاف نفرت انگیز ہونے یا نہ ہونیکا یقین کس طرح کیا جائے؟ مثلاً شیعوں کے خیالات وعقائد نفرت انگیز ہیں یا قابل برداشت؟ یا قادیانیوں کے عقیدے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ مزید براں توہین مذہب اور عقیدے کے اعتبار سے حساس معاملات کے خلاف نفرت انگیز سرگرمیوں پر پہلے ہی کثرت سے قانون سازی کی جا چکی تھی۔ بھارت میں شائع ہونے والی تمام کتابوں اور اخبارات کی درآمد ممنوع قرار دے دی گئی اور 12 جولائی کو اسلام پر ڈاکٹر فضل الرحمن کی کتاب پر بھی پابندی عائد کر دی گئی جس میں انہوں نے مذہبی کتابوں کی جدید توجیہات کی وکالت کی تھی۔ مغربی پاکستان میں علمی آزادی پر ایک سمپوزیم ہوا جس میں اتفاق رائے سے طے پایا کہ اس قسم کی آزادی ضرور دی جای چاہئے بشرطیکہ وہ نظریہ پاکستان سے متصادم نہ ہو۔ اس نوعیت کے اعلانات یا فیصلوں میں حقیقت پسندی کے مایوس کن فقدان اور ان میں مضمر خطرات پر تبصرہ ضروری نہیں"۔

مذہبی منافرت پھیلانے والے اشاعتی مواد کی بندش کی آڑ میں فوجی حکمرانوں نے سنسر شپ کا اختیار حاصل کر لیا۔ علمی سوچ کی آزادی حد درجہ محدود کر دی گئی۔ نتیجتاً کالجوں، یونیورسٹیوں اور میڈیا میں موجود صاحب علم حضرات چوکس ہو گئے۔ اہم تر پیش رفت یہ ہوئی کہ حکومت نے ایک پنڈورا بکس کھول دیا کہ "اسلامی" کیا ہے اور "غیر اسلامی" کیا ہے؟۔ ضیاء کے فوجی دور حکمرانی میں مذکورہ مباحث شدت اختیار کر گئے اور ان پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگا۔

یحییٰ خان کے دور میں سیاسی قوتوں کو منقسم کرنے کے منصوبے پر بھی عملدرآمد جاری رہا اور یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ عام انتخابات اکتوبر 1970 میں ہونگے جو بعد میں دسمبر 1970ء تک کے لئے ملتوی کر دیئے گئے۔ اس طرح جنوری میں شروع ہونے والی انتخابی مہم پورا ایک سال جاری رہی۔ حکومت کا منصوبہ یہ تھا کہ دیانت داری سے ہی ووٹ ڈالے جائیں

اوران کی گنتی بھی دیانتدارانہ ہو۔" انتخابی نتائج پر حکومتی اثرات کے لئے انتخابات میں دھاندلی کو بطور توسط نہیں اپنایا گیا بلکہ انتخابات پر منتج ہونے والے عمل کو حکومت نے اپنی مرضی ومنشا کے مطابق ڈھالا"۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لئے انتخابی امیدواروں کو بھاری رقوم ادا کی گئیں لیکن مارشل لاء کے ایک حکم کے تحت حکومت نے ایوب خان کے مسلم لیگی دھڑے کے فنڈز اپنی صوابدید پر لے لئے۔ انٹیلی جنس بیورو نے بھی اسلام پسند جماعتوں اور امیدواروں کے انتخابی اخراجات کے لئے صنعتکاروں اور تاجروں سے روپیہ حاصل کیا۔ 1969 کے اختتام پر جماعت اسلامی نے نظریہ پاکستان کے تحفظ کی شدید مہم چلائی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ پاکستان کو بے دین اشتراکیوں اور سیکولر عناصر کی طرف سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ آئی بی نے مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے علماء کو آمادہ کیا کہ وہ ایک ایسے مشترکہ فتوے پر دستخط کردیں جس میں سوشلزم اور سیکولرزم کو کفر قرار دیا گیا ہو۔ نتیجتاً مذہبی بنیاد پرستی اور جدیدیت کے درمیان ایک کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ اس جدوجہد کے بڑے اہداف عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی تھے۔ اول الذکر کا دعویٰ تھا کہ وہ سیکولر جماعت ہے جبکہ آخرالذکر سے منسلک لوگ اسلامی سوشلزم کا پرچار کررہے تھے۔

یکم جنوری 1970ء کو انتخابی مہم کا سرکاری سطح پر آغاز کیا گیا۔ اس وقت اسلام اور اشتراکیت کے درمیان جنگ پورے عروج پر تھی۔ یونیورسٹیوں اور ٹریڈ یونینوں کی سطح پر اسلام پسندوں نے اپنے سیکولر حریفوں کے ساتھ رضا کارانہ طور پر متشدد تصادم کا آغاز کردیا۔ اپریل مئی میں صحافیوں نے جو ہڑتال کی جنرل شیر علی خان نے ریاست اور میڈیا کو بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں اور سیکولر عناصر سے پاک کرنے کے لئے اسے عذر کے طور پر استعمال کیا جو آخرالذکر مکاتب فکر کی نجی ملکیت تھا۔ جنہیں نکالا گیا ان کی جگہ جماعت اسلامی کے وابستگان سے پر کی گئی تا کہ اسلام پسندوں کے پروپیگنڈہ کو فروغ دیا جاسکے۔

اسلام کی جو توجیہہ جماعت اسلامی کرتی تھی۔ اس سے اختلاف رکھنے والے مذہبی راہنماؤں نے اپنی جماعتیں تشکیل دے لیں۔ اس طرح "جمعیت علمائے پاکستان" اور "جمعیت علمائے اسلام" معرض وجود میں آئیں۔ بطور سیاسی اداکار سیاسی سٹیج پر دونوں جماعتیں انتخابات کے انعقاد سے چند ماہ قبل نمودار ہوئیں۔ ان متبادل مذہبی جماعتوں کے قیام کی حوصلہ افزائی اس لئے بھی کی گئی کہ مذہبی سیاست کے رخ پر کنٹرول حاصل کیا جاسکے۔ جماعت اسلامی اس حد تک منظم اور نظریاتی جماعت تھی کہ وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرسکتی تھی۔ مطلب یہ کہ اپنے تشخص کے لئے اسے کسی بیرونی عنصر کی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ دیگر اسلامی گروہ جماعت اسلامی کی خواہشات اور اس کے عزائم پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اچھے مالی وسائل کے حامل اسلام پسندوں نے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے ساتھ تصادم کی راہ اختیار کر لی۔ میڈیا کوریج کے اعتبار سے وہ اسلام پسند اچھے خاصے طاقتور تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے مقبول اور ہردلعزیز راہ نما ذوالفقار علی بھٹو کا "غیر اسلامی لائف سٹائل" اسلام پسندوں کے حملوں کا مرکز بن گیا۔ وہ مخالفت میں بہت نیچے اتر آئے

اور الزام عائد کرنا شروع کر دیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی ماں ہندو تھی۔ عوامی لیگ پر الزام عائد کیا گیا کہ بنگالی ہندوؤں کے ساتھ اس کے روابط بہت قریبی تھے اور اسے بھارت سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ نظریاتی مباحث صرف فوجی بیوروکریسی اور قدامت پسند سویلین دانشوروں کی توجہ اپنی جانب کھینچ سکے۔ تاہم دیہی عوام کے لئے روٹی ہی سب سے بڑا مسئلہ رہا۔ روٹی کے اس مسئلے نے عوامی لیگ کو عسرت زدہ بنگالیوں کے ساتھ نسبتاً زیادہ اختیارات یا اقتدار میں نسبتاً زیادہ حصے کے وعدے وعید اور پاکستان پیپلز پارٹی کو دولت کی از سر نو تقسیم کا مطالبہ کرنے کے قابل بنا دیا۔ دونوں نے ان وعدوں اور مطالبات سے بے پناہ فائدہ اٹھایا۔

انٹیلی جنس سروسز اسلام پسند تنظیموں کے لئے آسانیاں پیدا کر رہی تھیں اور وزارت اطلاعات نے ان تنظیموں کی بطور امکانی فاتح تشہیر کا ذمہ لے رکھا تھا۔ انتخابات سے قبل پیش آنے والی اس الجھن کے دو حصے تھے۔ انٹیلی جنس سروسز ایک ہی قسم کی جماعتوں کے معاملات میں اس حد تک ملوث ہو گئیں کہ انہیں دوسرے فریق کی طاقت کا اندازہ ہی نہ رہا۔ ادھر اسلام پسند جماعتوں کو جب اپنی فتح کے زیادہ امکانات دکھائی دیئے تو ان کے اندر گروہی اور طبقاتی کش مکش بڑھ گئی۔ 31 مئی 1970ء کو متعدد اسلامی جماعتوں کی طرف سے "یوم شوکت اسلام" سے موسوم کرنا محض اتفاق نہیں تھا۔ یہ ان دو اصطلاحات میں سے ایک تھی جو یحییٰ خان سیاسی جماعتوں کے سامنے شرائط کے طور پر پیش کیا کرتے تھے۔ یعنی حق حکمرانی کی دعویدار بننے سے قبل ضروری تھا کہ وہ ان شرائط کو پورا کریں۔ دوسری اصطلاح "پاکستان کی سالمیت" تھی۔ اسلام پسندوں کا خیال تھا کہ اصلی اور سچے اسلام کے ساتھ وابستگی کا فطری نتیجہ "پاکستان کی سالمیت" کے تحفظ کی صورت میں برآمد ہوگا۔ "یوم شوکت اسلام" کے موقع پر ملک گیر سطح پر پُر ہجوم ریلیوں کا انعقاد دیکھ کر حکومت کو یقین ہو گیا کہ "اسلام" اور "غیر اسلام" کے درمیان تقسیم اور کھنچاؤ سیکولر اور علاقائی جماعتوں کے اثرات کو محدود کر دے گا اور انہیں ایک سر بریدہ پارلیمنٹ میں مناسب نمائندگی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح ایک مصنوعی سی جمہوریت نظر آتی رہے گی۔ جس دن یوم شوکت اسلام کے سلسلے میں پر ہجوم ریلیاں منعقد ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں آئی ایس آئی کے دفتر کی طرف سے صدر دفتر کو ایک مراسلہ موصول ہوا جس میں درج تھا کہ وہ ریلیاں نظریہ اسلام اور نظریہ پاکستان کے ساتھ مسلمانوں کی گہری وابستگی کا واضح ثبوت تھیں۔

فوج نے مختلف سیاسی جماعتوں کی قوت کا جو اندازہ قائم کیا تھا۔ انتخابی مہم کے دوران اس میں چند تبدیلیاں آئیں۔ تاہم کسی مرحلے پر یہ توقع نہیں کی گئی کہ کوئی ایک پارٹی واضح فتح حاصل کر لے گی۔ یحییٰ دور میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کے سربراہ میجر جنرل غلام عمر جب فوج سے ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ انہوں نے ان کاوشوں کی وضاحت کی جو فوجی حکومت نے مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں کو ایک کرنے کے لئے کی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کاوشوں اور اسلام پسند جماعتوں کی حمایت کا باعث ہی یہ تھا کہ حکومتی تخمینوں کے مطابق ان کی کامیابی کے امکانات نسبتاً زیادہ روشن تھے۔

"نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ کوئی واحد جماعت قطعی اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی۔ جوں جوں انتخابی مہم آگے بڑھتی گئی واضح ہوتا چلا گیا کہ عوامی لیگ مشرقی اور پاکستان پیپلز پارٹی مغربی پاکستان تک محدود رہیں گی۔ ممکن ہے ملک کے دونوں حصوں میں باقیماندہ اکا دکا نشستیں جماعت اسلامی حاصل کر لے۔ تاہم ان نشستوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی۔ اندریں حالات مسلم لیگ کو واحد قومی جماعت سمجھا گیا جو ملک کے دونوں حصوں میں قابل ذکر تعداد میں نشستیں حاصل کر لے گی۔ بشرطیکہ اس کے تینوں دھڑے متحد ہو جائیں۔ اگرچہ ابھی تک اسے ملک کی سب سے بڑی جماعت نہیں کہا جا سکتا تاہم اس کی موجودگی (سیاسی) ماحول کو مثبت بنانے میں ممد ثابت ہوگی"۔

انٹیلی جنس سروسز کا اندازہ تھا کہ "اگرچہ عوامی لیگ سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرے گی اور مرکزی سطح پر سب سے بڑی جماعت کے طور پر نمودار ہوگی۔ تاہم حکومت تشکیل دینے کے لئے اسے دوسری جماعتوں کا تعاون درکار ہوگا"۔ اس وقت آئی۔ ایس۔ آئی کے سربراہ میجر جنرل محمد اکبر تھے۔ انہوں نے پیش گوئی کی کہ انتخابات کے بعد سودے بازی کا موسم آئے گا۔ مستقبل کے سیاسی عمل کے لئے وہ "بندر بانٹ" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ پاکستان کی فوجی حکومت اور انٹیلی جنس سروسز قومی مزاج کا درست اندازہ نہ کر سکیں اور چند غیر ملکی مبصرین ان پر سبقت لے گئے۔ امریکی قونصل جنرل کی رپورٹ کے مطابق مشرقی پاکستان میں تعینات برطانیہ کے ڈپٹی ہائی کمشنر رائے فوکس نے 6 جون 1969ء کو پیشن گوئی کی تھی کہ شیخ مجیب الرحمان اور عوامی لیگ کسی بھی الیکشن میں "واضح اور غالب فاتح" رہیں گے۔

پاکستان میں امریکی سفیر جوزف فارلینڈ نے اپنے ماتحت اور میدان سیاست میں مصروف کارافسران کی مدد سے ہوا کے رخ کا درست اندازہ کر لیا تھا۔ 3 جولائی 1970 کو انہوں نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف جو تار بھیجا امریکی سفیر نے اس میں اپنا وہ اندازہ بالاختصار درج کیا جو انتخابی مہم کے دوران اور اس کی روشنی میں قائم کیا گیا تھا۔

"اس وقت انتخابات کی راہ میں کوئی قابل ذکر رکاوٹ نظر نہیں آ رہی۔ 5 اکتوبر (انتخابات کے لئے معین کردہ تاریخ) کے بعد کی تصویر روز بروز مبہم اور غیر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ اگر عوامی لیگ اور کونسل مسلم لیگ نے نیشنل عوامی پارٹی (جس کے سربراہ عبدالولی خان تھے) سے ممکنہ تعاون حاصل کرنے کے بعد آئین کے مطابق موثر مخلوط اتحاد قائم کر لیا اور وہ اتحاد یحییٰ خان اور فوج کے لئے قابل برداشت ہوا تو اس غیر متجانس اسلامی ریاست کے مستقبل کے بارے میں کوئی امید کی جا سکتی ہے۔ یہ "اگر" بہت بڑا ہے۔ لیکن ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس وقت کوئی بھی قابل قیاس متبادل ایک "متحدہ پاکستان کے تسلسل کے امکانات کو تیزی سے اور خوفناک حد تک کم کر دے گا"۔

فوج یہ سمجھ رہی تھی کہ انتخابات کے بعد بھی ملک کی باگ ڈور بدستور اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اس نے فرض کر رکھا تھا کہ ایک واحدی اور نظریاتی آئین کے تحت پاکستان کے اتحاد کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے لئے اس کی مداخلت بیک وقت

کافی بھی تھی اور ضروری بھی۔ پاکستانی جرنیلوں نے اس دور کی کئی یادداشتیں قلمبند کیں جن میں انہوں نے گہرے تاسف کا اظہار کیا کہ فوج انتخابی نتائج کی درست پیشین گوئی نہ کر سکی۔ جرنیلوں نے آج کے دن تک یہ تسلیم نہیں کیا کہ فوجی حکومت نے ان انتخابات کے نتائج پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر کے ایک غلطی کا ارتکاب کیا تھا جن کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ آزادانہ ہوں گے اور ایک آئین ساز اسمبلی کے آزادانہ انتخاب میں ممد ثابت ہوں گے۔ مشرقی پاکستان کی پاکستان سے علیحدگی کے بارے میں بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ بالغ رائے دہی کے بین الاقوامی نظام کے تحت آزادانہ اور شفاف انتخابات کا انعقاد ہی یحییٰ خان اور ان کے فوجی رفقاء کی اصل غلطی تھی۔

پاکستان کی فوجی قیادت نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ ملکی صورت حال کبھی اس کے کنٹرول سے باہر نہیں ہوگی۔ اس اعتماد کی جزوی وجہ یہ تھی کہ فوج کو معلوم تھا وہ اپنی مرضی ومنشا کے مطابق انتخابی نتائج حاصل کر سکتی تھی۔ زیادہ تر پاکستانی جرنیل مغربی پاکستان کے صوبہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے رہنے والے تھے۔ بعض کا تعلق اس اردو بولنے والی اقلیت سے تھا جو تقسیم کے بعد شمالی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئی تھی۔ وہ سب جنگ جونسلوں کے برطانوی تصور کی پیداوار تھے۔ اس تصور کے تحت برطانویوں نے جو فوجی ہندوستان سے بھرتی کیے ان کا تعلق چند مخصوص نسلی گروہوں سے تھا۔ انگریز بنگالیوں کو جنگ جونسل خیال نہیں کرتے تھے جس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پاکستانی فوج میں مشرقی پاکستان کی نمائندگی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ 1947ء میں پاکستان کی فوج میں صرف ایک فیصد بنگالی تھے۔ 1960ء کی دہائی تک یہ تناسب صرف 7 فیصد تک بڑھایا جا سکا۔ افسروں میں یہ تناسب 7 فیصد سے بھی کم تھا۔

اسی طرح پاکستان کی سول بیوروکریسی میں بھی بنگالی افسران کی تعداد مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔ 1966ء میں پاکستان کے سرکاری ملازمین کی کل تعداد ایک لاکھ 14 ہزار 203 تھی۔ ان میں سے صرف 27648 کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ اگرچہ ملکی زرمبادلہ کے حصول میں بڑا حصہ مشرقی پاکستان کا تھا۔ تاہم مرکز کی جانب سے کی جانے والی سرمایہ کاری میں اسے مغربی پاکستان کی نسبت کم حصہ ملتا تھا۔ 1969-1970ء میں مغربی پاکستان کی فی کس آمدنی مشرقی پاکستان سے 61 فیصد زیادہ تھی۔ مشرقی پاکستان مشتعل تھا لیکن نوآبادیاتی گھمنڈ اور تکبر کے حامل مغربی پاکستانی افسران ان جذبات کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ پاکستان کی حکومت میں بنگالی اکثریت کو قائدانہ کردار ادا کرنے کی اجازت دینے پر کوئی بھی رضامند نہیں تھا۔ ایک امریکی سفارت کار نے اس صورت حال کا ادراک کیا اور نومبر 1969ء میں اپنا مکتوب واشنگٹن بھجوایا جس میں اس نے لکھا۔ "انتہائی حساس اور باریک مشاہدہ احتجاج کی اس زیریں رو کی نشان دہی کرتا ہے جو مشرقی پاکستان میں دوڑ رہی ہے۔ بنگالیوں کے خیال میں جاگیرداروں، سول بیوروکریسی اور فوج پر مشتمل مغربی پاکستان کی اشرافیہ بنگالیوں کی برتری قبول کرنے کی بجائے پاکستان کو ٹوٹتا دیکھ سکتی ہے"۔

ایوب خان کے دور میں ایک نیا رجحان دیکھنے میں آیا۔ بنگالیوں کو مغربی پاکستانیوں سے حقیر اور کم تر سمجھا جانے لگا۔ بنیادی طور پر اس نسل پرستانہ رویے کا باعث ایک مہمل سی نظریاتی اختراع تھی۔ فوج اور اس کی انٹیلی جنس سروسز کے اذہان میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بنگالیوں کی اکثریت ہندوؤں کے بہت قریب تھی اور پاکستان کی جو آئیڈیالوجی انہوں نے تراشی تھی۔ اس کے ساتھ ان کی وفاداری کم تھی۔ ایوب خان اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کی آبادی کا معتد بہ حصہ مشرقی پاکستان کے جن بنگالیوں پر مشتمل ہے ان کا تعلق شاید ابتدائی ہندوستانی نسلوں سے ہے۔ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ تخلیق پاکستان سے قبل انہوں نے حقیقی آزادی یا اقتدار اعلیٰ کا ذائقہ تک نہیں چکھا تھا۔ بلکہ ان پر متوارث ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندو۔ مغل۔ پٹھان اور انگریز حکومت کرتے رہے۔ مزید براں ابھی تک ان پر ہندوؤں کے تہذیبی وثقافتی اور لسانی اثرات بہت گہرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر وہ احساس کمتری موجود ہے جو مظلوم و مجبور اور استبداد کا شکار نسلوں میں ہوتا ہے اور نو حاصل شدہ آزادی کے تقاضوں سے وہ خود کو ابھی تک نفسیاتی طور پر ہم آہنگ نہیں کر سکے"۔

پاکستان کے حکمرانوں نے ملک کو تھوڑا بہت متجانس اسلامی ملک بنانے کی جو کوششیں کیں وہ بنگالی عوام کو راس نہ آئیں۔ وہ مغربی پاکستان کے اندر پیدا ہونے والے اس رجحان پر سخت کبیدہ خاطر تھے کہ بنگالی ہندوؤں کے ساتھ ان کی تہذیبی وثقافتی وابستگی کو غیر اسلامی خیال کیا جاتا تھا۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کچھ مذہبی راہنماؤں نے بنگالی مسلمانوں کو " آلائشوں سے پاک " کرنے کی ضرورت کا اظہار بھی کیا۔ ریاستی مشینری نے اسلام پر مبنی تہذیبی وثقافتی یکسانیت کے نفاذ کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ پاکستان کے قومی معماروں نے مختلف علاقوں میں قیام پذیر مسلمانوں کے تہذیبی وثقافتی تفاوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بنگالیوں نے محسوس کیا کہ ان کے حقوق اور تہذیبی تشخص کو اسلامی نظریاتی وطن پسندی کے نام پر مٹایا اور کم کیا جارہا ہے۔ مزید براں بھارت کے ساتھ پاکستان کی چپقلش اور دفاع پر اٹھنے والے بھاری اخراجات مشرقی پاکستان کی معیشت کو زک پہنچا رہے تھے۔ بنگالی اہل دانش جنہوں نے 1947ء میں بڑے فعال انداز میں تخلیق پاکستان کی خواہش کی تھی۔ انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے ساتھ ان کی یگانگت زیادہ ہے۔

بنگالیوں کو جب فوجی بیورو کریسی کے پاور سٹرکچر سے نکال باہر کیا گیا تو سماجی و معاشی انصاف کے حصول کے لئے ان کے پاس جو واحد ذریعہ رہ گیا وہ سیاست تھا۔ تقسیم ہند کے بعد بنگال کے مقبول اور ہر دلعزیز سیاستدانوں کا عمومی رجحان سیکولرزم کی طرف تھا۔ انہیں اکثر اوقات مشرقی بنگال کے ہندوؤں کی حمایت حاصل رہی جو صوبے کی آبادی کا 20 فیصد تھے۔ جمہوری سیاست کے سیاق وسباق میں یہ چیز اہم تھی۔ تقسیم سے قبل مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کا طریق کار رائج رہتا تو تقسیم کے بعد مشرقی بنگال اپنی وہ برتری کھو بیٹھتا جو اسے ایک نئے ملک میں آبادی کی بنیاد پر حاصل تھی۔

آبادی کے اعتبار سے مشرقی پاکستان کی برتری ختم کرنے کے لئے آزادی کے بعد ابتدائی چند سالوں کے دوران مغربی پاکستان کے سیاستدان جداگانہ طرز انتخاب کو برقرار رکھنے کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پاکستان کے "پاور سٹرکچر" میں نسبتاً معقول اور منصفانہ حصہ حاصل کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے آزادی کے بعد اس راستے پر چلنا شروع کر دیا جو مغربی پاکستان کے "سول ملٹری اتحاد" کے پیدا کردہ نظریاتی مثالی نمونے کی راہ کی عین مخالف سمت میں جاتا تھا۔ رابرٹ جیکسن واضح کرتے ہیں کہ بنگالیوں کی فکری قوس مغربی پاکستانی حکمرانوں کی سوچ سے قطعی مختلف تھی۔

"اسلام کے ساتھ وابستگی کے ساتھ ساتھ بنگالی ثقافت سے وفاداری بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی تربیت پارلیمانی روایات اور قانون کی حکمرانی کے زیر اثر ہوئی تھی۔ ایک مشترکہ عقیدے کے سوا مشرقی بنگالیوں کے رویے اپنے مغربی پاکستانی ہم وطنوں سے یکسر مختلف تھے"۔

مغربی پاکستان کی اشرافیہ، بالخصوص فوج نے بنگالیوں کی سیاسی فعالیت کو دیکھتے ہوئے ان پر بھارت سے گٹھ جوڑ کے الزامات عائد کر دیے۔ تقریباً ہر بڑی بنگالی سیاسی شخصیت پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے کسی نہ کسی موقع پر بھارتی انٹیلی جنس سروسز کے ساتھ ملکر کام کیا۔ 1940ء میں جس قرارداد میں ایک علیحدہ ملک یعنی پاکستان کا موثر انداز میں مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے محرک اے کے ایم فضل الحق بھی اعتراضات کی بوچھاڑ سے نہ بچ سکے۔ عوامی لیگ کے بانی حسین شہید سہروردی کو ایوب خان کے حکم سے میدان سیاست سے باہر نکال دیا گیا۔ ایوب خان کی حکومت نے شیخ مجیب الرحمٰن پر بھی الزام عائد کیا کہ انہوں نے بذریعہ انقلاب مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کی سازش کی اور اس مقصد کے لئے انہیں اسلحہ اور روپیہ بھارت نے فراہم کیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر نام نہاد اگرتلہ سازش کیس قائم کر دیا گیا جس میں ان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے بھارت اور پاکستانی فوج میں بنگالی افسروں کے ساتھ ملکر بغاوت کی منصوبہ بندی کی ہے۔ ایوب حکومت کے آخری دنوں میں اپوزیشن کے احتجاجی مظاہروں کے نتیجے میں وہ کیس واپس لے لیا گیا۔ 1970ء میں ہونے والے عام انتخابات میں یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کو حصہ لینے کی اجازت اس مفروضے کی بناء پر دیدی کہ عوامی لیگ کی مقبولیت (یا دوسرے لفظوں میں بنگالی حقوق کے لئے مطالبے) کو اس اتحادی سیاست کے ذریعے محدود کر دیا جائے گا جسے فوج کنٹرول کر رہی تھی۔

انتخابی نتائج نے حکومت کی اس امید پر پانی پھیر دیا کہ ایک سر بریدہ پارلیمنٹ معرض وجود میں آئے گی۔ 7 دسمبر 1970ء کو جب ووٹوں کی گنتی ہوئی تو پتہ چلا کہ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں 72 فیصد سے زائد ووٹ حاصل کئے۔ قومی اسمبلی کی جن 300 نشستوں پر مقابلہ ہوا۔ ان میں سے 160 عوامی لیگ جیت گئی۔ خواتین کے لئے مخصوص کی جانے والی 7 نشستیں بھی عوامی لیگ نے بلا مقابلہ جیت لیں۔ اس طرح 313 ارکان پر مشتمل قومی اسمبلی میں 167 نشستیں اس کے ہاتھ آ گئیں۔ مشرقی پاکستان میں صرف دو نشستوں پر ایسے نمائندے منتخب ہوئے جو عوامی لیگ کے

رکن نہیں تھے۔ 17 دسمبر کو منعقد ہونے والے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں عوامی لیگ نے ڈالے جانے والے ووٹوں کا 89 فیصد اور صوبائی اسمبلی کی 300 میں سے 288 نشستیں جیت لیں۔ صوبائی انتخابات میں جماعت اسلامی صرف 3 فیصد ووٹ اور 2 نشستیں حاصل کر سکی۔ مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی 138 میں سے 81 نشستیں جیت لیں۔ جیتی ہوئی اکثر نشستوں کا تعلق سندھ اور پنجاب سے تھا۔ خواتین کے لئے مخصوص 4 نشستیں ملا کر یہ تعداد 85 ہوگئی۔ تاہم اس نے کل 38.99 فیصد ووٹ حاصل کئے۔ بلوچستان اور شمالی مغربی سرحدی صوبے کے زیادہ تر ووٹ پشتون وطن پرست نیشنل عوامی پارٹی اور کٹر مذہبی جماعت جمعیت العلمائے اسلام کے حصے میں آئے۔ آخرالذکر نے اپنا وزن اسلام پسندوں کی بجائے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اسلام پسند جماعتوں نے انتخابات میں ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مسلم لیگ کے تینوں دھڑوں نے ملکر 18 نشستیں حاصل کیں۔ جمعیت العلمائے پاکستان کو 7 نشستیں ملیں۔ جبکہ جماعت اسلامی کو صرف 4 نشستوں پر کامیاب قرار دیا گیا۔ اسلام پسند جماعتوں کو ملک گیر سطح پر صرف 10 فیصد ووٹ ملے۔

حکومت کی بھرپور کوشش تھی کہ انتخابات میں مسلم لیگ کے مختلف دھڑے اور مذہبی جماعتیں قابل رشک نتائج دیں اور نادانستگی میں یہ حکومتی کاوشیں ان جماعتوں کو ضرورت سے بہت زیادہ پر اعتماد کر گئیں۔ وہ ایسے اتحاد بنانے میں ناکام رہیں جن کے ذریعے ملکی سطح پر ان کے محدود ووٹوں کے باوجود نسبتاً زیادہ نشستیں حاصل کی جاسکتی تھیں۔ انتخابی سکیم کے معمار میجر جنرل شیر علی خان اسلام پسند جماعتوں کی ناقص کارکردگی پر سخت مایوس ہوئے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ یہ انتخابی نتائج پاکستان کے دولخت ہونے کی راہ ہموار کر سکتے ہیں لہذا انہیں منسوخ کر دیا جائے کیونکہ حکومت نے اپنی پس پردہ کاروائیوں کو عوام سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ لہذا پاکستان کی تاریخ کے پہلے آزادانہ اور شفاف انتخابات کے انعقاد پر یحییٰ خان پر تعریف وتوصیف کے ڈونگرے برسائے جارہے تھے۔ جہاں تک ملکی اور غیر ملکی رائے عامہ کا تعلق تھا۔ یحییٰ خان وہ وعدہ نبھا رہے تھے جو انہوں نے اقتدار پر قبضہ کرتے وقت کیا تھا۔ یحییٰ خان نے نے کہا تھا۔

"میری خواہشات صرف اس صورت حال کو متشکل کرنے تک محدود ہیں جس میں آئینی حکومت کا قیام عمل میں آجائے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہوشمندانہ اور تعمیری سیاسی زندگی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے نتیجے میں منتخب ہونے والے عوامی نمائندوں کو اقتدار کی ہموار منتقلی کے لئے ایک ایسی انتظامیہ ناگزیر ہے جو باصلاحیت ہو۔ اس کے ہاتھ بھی صاف ہوں اور اس کی دیانت داری بھی ہر قسم کے شک سے بالا ہو۔ ایک قابل عمل آئین اور ایسے تمام سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کا حتمی حل پیش کرنا منتخب نمائندوں کا کام ہے جو لوگوں کے لئے وجہ اضطراب بنے ہوئے ہیں"۔

اس مرحلے پر انتخابی نتائج کو منسوخ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ یحییٰ خان اور فوج باوقار انداز میں منظر سے ہٹ سکتے تھے۔ اس طرح سیاست کو اپنی راہ خود متعین کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن انہوں نے صورت حال کو اپنے موافق ڈھالنے کا عمل جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ایسے کسی بھی آئینی انصرام کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں جو مرکز کی کمزوری کا باعث بنتا یا ان کی نظریاتی پیش موافقت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا۔

اس وقت تک پاکستانیوں کی اکثریت یعنی بنگالیوں کی طرف سے حاصل ہونے والا مینڈیٹ واضح اور غیر مبہم ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مرکز کو راتوں رات بے اختیار کر دیا جائے اور رائج الوقت اقتصادی نظام پر اثر انگیز نظر ثانی کی جائے۔ ان دونوں میں سے کوئی اقدام بھی مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ "مثبت" انتخابی نتائج کی توقع پر یحییٰ خان نے اپنے ذہن میں ایک آئینی مسودہ تیار کر رکھا تھا۔ جس کے تحت صوبائی خودمختاری کے حجم میں تھوڑا بہت اضافہ تو ہوسکتا تھا۔ لیکن جس قدر صوبائی خودمختاری عوامی لیگ چاہتی تھی۔ وہ اضافہ اس کی حدود سے بہت فاصلے پر تھا۔ عوامی لیگ کو بنگالی عوام کی واضح پشت پناہی حاصل تھی۔ جہاں تک قومی وسائل کے معقول تر اور منصفانہ اختصاص کا تعلق تھا مغربی پاکستان کے معیشت دان اسے مغربی پاکستان کی معاشی ترقی کے لئے تباہ کن خیال کرتے تھے۔ پاکستان کے "منصوبہ بندی کمیشن" کے پنجابی ڈپٹی چیئرمین نے کہا۔ "مشرقی پاکستان کے لئے مختص کردہ رقوم کا حجم بڑھا کر مغربی پاکستان کی ترقی کو جامد نہیں کیا جاسکتا"۔ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے طاقت کے استعمال اور ملک کی تقسیم کا خطرہ مول لے لیا۔ انتخابات کے بعد جلد ہی ڈھاکہ کا دورہ کرنے والے ایک جرنیل نے اپنے ساتھی افسران سے کہا۔ "فکر مند نہ ہوں۔ ہم ان کالے حرامیوں کو ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہم پر حکومت کریں"۔ انتخابات سے 6 دن بعد "نیو یارک ٹائمز" میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا "انتخابات نے پنجابیوں کو ہلا کر رکھ دیا" (Vote Jolts Punjabis)۔ اس مضمون میں پنجابیوں کے ان جذبات کو بالاختصار بیان کیا گیا جو لاہور کی سڑکوں پر چلنے پھرنے والا ایک عام آدمی رکھتا تھا۔ "پنجاب ختم ہو چکا ہے اب ہم پر سندھ اور بنگال حکومت کریں گے"۔ عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن بنگالی تھے جبکہ پی پی پی کے راہنما ذوالفقار علی بھٹو کا تعلق سندھ سے تھا۔ اگرچہ آئین ساز اسمبلی کے انتخابی عمل کے دوران آئینی بندوبست کے مطالبے کو علیحدگی پسندی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم فوج کے خیال میں شیخ مجیب الرحمٰن ایک ایسے علیحدگی پسند تھے جنہیں بھارت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے انتخابات کے فوراً بعد اعلان کر دیا کہ نیا آئین تحریر کرتے وقت مغربی پاکستان کے خیالات اور موقف کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ لیکن نیا آئین بنیادی طور پر سیکولر اور وفاق حلفی کے تقاضوں اور عوامی لیگ کے منشور سے ہم آہنگ ہوگا۔ وہ منشور جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ مشرقی پاکستان کا نام بدل کر بنگلہ دیش رکھ دیا جائے گا۔ قومی انتخابات میں فتح یاب ہوکر عوامی لیگ نے اپنا استحقاق سمجھا کہ اب وہ پاکستان کے ساتھ مشرقی بنگال کے الحاق کی شرائط تبدیل کرسکتی ہے۔

علیحدگی کا مطالبہ عام طور پر اقلیت کی طرف سے اکثریت کے خلاف پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ متحدہ پاکستان میں بنگالیوں کی اکثریت تھی۔ امریکی خانہ جنگی کے دوران اور بعض دیگر ممالک میں علیحدگی پسندی کے خلاف طاقت استعمال کی گئی۔ پاکستانی جرنیلوں نے ان واقعات کو نظائر خیال کیا۔ لیکن مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کا معاملہ اپنی نوعیت کا واحد معاملہ تھا۔ جس کی کوئی نظیر دستیاب نہیں تھی۔ کیونکہ آزادانہ انتخابات کے نتیجے میں اکثریت حاصل کرنے والوں کو یہ حق نہیں دیا جارہا تھا کہ وہ ملکی آئین میں اپنی ترجیحات شامل کرسکیں۔ لہذا جب فوجی حکومت پر جمہوری خول چڑھانے کا حکومتی منصوبہ بکھر گیا تو فوج اور اس کی انٹیلی جنس سروسز کی بدستور افضل و برتر رہنے کی خواہش جنگ پر منتج ہوئی۔

یحیٰی خان کے بنگالی سینئر مشیر ڈاکٹر جی ڈبلیو چوہدری کے بقول انتخابات سے قبل شیخ مجیب الرحمان نے یحیٰی خان کو یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے مطالبات پر سختی سے قائم رہنے کی بجائے انہیں تبدیل کرلیں گے اور فوج توقع کرنے لگی کہ "کچھ دو کچھ لو" کی بنیاد پر معاملات طے پا جائیں گے۔ جب مذاکراتی عمل شروع ہوا تو فوج نے محسوس کیا کہ عوامی لیگ کے رویے میں اول الذکر کی خواہش کے مطابق لچک موجود نہیں۔ فروری 1971ء میں یحیٰی خان نے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کا شیڈول تاخیر سے دیا اور 3 مارچ کو مذکورہ اجلاس غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کردیا گیا۔ بظاہر یہ سب مغربی پاکستان سے منتخب ہونے والے بڑے راہنما ذوالفقار علی بھٹو کے مطالبے پر کیا جارہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے مطالبہ کردیا کہ وہ آئین کی مبادیات اور بنیادی اصولوں پر عوامی لیگ کے ساتھ معاہدہ کریں گے۔ اس کے بعد اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوں گے۔

ملک کے اندر ہونے والی خانہ جنگی اور پاکستان کے دولخت ہوجانے کے بعد ان حالات پر ملک گیر مباحث شروع ہوگئے جو منتخب اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد میں التوا یا تاخیر کا باعث بنے۔ فوج کے معذرت خواہوں اور بھٹو کے مخالفین نے بھٹو کو الزام دینا شروع کردیا کہ بنگال کی اکثریتی جماعت کے حق حکمرانی کو تسلیم نہ کرکے انہوں نے دراصل غیر جمہوری رویے کا اظہار کیا۔ بھٹو کے ساتھی اور بعض غیر جانبدار مبصرین اس سانحے کا ذمہ دار فوجی قیادت کو ٹھہراتے ہیں۔ زیادہ تر پاکستانی یہ رائے رکھتے ہیں کہ مغربی پاکستان کی اشرافیہ نے پاکستان پر بنگالیوں کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ نتیجتاً فوج اور بھٹو نے اپنے ذہن کے مطابق مغربی پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لئے مشترکہ اقدامات کیے۔

بعد ازاں جب انتہائی توہین آمیز انداز میں ملک ٹوٹا تو ہر دو فریقین نے ایک دوسرے کو الزام دینا شروع کردیا کہ اس توہین میں بڑا کردار "میں نے نہیں۔ تم نے ادا کیا"۔ پاکستان نے جن واقعات کو اپنی یادداشت میں محفوظ رکھا ان میں بھارت کے اس کردار کو نمایاں مقام حاصل ہے جو آخر الذکر نے بنگالیوں کی حمایت اور مدد کی صورت میں ادا کیا۔ اگرچہ یہ امر ہر شک وشبہ سے بالا ہے کہ بھارت نے بنگالی وطن پرستی کی حمایت کی اور جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو بنگالیوں

کو اسلحے کی فراہمی کی صورت میں ایک آزاد بنگلہ دیش کے قیام میں ممد ثابت ہوا۔ لیکن سابقہ مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی بنیادی طور پر پاکستان کے اندر کھیلے جانے والے اقتدار کے کھیل کا نتیجہ تھی۔

بھٹو اور مجیب ہی وہ دو راہنما تھے جنہوں نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے اور نو منتخب قومی اسمبلی میں سب سے زیادہ نشستیں جیتیں۔ تاہم فوج دونوں کو ناپسند کرتی تھی۔ انتخابات کے بعد ایسی فضاء پیدا ہو گئی کہ جرنیلوں کے لئے بری طرح ہار جانے والی اسلام پسند جماعتوں کے علاوہ بھی کسی کو گلے لگانا ضروری ہو گیا۔ مجیب نے پاکستان کو ایک سیکولر ملک بنانے کے ارادے کا اظہار کیا۔ اس کے برعکس بھٹو نے "اسلام۔ شوشلزم اور جمہوریت" کا نعرہ بلند کر دیا۔ بھٹو جب ایوب خان کے ماتحت وزیر خارجہ کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے تو انہوں نے بھارت کے ساتھ "ایک ہزار سال" جنگ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ متعدد جرنیلوں کے ساتھ انہوں نے سماجی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ بعض جرنیلوں نے مذہبی قدامت پسندی سے خوفزدہ ہو کر نجی حیثیت میں بھٹو کی مدد بھی کی۔ پیپلز پارٹی کے قیام کی ابتدائی دستاویزات میں بھارت کے خلاف جہاد کا حوالہ بھی دیا گیا۔ عوامی سطح پر جب پاکستان پیپلز پارٹی نے یہ تاثر دیا کہ وہ امریکہ کی مخالف ہے تو چند امریکہ نواز جرنیل مضطرب ہو گئے لیکن جرنیلوں کی نظر میں بھٹو کی حیثیت مشرقی بنگال کی عوامیت کے خلاف توازن گر کی ہی رہی اور امریکہ مخالف تاثر بھٹو کی اس حیثیت کے بوجھ تلے دب گیا۔ یحیٰی خان اور ان کے قریبی ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ بھٹو کو مجیب کے خلاف استعمال کیا جائے تا کہ اختیارات بدستور فوج ہی کو حاصل رہیں۔

عوام کے منتخب نمائندوں کو "فری ہینڈ" دینے کا جو وعدہ یحیٰی خان نے ابتداء میں کیا تھا۔ اس سے انکار کرتے ہوئے اپنے ذاتی آئین کو مسلط کرنے کے لیے جرنیلوں نے مجیب اور بھٹو دونوں کے خلاف اسلامی جماعتوں کو کھڑا کر دیا۔ مذہبی جذبات کو بھڑکانے کے عمل کا آغاز انتخابات کے بعد جلد ہی کر دیا گیا۔ جنوری میں سرکاری ذرائع ابلاغ نے "ترک فن محبت" (The Turk Art of Love) کے عنوان سے شائع ہونے والی ایک کتاب کو خوب اچھالا جس کا یہودی مصنف ایک بھارتی شہری تھا۔ کتاب میں مبینہ طور پر پیغمبر اسلام کی توہین کی گئی تھی۔ مذہبی گروہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے خلاف پرتشدد احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کیا۔ اس طرح جو حلقے انتخابی نتائج کے باعث حوصلہ ہارے ہوئے تھے، مذہبی گروہوں کو انہیں بھی متحرک کرنے کا موقع مل گیا۔ مصنف کی نسل پرستی نے بھارت اور اسلام پر حملے کے درمیان ایک تعلق پیدا کر دیا کیونکہ پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز ایسے مذہبی مظاہروں کے اہتمام میں مہارت کی حامل تھیں جن کا اس دور کے سیاسی مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ملک کے اندر مذہبی جذبات کو حالت جوش میں رکھنے کے لیے مذہبی گروہوں کے عضلات کو کس طرح مرتعش رکھنا ہے۔ لہذا تجویز پیش کی گئی کہ مہم کے دوران اسلام پسندوں اور سیکولر وسوشلسٹ عناصر کو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھا جائے۔ حصول مقصد کے لیے فعال ایجنٹوں نے عوامی جذبات کو آگ دکھانے کے لیے اسلام کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ جس کے اندر مبینہ طور پر حضرت محمد ﷺ کے بارے

میں توہین آمیز اور گستاخانہ مواد موجود تھا۔ اس کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے نتیجے میں اسلام پسند ایک ایسے وقت پر مرکزی مقام کی طرف لوٹ آئے جب عوام کی توجہ سیاسی سودے بازیوں میں مصروف فوجی حکومت، پاکستان، پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ پر مرکوز تھی۔

یکم مارچ کو یحیٰی خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی کر دی۔ عوامی لیگ نے سول نافرمانی کی کال کی صورت میں مذکورہ التواء کے ردعمل کا اظہار کیا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک مشرقی پاکستان کا کنٹرول فوج کی بجائے عوامی لیگ کے ہجوموں کے پاس رہا۔ صوبے بھر میں پاکستانی پرچموں کی جگہ بنگلہ دیش کے پرچم لہرا دیئے گیے۔ اس پیش رفت کی وضاحت کرتے ہوئے بنگلہ دیشی دانشور تعلقدار منیر الزماں لکھتے ہیں۔

"شیخ مجیب نے پاکستان کی مرکزی حکومت کے خلاف غیر معینہ عرصے کے لیے غیر متشدد اور عدم تعاون پر مبنی تحریک چلانے کی کال دے دی۔ اتحاد و اتفاق کا متاثر کن مظاہرہ کرتے ہوئے ہائی کورٹ کے ججوں سمیت تمام سرکاری ملازمین اپنے دفاتر سے غیر حاضر رہے اور وعدہ کیا کہ جب تک شیخ مجیب چاہیں وہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے رہیں گے۔ اس مرحلے پر مجیب کی رہائش گاہ نے بنگلہ دیش کے نئے سیکرٹریٹ کی شکل اختیار کر لی۔

بائیکاٹ کے ابتدائی دو دنوں کے دوران فوج نے بھرپور کوشش کی کہ انتظامی معاملات بطریق احسن چلتے رہے لیکن جملہ سرکاری ملازمین کے عدم تعاون نے ان کوششوں کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔ باغی عوام نے شدید مزاحمت کی۔ فوج مشرقی کمان کے جنرل انچارج کی ہدایات کے پیش نظر اپنی بریکوں میں واپس آ گئی۔ 4 مارچ 1971ء سے حالات کو معمول پر لانے کے لئے شیخ مجیب کی رہائش گاہ پر بنے "بنگلہ دیشی سیکرٹریٹ" سے ہدایات کا باقاعدہ اجراء شروع ہو گیا۔ مارچ کی 4، 7، 9، 11 اور 15 تاریخ کو بنگلہ دیش کے نام پر جو ہدایات جاری کی گئیں وہ بنگلہ دیشی معیشت کو متحرک اور امن و امان کی صورت حال کو برقرار رکھنے میں ممد ثابت ہوئیں۔

اس مرحلے پر "ریڈیو پاکستان ڈھاکہ" کا نام بدل کر "ڈھاکہ ریڈیو سنٹر" رکھ دیا گیا۔ یہ کام بنگالی براڈ کاسٹروں نے دکھایا۔ "ڈھاکہ ریڈیو سنٹر" سے انقلابی واقعات کی تفاصیل کے حامل نیوز بلیٹن نشر کیے جانے لگے۔ مصروف نغمہ "امار سونار بنگلہ" (ہمارا سنہری بنگال) بڑی باقاعدگی سے نشر کیا جانے لگا جسے "سنٹرل سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی" نے پہلے ہی بنگلہ دیش کا قومی ترانہ قرار دے رکھا تھا۔ حب الوطنی پر مبنی اور انقلابی نغمات بھی نشر کیے جانے لگے۔ 7 مارچ کو ڈھاکہ میں ایک غیر معمولی حجم کے حامل عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب نے مطالبہ کیا کہ (1) مارشل لاء اٹھا لیا جائے۔ (2) اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیئے جائیں۔ (3) فوج واپس بریکوں میں چلی جائے۔ اور (4) بنگلہ دیش کی زمینی اور حقیقی صورت حال کو قانوناً تسلیم کر لیا جائے۔ شیخ مجیب کے

ہاتھوں ایک " حقیقی حکومت " کا قیام بنگلہ دیشی انقلاب کے پہلے مرحلے کی صرف ایک جہت تھی۔ اس مرحلے کا دوسرا عجیب وغریب پہلو عامتہ الناس کا جنگجویانہ رویہ تھا۔ یکم مارچ سے 25 مارچ 1971ء تک ڈھاکہ کی گلیوں میں ان گنت جلوس نکالے گئے۔ شرکائے جلوس کے پسندیدہ ترین نعرے یہ ہوا کرتے تھے۔ (1) "جوئی بنگلہ" (بنگال کو شان ملی) اور (2) "سوادھن بنگلہ دیش زندہ باد" (خدا آزاد بنگلہ دیش کی عمر دراز کرے)۔ اکثر اوقات ان جلوسوں کا اختتام "32 دھان منڈی" پر ہوا کرتا تھا۔ جہاں شیخ مجیب کی رہائش گاہ واقع تھی۔ جلوس دھان منڈی پہنچتے تو شیخ مجیب لوگوں کو یقین دلایا کرتے تھے کہ بنگلہ دیش کے لئے "مکتی" (آزادی) حاصل کر لی جائے گی۔ اسی نوعیت کے مظاہرے بنگلہ دیش کے دیگر شہروں اور قصبوں میں بھی ہوتے رہے۔

شیخ مجیب اپنی "سٹریٹ پاور" کے ذریعے حکومت پر دباؤ بڑھا رہے تھے لیکن انہوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے یک طرفہ اعلان سے گریز کیا۔ فوجی حکومت نے عوامی لیگ، پی پی پی اور حکومت کے درمیان سہ جہتی مذاکرات کا اہتمام کیا۔ لیکن کوئی سمجھوتہ طے نہ پاسکا۔ ادھر مذاکرات ہو رہے تھے اور ادھر مشرقی پاکستان میں تعینات فوج کی نفری میں اضافہ کر دیا گیا۔ مزید براں علیحدگی کے خطرات سے نمٹنے کے لئے منصوبہ بندی کر لی گئی۔

جو سول اور فوجی افسران یحییٰ خان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے آخر الذکر کو اکسایا کہ وہ کوئی ایکشن لیں۔ ان کے خیال میں عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان کے عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی اور عوام میں اتنی قوت برداشت نہیں تھی کہ وہ طویل عرصہ مخالفت کر سکیں لہٰذا بنگالی وطن پرستی کی لہر اور ان کے مطالبات فوجی کاروائی کے بعد چند دنوں کے اندر اندر دم توڑ دیں گے۔ یحییٰ خان کو یقین دلایا گیا کہ مختصر مگر سخت ایکشن صورت حال کو معمول پر لانے میں ممد ثابت ہوگا اور سیاستدان بھی گھٹنے ٹیک دیں گے۔ چند ہزار لوگوں کو مار بھی دیا جائے تو ملک کو متحد رکھنے کے لئے یہ قیمت زیادہ نہیں ہوگی۔ اقتدار ایک ثابت شدہ غدار کے حوالے کر دینا بہت بڑی غلطی ہوگی اور تاریخ یحییٰ خان کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اتفاق سے یہ مشورہ یحییٰ خان کے اپنے خیالات سے بھی مطابقت رکھتا تھا۔ ان کی یہ رائے پختہ ہوگئی کہ "انہیں طاقت کی جھلک دکھاؤ سب سیدھے ہو جائیں گے"۔

فوج کے جو افسران مشرقی پاکستان میں کم یا زیادہ عرصہ خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ انہیں مقامی مزاج کا اندازہ تھا۔ انہوں نے بنگالی عوام کے خلاف طاقت کے استعمال کی حمایت نہیں کی۔ مشرقی پاکستان کے فوجی گورنر ایڈمرل ایس ایم احسن اور فوجی کمانڈر صاحبزادہ یعقوب علی خان کی مشترکہ رائے تھی کہ سیاسی صورت حال کو فوجی اقدامات کے ذریعے تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یعقوب خان صراحتاً رقمطراز ہیں کہ یحییٰ خان کے خیال میں "بندوق کی گولیوں کی ہلکی سی آواز ہی موثر ثابت ہوگی اور مارشل لاء کی سختیوں کا دوبارہ نفاذ کسی قسم کے مسائل پیدا نہیں کرے گا"۔

وہ بضد رہے کہ شیخ مجیب اپنے 6 نکات میں لچک پیدا کریں۔ تاکہ ذوالفقار علی بھٹو اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے دیگر راہنما اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کر سکیں۔ دوسری صورت میں وہ اجلاس کے انعقاد میں التواء کا فیصلہ واپس لینے پر تیار نہیں تھے۔

احسن اور یعقوب خان دونوں مستعفی ہو گئے۔ ایک نئے فوجی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو قومی یک جہتی اور اتحاد کے قیام کے لئے میدان میں لایا گیا۔ فوج کے رویے کا اندازہ صرف اس گفتگو سے قائم کیا جا سکتا ہے جو جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل خادم حسین راجہ نے اپنے ساتھی افسران کی موجودگی میں عوامی لیگ کے ایک ہمدرد اور بہی خواہ کے ساتھ کی۔ "میں جو کر سکا کروں گا۔ ٹینکوں۔ توپ خانے۔ اور مشین گنوں کی مدد سے تمام غداروں کو موت کی نیند سلا دوں گا اور اگر ضروری ہوا تو ڈھاکہ کو زمین بوس کرنے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا نہ کوئی حکومت کرنے والا باقی رہے گا اور نہ ہی کوئی ایسا فرد بچے گا جس پر حکومت کی جائے"۔

کوڈ ورڈز میں اس فوجی کریک ڈاؤن کا نام " آپریشن سرچ لائٹ " رکھا گیا۔ مذکورہ آپریشن 25 مارچ 1971ء کی رات شروع کیا گیا۔ جن بنیادوں پر اس آپریشن کی منصوبہ بندی کی گئی وہ کچھ اس طرح تھیں۔

" عوامی لیگ کے عمل اور ردعمل کو باغیانہ سمجھا جائے۔ عوامی لیگ کے حامیوں اور مارشل لاء کے مخالفین کو دشمن عناصر خیال کیا جائے کیونکہ عوامی لیگ کو وسیع البنیاد حمایت حاصل ہے۔ فوج میں شامل کچھ مشرقی پاکستانی عناصر بھی اس کے حامی ہیں۔ لہذا یہ آپریشن حد درجہ ہوشیاری اور چالاکی سے شروع کیا جائے۔ فریق ثانی حیران رہ جائے۔ مغالطے کا شکار ہو جائے اور اس کی رفتار بہت تیز ہو"۔

فوج پوری قوت سے عوامی لیگ کے حامیوں، ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء اور بنگالی ہندوؤں کے خلاف حرکت میں آ گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرنے کے بعد مغربی پاکستان منتقل کر دیا گیا۔ غیر ملکی صحافیوں کا گھیراؤ کر کے انہیں صوبہ بدر کر دیا گیا تاکہ وہ قتل عام کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ عینی شاہدین بتاتے ہیں کہ فوجیوں نے اخبارات کے دفاتر اور یونیورسٹی ہاسٹلز کے متعدد کمرے دھماکوں سے اڑا دیے۔ وہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرنے کے بعد حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ وہ نعرہ ہے جو مسلمان میدان جنگ میں دشمنان اسلام کے خلاف بلند کرتے ہیں۔ ایسے شواہد دستیاب نہیں تھے جن کی بناء پر کہا جا سکتا کہ اس مرحلے پر عوامی لیگ عسکری صلاحیت کی حامل تھی۔ پاکستان کی بری فوج کے پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ کے ایک افسر صدیق سالک فوجی کارروائی کے دوران ڈھاکہ چھاؤنی میں موجود رہے۔ وہ 25 مارچ 1971ء کی رات کے احوال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

" چھاؤنی سے نکلنے والے پہلے دستے کو فارم گیٹ کے قریب مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جگہ چھاؤنی سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ دستے کو روکنے کے لیے سڑک پر درخت کا بہت بڑا تنا گرا دیا گیا تھا۔ تنے کے دونوں جانب جو

خلاء بچے۔ انہیں پرانی کاروں کے ڈھانچوں اور بھاپ سے چلنے والے ایک ناکارہ رولر سے پر کیا گیا۔ اس رکاوٹ سے شہر کی جانب عوامی لیگ کے کئی سو وابستگان کھڑے "جوئی بنگلہ" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ میں جنرل ٹکا خان کے صدر دفتر کے برآمدے میں کھڑا ان کی پر جوش آوازیں سن رہا تھا۔ جلد ہی رائفل کے چند فائروں کی آواز "جوئی بنگلہ" کے نعروں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد کسی خودکار ہتھیار سے مارے جانے والے برسٹ نے فضا کا سینہ چیر دیا۔ اس کے بعد فائرنگ اور پر جوش نعروں کی ملی جلی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی کبھار کوئی ہلکی مشین گن بھی قہقہہ لگا دیتی تھی۔ پندرہ منٹ بعد شور میں واضح کمی واقع ہوگئی اور نعروں کا شور بھی کم ہوگیا۔ بظاہر اسلحہ جیت چکا تھا"۔

تاہم نعروں اور بندوقوں کے درمیان مقابلہ زیادہ دور اپیے پر محیط نہیں تھا۔ قبل اس کے کہ انہیں غیر مسلح کر دیا جاتا۔ پاکستان کی برّی فوج میں شامل کئی بنگالی افسران اور جوان اپنی اپنی یونٹوں سے فرار ہوگئے۔ ان مفروروں نے عوامی لیگ کے متعدد کارکنوں اور مشرقی بنگال کے ہندوؤں کو ہمراہ لیا اور بھارت چلے گئے۔ بھارت کی معاونت سے انہوں نے "مکتی باہنی" (نجات دہندہ فوج) تشکیل دی۔ بھارت نے پاکستانی فوج کی کاروائی کو بنگالیوں کی نسل کشی قرار دیا اور اپنے ہاں بڑی تعداد میں بنگالی پناہ گزینوں کی موجودگی کو بنیاد بنا کر مشرقی پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا جواز پیدا کر لیا۔ پاکستانی فوج مستقبل کے پاکستانی آئین پر ہونے والے سیاسی مباحث کا رخ خانہ جنگی اور اسلامی پاکستان اور ہندو بھارت کے درمیان ایک اور مقابلے جیسے موضوعات کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ ایڈمرل احسن (فوجی گورنر جو انتخابات کرانے کے بعد فوجی کاروائی کے موقع پر احتجاجاً مستعفی ہوگئے) نے بعد میں چند امریکی افسران کے ساتھ گفتگو کے دوران تسلیم کیا کہ کم از کم مارچ سے پہلے تک شیخ مجیب علیحدگی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ عوامی چیخ و پکار کے باوجود بھارتی رویہ بھی نسبتاً معتدل تھا اور مارچ سے پہلے وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں اس کے ہاتھ نسبتاً صاف تھے۔

پاکستانی فوج کی کاروائی کا ہدف عوامی لیگ کے حامی عناصر تھے اور چونکہ عوامی لیگ کو حاصل عوامی حمایت وسیع البنیاد اور ملک گیر تھی۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پورا مشرقی پاکستان ہی فوج کی زد میں تھا۔ اس دور کی داستانیں سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی فوج نے جن لوگوں پر علیحدگی پسند، غدار اور بھارتی ایجنٹ ہونے کے لیبل چسپاں کر رکھے تھے۔ ان کے ساتھ نمٹتے وقت اس نے بربریت کا مظاہرہ کیا۔ فوجی کاروائی کے آغاز سے ایک ہفتہ بعد 31 مارچ کو "نیو یارک ٹائمز" نے اپنے اداریے میں لکھا کہ بنگالیوں کی جو اکثریت مختلف بنیادوں اور نئی شرائط پر مشرقی پاکستان کو پاکستان ہی کا حصہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ پاکستانی فوج کے درشت اور بے رحمانہ سلوک نے علیحدگی پسندوں کے موقف کو تقویت دی۔ اخبار لکھتا ہے۔

"فوجی حکومت میں غالب اکثریت مغربی پاکستانیوں کی ہے۔ اس نے خدا اور اتحاد پاکستان کے نام پر بنگالیوں کی اکثریت کے خلاف جو بے رحمانہ کریک ڈاؤن کیا وہ دونوں کا نام بدنام کرنے کا باعث بنا۔ غیر مسلح شہریوں پر پاکستانی فوج

کے شدید حملوں کے ذریعے حاصل ہونے والا اتحاد بے مقصد اور ناپائیدار ثابت ہوگا۔ مغربی پاکستان کی فوج نے مشرقی پاکستان میں بسنے والے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا۔ اس کا یکسر اور مکمل علیحدگی کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا"۔

جلد ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پیدا ہونے والے فاصلوں کے سامنے عوامی لیگ کے حامیوں اور حکومت کے درمیان موجود فاصلے ہیچ نظر آنے لگے۔

پاکستان کی فوج کی کاروائی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے سویلین افراد کی تعداد تا حال متنازعہ فیہ ہے۔ شیخ مجیب الرحمان کے خیال میں قتل کیے جانے والے بنگالیوں کی تعداد 30 لاکھ سے زیادہ تھی جبکہ جنرل ٹکا خان کے بقول۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد 34 ہزار تھی۔ میجر جنرل فرمان علی خان ان دنوں مشرقی پاکستان کی مارشل لاء انتظامیہ میں سول معاملات کے سربراہ تھے۔ سقوط ڈھاکہ کو دو عشروں سے زائد عرصہ بیت چکا تھا۔ جب انہوں نے ایک انٹرویو میں تسلیم کیا کہ پاکستانی فوج کے ہاتھوں مارے جانے اولے بنگالیوں کی تعداد 50 ہزار کے لگ بھگ ہوسکتی ہے۔

ایک امریکی افسر کے سامنے جنرل فرمان نے یہ بھی تسلیم کیا کہ 60 لاکھ کے قریب بنگالی پناہ گزین بھارت چلے گئے اور پاکستانی فوج مشرقی بنگال سے ہندوؤں کا صفایا کردینا چاہتی تھی۔

مکتی باہنی بھی بھاری تعداد میں انسانی جانوں کے اتلاف کا باعث بنی۔ اس کا ہدف غیر بنگالی سویلین افراد تھے۔ بظاہر اس کے اقدامات پاکستانی فوج کی کاروائی کا ردعمل تھے۔ اگست میں یحیٰ خان کی حکومت نے مشرقی پاکستان کے بحران پر جو قرطاس ابیض شائع کیا اس میں واضح طور پر تسلیم کیا گیا کہ بنگالیوں نے جو مظالم ڈھائے وہ پاکستانی فوج کی کاروائی کا نتیجہ تھے۔ پاکستانی فوج کے تشدد نے انہیں ایسا کرنے پر اکسایا۔ قرطاس ابیض میں فوجی کریک ڈاؤن سے قبل اور اس کے بعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی تفصیل تاریخوں کے اعتبار سے ترتیب کے ساتھ دی گئی تھی۔ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں پر 25 مارچ یعنی فوجی کریک ڈاؤن کے آغاز کے بعد حملے کیے۔ ایک پاکستانی جرنیل نے ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستانی فوج کے عناصر غضب ناک ہوگئے اور انتقاماً سوچے سمجھے بغیر گولیوں کی بارش کرتے رہے۔ گاؤں کے گاؤں نذر آتش کردیے اور قتل وغارت کا بازار گرم رکھا۔ بنگالیوں کی بڑی تعداد پر اس وقت موت نازل کر دی گئی جب وہ پناہ گزینوں کی صورت میں بھارتی سرحد عبور کررہے تھے"۔

بعدازاں جنرل ٹکا خان کو جلد ہی عالمی میڈیا میں "بنگال کا قصاب" کہہ کر پکارا جانے لگا۔ حالانکہ نہ تو وہ اکیلے ذمہ دار تھے نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ارباب اقتدار کے حکم کے بغیر ہی قتل وغارتگری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس دور کی اعلیٰ فوجی شخصیات نے جو یادداشتیں تحریر کی ہیں ان میں ایک دوسرے پر بزدلی۔ سٹریٹیجک سوچ کے فقدان اور

طاقت کے زائداز ضرورت استعمال جیسے الزامات عائد کیے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی جنہوں نے اپریل 1971ء میں ٹکہ خان سے بطور کمانڈر مشرقی کمان چارج لیا۔ وہ ابتدائی فوجی آپریشن کو اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"25 اور 26 مارچ 1971ء کی درمیانی رات جنرل ٹکہ نے پہلی ضرب لگائی۔ ایک پرامن اور پرسکون رات آہوں۔ کراہوں۔ سسکیوں اور چیخوں میں بدل گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی گمراہ اور غلط رو عوام کے ساتھ نہیں نمٹ رہے۔ بلکہ دشمن پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ جتنی طاقت ان کی صوابدید پر تھی۔ انہوں نے استعمال کر ڈالی۔ وہ فوجی کاروائی صریحاً ظلم تھا۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان نے جو قتل عام بخارا اور بغداد میں کیا۔ ٹکا خان نے سویلین افراد کو قتل کرنے اور زمین کو جھلسا دینے کی جو پالیسی اپنائی وہ اس سے بڑھکر تھی۔ بے رحمی اپنے عروج پر پہنچی۔ جنرل ٹکا نے اپنے فوجیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ انہیں (بنگال کی) عوام نہیں۔ صرف سرزمین چاہئے۔ جنرل فرمان علی اپنی ٹیبل ڈائری میں رقم طراز ہیں۔ "مشرقی پاکستان کی سرسبز سرزمین سرخ ہو جائے گی" اور واقعتاً وہ سرزمین بنگالیوں کے خون سے سرخ ہوگئی۔

پاکستانی جرنیلوں کو آج کے دن تک قائل نہیں کیا جاسکا کہ اپنے ملک کی بنگالی عوام کے ساتھ ان کا رویہ غلط تھا۔ فوج نے بنگالیوں کے خلاف جو پرتشدد اقدامات کیے۔ جرنیل ان کی متعدد وضاحتیں پیش کرتے ہیں۔ جنرل گل حسن نے جو اس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے اور بعد میں کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جنرل ٹکہ خان کے اقدامات کو عوامی لیگ کے اس توہین آمیز رویے کا ردعمل قرار دینے کی کوشش کی ہے جو آخر الذکر نے سول نافرمانی کے دوران فوج کے ساتھ روا رکھا۔ ان دنوں اسے مشرقی پاکستان پر موثر کنٹرول حاصل تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"جنرل ٹکہ خان کے چارج سنبھالنے سے قبل ہماری فوج کو چھاؤنیوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً جب فوجی باہر نکلتے تھے تو عوامی لیگ کے پیروکار انہیں توہین اور گالیوں سے نوازتے تھے۔ لہذا ان کی نقل و حرکت محدود تھی۔ بنگالی ٹھیکیداروں نے ان کو تازہ راشن فراہم کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا۔ بجلی اور پانی کی ترسیل بھی روک دی گئی۔ اندریں حالات صورت حال بدتر ہوگئی۔ وہ ایک اندوہناک دور تھا۔ جب فوج کو کاروائی کا حکم ملا تو فطری سی بات تھی کہ وہ اس اہانت کو نہ بھلا سکی۔ جو انہوں نے عوامی لیگ کے حامیوں کے ہاتھوں اٹھائی تھی"۔

جنرل یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان آخری ملاقات کے دوران جو گفتگو ہوئی۔ وہ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ ممکن ہے فوج نے اپنے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر بنگالیوں کو سبق سکھانا چاہا ہو۔ شیخ مجیب الرحمان کے ایک قریبی ساتھی اور بعد میں بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ بننے والے ڈاکٹر کامل حسین کے بقول جب یحییٰ خان نے عوامی لیگ کے راہنماؤں کا استقبال کیا تو انہوں نے ہاتھ میں وہسکی کا ایک بڑا گلاس تھام رکھا تھا۔ انہوں نے شیخ مجیب کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا۔" اپنے لڑکوں سے کہہ دو کہ انہیں فوج کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہم سب کو چاہیے کہ اسلام کی شان وشوکت اور پاکستان کی سالمیت کے لئے مل کر کام کریں"۔ ڈاکٹر حسین ششدر رہ گئے کہ ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھام کر خدمت اسلام کی ترغیب دی جا رہی تھی۔ حالانکہ اسلام میں شراب کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یحییٰ خان تو صرف فوجی قیادت کی ترجیحات بتا رہے تھے جن کا مرکز پاکستانی قوم تھی۔ جسے اسلام کے نام پر فوج نے اکٹھا کر رکھا تھا اور سویلین عوام اس فوج کو چیلنج نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ عام انتخابات میں انہیں عوام کی طرف سے واضح اور قطعی مینڈیٹ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ ٹکہ خان کو کسی صورت اس بربریت کا واحد ذمہ دار نہیں کہا جا سکتا جس کا تسلسل ان کے چارج چھوڑ دینے کے بعد بھی نہ ٹوٹا۔

جس دن فوج نے کاروائی کا آغاز کیا۔ اس سے اگلے روز یحییٰ خان نے قوم سے خطاب کیا۔ انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو باغی قرار دیتے ہوئے عوامی لیگ پر پابندی اور پریس پر سنسر شپ نافذ کر دی۔ زیادہ تر مغربی پاکستانی بالخصوص اسلام پسند جماعتوں نے ان کے فیصلے کی تائید کی۔ فوج کے جونیئر افسران نے بھی اطمینان کا اظہار کیا کہ بنگالیوں کو کم از کم ایک نسل کے دورانیے کے لئے سلجھا لیا گیا ہے۔ چھاؤنیوں میں فوجی افسروں کے ساتھ ملاقاتوں کے دوران یحییٰ خان سے مسلسل کہا جا رہا تھا کہ وہ سیاستدانوں کے زیادہ مطالبات مت تسلیم کریں۔ جو فوجی افسران مشرقی پاکستان کی چھاؤنیوں میں تعینات تھے انہیں قتل وغارت اور اپنی پرتشدد کاروائیوں پر کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ ان کی زندگی شام کے وقت اور رات گئے ہونے والی تقریبات سے عبارت تھی۔ ایسے فوجیوں کی تعداد بہت کم تھی جو اپنے مسلمان بھائیوں اور سابقہ پاکستانیوں کے ساتھ جنگ کرنے پر نادم تھے۔ یا ان کے ذہنوں پر بوجھ تھا۔ فوجی افسران کے انفرادی رویے فوج کی اجتماعی سوچ کے عکاس تھے۔ جو بنگالی وطن پرستی کا حتمی نتیجہ تھا۔ جس طرح ماضی میں عسکری تصادم کے دوران فوج اسلامی جذبات کے زیر اثر تھی۔ اسی طرح بنگالیوں کے خلاف کاروائی کو بھی پاکستان کے اسلامی تشخص کی جنگ سمجھا جا رہا تھا۔

مشرقی پاکستان میں فوج نے یہ تاثر پھیلا رکھا تھا کہ فوجی کاروائیوں کا مقصد بغاوت کا سر کچلنا ہے جبکہ مغربی پاکستانی فوج کو دشمنان اسلام کے ساتھ لڑنے والے مجاہدین کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ مغربی پاکستان میں یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ بنگالی ہندوؤں کا رسوخ اور مسلمان مخالف قوتوں کے اقدامات ملک کے مشرقی بازو میں بحران کا باعث بن رہے تھے۔ بھارت کی طرف سے بنگالیوں کے حق میں جاری کیے جانے والے ہر بیان کو اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کیا جانے لگا کہ عوامی لیگ بھارتیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بھارتی مداخلت نے صورت حال کو سنگین تر بنایا۔ تاہم اسے مشرقی پاکستان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی سب سے بڑی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مغربی پاکستان میں رائے عامہ کو متشکل کرنے میں یا تو حکومت کا ہاتھ تھا اور یا پھر وہ اسلامی عناصر یہ فریضہ

سرانجام دے رہے تھے جو میڈیا پر حاوی تھے۔ سیکولرزم کو کفر اور خلاف اسلام قرار دینے کی جو مہم چلائی گئی تھی اکثر لوگوں کے ذہنوں پر اس کے اثرات ابھی تازہ تھے۔ اگرچہ انتخابات کے وقت انہوں نے اس مہم کا اثر قبول نہیں کیا تھا۔ تاہم ایک ہزار میل دور لڑی جانے والی جنگ کے دوران ان کی سماعت سے اس مہم کی بازگشت ٹکرانے لگی۔ مزید براں مغربی پاکستان کی مقبول سیاسی قوت مشرقی پاکستان میں فوج کی زیادتیوں کے ردعمل کے طور پر فوج کے مقابل نہیں آنا چاہتی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو حکمران جرنیلوں کے ساتھ خوشگوار مراسم برقرار رکھنا چاہتے تھے تاکہ مغربی پاکستان میں ان کے برسراقتدار آنے کے امکانات خطرات سے دوچار نہ ہو جائیں۔ وہ اس امکان کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی مخالفت کو ختم کر دینے کے بعد فوج مغربی پاکستان کی منتخب قیادت کے خلاف بھی طاقت استعمال کر سکتی تھی۔ یہ واحد وجہ تھی جس کی بناء پر اپنی سیاسی فتح کے باوجود انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ حکومت سے سیاسی اقتدار میں اپنا حصہ طلب کریں۔ اس سے آگے نہ جائیں۔

ٹکہ خان سے چارج لینے کے بعد جنرل ایم۔ اے۔ کے نیازی نے اپنے آپ کو مذہبی سانچے میں ڈھال لیا۔

فوجیوں سے گفتگو کے دوران وہ بار بار قرآن وسنت اور تاریخ اسلام کے حوالے دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے:۔ "جس طرز زندگی کی قرآن تلقین کرتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسلام امن کا دوسرا نام ہے۔ عام حالات میں اسلام یقیناً امن کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن حقیقت پسندانہ طرز اندگی ہونے کے ناطے اسے احساس ہے کہ مستقل امن کا انحصار حملہ آور کو پسپا کرنے کی صلاحیت پر ہے"۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "بطور مسلمان ہم نے ہمیشہ ایسے دشمنوں سے جنگ کی جو تعداد اور ساز وسامان میں ہم سے برتر تھے۔ دشمن ہمیں کبھی شکست نہ دے سکا۔ یہی جہاد کی روح ہے اور یہ اسلام کے ساتھ وابستگی کا نتیجہ ہے کہ مٹھی بھر مسلمان مضبوط ترین دشمنوں پر ضربیں لگاتے اور انہیں شکست سے دوچار کرتے رہے۔ جنگ احد، جنگ بدر، جنگ خیبر اور جنگ دمشق مسلمانوں کے حوصلہ وہمت کا ثبوت ہیں۔ جنرل نیازی کے لیکچروں نے مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی پر مذہبی رنگ چڑھا دیا"۔ انہوں نے مزید کہا۔ "ہمارا ایک ایسا دشمن ہے جس کا نصب العین اور شدید ترین خواہش ہے کہ پاکستان کو لخت لخت کر دیا جائے"۔

فوج کو مذہبی جنون میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت نے جماعت اسلامی، مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں، نظام اسلام پارٹی، جمعیت العلمائے پاکستان اور عوامی لیگ کے مقابلے میں الیکشن ہارنے والی دیگر جماعتوں کو ایک نیم سرکاری کردار سونپ دیا۔ ان جماعتوں کے ارکان نے مشرقی پاکستان میں ضلعی حتیٰ کہ گاؤں کی سطح پر امن کمیٹیاں تشکیل دے دیں اور فوج کے انٹیلی جنس نیٹ ورک کے طور پر کام شروع کر دیا۔ بالخصوص جب مکتی باہنی نے پاکستانی فوج کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا تو ان جماعتوں کا کردار بڑھ گیا۔

جب ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے دیگر بڑے شہروں میں بظاہر امن بحال ہو گیا تو فوجی حکومت نے اپنی توجہ ایک نئی سیاسی حکمت عملی تشکیل دینے پر مرکوز کر دی۔ فیصلہ کر لیا گیا کہ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے قومی وصوبائی اسمبلی کے ارکان کو دشمن کے ساتھ گٹھ جوڑ اور پاکستان کی سالمیت کو چیلنج کرنے کے الزام میں نا اہل قرار دے دیا جائے۔ انٹیلی جنس بیورو اور آئی ایس آئی نے ایسے ارکان قومی اسمبلی کی فہرست مرتب کی جنہیں نا اہل قرار دیا جانا تھا۔ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے 160 میں سے 72 ارکان کو نا اہل قرار دیدیا گیا۔ اس طرح 313 ارکان پر مشتمل قومی اسمبلی میں اس کے پاس صرف 86 نشستیں رہ گئیں۔ مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے 288 ارکان میں سے 191 کی رکنیت منسوخ کر دی گئی اور عوامی لیگ کے پاس 300 نشستوں پر مشتمل اسمبلی میں صرف 95 نشستیں بچیں۔ نظری اعتبار سے ان نشستوں کو خصوصی انتخابات کے ذریعے پر ہونا تھا۔ لیکن فوج نے 6 اسلام پسند جماعتوں کے ایک اتحاد کا اہتمام کیا جس کا نام "متحدہ مخلوط جماعت" رکھا گیا۔ میجر جنرل فرمان علی خان کی سربراہی میں ایک خصوصی سیل کا قیام عمل میں آیا جس کے ذریعے مختلف جماعتوں کے لئے مختلف تعداد میں نشستیں مختص کی گئیں اور اسلام پسند امیدواروں کو یقین دہانی کرائی گئی کہ انہیں بلا مقابلہ منتخب قرار دیدیا جائے گا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں 6 اسلام پسند جماعتوں یعنی مسلم لیگ کے تینوں دھڑوں۔ پاکستان جمہوری پارٹی۔ نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے حصے میں قومی اسمبلی کی 121 نشستیں آئیں۔ اس طرح مستقبل میں تشکیل دی جانے والی کسی بھی مخلوط حکومت میں ان کی شمولیت ضروری ہو گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو بھی 5 نشستوں کی پیش کش کی گئی۔ اس پیش کش کا مقصد یہ تھا کہ پی پی پی اس بندر بانٹ پر اعتراض نہ کرے۔ حالانکہ اس نے عام انتخابات میں مشرقی پاکستان کی کسی قومی اسمبلی کی نشست پر اپنا ایک امیدوار بھی کھڑا نہیں کیا تھا۔ بلا مقابلہ نشستوں کا سب سے بڑا حصہ یعنی 50 نشستیں جماعت اسلامی کو دی گئیں۔ حالانکہ جماعت اسلامی نے چند ماہ قبل منعقد ہونے والے انتخابات میں انتہائی ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور مجموعی طور پر اسے بہت کم ووٹ ملے تھے۔ یہ 50 نشستیں ملنے کے بعد اس کی نشستوں کی کل تعداد 54 ہو گئی اور وہ پارلیمنٹ میں ایک بڑی اور موثر طاقت بن گئی۔

منتخب ڈھانچے کو پارہ پارہ کرنے کے بعد یحیٰی خان نے آئینی ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی کی مدد سے ملک کے لئے ایک آئین کو حتمی شکل دینا چاہی۔ آئین لکھنے کا فریضہ اب منتخب قومی اسمبلی کے پاس نہیں تھا۔ صدر، فوج کے سپریم کمانڈر اور کمانڈر انچیف کے عہدوں کے علاوہ یحیٰی خان نے مارشل لاء کے تحت اختیارات حاصل کرنے کی تجویز بھی پیش کر دی۔ نیا آئین فوجی صدر کو "پاکستان کی سالمیت۔ نظریہ پاکستان اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے خصوصی ذمہ داریاں تفویض کرتا تھا"۔ یحیٰی خان مبینہ طور پر یہ سمجھتے تھے کہ "ملک کو اس وقت ترکی کی طرز پر ایک ایسا آئین درکار تھا۔

جس کے تحت مسلح افواج کا کمانڈر انچیف ہی ملک کا صدر اور موثر ترین راہنما بن سکتا تھا"۔ جرنیل فیصلہ کر چکے تھے کہ آئین میں ان کے نام نظریہ پاکستان کے محافظوں کے طور پر درج کیے جائیں گے۔ عوامی لیگ کی جیتی ہوئی نشستوں کی آمرانہ اور اندھا دھند تقسیم کے ذریعے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا نقشہ بدلنے کے علاوہ فوجی حکومت نے بغاوت کو کچلنے کے لئے اسلام پسند جماعتوں کو "بھرتی" کر لیا۔ بنگالیوں کے خلاف فوجی کریک ڈاؤن سے پہلے ہی بھارت نے اپنی فضائی حدود میں پاکستانی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا۔ نتیجتاً فوجیوں کو مغربی پاکستان سے بھاری تعداد میں مشرقی پاکستان پہنچانا خاصا دشوار ہو گیا۔ فوجی کاروائی کے آغاز کے وقت مغربی پاکستان کے صرف 12 ہزار فوجی مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔ پاکستانی فوج میں شامل 18 ہزار بنگالیوں کو یا تو غیر مسلح کر دیا گیا اور یا وہ فرار ہو گئے۔ مغربی پاکستان کے فوجیوں کی تعداد 34 ہزار کرنے کیلئے انہیں براستہ سری لنکا مشرقی پاکستان پہنچانا پڑا۔ اس دور میں پاکستان کی دفاعی حکمت عملی یہ تھی کہ "مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا" لہذا مغربی پاکستان میں فوج بڑی تعداد میں درکار تھی۔ مطلب یہ کہ اگر بھارت مشرقی پاکستان پر دباؤ بڑھائے تو اس پر مغربی پاکستان سے حملہ کر دیا جائے۔ نقل و حمل اور طلب و رسد کی دشواریوں اور تزویراتی حکمت عملی کے امتزاج کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ تقریباً 6 کروڑ اڑیل اور بے سکون آبادی کا مقابلہ کرنے کے لئے بھاری تعداد میں فوج تعینات کرنا پڑی۔ ان 6 کروڑ میں سے ہزاروں نے بھارتی تربیت اور معاونت سے فوج کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تھے۔

فوج نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان میں مقیم غیر بنگالیوں میں سے ایک لاکھ افراد کو بطور رضا کار بھرتی کیا جائے۔ جماعت اسلامی بالخصوص طالب علموں میں اس کی ذیلی تنظیم "اسلامی جمعیت طلبہ" نے مئی 1971ء میں فوج کی کوششوں میں شامل ہو کر بغاوت کو کچلنے کے لئے دو نیم فوجی یونٹیں تشکیل دیدیں۔ بڑی تعداد میں رنگروٹ مہیا کئے۔ ستمبر تک 50 ہزار رضا کاروں پر مشتمل فوج تیار ہو چکی تھی۔ مغربی پاکستان کے سیکولر سیاستدانوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو "جماعت اسلامی کی نامزد کردہ فوج" ہے۔ اسلام پسندوں کے دو بریگیڈز کا نام "الشمس" اور "البدر" رکھا گیا۔ ان ناموں کی نوعیت علامتی تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی سربراہی میں مسلمانوں نے اسلام کی خاطر جو پہلی جنگ لڑی۔ اس کا نام جنگ بدر تھا۔ جنوبی ایشیاء میں تجدید اسلام کے لئے ان دونوں بریگیڈز نے خود کو "سورج" اور "چاند" سمجھا۔ بعدازاں مشرقی کمان کے سربراہ جنرل نیازی نے ان رضا کاروں کے کردار کی یوں وضاحت کی۔

رضا کاروں کے لئے ایک علیحدہ نظامت قائم کر دی گئی۔ "البدر" اور "الشمس" کے نام سے دو علیحدہ علیحدہ گروپ منظم کئے گئے۔ "البدر" میں سکولوں اور مدرسوں کے ایسے طلباء کو بھرتی کیا گیا جو مناسب حد تک تعلیم یافتہ بھی تھے اور ان کے جذبے بھی بیدار تھے۔ انہیں "خصوصی کاروائیاں" کرنے کی تربیت دی گئی۔ باقی سب کو "الشمس" بریگیڈ میں بھرتی کر لیا گیا۔ جنہیں پلوں۔ اہم مقامات اور دیگر علاقوں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی۔

رضا کاروں کو زیادہ تر ایسی جگہوں پر تعینات کیا گیا جہاں انہیں کنٹرول اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے فوجی عناصر موجود تھے۔ انہیں ایسے علاقوں میں بھیجا گیا جہاں وہ مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ وہاں دائیں بازو کی جماعتوں کا زور تھا جو مقامی سطح پر خاصا اثر ورسوخ رکھتی تھیں۔

بنگلہ دیشی دانشوروں نے "الشمس" اور "البدر" سے وابستہ جنگ جوؤں پر الزام عائد کیا کہ وہ جنوبی تھے۔ ان پر پاکستانی فوج کے "ڈیتھ سکواڈز" ہونے اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے پروفیسروں۔ صحافیوں۔ علمی وادبی شخصیتوں حتیٰ کہ ڈاکٹروں کو ختم کرنے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ مبینہ طور پر "البدر" نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے دس پروفیسروں، 5 بڑے بڑے اور معروف صحافیوں (جن میں بی بی سی کا نامہ نگار بھی شامل تھا)، دو علمی شخصیتوں اور 26 ڈاکٹروں کو صرف ڈھاکہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کئی جگہوں پر "مکتی باہنی" کے ساتھ ہونے والے تصادم کے دوران جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے متعدد حامی بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بنگلہ دیش کے معرض وجود میں آجانے کے بعد جب بنگالی وطن پرستوں نے اپنے حساب چکائے تو مرنے والوں کی تعداد قابل ذکر حد تک بڑھ گئی۔

سیاسی جوڑ توڑ کے ماہرین حکومت کی مدد نہ کر سکے اور پاکستانی فوج کے لئے زمینی صورت حال بدستور غیر یقینی اور خطرناک رہی۔ بھارت بنگالی مزاحمت کاروں کی مدد میں مکمل طور پر ملوث ہو گیا اور عالمی سطح پر بنگالی عوام کے لئے ہمدردی وسعت اختیار کر گئی۔ ادھر بھارت کے اندر مغربی بنگالی ریاست اور شمال مشرقی علاقے میں انقلاب اور انتہا پسندی کی لہر دوڑ گئی۔ جس نے بھارت کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ بھارت کے دونوں مذکورہ علاقوں کی عوام نے ماضی قریب میں کمیونسٹ جنگ جوئی کا مشاہدہ کیا تھا۔ اگر پاکستان سے آنے والے بنگالی پناہ گزینوں کے لئے اپنے گھروں کو لوٹنا ناممکن ہو جاتا تو وہ بالآخر کمیونسٹ نکسل باڑیوں کی بغاوت کا حصہ بن سکتے تھے۔ مشرقی پاکستان کی صورت حال تعطل کا شکار تھی۔ پاکستانی فوج گوریلوں کو ختم کرنے میں ناکام ہو چکی تھی اور مکتی باہنی کے پاس اتنی فائر پاور نہ تھی کہ پاکستان کی فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کیا جا سکتا۔ عالمی رائے عامہ کے تحت متشکل ہونے والے دباؤ کے نتیجے میں پاکستان استیصال اور خانہ جنگی کے خاتمے اور شیخ مجیب کی رہائی کے لئے بنگالی عوام کی منتخب قیادت کے ساتھ مذاکرات پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ لیکن امریکہ نے اپنا جھکاؤ پاکستان کی طرف ظاہر کیا اور یحییٰ خان کے لئے عالمی دباؤ کو نظر انداز کرنا نسبتاً آسان ہو گیا۔

یحییٰ خان کی فوجی حکومت کے لئے امریکی حمایت کا مشرقی پاکستان کے معاملات اور بنگالی قوم پرستوں کی خواہشات کے موافق یا ناموافق پہلوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پاکستان کی فوجی قیادت کا کام صرف یہ تھا کہ وہ ماضی کی طرح عالمی سطح پر امریکی ارادوں کی تکمیل میں مدد و معاون ثابت ہوتی رہے۔

یحییٰ خان نے مارچ 1969ء میں یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے 37ویں صدر کے طور پر رچرڈ نکسن کی افتتاحی تقریب سے دو ماہ بعد پاکستان کی عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی۔ نکسن سرکاری اور نجی حیثیت میں چار مرتبہ پاکستان کے دورے پر آئے انہوں نے ابتداء سے ہی تسلیم کر لیا تھا پاکستان کے ساتھ امریکی مفادات وابستہ تھے۔ یحییٰ خان نے ایوب خان کی جگہ لی تو رچرڈ نکسن نے پاک امریکہ تعلقات کی تعمیر نو کے لئے اچھا موقع خیال کیا۔ ایوب خان پاکستان کو چین کے زیادہ قریب لے گئے تھے اور 1965ء میں بھارت کے ساتھ جنگ کے بعد سوویت روس کو مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ اگرچہ نکسن ایوب خان کے ذاتی دوست تھے۔ تاہم جان گئے کہ وہ بات پرانی ہو چکی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ پاکستان کا نیا فوجی حکمران امریکی اشیر باد کے حصول کے لئے بے چین ہوگا۔ جب نکسن اور قومی سلامتی کے معاملات میں ان کے معاون ہنری کسنجر چین کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کے لئے منصوبہ بندی کر رہے تھے تو انہوں نے اس بڑے سفارتی انقلاب میں یحییٰ خان کو ثالث بالخیر کا کردار ادا کرنے کی دعوت دی۔ رچرڈ نکسن نے پاکستان کا پانچواں دورہ پاک امریکہ تعلقات میں پیدا ہونے والے عارضی سفارتی تعطل کے دوران کیا۔ وہ ایک مختصر لیکن حد درجہ اہمیت کا حامل دورہ تھا۔ نکسن نے یحییٰ خان سے کہا کہ وہ واشنگٹن اور پیکنگ کے درمیان رابطے کا فریضہ سرانجام دیں اور دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کو معمول پر لانے کے امکانات دریافت کریں۔ یحییٰ خان مان گئے اور وعدہ کیا کہ وہ اس فریضے کی ادائیگی کے دوران کامل رازداری سے کام لیں گے۔ اس خدمت کے بدلے میں نکسن نے یحییٰ خان کو یقین دلایا کہ ان کی نیک خواہشات آخرالذکر کے ساتھ رہیں گی اور مستقبل کے لئے امریکی حکمت عملی میں پاکستان کو قابل ذکر مقام دیا جائے گا۔

یحییٰ خان نے براستہ راولپنڈی دورہ چین میں ہنری کسنجر کو سہولیات فراہم کیں۔ اس خدمت نے یحییٰ خان کو رچرڈ نکسن کے تشکر اور ہمدردی کا حقدار بنا دیا۔ بعد ازاں جتنا عرصہ مشرقی پاکستان بحران کی زد میں رہا۔ امریکی صدر نے بھارت کے ساتھ رویہ سخت رکھا اور پاکستان کی طرف جھکاؤ دکھاتے رہے۔ مارچ 1971ء میں فوجی کریک ڈاؤن کے آغاز کے بعد جلد ہی پاکستان میں تعینات امریکی قونصل جنرل نے خفیہ تاروں کے ذریعے جو رپورٹیں واشنگٹن بھجوائیں ان میں لکھا کہ پاکستانی افواج نے خوف اور دہشت کی باگیں تھام رکھی ہیں اور طالب علم راہنماؤں اور یونیورسٹی کے اساتذہ سمیت عوامی لیگ کے راہنماؤں اور ارکان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑے طریقے سلیقے سے قتل کیا جا رہا ہے۔ قونصل جنرل آرچر بلڈ نے امریکی حکومت سے کہا کہ وہ پاکستانی فوج کے رویے پر افسوس کا اظہار کرے۔ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے نے اس درخواست میں تبدیلی کرتے ہوئے لکھا کہ (صدمے کی بجائے) امریکی حکومت کہے کہ وہ "حد درجہ فکر مند" ہے۔ لیکن واشنگٹن نے فیصلہ کیا کہ کوئی واضح موقف اختیار کرنے کی بجائے اپنے ردعمل کو تاویل میں ڈال دے۔ جب امریکی شہریوں کو (حفاظتی نقطہ نظر سے) مشرقی پاکستان سے نکالا گیا تو پاکستانی حکومت نے اصرار کیا کہ ملک

چھوڑنے سے قبل انہیں پی آئی اے کے طیارے پر پہلے ڈھاکہ سے کراچی پہنچایا جائے۔ امریکہ اپنے شہریوں کو براہ راست بنکاک بھجواسکتا تھا جو جغرافیائی اعتبار سے زیادہ قریب تھا۔ پاکستان چاہتا تھا کہ مغربی پاکستان سے فوجیوں کو مشرقی پاکستان لانے اور پھر خالی واپس جانے والے جہاز کرایہ کما سکیں۔

فوج کے ہاتھوں مشرقی پاکستانیوں کے استیصال کو امریکی حکومت نے "پاکستان کا اندرونی معاملہ" قرار دیدیا۔ تاہم امریکی رائے عامہ نے پاکستان کے رویے پر شدید تنقید کی۔ 7 اپریل 1971ء کو "نیویارک ٹائمز" نے اپنے اداریے میں لکھا کہ "اس امر کے عینی گواہ موجود ہیں کہ پاکستانی فوج مشرقی بنگال میں بلاامتیاز قتل وغارت میں مصروف ہے۔ حالیہ واقعات پر واشنگٹن کی مسلسل خاموشی روز بروز ناقابل فہم ہوتی جارہی ہے"۔ امریکی کانگریس نے بھی صدر نکسن کی "پاکستان پالیسی" پر تنقید کی۔ ڈھاکہ میں امریکی قونصلیٹ کے دفتر میں تعینات سٹاف کے ارکان نے ایک تار واشنگٹن بھیجا جس میں انہوں نے امریکی پالیسی سے "اجتماعی اختلاف" کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ پاکستانی فوج بنگالی عوام کا استیصال کر رہی ہے۔ لہٰذا اس کی مذمت کی جائے لیکن کانگریس اور میڈیا کی طرف سے تنقید کے باوجود صدر نکسن نہیں ڈگمگائے۔ پاکستان میں اپنے نمائندے کی بات پر کان دھرنے کی بجائے صدر نکسن نے ایک مرحلہ پر قونصل جنرل آرچر بلڈ کے تبادلے کے احکامات جاری کر دیئے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ ولیم پی راجرز نے ڈھاکہ میں امریکی قونصلیٹ کے سٹاف کے ساتھ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "تم لوگ رپورٹیں بھیجنے کی بجائے عرضیاں اور درخواستیں لکھ کر بھیج رہے ہو"۔

جب بحران طوالت اختیار کر گیا تو صدر نکسن کو تجویز پیش کی گئی کہ وہ پاکستان پر دباؤ ڈالیں کہ منتخب بنگالی قیادت کے ساتھ مل کر مسئلے کا کوئی سیاسی حل تلاش کرے۔ لیکن صدر امریکہ نے مذکورہ تجویز کو نظر انداز کر دیا۔ پاکستانی جرنیلوں نے جب امریکی جھکاؤ کا مشاہدہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ امریکہ اب پاکستان کے ایماء پر مداخلت کرے گا۔ یحیٰی خان چین اور امریکہ کے درمیان بطور ثالث بالخیر اپنے خفیہ کردار پر مطمئن ہے۔ لہٰذا انہوں نے بنگالیوں پر پاکستانی مظالم اور زیادتیوں کے نتیجے میں متشکل ہونے والے عالمی دباؤ کو نظر انداز کر دیا اور اپنا رویہ مزید سخت کر لیا۔ مثال کے طور پر جون 1971ء میں انہوں نے قوم سے خطاب کے دوران کیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں فوج کی مداخلت پر خدا کا شکر ادا کریں۔ ایک برطانوی صحافی نے جو یحیٰی خان کی اس قدر خود اعتمادی کے پس منظر سے آگاہ نہ تھا۔ ان کے غیظ وغضب اور فوج کی افضلیت پر اصرار کو باعث حیرت قرار دیا۔

پاکستانی صدر نے دہشت زدہ اور بے خانماں کیے جانے والوں کے لئے بھرپور ہمدردی کا اظہار کیا۔ تاہم ان لوگوں کے مصائب کا ذمہ دار فوج کی بجائے علیحدگی پسندوں، سماج دشمن عناصر، تخریب کاروں، باغیوں، دراندازوں، شرپسندوں اور بے دین فتنہ انگیزوں کو ٹھہرایا۔ سیاسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ مطلق العنان حکمران عادت کے طور پر (اور خرابی حالات کی ذمہ داری اپنے کندھوں سے اتار کر دوسروں کے کندھوں پر منتقل کرنے کے لئے) اس قسم کی باتیں کرتے ہی

رہتے ہیں۔ ان کے خطاب میں صدارتی پالیسیوں کے دیوالیہ پن کا ذکر عنقا تھا۔ تاہم پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے عقیدے کی تقلید کی تلقین کے لئے اچھی خاصی فصیح البیانی سے کام لیا گیا۔ بنگالیوں نے بھی صدر کی زبانی غیر ملکی دشمنوں کی طرف سے لاحق خطرات کے بارے میں سنا جو "ہمارے پیارے ملک کو تباہی سے دوچار کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے ملک کو جن کے دلوں کی دھڑکنوں میں حضور ﷺ کی محبت رچی بسی ہوئی ہے۔ جن کے دل ایمان کے نور سے فروزاں ہیں اور جو نصرت خداوندی پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں"۔ صدر نے کہا کہ آئین کو ہر صورت نظریہ اسلام پر مبنی ہونا چاہئے۔ وہ صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین ہو"۔ صدر نے مزید کہا۔ "ہم میں سے ہر ایک مجاہد ہے"۔ یہ جملہ اسلام کے جنگجویانہ پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔

انہی دنوں ڈھاکہ کا دورہ کرنے کے بعد امریکی سفیر جوزف فارلینڈ نے رپورٹ پیش کی۔ "پاکستانی فوج کے افسران اور سپاہیوں کی ہر ہر بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے گمراہ کردہ بنگالیوں کے خلاف مصروف جہاد ہیں"۔ انہوں نے ایسی کوئی تجویز پیش نہ کی کہ امریکہ اپنا کردار ادا کرتے ہوئے پاکستانی فوج کو جہاد ترک کرنے کا مشورہ دے۔ بلکہ لکھ بھیجا کہ "دوسری عالمی جنگ کے بعد جہاں کہیں بھی بغاوت ہوئی۔ اسے مذاکرات کے ذریعے ختم نہ کیا جا سکا"۔ امریکی سفیر کے خیال کے مطابق پاکستان کے اندر پائے جانے والے غیر فوجی یا سیاسی اختلافات بھی صرف اور صرف جنگ کے ذریعے اور جنگ کی منطق سے ہی حل کئے جا سکتے تھے۔

جولائی میں نکسن کے دورہ چین کا اعلان کر دیا گیا۔ اس حوالے سے پاکستان کا کردار منظر عام پر آ گیا اور مغربی پاکستان کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حسن ظہیر اس دور میں ایک سینئر سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے بعد میں لکھا:-

اگرچہ کسی پر واضح نہیں تھا کہ یہ نئی پیش رفت پاکستان کو اس کے مصائب سے کس طرح نجات دلائے گی تاہم فوج کے اس اعتماد میں مزید پختگی آ گئی کہ "امریکہ ہمہ طاقتور ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے"۔ پاکستان کا دفتر خارجہ بھی توقع کر رہا تھا کہ اسے اس کی خدمات کا صلہ دیا جائے گا اور اپنے ہمسائے کے ناپاک عزائم کے خلاف "واشنگٹن۔ اسلام آباد بیجنگ" پر مشتمل محور کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔

امریکہ اور چین پر حد سے زیادہ اور غیر حقیقت پسند اعتماد نے پاکستانی حکمرانوں کو شہہ دی کہ وہ کسی بھی سیاسی حل کو مسترد کر دیں لہذا وہ بنگالیوں کے معاملے میں فوجی طریق کار ہی کو ترجیح دیتے رہے۔ سال کے اواخر تک پاکستانی جرنیل یہی سمجھتے رہے کہ انہیں بھارت کے ساتھ جنگ نہیں لڑنا پڑے گی اور وہ اپنی تمام تر توجہ مشرقی پاکستان میں ہنگامہ آرائی کے خاتمے پر مرکوز رکھ سکیں گے۔ اس دوران بھارت اور روس کے درمیان ایک "معاہدہ دوستی" طے پا گیا۔ نومبر تک پاکستان اور بھارت کے درمیان متوقع جنگ سر پر منڈلانے لگی۔

بھارت نے 21 نومبر کو مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت کا آغاز کر دیا لیکن اسے باقاعدہ جنگ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ 3 دسمبر 1971ء کو پاکستان نے مغرب کی جانب سے بھارت پر حملہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ اس طرح سقوط مشرقی پاکستان کی پیشگی روک تھام کی جا سکے گی لیکن بھارت کو مشرقی پاکستان میں براہ راست آگے بڑھنے کا موقع مل گیا تا کہ بنگلہ دیش کی تخلیق میں بنگالیوں کی مدد کی جا سکے۔ 14 دسمبر کو جب بھارتی فوج نے ڈھاکہ کو گھیرے میں لے رکھا تھا، پاکستان کی ہائی کمان نے محصور چھاؤنی کو پیغام بھیجا کہ "زرد اور سفید مدد شمال اور جنوب کی طرف سے ملنے والی ہے۔ زرد اور سفید رنگ "تصوراتی مدد" کی علامتیں تھے۔ وہ "تصوراتی مدد" جو جنگ بندی اور پسپائی کے حوالے سے مشرقی کمان کے مذاکرات کو ملتوی کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ اگرچہ انہوں نے سفارتی مدد جاری رکھی لیکن امریکہ اور چین میں سے کوئی بھی پاکستان کی طرف سے جنگ میں کودنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ جنرل یحییٰ خان مشرقی کمان کو صرف یہ ہدایات جاری کرتے رہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح بھارتی پیش قدمی کو روکے رکھے تا کہ وقت مل جائے اور اقوام متحدہ ایسی قرارداد منظور کر لے جو پاکستانی فوج کی ذلت آمیز پسپائی اور ملک کی مستقل تقسیم کی راہ روک سکے۔ مغربی پاکستان کی فوجی قیادت کی ساکھ بچانا مشرقی پاکستان کی فوجی صورت حال سے وابستہ زمینی حقائق کا سامنا کرنے سے زیادہ اہم تھا۔

صدر نکسن کا پاکستان کی طرف جھکاؤ پاکستان کو ایک رکھنے میں ناکام رہا۔ نکسن پالیسی کے ناقدین کا خیال تھا کہ اس پالیسی نے پاکستان کے فوجی راہنماؤں کی حوصلہ افزائی کی اور انہوں نے بنگالیوں کے استیصال اور ان پر اسلامی نظریاتی وطن پرستی کے تصور کو مسلط کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

کسنجر نے چو این لائی کو مطلع کر دیا تھا کہ امریکہ بھارت کے کسی بھی فوجی اقدام کی شدید مخالفت کرے گا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پاکستان کو فوجی معاونت فراہم کی جائے گی یا اس کے ایماء پر کوئی فوجی قدم اٹھایا جائے گا۔ اس نوعیت کا بیان یحییٰ خان پر دو طرح صحت مند اثرات مرتب کر سکتا تھا۔ یا تو وہ اپنی بے ثمر استیصالی پالیسی پر نظر ثانی کرتے اور یا پھر ایسے حقیقت پسند اور سیاسی اقدامات کرتے جو سیاسی عمل کی بحالی پر منتج ہوئے۔ دوسرے اگرچہ فوج میں اعتدال پسندوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن وہ عملی سوچ کے حوالے سے حکومت کے اندرونی مشاورتی حلقے میں نسبتاً زیادہ رسوخ حاصل کر سکتے تھے۔ کسی سیاسی حل کی ضرورت پر امریکی موقف کا حامل یہ دوٹوک بیان یحییٰ کی پوزیشن کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے مجیب کو غدار کا خطاب دینے کے بعد اپنے آپشنز ختم کر لئے تھے اور ایک "غدار" کے ساتھ معاملات طے کرنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ لیکن انقلابی ٹولہ امریکی خواہشات سے ہم آہنگ کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر سکتا تھا۔ جولائی کے بعد سے یحییٰ خان اور ان کے جرنیل صورت حال سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اور صرف امریکہ پر انحصار کر رہے تھے کہ وہ ان کے بحران کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اندریں حالات کسنجر کی طرح یہ فرض کر لینا درست نہیں تھا کہ جرنیل اس دوست قوت کے سیاسی دباؤ کو ٹھکرا دیں گے۔ جسے وہ اپنی بڑی طاقت خیال کرتے تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ "پاکستان

مخالف" امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا یہ موقف کہ یحیٰی خان کو سیاسی حقائق کا سامنا کرنے پر مجبور کیا جائے، پاکستان کے مفادات کے لئے وہائٹ ہاؤس کے جھکاؤ سے زیادہ مفید ثابت ہوسکتا تھا۔

کرسٹووین ہولن جس نے 1969ء سے 1972ء تک امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں مشرق قریب اور جنوبی ایشیاء کے معاملات کے لئے ڈپٹی اسسٹنٹ سیکرٹری کے طور پر خدمات سرانجام دیں اور جو بنگلہ دیش کے بحران کے دوران امریکی فیصلہ سازی کا گواہ تھا۔ اپنی عقب بینی کی صلاحیت سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"اگر نکسن اور کسنجر بھارت اور پاکستان کے باہمی تنازعے کو سپر پاور کے عالمی نکتہ نظر کے مطابق ڈھالنے کی خواہش پر قابو پالیتے تو 1971ء میں امریکی مفادات کو زیادہ فروغ دیا جاسکتا تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسندانہ مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس تنازعے کو جنوبی ایشیاء کے علاقائی سیاق وسباق میں حل کرنے کی کوشش کرتے۔ امریکہ کو چاہئے تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے استیصالی رویے کے خلاف ابتداء میں ہی مذمتی بیان جاری کر دیتا۔ بعدازاں پاکستان کو فوجی ساز وسامان کی فراہمی کا سلسلہ ترک کر دیتا۔ اس طرح بعد میں جو رخنے پیدا ہوئے انہیں بڑی سرعت کے ساتھ پر کیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ خیالات سفارتی ذرائع کے توسط سے صدر یحیٰی پر پیشگی واضح کر دئے جاتے۔ انہیں بتا دیا جاتا کہ امریکی عوام اور کانگریس انسانیت اور انسانی حقوق کے حوالے سے مشرقی بنگال کی صورت حال پر بہت فکرمند ہیں تو چین کے ساتھ دوستی کا آغاز متاثر نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ چین کے ساتھ امریکہ کے خوشگوار تعلقات فطری اور منطقی طور پر پاکستان اور چین دونوں کے لئے فائدہ مند تھے۔ بھارت اور پاکستان دونوں کے اندر امریکی رسوخ محدود تھا۔ اگر نکسن انتظامیہ ابتداء میں ہی یہ قدم اٹھالیتی اور پھر بھارت پر دباؤ ڈالا جاتا تو اول الذکر کی نیک نیتی اور اخلاص مندی کے ثبوت کا حجم بڑھ جاتا کیونکہ یحیٰی خان کے پاس کوئی متبادل نہیں تھا۔ لہذا مشرقی پاکستان کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل نکالنے کے لئے یحیٰی خان کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور انہیں مجبور کر دیا جاتا۔ اس طرح پاکستانی صدر پر امریکہ کے اثر ورسوخ میں بھی کمی واقع نہ ہوتی"۔

امریکہ نے صرف بھارت پر دباؤ ڈالنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خلیج بنگال میں موجود اپنے ساتویں بحری بیڑے کو بھی حرکت میں آنے کا حکم جاری کر دیا۔ جس کا بظاہر مقصد بھارت کو پاکستان ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے باز رکھنا تھا۔ اندرا گاندھی نے یہ دباؤ نظر انداز کر دیئے اور بھارتی فوج ڈھاکہ تک مشرقی پاکستان کے اندر گھستی چلی گئی۔ مشرقی پاکستان میں موجود پاکستانی فوج نے 16 دسمبر 1971ء کو بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ 90 ہزار کے قریب پاکستانی فوجیوں اور سویلین افراد کو جنگی قیدیوں کی حیثیت میں بھارت منتقل کر دیا گیا اور سابقہ مشرقی پاکستان بالآخر بنگلہ دیش بن گیا۔

ہتھیار ڈالنے سے 4 دن بعد 20 دسمبر 1971ء کو یحییٰ خان کو ان کے سینئر کمانڈروں نے توہین آمیز انداز میں اقتدار سے الگ کر دیا۔ بطور چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر اپنے 33 ماہ پر محیط دور اقتدار میں یحییٰ خان نے پاکستان کی دفاعی اسٹیبلشمنٹ اور اسلام پسندوں کے درمیان کیفیتی اتحاد میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ بجائے اس کے کہ پاکستانی فوج جس میں پنجابی مسلمانوں کی اکثریت تھی اور بنگالیوں کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی کے بعد یہ سوال اٹھتا کہ آیا صرف اسلام پاکستان کو متحد رکھنے کے لئے کافی تھا یا نہیں۔ بھارتی فوج کی مدد سے مشرقی پاکستان کی پاکستان سے علیحدگی نے پاکستان میں اسلام کا سیاسی کردار مزید بڑھا دیا۔ ہندو بھارت کے لئے پاکستانی فوج کی اداراتی نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں جو ذلت اور اہانت اٹھائی تھی اس کے انتقام کی خواہش بھارت دشمنی میں اضافے کا باعث بن گئی۔

پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو یہ ادراک بدستور رہا کہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ملنے والی اقتصادی اور عسکری امداد پاکستان کے ویژن کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر تھی لیکن امریکہ پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے فوجی مدد دینے میں ناکام رہا۔ پاکستان میں اس ناکامی کی توجیہہ یہ کی گئی کہ اس نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ نتیجتاً پاکستان کے اندر یہ سوچ پیدا ہوگئی کہ امریکہ سے تعاون کے حصول کا سلسلہ تو جاری رہے لیکن آئندہ اس پر انحصار یا بھروسہ نہ کیا جائے۔

پرانا اور نیا پاکستان

مشرقی پاکستان کا الگ ہو کر بنگلہ دیش بن جانا بطور ایک آزاد مملکت پاکستان کی مختصر سی زندگی کا المناک سانحہ تھا۔ ملک کی آبادی نصف سے بھی کم ہو گئی۔ پاکستان اپنے علاقے کے ایک قابل ذکر حصے سے محروم ہو گیا۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں اس کا جغرافیائی کردار بھی محدود ہو گیا اور اقتصادی اعتبار سے بھی ایک جزو اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ بھارت کے ہاتھوں شکست کی ہزیمت بھی ایک بہت بڑا نفسیاتی دھچکہ ثابت ہوئی۔ اسلامی نظریہ بنگالیوں کو پاکستان کا حصہ بنائے رکھنے میں ناکافی ثابت ہوا۔ پاکستانی فوج کی کا تاثر جسے جنرل شیر علی خان ایک نادیدہ کرشمہ کہا کرتے تھے اور جو اسے پاکستان پر حکومت کرنے کے قابل بناتا تھا وہ بھی بکھر کر رہ گیا۔

سالہا سال سے پاکستانی جرنیل اس تصور کو مقبول بنانے میں مصروف تھے کہ ایک مسلمان دوران جنگ پانچ ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ وہ اس مفروضے کی بنیاد پر آپریٹ کرتے رہے کہ "بھارتی حد درجہ بزدل اور غیر منظم ہیں لہذا وہ کسی ایسے فوجی ردعمل کا اظہار نہیں کر سکتے جو پاکستان کے لئے خطرہ بن سکے۔ ایوب خان کا یہ خیال درست تھا کہ صحیح وقت اور صحیح مقام پر صرف دو مکے رسید کر دیئے جائیں تو ان کے سامنے ہندو مورال نہیں ٹھہر سکتا"۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ پاکستان کے 97700 باقاعدہ اور نیم عسکری سپاہی بھارتیوں کے پاس جنگی قیدی بن گئے۔ 12500 سویلین مددگار ان کے علاوہ تھے۔ مزید براں پاکستانی فوج اپنا یہ عہد نہ نبھا سکی کہ وہ آخری آدمی کے زندہ رہنے تک لڑتی رہے گی۔ میدان جنگ میں ابھی صرف 1300 فوجی کام آئے تھے کہ مشرقی کمان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ادھر مغربی محاذ پر بھی صرف 1200 جانوں کے نقصان نے فوجی کارکردگی میں سے جوش و خروش منہا کر دیا۔

پاکستان کا امریکہ کے ساتھ اتحاد اول الذکر کی مسلح افواج کی تربیت اور انہیں اسلحے اور دیگر ساز و سامان سے لیس کرنے میں تو ممد ثابت ہوا۔ لیکن پاکستان کی سالمیت کی ضمانت دینے میں ناکام رہا۔ پاکستان کی حکمران اشرافیہ توقع رکھتی

تھی کہ مذہبی قوم پرستی، بھارت کے ساتھ تعلقات میں کھنچاؤ اور مغرب کے ساتھ اتحاد "سول ملٹری امتزاج" کی نگرانی میں پاکستان کی بقاء اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرے گا۔ "سول ملٹری اشرافیہ" نے پاکستان کے دفاع کے لئے جو سہہ جہتی پالیسی مرتب کی تھی وہ ملک کی تقسیم کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکی۔ جن دنوں بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا، امریکہ کی ایک علمی شخصیت پاکستان میں مقیم تھی۔ جس نے بچے کھچے پاکستان کے متعلق بالاختصار مندرجہ ذیل تبصرہ کیا:-

"نظریہ پاکستان اب اس اعتبار سے قابل قبول نہیں رہ گیا کہ یہ ملک جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی مادر وطن ہے۔ ذمہ دار عہدوں پر فائز سرکاری افسران اور کاروباری لوگ نظریہ پاکستان اور اس کے مستقبل کے لئے اتنے پر یقین نہیں جتنے ان کے باپ یا بڑے بھائی تھے۔ مایوسی، بے یقینی، شکوک وشبہات اور قنوطیت وہ اوصاف ہیں جو پاکستان کی دانشورانہ فضا کی وضاحت کرتے ہیں۔ دو شاخہ ہونے کے باعث پاکستان نے صرف جغرافیائی اعتبار سے اپنا علاقہ ہی نہیں کھویا بلکہ اعتماد کا ضیاع ایک شدید تر مگر نادیدہ نقصان ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اب وہ اعتماد بحال نہیں ہو سکے گا"۔

جب بھارتی فوج نے ڈھاکہ فتح کیا تو مغربی پاکستان کے عوام یہ بُری خبر سننے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ ریاستی کنٹرول میں مغربی پاکستان کا میڈیا پاکستانی فوج کی تصوراتی فتح کے من گھڑت قصے سنا رہا تھا۔ "بھارت کو کچل دو" کے نعروں اور ان نعروں پر مشتمل پوسٹروں اور سٹکروں سے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کی دیواریں بھر دی گئی۔ بھارتی فوج جب مغربی ممالک کے جنگی نامہ نگاروں کے ہمراہ جیسور میں داخل ہوئی تو مقامی بنگالیوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ حکومت کے ملکیتی اخبار "پاکستان ٹائمز" نے جیسور کو "پاکستان کا سٹالن گراڈ" قرار دیا۔ اخبار کے مدیر زیڈ۔ اے سلہری نے لکھا "ہمارا فوجی ایک کاملاً مختلف قسم کا فوجی ہے۔ بالخصوص اپنے بھارتی ہم منصبوں سے تو وہ بالکل ہی مختلف ہے۔ وہ بیک وقت اسلحے اور ایمان سے مسلح ہوتا ہے"۔ بھارتی دعوؤں کی تکذیب اور نفی کے لئے جھوٹ بولا جاتا رہا کہ بنگلہ دیشی بنگالی بھارتی جارحیت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے۔ حالانکہ عالمی میڈیا نے سقوط مشرقی پاکستان کے متعلق بھارتی دعوؤں کی تصدیق کر دی تھی۔ ریڈیو پاکستان سے سقوط ڈھاکہ سے صرف چار دن قبل اعلان کیا گیا کہ "ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے فوجی اپنی جانیں قربان کر دینے کا پختہ عزم رکھتے ہیں"۔

اگرچہ فوج کی اعلیٰ کمان ہر بات اور ہر پیش رفت سے بخوبی باخبر تھی لیکن مغربی پاکستان کے عوام کو آخری وقت تک شکست قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کیا گیا۔ بالآخر مختلف خاکوں پر مشتمل رپورٹیں تیار کی گئیں جن میں بتایا گیا کہ فوجی صورت حال سنگین ہے اور فوج تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ صرف 16 دسمبر 1971ء کی سہ پہر جب ڈھاکہ کی ریس کورس گراؤنڈ میں ہتھیار ڈالنے کی رسمی تقریب منعقد ہو رہی تھی، پاکستانی حکومت نے 27 الفاظ پر مشتمل ایک بیان جاری کیا کہ "تازہ ترین رپورٹ کے مطابق بھارت اور پاکستان کے مقامی فوجی کمانڈروں کے درمیان سمجھوتہ طے پا جانے کے بعد جنگ بند کر دی گئی ہے اور بھارتی فوج ڈھاکہ میں داخل ہو چکی ہے"۔ مغربی پاکستان کے عوام کے لئے

جنہیں نویدیں سنائی جا رہی تھیں کہ جہاد میں فتح ہمارے قدم چومنے والی ہے، یہ خبر ایک بہت بڑا دھچکہ ثابت ہوئی۔ جنگ ہار دی گئی اور برج نہ الٹائے جا سکے۔

فوجی قیادت کے ایک طبقے کی شدید خواہش تھی کہ بچے کھچے ملک پر فوج بدستور حکومت کرتی رہے۔ وہ طبقہ چاہتا تھا کہ عوام کو نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حقائق سے آگاہ کیا جائے۔ جی ایچ کیو راولپنڈی میں چیف آف جنرل سٹاف نے فوج کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ کو حکم دیا کہ "جاؤ اور قوم کو اس دھچکے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرو۔ عوام کو جو جی چاہے بتا دو۔ کچھ بھی کہہ دو۔ یہ تمہارا کام ہے۔ کسی بھی ملک کو اپنی مسلح افواج سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ ہم نے شدید رکاوٹوں کے باوجود جو کیا۔ کوئی فوج اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھی"۔

پاکستان کی فوجی شکست کے حجم اور پاکستان پر اس کے ممکنہ اثرات کو ہضم کرنا پاکستانی عوام کے لئے آسان نہیں تھا۔ تمام بڑے بڑے شہروں کی سڑکوں پر اور گلیوں میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ فوراً ہی شروع ہو گیا جو ٹیلی ویژن اور ریڈیو سٹیشنز حکومتی نگرانی میں کام کر رہے تھے وہاں متعین کردہ افراد نے اپنے معمول کے مسودے ایک طرف رکھ دیئے اور حکمران فوجی ٹولے پر تنقید کے کوڑے برسانے لگے۔ فوج میں بھی "ارتعاش" کا مشاہدہ کیا گیا۔ اعلیٰ فوجی افسران کی ریشہ دوانیوں اور افراتفری کی وضاحت کرتے ہوئے ائر مارشل اصغر خان لکھتے ہیں:۔

"ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کی پسپائی سے چند دن بعد چیف آف دی جنرل سٹاف گل حسن خان نے کلیدی اور اہم فوجی فارمیشنوں کا دورہ کیا تاکہ فوج کے موڈ کا جائزہ لیا جائے۔ انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ یحییٰ خان کے خلاف شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ لہذا انہیں ہر صورت قائل کیا جائے کہ اقتدار چھوڑ دیں۔ وہ نیم دلی سے عہدہ صدارت سے دستبردار ہونے پر تیار ہوئے تاہم مصر رہے کہ انہیں بدستور برّی فوج کا کمانڈر انچیف رہنے دیا جائے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ برّی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل حمید خان جی ایچ کیو سے وابستہ افسران سے خطاب کریں اور میجر سے اوپر تمام عہدوں کے حامل جی ایچ کیو کے تمام افسران کو گفتگو کے لئے اکٹھا کر لیا گیا۔ وہ اجلاس اس الجھاؤ کی نذر ہو گیا کہ افسران جنرل حمید خان کی بات ہی سننا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ یحییٰ خان سے کمانڈر انچیف کے عہدے کا چارج خود سنبھالنے کے لئے لابنگ کر رہے تھے"۔

افسران نے بری فوج کے چیف آف سٹاف کو دوران خطاب ٹوکا اور مطالبہ کیا کہ فوجی میسوں میں شراب پر پابندی عائد کر دی جائے۔ کیونکہ یحییٰ خان سمیت سنیئر فوجی جرنیلوں کا ٹولہ کثرت مے نوشی کی شہرت رکھتا تھا۔ کچھ یونٹوں نے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور باغیانہ روش اختیار کرتے ہوئے اصرار کیا کہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔ ایک سنیئر سول بیوروکریٹ لکھتے ہیں "انتقال اقتدار کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا اور کہا جانے لگا کہ اختیارات خود اعتمادی

سے خالی اور توہین زدہ یحییٰ سے لیکر بھٹو کو دیدیا جائے جو مرد دوراں ہیں اور جن میں جرات، حوصلہ، توانائی، فن خطابت اور علم تاریخ جیسی قائدانہ خوبیاں موجود ہیں"۔ جب یحییٰ خان سے قریبی تعلق کے حامل ایک جرنیل نے "ایلیٹ کمانڈر یونٹ" کو بیرون ملک سے واپس آنے والے مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت کے منتخب راہنما ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری پر مامور کرنا چاہا تو جونیئر افسروں نے اس کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

اندریں حالات یحییٰ خان کا بدستور مقتدر رہنا ممکن نہیں تھا۔ یحییٰ خان نے اپنے طور پر 17 دسمبر 1971ء کو یعنی سقوط ڈھاکہ سے اگلے دن قوم سے خطاب کا پروگرام بنایا۔ وہ نئے آئین کے خدوخال بیان کرنا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں "نظریہ پاکستان کو تحفظ اور فروغ" دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ جونیئر فوجی افسران اور سرکاری ملازمین کی وفاداریاں انہیں بالکل ہی حاصل نہ تھیں لہذا وہ خطاب نہ کر سکے۔ بھٹو جو امریکہ سے واپسی پر روم رکے ہوئے تھے۔ یحییٰ خان سے چارج لینے پاکستان پہنچ گئے۔

آئین کی عدم موجودگی میں بھٹو نے یحییٰ خان سے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدوں کا چارج لے لیا۔ دونوں عہدے بیک وقت یحییٰ خان کے پاس تھے۔ بھٹو نے یحییٰ خان کو پوری مراعات اور عزت کے ساتھ ریٹائر کیا۔ جن جرنیلوں کی آخری وقت تک کوشش رہی تھی کہ کسی سویلین کو ریاست کا سربراہ نہ بننے دیا جائے۔ ان کے ساتھ بھی یہی فیاضانہ سلوک کیا گیا۔ بھٹو نے لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان کو نیا آرمی چیف نامزد کیا تو یہ تاثر عام ہو گیا کہ فوجی افسران نے یحییٰ خان کے خلاف جو علم بغاوت بلند کیا تھا اس میں جنرل گل حسن نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ادھر لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان نے اپنی یادداشتوں میں دعویٰ کیا کہ انہیں بھٹو کے صدر بننے کا علم اس وقت ہوا جب بری فوج کی کمان قبول کرنے کے بعد انہیں بھٹو کی طرف سے مسلح افواج میں سیاسی مداخلت نہ کرنے کی یقین دہانی پر مشتمل خط موصول ہوا۔ جن افسران نے یحییٰ خان کے خلاف بغاوت کی تھی، ان کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ وہ انتقال اقتدار کے محرکات سے بے خبر تھے۔ ان میں سے ایک افسر نے بتایا کہ جنرل حمید خان کو جی ایچ کیو میں دوران خطاب باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت روکا گیا تھا۔

یہ جاننا کہ یحییٰ خان کو پرامن طور پر بھٹو کو اقتدار منتقل کرنے پر کس نے قائل کیا، اس لئے اہم ہے کہ اس کا بھٹو کے چند متنازعہ فیصلوں اور ان حالات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جن کے تحت انہیں اقتدار سے الگ کیا گیا۔ جرنیلوں کا جو ٹولہ یحییٰ خان کے بہت قریب تھا اگر وہ اقتدار بھٹو کو منتقل نہ کرنے پر تلا ہوا تھا اور پی پی کے راہ نما کو اقتدار دلوانے میں لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان نے بھی کوئی فعال کردار ادا نہیں کیا۔ تو فوج میں شامل صرف ایک عنصر بچتا ہے۔ جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یحییٰ خان کو انتقال اقتدار پر مجبور کیا ہو گا اور وہ عنصر ہے ملٹری انٹیلی جنس میں شامل سینئر جرنیل۔ یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ نہ تو بھٹو نے میجر جنرل اکبر خان کو ریٹائر کیا جو 1970ء میں ہونے والے انتخابات کے دوران آئی ایس آئی کے سربراہ تھے اور نہ ہی ان کے جانشین میجر جنرل (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) غلام جیلانی کو ریٹائر کیا جو

انتقال اقتدار کے وقت آئی ایس آئی کے سربراہ تھے۔ درحقیقت جتنے برس بھٹو نے اقتدار میں گزارے۔ آئی ایس آئی کی سربراہی جنرل جیلانی کے پاس رہی۔ بقول بھٹو جب انہوں نے آرمی چیف کے لیے جنرل ضیاء الحق کا انتخاب کیا تو جنرل جیلانی ان کے چوائس پر اثر انداز ہوئے۔ وہ جنرل ضیاء جنہوں نے بعد میں بھٹو کو اقتدار سے نکال باہر کیا اور پھانسی پر لٹکا دیا۔ یحییٰ خان کے مٹھی بھر ساتھیوں کے علاوہ زیادہ تر افسران جو یحییٰ خان کی سیاسی تقسیم کی ناکام حکمت عملی پر مذہبی جماعتوں کی مدد سے عملدرآمد میں ملوث تھے۔ ان کی نوکریاں بحال رہیں اور وہ فوج کے اعلیٰ ترین عہدوں سے مستفید ہوئے۔ بھٹو کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے نائبین دلیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ اس مرحلے پر سویلین حکومت کے قیام میں پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز ممد ثابت ہوئیں جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان کی اور فوج کی اداراتی برتری برقرار رہے۔

بطور ادارہ فوج کو ایک ایسے مقبول اور ہردلعزیز سیاسی راہ نما کی ضرورت تھی جو پاکستان کی سالمیت کے چکنا چور شیشے کی کرچیاں سمیٹ سکے۔ بھٹو کو برسراقتدار آنے کی اجازت دیکر جرنیل توقع کرنے لگے کہ مشرقی پاکستان میں فوج کے کردار پر جو تنقید ہوتی ہے۔ اس کا رخ بھی بدل جائے گا اور وہ پاکستان کے دولخت ہونے میں بھٹو کے کردار پر ہونے والے سیاسی مباحث پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرسکیں گے کہ وہ کس طرح شیخ مجیب الرحمان کو اکاموڈیٹ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ بھٹو کے مخالفین خوش تھے کہ برسراقتدار آتے ہی ان پر عائد کیا جانے والا یہ الزام ان کے ہاتھ لگ گیا جو مختصر عرصے میں فوج کی شہرت بحال کرنے میں ممد ثابت ہوا۔ فوجی قیادت نے درج ذیل معاملات میں اپنے مفروضے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ (1) حاکمیت کی مرکزیت (2) بھارت کے ساتھ دشمنی اور (3) بھارت کے ساتھ دشمنی کو ہوا دینے کے لیے بیرونی امداد پر انحصار۔ اقتدار سے باہر ہونے کے باوجود فوج اپنے اسلام پسند اتحادیوں پر انحصار کرسکتی تھے کہ وہ ایک نئے پاکستان کو متشکل کرنے کے لیے پاکستان کے نئے حکمران پر دباؤ ڈالیں اور وہ نیا پاکستان پرانے پاکستان سے ہر اعتبار سے مختلف ہو۔

تقریباً دوعشروں کے دوران ذوالفقار علی بھٹو پاکستان پر حکومت کرنے والے پہلے سویلین حکمران تھے۔ 1951ء میں ایک سرکاری ملازم غلام محمد پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے۔ ان کے دور کے آغاز کے بعد حقیقی اختیارات "سول ملٹری امتزاج" کے پاس رہے۔ بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی صرف 4 سال قبل یعنی 1967ء میں معرض وجود میں آئی تھی۔ تنظیمی اعتبار سے یہ کوئی مضبوط سیاسی جماعت نہیں تھی۔ اسے ملنے والی عوامی حمایت اور اس کی تنظیمی ساخت بھٹو کی کرشماتی شخصیت کے گرد گھومتی تھی۔ پاکستانیوں کی اکثریت کے نزدیک بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی انقلابی تبدیلیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں جو ووٹ پی پی پی کو ملے۔ ان کا تجزیہ عوام کے نام پارٹی کی اپیل کی وضاحت کرتا ہے۔

بھٹو کا کلیدی نعرہ "روٹی کپڑا اور مکان" تھا۔ یہ نعرہ ایک سیکولر مطالبہ ہے جو کم مراعات یافتہ طبقے بہتر زندگی گزارنے کی خواہش کے تحت پیش کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان سے اسلام کو مٹا دینا ناقابل تصور تھا۔ بہت مشکل تھا کہ یہ پروگرام روایتی دیہی اشرافیہ اور ملاؤں کو اپیل کرتا۔ لہذا پی پی پی کو اپنی مہم چلانے کے لئے وہ دروازہ بند ملا۔

مزید براں ترقی کی سطح، جدیدیت اور پی پی کو ملنے والی عوامی حمایت کے درمیان بھی بہت مضبوط رشتہ تھا۔ اسے ان علاقوں سے نسبتاً زیادہ ووٹ ملے جہاں جدیدیت کا عمل تیز رفتاری سے جاری تھا۔ یہ پاکستانی سیاست میں انقلابیت کی علامت تھی۔ یہ انقلابیت پرانے نظام اور اس کے تشکیلی عناصر کے خلاف تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں ووٹ دینے کا مطلب یہ تھا کہ اس سسٹم کے خلاف ووٹ دیئے جا رہے تھے جس سے عوام کو الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔

صدر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی پارٹی کی ہائی کمان نے جس طرح پاکستانی سیاست میں سیکولر روح پھونکی اس پر ایک پاکستانی قلمکار لکھتے ہیں۔

"انیسویں صدی میں عظیم مسلمان مصلح سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی قیادت کٹڑ مذہبی ٹولے کے ہاتھوں سے چھینی اور انہیں ترقی اور جدید یدیت کی راہ پر ڈال دیا۔ 1947ء تک سیاست میں یہی رجحان حاوی رہا۔ لیکن 1948ء میں محمد علی جناح کی وفات کے بعد جلد ہی دائیں بازو۔ (اسلام پسند) کی جماعتوں نے ایک مرتبہ پھر سر ابھارا۔ اقتصادی اور سماجی پروگراموں کے فقدان کے باعث سیاستدانوں نے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل اور فروغ کے لئے گمراہ کن حربے اپنا لئے اور مذہبی جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا۔ یہ کریڈٹ بھٹو کو جاتا ہے کہ انہوں نے اشتراکی منشور کی حامل ایک پارٹی تیار کی۔ جس کے نتیجے میں معاشی اور سماجی معاملات حد درجہ اہمیت اختیار کر گئے جن کا کروڑوں انسانوں کے ساتھ براہ راست تعلق تھا۔ انہوں نے مذہب کو سیاست سے بڑی کامیابی سے الگ کیا۔ دائیں بازو کی جماعتوں نے بھٹو کی راہ میں روڑے اٹکائے اور گھٹیا حربے استعمال کئے تاہم پاکستان پیپلز پارٹی نے انتخابات میں قابل رشک اور شاندار فتح حاصل کی اور سر سید احمد خان نے مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا جو عمل شروع کیا تھا اسے بحال کر دیا۔ اب معاشی معاملات سیاست کے رخ کا تعین کریں گے"۔

"سول ملٹری امتزاج" اور پاکستانی سیاستدانوں کی پہلی نسل نے جو نظریاتی بت تعمیر کیا تھا۔ سیاست سے مذہب کو الگ کرنے کے لئے بھٹو کو وہ بت توڑنا پڑا۔ بھٹو نے سماجی معیارات پر مشتمل ایک ایسا ویژن پاکستان کو دیا جس کا مقابلہ یورپ کے کچھ حصوں کے سماجی معیار سے کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے تعصبات اور جہل وضلالت کے خلاف جنگ کی بات کی۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کے فروغ کا تذکرہ کیا۔ جو وقار پاکستان کے شہریوں کا حق تھا۔ اس کی بحالی کا ذکر کیا اور پورے ملک میں تعلیم اور صحت عامہ کی سہولتوں تک آسان رسائی کو اپنی گفتگوؤں اور خطابات کا موضوع بنایا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بھارت کے ساتھ تصادم کی فضا برقرار رہے۔ ان کے آمرانہ اور مطلق العنانیت پر مبنی رجحانات کے ساتھ ساتھ بھارت کے بارے میں ان کی پالیسی بھی ان کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنی۔

پاکستان اپنے دفاعی بجٹ کو کم کئے بغیر سماجی شعبے پر اٹھنے والے اخراجات میں اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔ بھارت کے ساتھ مقاومت کی پالیسی ایک نظریاتی ضرورت تھی۔ یہی نظریاتی ضرورت ایک بڑے دفاعی بجٹ کا جواز فراہم کرتی تھی۔

اس پالیسی نے بھٹو کو پاکستانی ریاست کو سیکولر بنانے کے عزم اور ارادے سے بھی دور کر دیا۔ بھٹو سیاست میں پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کا کردار کم کرنے میں بھی ناکام رہے بلکہ بعض معاملات میں ان کے کردار کو بڑھانا پڑا تاکہ ملکی سیاست میں مسٹر بھٹو کی برتری قائم رہے۔ فوج نے بھٹو کی سویلین انتظامیہ کو ایسے فیصلے کرنے پر مجبور کیا جو نتیجتاً اول الذکر کی عزت اور شہرت کو بحال کرنے کا باعث بن سکیں اور ملکی معاملات میں اسے وہی رسوخ اور مقام ومرتبہ حاصل ہو جائے جو ایوب خان اور یحییٰ خان کے ادوار حکومت میں میسر تھا۔ اپنے نائب شاہی تسلط کو یقینی بنانے کے لئے "سول ملٹری امتزاج" کو اسلامی گروہ ایک مرتبہ پھر بطور اتحادی میسر آگئے۔

سیکولر اور اشتراکی نعرے اور بھارت مخالف موقف بھٹو کی عوامی مقبولیت کا باعث بنے۔ 1971ء میں بھارت کے ہاتھوں پاکستان کی فیصلہ کن شکست سے قبل انہیں اپنی سماجی ومعاشی خواہشات اور فوجی اعتبار سے بھارت کے ساتھ مقابلے کی خواہش کے درمیان موجود تضاد کا ادراک نہ تھا۔ تقسیم کے بعد چونکہ زیادہ تر ملکی وسائل فوج کی صوابدید پر تھے۔ لہذا وہ اپنے ناقابل تسخیر ہونے کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل وہ اپنی سٹریٹیجک ناکامیوں کو چھپانے میں کامیاب رہی لیکن اب چونکہ فوج اپنا مقام ومرتبہ کھو چکی تھی۔ لہذا تبدیلی کا موقع موجود تھا۔ بھارت کے بارے میں بھٹو کی سوچ نے ایک مختلف راہ متعین کر دی:۔

" بھٹو نے بھارت کو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن کے طور پر متعارف کرایا۔ ایسی صورت میں وہ لامحالہ پاکستان کا بھی پکا دشمن تھا۔ جو اسے لخت لخت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کیا جو بے خوف تھا اور بھارت کے ارادوں کو بھی خاک میں ملا سکتا تھا۔ اپنے مخالفین کو انہوں نے (دشمن کو) خوش کرنے والوں اور اس کے ایجنٹوں کے طور پر متعارف کرایا۔ انہوں نے کہا کہ بھارت کے ساتھ مقاومت کی پالیسی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت نہیں دیتا اور بھارتی مسلمانوں پر ظلم وستم بند نہیں کرتا۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد ہی وہ بھارت کو تعاون کی پیش کش کر سکتے تھے۔ لیکن حالات جو رنگ بھی اختیار کر لیں۔ بقول بھٹو وہ بھارت کی برتری اور تسلط کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے"۔

یہ موقف اختیار کرنے کے بعد بھٹو کو ایک ایسی دفاعی پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا جو سابقہ فوجی حکومتوں کی دفاعی پالیسیوں سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ سقوط مشرقی پاکستان کی وجوہ کے تعین کے لئے جو انکوائری کمیشن تشکیل دیا گیا تھا، اس کی پیش کردہ رپورٹ کو بھٹو نے خفیہ رکھا تاکہ فوج پریشان کن صورت حال سے دوچار نہ ہو۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے کچھ اقتباسات سقوط مشرقی پاکستان سے 33 برس بعد منظر عام پر لائے گئے جو پاکستانی جرنیلوں کے سٹریٹیجک واہموں اور مغالطوں اور ان کے کردار کے لئے آج کے دن تک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ اگر پاکستان کی تقسیم کے بعد جلد ہی وہ رپورٹ منظر عام پر لائی جاتی تو فوج کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اس رپورٹ کے اجراء کو التواء میں ڈال کر بھٹو نے

فوج پر مہربانی کی۔ التواء کا فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے میڈیا کے توسط سے ایک باقاعدہ مہم چلائی جس میں (قدرتی آفات کے موقع پر) فوج کے ریلیف ورک اور دشمن ہمسائے کے مقابلے میں ملکی دفاع جیسی خدمات کو سراہا گیا۔ 1971ء میں وقوع پذیر ہونے والے المیے کے نتیجے میں فوج کی شہرت اور وقار کو جو نقصان پہنچا تھا بھٹو کے ان اقدامات سے اس کا ازالہ بھی ہو گیا اور 1977ء میں بھٹو کو اقتدار سے بھی معزول کر دیا گیا جس کی بنیادی وجہ وہ صورت حال بنی جو ان کے اسلام پسند سیاسی مخالفین کی پیدا کردہ تھی۔

بھٹو نے ایک منقسم مخلوط انتخابی اتحاد تشکیل دیا جس میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے سوشلسٹ، سندھ اور پنجاب کے زمیندار، صنعتی کارکن، طلباء حتیٰ کہ کچھ صنعتکار بھی شامل تھے۔ مذکورہ اتحاد کی تشکیل کے وقت بھٹو نے مختلف لوگوں سے مختلف وعدے کئے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح کی طرح بھٹو بھی پاکستان کے متعلق اپنے ارادوں کے بارے میں کسی حد تک ابہام کا شکار تھے۔ مسٹر جناح نے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کو ایک ملک کے حصول کے لئے متحرک تو کر دیا لیکن وہ اس امر کی تفصیلات طے نہ کر سکے کہ اس ملک کو چلانا کس طرح ہے۔ بھٹو نے بھی ارتکاز دولت واقتدار کے خلاف اپنے طرفداروں کا ایک حلقہ تو تشکیل دے لیا لیکن وہ ان تفصیلات کی مکمل توضیح نہ کر سکے کہ وہ پاکستان میں بنیادی تبدیلیوں کے رونما ہونے کی امید کس طرح رکھتے ہیں۔

"1970 کے انتخابات میں مسٹر بھٹو کی فتح کی بڑی وجہ ان کے حلیفوں اور طرفداروں کا وہ حلقہ تھا جو ملک کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی اداروں کی مکمل اوور ہالنگ کا خواہاں تھا۔ بھٹو کے حلیفوں کے حلقے میں شامل وہ لوگ جو ایوب خان کے دور حکومت کے اواخر میں روایتی سیاسی راہنماؤں کی نشاۃ الثانیہ پر پریشان تھے، وہ "ماڈرنائزیشن" کا (بھٹو اس کے اردو متبادل کے طور پر "معاشرتی ترقی" کی ترکیب استعمال کیا کرتے تھے) مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن بھٹو اور ان کے حامی "معاشرتی ترقی" کی غیر مبہم اور واضح تعریف پیش کرنے میں ناکام رہے۔ لہٰذا برسر اقتدار آتے وقت بھٹو ایک ایسی پارٹی کو ہمراہ لائے جو ملکی اداروں کے ڈھانچوں کو یکسر بدل دینا چاہتی تھی۔ لیکن نئے ڈھانچوں کے خدوخال پر وہ اتفاق رائے حاصل نہ کر سکے۔ ویسٹ منسٹر طرز کی پارلیمانی جمہوریت سے لیکر روسی طرز کی پرولتاری آمریت تک سبھی نمونے پیش کئے گئے۔ انہوں نے اپنے حلقوں کو اپنی ترجیحات سے بے خبر رکھا۔ یہ تاثر کہ وہ اپنے لئے مختلف آپشنز کو کھلا رکھنا چاہتے ہیں ایک ایسی حکمت عملی تھی جو ان کے پیروکاروں اور مخالفین دونوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی تھی۔

بھٹو اس پوزیشن میں تھے کہ وہ اپنی توجہ کا رخ پرانی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے نظریے کی طرف بھی موڑ سکتے تھے اور ان لوگوں کو بھی تقویت بہم پہنچا سکتے تھے جو پاکستان کی ملی بنیادوں کا از سر نو تعین چاہتے تھے۔ جن حالات میں وہ برسر اقتدار آئے ان کا تقاضا تھا کہ وہ پاکستان کو تبدیلی کے عمل میں سے گزارنے سے قبل اپنی حاکمیت کو مستحکم کر لیں۔ اس مقصد کے

حصول کے لئے انہوں نے اپنی حاکمیت کو لاحق خطرے کی نشاندہی بھی کی اور اپنے اختیارات کو یکجا کرنے کے لئے پہلے چند ماہ کے دوران مارشل لاء کے تحت حاصل شدہ اختیارات بھی استعمال کیے۔ بھٹو کے مخالفین ان کے آمرانہ اقدامات کو ان کی عدم برداشت" اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے کی عادت" پر محمول کرتے ہیں۔ تاہم ان کے معترفین دلیل پیش کرتے ہیں کہ بھٹو کے ان اقدامات کی جزوی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو ایک ایسا انقلابی راہنما سمجھتے تھے جو ایک نئے نظام کی تعمیر میں مصروف تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک نئے سول معاشرے کی تعمیر اور اسے تقویت دینے میں ناکامی نے ان کی اقتدار سے معزولی میں بھی اہم کردار ادا کیا اور اسی بناء پر پاکستان مزید انحطاط سے دوچار ہو گیا اور اس پر ایک مرتبہ پھر فوج مسلط ہو گئی۔

پاکستان کی مذہبی جماعتوں، بالخصوص جماعت اسلامی نے بھٹو کی مخالفت کا اس دن ہی آغاز کر دیا تھا جس دن انہوں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔ کیونکہ 1970ء کے انتخابات کی مہم کے دوران وہ انہیں اور ان کے اشتراکی نظریات کو اسلام کے لئے خطرہ قرار دے چکے تھے۔ مذہبی راہنماؤں کے لئے کسی طرح قابل قبول نہ تھا کہ بھٹو یا ان کی پارٹی ملک کی تقسیم کے المیے کے بعد پاکستان کی تعمیر نو میں کوئی کردار ادا کر سکے۔ جس دن بھٹو نے اقتدار سنبھالا، جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم نے لاہور میں ان کے پتلے نذر آتش کیے اور اس دن کو "یوم سیاہ" قرار دیا۔

یحییٰ دور میں اسلام پسندوں نے میڈیا میں جو رسوخ قائم کر لیا تھا اسے انہوں نے بھٹو کے خلاف استعمال کیا۔ انہیں مارشل لاء کے تسلسل پر اعتراض تھا۔ مزید براں ان کا موقف تھا کہ کوئی سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کیونکر بن سکتا ہے؟ جب پاکستان ٹیلی ویژن نے ایک نیوز بلیٹن کے دوران ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کی ہتھیار ڈالنے کی تقریب کی فلم دکھائی۔ جماعت اسلامی نے فوج کی توہین کی کوشش کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کر دیے۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ فوج نے بھی اسے بھٹو کی طرف سے فوج کو بدنام کرنے کی کوشش خیال کیا۔

فوج کے نجی خیالات اور اسلام پسندوں کے عمومی موقف کے درمیان مطابقت کی غیر معمولی سطح کا مشاہدہ کیا گیا۔ 1973ء کے اوائل میں جماعت اسلامی کے امیر نے فوج سے باقاعدہ اپیل کر دی کہ وہ بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دے۔ کیونکہ وہ "طبعاً، مزاجاً اور فطرتاً" اخلاق باختگی کا شکار تھے۔ بھٹو نے چند اسلام پسند اشاعتی اداروں پر پابندی عائد کر دی اور جماعت اسلامی کے راہنماؤں اور فعال کارکنوں کو اپنے ایمرجنسی اختیارات کے تحت گرفتار کر لیا۔ بری فوج کی کمان بدل کر انہوں نے اس پر بھی اپنی بالادستی قائم کر لی۔ جنرل ٹکہ خان نے جنہیں کمانڈر انچیف کی بجائے نامزد چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا۔ جنرل گل حسن سے مارچ 1972ء میں چارج لے لیا۔ جنرل ٹکہ خان کی شہرت تھی کہ وہ ایک پیشہ ور سپاہی ہیں۔ لیکن انہیں "بنگال کے قصاب" کا خطاب مل چکا تھا۔ اس منفی شہرت کے باعث وہ اس قابل نہیں تھے کہ کسی غیر

قانونی فوجی بغاوت کے لئے عوامی حمایت حاصل کر سکیں۔ بھٹو کا خیال تھا کہ صورت حال ان کے قابو میں تھی۔ 1972ء کے اواخر میں پاکستان کے سیاسی منظر پر ایک امریکی مبصر نے درج ذیل تبصرہ کیا:-

" ملکی معاملات اچھی طرح مسٹر بھٹو کے ہاتھ میں ہیں۔ سول سروس اور فوج میں ان کے جو حقیقی، بارسوخ اور تصوراتی مخالفین تھے یا تو انہیں گھر بھیج دیا گیا اور یا ان کی جگہ بھٹو کے پسندیدہ افراد نے لے لی۔ جو باقی بچے انہیں اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ وہ صدر کی اتھارٹی کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ بھٹو مختصر عرصے میں بہت سی کامیابیاں حاصل کر چکے ہیں۔ امریکہ نے اقتصادی امداد کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ یہ شواہد بھی ملے ہیں کہ چین اقتصادی اور عسکری شعبوں میں معاونت کر رہا ہے۔ عالمی تجارت اور تجارتی تناظر میں بھی پاکستان کی پوزیشن میں بہتری کا مشاہدہ کیا گیا"۔

صدر پاکستان اور بظاہر پاکستان کا قطعی حکمران بننے کے بعد دو دن کے اندر بھٹو نے امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ جس کا بنیادی مقصد امریکہ سے معاشی اور عسکری مدد کا حصول تھا۔ سفیر نے واشنگٹن لکھ بھیجا کہ " بھٹو کے خیال میں بھارت نے تقسیم ہند کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور نہ ہی اس خیال سے کبھی سمجھوتہ کیا"۔ جغرافیائی سرحدوں کے سکڑنے اور آبادی کم ہو جانے کے باوجود بھٹو نے دفاعی بجٹ کو کم کرنے کی بجائے اسے برقرار رکھا۔ بلکہ اسے وسعت دیکر ملک پر فوجی تسلط کے امکانات بڑھا دیئے۔ عبرتناک فوجی شکست سے صرف دو ماہ بعد پاکستان نے امریکہ کو پیش کش کر دی کہ وہ بلوچستان کے ساحل کے ساتھ اپنے فوجی اڈے قائم کر لے اور اس سہولت کے بدلے میں پاکستانی افواج کو دوبارہ مسلح کرے۔ یہ تجویز صرف سفارتی سطح پر ہی نہیں بھیجی گئی۔ آئی ایس آئی کے خارجی شعبے کے ایک رابطہ افسر نے امریکہ کے فوجی مشن میں شامل ایک افسر سے ملاقات بھی کی۔ یہ ملاقات آئی ایس آئی کے اعلیٰ افسران کی صوابدید پر کی گئی۔ امریکی افسر سے دریافت کیا گیا کہ آیا امریکہ پاکستان میں اڈوں کے قیام میں دلچسپی رکھتا ہے؟ پاکستانی فوج نے بڑی خاموشی سے اپنی تعمیر نو کا آغاز کر دیا اور جس طرح ماضی میں ہوا تھا۔ اس مقصد کے لئے امریکی معاونت کے حصول کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ اس مرتبہ اڈوں کی پیش کش سے ظاہر ہوتا تھا کہ فوج ماضی کے مقابلے میں زیادہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

وقتی طور پر ہی سہی۔ امریکہ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کو امریکی فوجی امداد کے بل بوتے پر بھارت کی برابری نہ کرنے دی جائے۔ اڈوں کی پیش کش بڑی نرمی سے ٹھکرا دی گئی۔ سیکرٹری آف سٹیٹ ولیم پی راجرز نے صدر نکسن کے نام ایک یادداشت تحریر کی جس میں جنوبی ایشیاء کی نئی صورت حال اور امریکی ترجیحات کا مختصر بیان موجود تھا:-

"دسمبر میں ہونے والی جنگ کے نتیجے میں جنوبی ایشیاء کے توازن میں جو بڑی تبدیلی رونما ہوئی اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نہیں چاہتے کہ پاکستان کو سٹریٹیجک اعتبار سے بھارت کے برابر لے آئیں۔ نہ ہی ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ جنوبی ایشیاء کے بارے میں اب ہماری پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ وسیع تر سیاسی مفاہمت اور سمجھوتوں کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ

مفاہمت یا سمجھوتے اس کھنچاؤ یا کشیدگی کی جگہ لے لیں جو گذشتہ 20 برس سے برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اس کی سالمیت کے تحفظ اور معاشی ترقی کے لئے ہم جو امداد مہیا کر رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہم بھٹو کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ بھارت کے ساتھ بنیادی امور پر سمجھوتے کی سمت قدم بڑھائیں۔ فوجی میدان میں ہم ہر ایسے اقدام سے گریز کریں جن سے پاکستان کی حوصلہ افزائی ہو کہ وہ ان مشکل فیصلوں کو ایک مرتبہ پھر موخر کر دے جو اس کے طاقتور ہمسائے کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے درکار ہیں۔ ہم بھارت کی بھی حوصلہ افزائی کریں اور وہ تسلیم کر لے کہ پاکستان کے ساتھ ہماری فیاضیانہ پالیسی میں اس کے طویل المیعاد مفادات مضمر ہیں اور اس طرح بھارت علاقائی استحکام کے حصول میں نسبتاً موثر کردار ادا کر سکے گا"۔

جنوبی ایشیاء میں توازن کے نئے تناسب کے قیام کا ایک موقع اس وقت میسر آیا جب جون 1972ء میں بچے کھچے پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے امن مذاکرات کے لئے بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے شملہ میں ملاقات کی۔ وہ ملاقات برابری کی بنیاد پر نہیں تھی۔ بھٹو کو پاکستان کا وہ 5139 مربع میل علاقہ واپس لینا تھا جس پر بھارت قابض تھا اور اس بھارتی راہنما سے اپنے جنگی قیدی رہا کرانا تھے جس نے ان کے ملک کی توہین کی اور اسے دو ٹکڑے کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اگرچہ بھارت کے نقطہ نظر کے مطابق مسئلہ کشمیر کا کوئی حتمی حل ٹھونسنے کا وہ بہترین موقع تھا۔ تاہم بھٹو نے مسز گاندھی سے درخواست کی کہ وہ اس موقع پر مذکورہ مسئلے کے کسی حتمی حل پر اصرار نہ کریں اور اس حوالے سے کسی دوطرفہ سمجھوتے سے اجتناب برتیں۔ مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو زہر آلود کر رہا تھا۔ اس کے حل کی صورت میں دونوں ہمسایہ ملکوں کے تعلقات معمول پر آ سکتے تھے۔ اس کا حل پاکستان کا یہ دماغی خلل بھی رفتہ رفتہ دور کر دیتا کہ بھارت پاکستان کی تباہی کے درپے ہے۔ بھٹو کی اس دلیل نے مسز گاندھی کو قائل کر لیا کہ پاکستانی فوج بھٹو کی کمزور اور بھر بھری حکومت کو یہ الزام دیکر معزول کر دے گی کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیر بھی کھو دیا۔

بھٹو اور مسز گاندھی نے اس مشترکہ اعلامیے پر اتفاق کیا کہ "دونوں ملکوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے اختلافات پر امن ذرائع اور دوطرفہ مذاکرات کے توسط سے حل کریں گے"۔ کشمیر میں جنگ بندی لائن کو لائن آف کنٹرول قرار دیدیا گیا۔ بھارت کی طرف سے اس مشترکہ اعلامیے پر دستخط کرنے والے حکام نے کہا کہ اس وقت جتنے علاقے پر جس فریق کا کنٹرول ہے۔ وہ قانونی قبضے کے مترادف تھا۔ بھارت کو یہ فائدہ پہنچا کہ کشمیر میں رائے شماری پر عالمی اصرار اور دباؤ کا دور ختم ہو گیا۔ بھٹو نے بعد میں ایک بیان دیا جس میں کہا کہ انہوں نے پاکستان کو ایک قطعی اور حتمی توہین سے بچا لیا ہے۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ اسے کشمیر پر اپنے دعوے سے کاملاً دست بردار ہونا پڑ جاتا لیکن مذہبی جماعتوں نے شملہ معاہدے کی توجیہہ یہ کی کہ پاکستان کو بیچ دیا گیا ہے اور پاکستان کے دشمن کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کرنے کے خلاف سڑکوں پر احتجاج شروع کر دیا۔

"شملہ سمجھوتے" کے نتیجے میں پاکستان میں رہ جانے والے 36000 بنگالیوں کا بنگلہ دیش جانا ممکن ہوگیا۔اس کے بدلے میں پاکستان کے نوے ہزار جنگی قیدی وطن لوٹ آئے۔ان میں سے اکثر کو فوج میں دوبارہ بھیج دیا گیا۔ان میں میجر جنرل فرمان علی جیسے بعض افسران ایسے بھی تھے جو یحیٰ حکومت کی اس کوشش کا حصہ تھے کہ بلا مقابلہ خصوصی انتخابات کی ترکیب کے ذریعے 1970ء میں ہونے والے انتخابات کے نتائج بدل دیئے جائیں۔ باقی وہ تھے جنہوں نے بنگالیوں کو بدنام اور رسوا کرنے کی مہم میں بھرپور شرکت کی تھی اور ان پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ ہندو اور بھارتی رسوخ کے زیر اثر تھے۔ تقریباً سبھی خانہ جنگی کے دوران اسلام پسند گروہوں اور فوج کی مبنی پر تعاون کوششوں سے متاثر ہوئے تھے۔بعض افسران نے اسلام پسندوں کے ساتھ ذاتی مراسم قائم کر لئے تھے اور ان کے ساتھ تبادلہ خیالات بھی کرتے تھے۔

مشرقی پاکستان کے آخری ایام میں اسلام پسندوں اور فوج کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کو ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔1971ء کی جنگ کے فوراً بعد بھٹو نے امریکی حکام کو بتایا کہ مسز گاندھی نے پورے برصغیر میں "ایک سے زیادہ بنگلہ دیش" بنانے کی بنیاد کس طرح رکھی تھی۔ مطلب یہ کہ 1947ء میں تقسیم ہند کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی ایک ریاست کے حصے بخرے ہوگئے تو چاروں طرف علیحدگی پسند تحریکیں شروع ہو جائیں گی اور ہمسایہ ریاستیں ان تحریکوں کی حوصلہ افزائی کریں گی۔ ظاہر ہے بھٹو کے ذہن کے مطابق بھارت سے انتقام لینے کے امکانات موجود تھے۔جس قسم کی تحریک کے نتیجے میں بنگلہ دیش دنیا کے نقشے پر ابھرا اس جیسی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی تھی۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان جو توازن درکار تھا اس کی عدم موجودگی میں مغربی پاکستان میں بھی علیحدگی کے جراثیم پھیل رہے تھے جس پر بھٹو پریشان تھے۔ "نئے پاکستان" کے متعلق بھٹو کو جو خدشات لاحق تھے اور جو منصوبہ بندی انہوں نے کی وہ "پرانے پاکستان" کے حکمرانوں کے خدشات اور منصوبہ بندی سے مختلف نہیں تھے۔

بھٹو نظریاتی جھکاؤ کی حامل فوج رکھنے کے خلاف نہیں تھے بلکہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے علاقائی مقام و مرتبے کی تجدید کے لئے انہوں نے جو " گرینڈ ڈیزائن " تیار کیا تھا (جس سے فوج بھی آگاہ تھی) ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ اس کی تکمیل میں اسلام پسند ایک "مفید پریشر گروپ" ثابت ہوں گے۔ پاکستان کے اندر اپنی مقبولیت کے بارے میں بھٹو پراعتماد تھے۔جن اسلامی جماعتوں کو انہوں نے کچھ ہی عرصہ قبل فیصلہ کن شکست دی تھی انہیں وہ اپنے لئے اندرونی چیلنج نہیں سمجھتے تھے۔ادھر نسلی قوم پرستی کے مقابلے اور پاکستان کے بیرونی دشمن بھارت کے خلاف قوم کو کھڑا کرنے میں اپنے محدود کردار پر اسلام پسند جماعتیں ناخوش تھیں۔ سیاسی اقتدار کے سنجیدہ امیدوار کا کردار ادا کرنے کے لئے وہ بھٹو کے سیکولر مخالفین کے ساتھ شامل ہوگئیں۔

پاکستان کی دفاعی اسٹیبلشمنٹ کے نقطہ نظر کے مطابق اسلام پسندانہ عزائم بری چیز نہیں تھے۔ کیونکہ فوج ملک کی سالمیت کے تحفظ میں ناکام رہی۔ لہٰذا اسے مجبوراً اختیارات بھٹو کو دینا پڑے۔اب وہ مناسب وقفہ ڈالے بغیر پاکستان کی

سیاست میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ فوج منتظر تھی کہ بھٹو غلطیاں کریں اور اسلام پسند اپنے نظریاتی ایجنڈے کو زندہ رکھتے ہوئے سیاسی اعتبار سے ان پر چھا جائیں۔

شملہ سمجھوتے اور جنگی قیدیوں کی واپسی کے بعد پاکستان کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور اقتدار اعلیٰ کی مالک ریاست کے طور پر تسلیم کرلے۔ بڑی طاقتوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا اور پاکستان کو کوئی امید نہ رہی کہ اس کا سابقہ مشرقی بازو ایک مرتبہ پھر اس کے ساتھ آن ملے گا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو مغربی پاکستان کی ایک جیل سے رہائی پانے کے بعد بنگلہ دیش کے صدر بن چکے تھے انہوں نے دھمکی دیدی کہ وہ جنگی عزائم کے الزام میں پاکستانی فوج کے افسروں پر مقدمات دائر کریں گے۔ یہ چیز فوج کے لئے کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ فوج میں جو ذہن زیادہ شکی تھے وہ فکر مند ہو گئے کہ بھٹو شیخ مجیب کو کوئی مثبت اشارہ دیدیں گے اور ان جرنیلوں کی شامت آجائے گی جنہوں نے بھٹو کو اقتدار ملنے کی مخالفت اور ان کے خلاف باقاعدہ سازش کی تھی کہ ان کی حکومت قائم نہ ہو سکے لیکن بظاہر بھٹو ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے شرط عائد کردی کہ پاکستان بنگلہ دیش کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرے گا جب تک شیخ مجیب اپنی مندرجہ بالا دھمکی واپس نہیں لیں گے۔

ملک کے اندر بھٹو کی اس تجویز پر بہت لے دے ہوئی کہ بنگلہ دیش کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ جماعت اسلامی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سخت خلاف تھی۔ لہٰذا اس نے "بنگلہ دیش نامنظور" کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کردیا۔ دوران مہم اسلام پسند اور فعال طلبہ نے تعلیمی اداروں اور مسجدوں میں اجتماعات سے خطاب کیا اور اس خیال کی تشہیر کی کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھٹو کی ایک سازش کا نتیجہ تھی۔ "ادھر تم۔ ادھر ہم" کی توجیہہ یہ کی گئی کہ وہ اصل اقتدار اور اختیارات مغربی پاکستان میں رکھنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی قبول کرلی۔ اگرچہ بھٹو نے یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کئے تھے تاہم اس جملے کو ان کے ساتھ منسوب کردیا گیا۔ خالد حسن اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ادھر تم۔ ادھر ہم" پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک حامی اخبار کے 15 مارچ 1971ء کے شمارے کی شہ سرخی تھی اور جس نے شبہ سرخی بنائی۔ اس نے بالاختصار بھٹو کا شراکت اقتدار کا وہ فارمولہ پیش کیا تھا جو انہوں نے دسمبر 1970ء میں ہونے والے انتخابات کے بعد پیش کیا تھا۔ "بنگلہ دیش نامنظور" نامی تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ فوج کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ذمہ دار ہونے کے الزام سے بچایا جاسکے۔ اسلام پسندوں کا موقف تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہونے والی خانہ جنگی کو نظریہ پاکستان کے نظری عناصر کی نفی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ جنگ پر اکسانے والے ملکی سازشی (بھٹو) اور غیر ملکی جارح (بھارت) تھے۔

اگرچہ بھٹو نے پاکستان کے مورال اور عالمی سطح پر اس کے مقام کو بحال کرنے کی تیز رفتار کوششیں کیں۔ تاہم پاکستان اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوراً ہی دوبارہ بھارت کے مقابل آجاتا۔ پاکستان کے قومی دفاع کے شعبے نے

افغانستان کو دشمن ملک قرار دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح بھارت نے بنگالی وطن پرستوں کی حمایت میں کردار ادا کیا تھا اسی طرح افغانستان کی حکومت بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بدامنی کا باعث بن رہی تھی۔ بعد میں جب روس افغانستان کے معاملات میں براہ راست ملوث ہو گیا تو پاکستان نے افغانستان پر زیادہ توجہ مرکوز کردی۔ آنے والے چند برسوں کے دوران افغانستان نے پاکستان کی دفاعی اسٹیبلشمنٹ کے متعدد مقاصد پورے کئے۔ پاکستان کی فوج اور سیکیورٹی سروسز کو ایک اور میدان میسر آ گیا جہاں وہ اعصاب کو سکون دے سکتی تھیں۔ پاکستانی فوج نے افغانستان کے اسلام پسندوں کی مدد سے بے قاعدہ جنگ کے تجربات بھی کئے۔ یہ سب کچھ روس کے افغانستان میں ملوث ہونے اور بعدازاں امریکی مداخلت سے قبل ہوتا رہا۔

1970ء کے انتخابات میں افغانستان کی سرحد کے ساتھ واقع دونوں پاکستانی صوبوں نے نسل پرست اور وطن پسند سیاسی جماعت "نیشنل عوامی پارٹی" (نیپ) کو تکثیری نتائج دیئے تھے۔ نیپ کے سربراہ خان عبدالولی خان تھے۔ پشتون قبائلی پٹیوں کے ساتھ بسنے والے رائے دہندگان کی آراء منقسم ہو گئیں اور نیپ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہ کامیابی حاصل نہ کرسکی جو مشرقی بنگال میں عوامی لیگ کے حصے میں آئی تھی۔

1947ء میں ولی خان اور ان کے خاندان نے برطانوی ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کی تھی اور مذہبی وطن پسندی کے مقابلے میں نیپ کے بلوچ راہنماؤں نے نسل پرستانہ وطن پسندی کی سرپرستی کی تھی۔ ان میں سے بعض نے پاکستان میں اپنے علاقے کی شمولیت کی بھی مخالفت کی تھی۔ "نیپ" برملا طور پر ایک سیکولر جماعت اور بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات کی حامی تھی۔ بنگالی وطن پرستی کے خلاف جہاد کے آخری مراحل میں یحیٰی خان نے مغربی پاکستان میں بغاوت کی سازش کے الزام میں "نیپ" پر پابندی عائد کردی تھی۔

بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو "نیپ" پر سے پابندی اٹھالی۔ 1972ء کے اوائل میں انہوں نے "نیپ" کو اجازت دیدی کہ وہ "جمعیت العلمائے اسلام" (جے یو آئی) کے ساتھ اتحاد کے ذریعے سرحد اور بلوچستان میں اپنی حکومت قائم کرلے۔ بعدازاں نیپ پر مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کی منصوبہ بندی کا الزام عائد کرتے ہوئے انہوں نے بلوچستان حکومت کو معزول کردیا۔ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ بغاوت کے دوران استعمال کے لئے اسلحہ اسلام آباد کے عراقی سفارت خانے میں چوری چھپے ذخیرہ کیا گیا تھا۔ امریکی سفارتکاروں اور پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کو علم تھا کہ عراقی اسلحہ بلوچستان کے ایرانی حصے میں بلوچ باغیوں کے لئے رکھا گیا تھا اور یہ عراق کے کرد باغیوں کو ملنے والی ایرانی حمایت کا ردعمل تھا۔ پاکستان کی سیکیورٹی سروسز نے بھٹو کی غلط راہنمائی کی جس کے نتیجے میں افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ چھوٹے پیمانے پر خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ عراقی سفارت خانے میں اسلحے کی دریافت سے چند دن قبل بھٹو نے امریکی ناظم الامور سے درخواست کی تھی کہ نیپ کی بلوچ قیادت کے ساتھ سیاسی مذاکرات کے دوران ان کی مدد کی جائے۔ اگر نیپ عراق کی

نسبتاً نئی بعث حکومت کی تیار کردہ سازش کا حصہ ہوتی تو امریکہ بھٹو اور بلوچ راہنماؤں کے مابین مصالحت کے لئے کسی ہمدردی کا اظہار نہ کرتا۔

اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو رفتہ رفتہ زیادہ مطلق العنان ہوتے چلے گئے۔ جن افراد اور گروہوں نے ان کے سیاسی کیریئر کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی تھی۔ انہیں سزا دینے کے لئے انہوں نے مارشل لاء کے تحت حاصل شدہ اختیارات استعمال کئے۔ جب وہ بلوچستان حکومت کو معزول کر چکے تو ان کے ناقدین نے انہیں ایک ایسا "منتخب سویلین طاقتور شخص" خیال کرنا شروع کر دیا جس کے اندر پارلیمانی جمہوریت کے باریک نکات کے بارے میں تحمل اور برداشت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ انہوں نے بلوچستان کی حکومت کو معزول کیا تو ان کے سیکولر اور اسلام پسند مخالفین کے لئے ان کے آمرانہ رجحانات کی تصدیق ہوگئی۔ بھٹو نے سمگل شدہ اسلحے کا الزام نیپ کے راہنماؤں پر عائد کرنے کا جو فیصلہ کیا۔ حزب اختلاف کے ایک راہنما نے اسے ہٹلر کی اس سازش سے تشبیہہ دی جس کے تحت اس نے ریخ سٹیگ کو جلا ڈالا اور اس "واردات" کو ہر قسم کی سیاسی مخالفت پر پابندی کے لئے عذر کے طور پر استعمال کیا۔

بلوچستان حکومت کی معزولی کے بعد شمالی مغربی سرحدی صوبے میں بھی نیپ کی حکومت احتجاجاً مستعفی ہوگئی۔ قبائلی بغاوت سے نمٹنے اور اسے ایک بار پھر پاکستان کے اتحاد اور یک جہتی کی محافظ ثابت کرنے کے لئے فوج طلب کر لی گئی۔ حکومتی حملے کے نتیجے میں نیپ نے حزب اختلاف کے اس اتحاد کا حصہ بننے کا ارادہ ترک کر دیا جس پر مذہبی جماعتیں حاوی تھیں۔ درحقیقت بھٹو نے اپنے سیکولر مخالفین کو کمزور اور اسلام پسندوں کی پوزیشن کو مضبوط بنا دیا اور آخرالذکر نے ان کی حکومت کو اپنی مخالفت کا نشانہ بنالیا۔

باغی بلوچ قبائل کو کچھ معاونت افغانستان سے بھی حاصل ہوئی جو پشتون علاقے کی پاکستان میں شمولیت کا 1947ء سے ہی مخالف تھا۔ افغان حکومت وقتاً فوقتاً "پشتونستان" کے مطالبے کی حمایت کرتی رہی اور چونکہ افغانستان سوویت یونین کی وسطی ایشیائی ریاستوں کی جنوبی سرحد پر واقع تھا۔ سوویت یونین نے افغانستان میں (ہر دور میں) اپنی قابل ذکر سیاسی موجودگی برقرار رکھی۔ 1973ء میں افغان بادشاہت کے خاتمے کے بعد سردار محمد داؤد کے جمہوری دور حکومت میں افغانستان میں سوویت یونین کا اثر و نفوذ بڑھ گیا اور پاکستان مخالف پروپیگنڈا جاری رہا۔ تاہم افغانستان کو اپنی تجارت کے لئے پاکستان سے راہداری بھی درکار تھی اور پاکستان پر اپنی مرضی ٹھونسنے کے لئے اس کے پاس کافی عسکری ذرائع بھی ناپید تھے۔

بلوچستان میں ہونے والی بغاوت نے پاکستانی فوج اور انٹیلی جنس سروسز کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ افغانستان کو ایک ایسے قابل ذکر اور اضافی خطرے کے طور پر روشناس کرا سکیں جو پاکستان کی سلامتی کو لاحق تھا۔ اسطرح پاکستان کے فوجی

اخراجات کی سطح کو برقرار رکھنے کا جواز میسر آ گیا اور وہ بدستور ایک "چھاؤنی ریاست" بنا رہا۔ بعدازاں بھٹو مجبور ہو گئے کہ وہ افغانستان کے دو اسلام پسند راہنماؤں، برہان الدین ربانی اور گلبدین حکمت یار کے جنگ جو گروہوں کی حمایت کریں۔ ربانی کی جمعیت اسلامی اور حکمت یار کی حزب اللہ کو افغانستان کے اندر محدود حمایت حاصل تھی۔ دونوں بالترتیب پاکستان کی جماعت اسلامی اور مشرق وسطیٰ کی اخوان المسلمین کے ساتھ نظریاتی طور پر وابستہ تھیں۔ افغانستان پر روسی حملے سے قبل جب وہاں اسلام پسندوں کا زور تھا، پاکستان نے افغانستان میں اپنا رسوخ بڑھانا چاہا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ پاکستان کی آئی ایس آئی نے اس خفیہ آپریشن کا آغاز اس وقت کیا جب پاکستان پر بظاہر ایک سیکولر سیاستدان یعنی بھٹو حکمران تھے۔ جنرل خالد محمود عارف کہتے ہیں:-

جولائی/اگست 1973ء میں پاکستان کے دفتر خارجہ میں ایک "افغان سیل" کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ مسلسل 3 برس وزیراعظم بھٹو یا سیکرٹری خارجہ عزیز احمد کی صدارت میں اس کے اجلاس اور افغان پالیسی کے راہنما اصولوں کا تعین ہوتا رہا۔ قبائلی نیم فوجی فورس فرنٹیئر کانسٹیبلری کے انسپکٹر جنرل اور انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل نے باہم ملکر افغانستان کے اندر مشن جاری رکھے۔ اس دوران افغان راہنما ربانی اور حکمت یار پاکستانی حکام کے ساتھ رابطے میں رہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اٹلی میں مقیم افغانستان کے جلاوطن بادشاہ کے ساتھ بھی رابطے کی راہیں کھلی رکھیں۔ بھٹو دور میں افغانستان کے اندر ابتدائی کاروائیوں کی اہمیت کا اندازہ بعد میں سامنے آنے والی پیش رفتوں کے سیاق وسباق میں بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے جو روسی قبضے کے خلاف اس افغان جہاد پر منتج ہوئیں جسے امریکہ کی پشت بناہی حاصل تھی۔

افغانستان کے معاملات میں پاکستان کی مداخلت کے آغاز کے بعد جلد ہی بھٹو نے اس بناء پر امریکہ سے اضافی عسکری امداد کا مطالبہ کر دیا کہ اب پاکستان کو لاحق خطرات کا حجم بڑھ چکا ہے۔ پاکستان کی فوج اور سیکیورٹی ایجنسیوں نے بھی بلاشبہ اس مطالبے میں بھٹو کی حوصلہ افزائی کی۔ بھٹو کا دعویٰ تھا کہ بلوچستان میں ہونے والی قبائلی بغاوت پاکستان پر روسی اثرات بڑھانے کے لئے بھارت اور سوویت یونین کے ایک مشترکہ بڑے منصوبے کا حصہ تھی لیکن امریکہ بھٹو کی باتوں میں نہ آیا۔ جولائی 1973ء میں بھٹو نے واشنگٹن کا جو دورہ کیا اس کے تناظر میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے صدر نکسن کے لئے بھٹو کے ساتھ گفتگو کے حوالے سے چند پوائنٹس تیار کئے جو کچھ اس طرح تھے:-

بھٹو اس بات پر زور دیں گے کہ "بھارت روس اتحاد" کی طرف سے پاکستان کو لاحق خطرات بڑھ رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ صوبہ بلوچستان میں ہونے والی قبائلی بغاوت میں روسی ہاتھ کا تذکرہ بھی کریں۔ لیکن پاکستانی حکام جس نوعیت کے خطرات کا اظہار کر رہے ہیں ہم ان سے متفق نہیں ہیں۔ مستقبل قریب میں پاکستان کی سالمیت کو روس یا بھارت سے کوئی خطرہ نہیں۔ بلوچستان میں روس کے ملوث ہونے کا ثبوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ کافی عرصہ بعد تک بھی اگر پاکستان

اندرونی عدم استحکام اور گہری تقسیم کا شکار رہا تو ممکن ہے کہ افغانستان، بھارت اور روس کو اس پر دباؤ ڈالنے کی ترغیب ملے۔ اندریں حالات پاکستان کے دفاعی مسائل کے حل کی نوعیت سیاسی،نفسیاتی اور اقتصادی ہے۔فوجی حل کی حیثیت ثانوی ہے۔

صاف نظر آرہا تھا کہ بھٹو نے پاکستان کی دفاعی اسٹیبلشمنٹ کی پالیسیوں کو اپنا لیا ہے۔وہ بھارت کو بدستور پاکستان کا دائمی دشمن خیال کرتے رہے اور یہی سمجھتے رہے کہ اسلامی نظریے اور فوجی قوت کی مسلسل تعمیر کے امتزاج میں ہی پاکستان کا دفاع مضمر تھا۔ بھارت کے ساتھ کشیدگی اور کھنچاؤ کے ساتھ ساتھ پاکستان نے اب افغانستان میں اسلام پسندوں کی بغاوت کو متشکل کر کے وہاں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے منصوبوں پر بھی عملدر آمد شروع کر دیا۔ پاکستان کی پالیسی کا تیسرا عنصر یعنی اپنی معاشی اور عسکری ضروریات کی تکمیل کے لئے امریکی امداد کا حصول موثر انداز میں اور فوج کی ترجیحات کے مطابق کام نہیں کر رہا تھا۔ پاکستانی جرنیلوں نے اس حقیقت کو پسند نہ کیا کہ بھٹو امریکہ سے عسکری امداد کے حصول میں ناکام رہیں۔

"عالمی ترقی کے لئے امریکی ایجنسی" کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان نے 1972ء اور 1977ء کے درمیان اقتصادی تعاون کی مد میں امریکہ سے 93 کروڑ 73 ڈالرز حاصل کئے۔ ان سالوں کے دوران پاکستان پر بھٹو حکمران تھے۔ تاہم اس دوران امریکہ نے پاکستان کو جو عسکری مدد دی وہ محض 17 لاکھ ڈالرز تھی اور اس کا زیادہ حصہ بھی افسران کی تربیت کے اخراجات اور امریکی ساز وسامان کے فالتو پرزہ جات پر مشتمل تھا۔ اگرچہ بھٹو نے چین سے قابل ذکر مقدار میں فوجی معاونت حاصل کی اور وہ یورپی ممالک سے بھی فوجی ساز وسامان خرید سکتے تھے۔ تاہم پاکستانی جرنیلوں نے ان پر الزام عائد کیا کہ اشتراکیت کی طرف جھکاؤ اور امریکہ مخالف بیانات کے باعث وہ امریکی امداد کی پائپ لائن کو دوبارہ کھلوانے میں ناکام رہے۔

متعدد رکاوٹوں کے باوجود بھٹو مختصر عرصے کے دوران اپنی "عوامی مطلق العنان حکومت" کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سیاسی معاملات میں وہ مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اقتصادی محاذ پر انہوں نے نجی شعبے کے ملکیتی بنکوں اور کئی صنعتی شعبوں کو قومیا لیا۔ اس عمل کے دوران بعض سماجی اور معاشی گروہوں کو ان کی پالیسیوں نے نقصان سے دوچار کیا اور نتیجتاً انہوں نے ان کی پالیسیوں کے خلاف متحد ہونا شروع کر دیا۔ بھٹو کو 1977ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور بعد ازاں 1979ء میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ اسلام پسند گروہ اور فوج۔ یہی دو حلقے دوران اقتدار ان کی نگاہ التفات کا مرکز رہے اور وہی ان کے زوال کا سبب بن گئے۔

بھٹو نے اس امر کو یقینی بنایا کہ ملکی وسائل کا مناسب حصہ فوج کو ملتا رہے۔ نتیجتاً رفتہ رفتہ فوج کا حجم اور عسکری اخراجات بڑھتے چلے گئے۔ 1973ء میں انہوں نے ایک ایسے آئین پر تمام سیاسی جماعتوں سے اتفاق رائے حاصل کر لیا تو جو برطانوی طرز کے پارلیمانی نظام حکومت کی نمائندگی کرتا تھا۔ مذہبی جماعتوں نے مطالبہ کیا کہ "قرارداد مقاصد"

کو آئین کی تمہید میں شامل کیا جائے اور حکومت متفق ہوگئی۔ بھٹو نئے آئین کے تحت وزیراعظم بن گئے لیکن آئین پر عملدرآمد بھی پاکستان کو عملاً ایک جمہوری ملک نہ بنا سکا۔ بھٹو نے جب سویلین اختلافات کو دبانے کے لئے ریاستی طاقت استعمال کی تو ان کے مخالفین انہیں ایک "منتخب آمر" سمجھنے لگے۔ وہ خود کو نپولین بوناپورٹ جیسے نظام حکومت کا خالق خیال کرتے تھے۔ بھٹو شخصی نظام حکومت کو ایک ایسے ملک کے غریب اور محروم عوام کے لئے فائدہ مند سمجھتے تھے جہاں ماضی میں مساوات نام کی کسی چیز کا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو۔

1974ء تک بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے عناصر کو رفتہ رفتہ اقتدار سے دور کرنا شروع کر دیا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اشتراکی دانشوروں کی جگہ روایتی زمینداروں نے لے لی جو اب پارٹی میں شامل ہو چکے تھے۔ جب بھٹو کی پہلی سیاسی ٹیم کی جگہ ان وزراء اور مشیروں کی ٹیم نے لے لی جن کا تعلق سول اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ تھا تو پی پی پی کے سیکرٹری جنرل نے محسوس کیا کہ بھٹو کا جھکاؤ اسلام کی مبنی بر جہل وضلالت توجیہہ کی طرف تھا۔ تین بظاہر غیر متعلقہ تبدیلیاں اس جھکاؤ کی عکاس یا ممکنہ باعث بنیں۔ پہلی پیش رفت تو یہ تھی ایک آئینی ترمیم کے ذریعے انہوں نے احمدی فرقے کو غیر مسلم قرار دیدیا۔ دوسری پیش رفت لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد تھا۔ تیسری پیش رفت کا تعلق ایک خفیہ فیصلے سے تھا۔ 1972ء میں فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کرے گا۔ بعد ازاں 1974ء میں جب بھارت نے کامیاب ایٹمی تجربہ کیا تو مذکورہ صلاحیت کا حصول پاکستان کی انتہائی اہم اور اولین ترجیح بن گیا۔

جس قصبہ میں احمدی فرقے کا صدر دفتر تھا اس کے ریلوے سٹیشن پر مئی 1974ء میں اسلام پسندوں اور احمدی طلباء کے درمیان شدید تصادم ہوا جس پر اسلام پسندوں نے زبردست احتجاج کیا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ احمدی فرقہ ایک متنازعہ فرقہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ لیکن نہ تو وہ پیغمبر خدا حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی مانتے ہیں اور نہ ہی جہاد کو فرض سمجھتے ہیں۔ یہ فرقہ اپنے بانی مرزا غلام احمد کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے جس نے 19 ویں صدی میں اس کی بنیاد رکھی۔ احمدیوں کی اکثریت اسے (نعوذ باللہ) نبی سمجھتی ہے۔ احمدی کئی عشروں سے کٹر مذہبی گروہوں کا ہدف بنے ہوئے ہیں اور 1953ء میں احمدیوں کے خلاف احتجاج پاکستان میں پہلی مرتبہ مارشل لاء کے نفاذ کا باعث بنا۔ ہربرٹ فیلڈ مین لکھتا ہے۔ "قادیانیوں (احمدیوں) کے خلاف احتجاج اس قدر آتش گیر مواد ہے کہ خصوصاً پنجاب میں یہ مجاز حکام کو پریشان کرنے اور ان کی حاکمیت کو نقصان پہنچانے کا ایک ذریعہ بن چکا ہے"۔ مئی 1974ء میں ربوہ کے ریلوے سٹیشن پر ہونے والا طلباء تصادم مذہبی گروہوں کی طرف سے احمدیوں کے خلاف تازہ احتجاج کے آغاز کا باعث بن گیا۔

احمدیوں نے 1970ء میں ہونے والے انتخابات میں اس امید پر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی کہ آخر الذکر کا سیکولر اور لبرل ایجنڈا انہیں کٹر مذہبی جماعتوں کے تعصب سے بچائے رکھے گا۔ بھٹو کو بخوبی علم تھا کہ فرقہ وارانہ

اور مذہبی احتجاج حکومت کو گرانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ 1953ء کی تاریخ سے بھی آگاہ تھے کہ احمدیوں کے خلاف احتجاج کے دوران مذہبی گروہوں اور پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کے مابین روابط کس طرح مستحکم ہوگئے تھے۔ احتجاج کرنے والے اسلام پسندوں کی مخالفت کا خطرہ مول لینے کی بجائے بھٹو نے ان کا مطالبہ ماننے کا فیصلہ کرلیا۔ پاکستان کے آئین میں ایک ترمیم کے ذریعے ایک شق کا اضافہ کردیا گیا جس کے مطابق احمدیوں کو موثر انداز میں غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ بعدازاں مذہبی امور کی ایک وزارت قائم کردی گئی۔ جماعت اسلامی کے ایک منحرف سابق رکن مولانا کوثر نیازی کو مذہبی امور کی وزارت کا قلمدان سونپ دیا گیا۔ جن کے بارے میں پی پی پی میں شامل بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ارکان کا خیال تھا کہ وہ سیکیورٹی ایجنسیز کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ نیازی نے بھٹو کو مذہبی جماعتوں کا مطالبہ تسلیم نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن بھٹو کو بظاہر " کسی اور نے "مذہبی جماعتوں کا ایجنڈا اپنانے پر قائل کررکھا تھا۔ دیگر مبصرین فکرمند تھے کہ اسلام پسند جماعتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دراصل بھٹو فرقہ وارانہ آراء کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ ہربرٹ فیلڈ مین جیسے مبصرین نے لکھا کہ "صرف قادیانی ہی صبر وتحمل اور برداشت سے عاری کٹر مذہب پسندوں کے غضب کو آواز نہیں دے رہے"۔

مذہبی قدامت پسندی کی جانب بھٹو کا جھکاؤ ان کے اقتصادی اور فوجی دفاع کے ایجنڈوں سے منسلک تھا۔ 1973ء میں عربوں نے تیل کی برآمد پر جو پابندی عائد کی اس کے باعث دنیا بھر میں تیل کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں اور خلیج فارس کے ممالک کی اقتصادیات حد درجہ مستحکم ہوگئیں۔ بھٹو نے چاہا کہ "پیٹروڈالرز" کے بہاؤ سے وہ بھی استفادہ کریں لیکن اس کے لئے پاکستان کے اسلامی تشخص پر زور دینا ضروری تھا۔ پاکستان نے لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا اور سعودی عرب کے شاہ فیصل بن عبدالعزیز کی سرپرستی میں " آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس" (او آئی سی) کے مستقل ڈھانچے کی تشکیل میں پاکستان پیش پیش رہا۔ مسلمان اکثریت کے حامل تمام ملکوں یا حکومتوں کے سربراہوں کی موجودگی نے بھٹو کو موقع فراہم کردیا کہ وہ بنگلہ دیش کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی مدعو کریں اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیں۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کا اہم ترین نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پاکستان کو مسلم دنیا کی راہنما طاقت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ آزادی کے بعد ابتدائی چند سالوں کے دوران بانیان پاکستان کی بھی یہی شدید خواہش رہی۔ اسی سال جب بھارت نے جوہری تجربہ کیا۔ بھٹو نے سوچا کہ وہ بھی پاکستان کے دوسال پرانے ایٹمی پروگرام کے لئے برادر اسلامی ملکوں سے فنڈز حاصل کرسکتے تھے جنہیں وہ ماضی قریب میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر اکٹھا کرچکے تھے۔

بھٹو نے پاکستان کے اسلامی تشخص اور اس کے ایک نظریاتی ملک ہونے پر بحث پر بھی مثبت ردعمل کا اظہار کیا۔ حکومتی سرپرستی میں پاکستان کی تاریخ اور ثقافت کے موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس کے موقع پر پاکستان کی اسلامی بنیادوں پر زور دیا گیا۔ مذکورہ "بنیادوں" کے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر وحیدالزمان نے کہا:-

"حساس اور سوچنے والے اذہان وہ سوالات پوچھ رہے ہیں جنہیں محض علمی مباحث اور نظریاتی تصورات کا نام دیکر نہیں ٹالا جاسکتا۔ بلکہ وہ قومی تسلسل اور بقاء کے سوالات ہیں۔ وہ کون سے بندھن ہیں جو پاکستانی عوام کو ایک رکھنے میں ممد ثابت ہورہے ہیں؟ پاکستان کی روح اور تشخص کیا ہے؟ ہماری قومی شناخت اور غیر معمولی یگانگت کیا ہے جو ہماری قوم کو دوسری قوموں سے ممتاز ایک قوم بناتی ہے؟"۔

پھر وہ کہتے ہیں:-

"پاکستان کے مطالبے کے پس منظر میں جو متحرک خیال کارفرما تھا وہ دراصل مسلمانوں کی سرزمین پر خدا کی بادشاہت کے قیام کی خواہش تھی۔ یہی خواہش تحریک آزادی کی بنیاد کا پتھر بنی۔ لوگوں کے نظریے اور قومی ریاست کی غائیت وجود بھی یہی خواہش تھی۔ اگر ہم نظریہ اسلام کو ترک کردیں تو ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں جس کی مدد سے خود کو ایک قوم کے طور پر متحد رکھ سکیں۔ اگر خدانخواستہ عرب ترک یا ایرانی اسلام کو ترک کردیں تو عرب پھر بھی عرب۔ ترک پھر بھی ترک اور ایرانی پھر بھی ایرانی رہیں گے۔ لیکن اگر ہم اسلام ترک کردیں تو ہم کیا رہ جائیں گے؟"۔

پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کی تجدید نے اسلام پسندوں کے موقف کی بازگشت کی صورت اختیار کرلی اور جغرافیائی تشخص کی بنیاد پر تعمیر قوم کے امکان کی نفی کردی۔ حتیٰ کہ جن علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی وہاں مسلمانوں کی سیلف گورننس بھی اسی "نفی" کی زد میں آگئی۔ تحریک پاکستان کے دوران بانی پاکستان مسٹر جناح نے متحدہ ہندوستان میں اقلیت کہلانے سے بچنے کے لئے مسلمانوں کی سیلف گورننس پر زور دیا تھا۔ لیکن اسلامی جمہوریہ کے طور پر نظریہ پاکستان نے اس تصور کے مقابلے میں افضلیت حاصل کرلی۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد پاکستان نسبتاً زیادہ متجانس ملک بن گیا اور ایک متبادل سیکولر ویژن کی دریافت اور وادی سندھ اور اس سے متصل علاقوں کے جغرافیائی اتحاد کے لئے ایک موقع میسر آگیا۔ جمہوری سیاست کے ذریعے نسلی۔ علاقائی اور قبائلی اختلافات کو ختم کیا جاسکتا تھا۔ اب نئے پاکستان کو صرف مذہب پر بھروسہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان واحد بندھن تھا۔

کچھ سیکولر دانشوروں نے وادی سندھ اور اس کے مغربی اور شمالی پہاڑوں پر مشتمل علاقوں کو ارضیاتی، جغرافیائی، نسلی اور تاریخی بنیادوں پر باقیماندہ جنوبی ایشیاء سے الگ ایک قومی اکائی کے طور پر دیکھنا شروع کردیا لیکن جس ترقی پسند پاکستان کا تصور بھٹو کے ذہن میں موجود تھا اس پر ان خیالات کا انطباق ممکن نہیں تھا۔ لہذا اس عمل کے دوران انہوں نے سیکولر قوتوں کو کمزور کردیا۔

1976ء کے اواخر تک بھٹو پاکستان کی مسلح افواج کو طاقتور بنا چکے تھے اور پرانے پاکستان کے بعض اہم عناصر کو نئے پاکستان کے حصے کے طور پر اپنا چکے تھے۔ اگرچہ متعدد سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل ابھی تک حل طلب تھے تاہم اس کی جو

حالت مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے فوراً بعد ہوگئی تھی۔ اب یہ اس سے کہیں بہتر شکل اختیار کر چکا تھا۔ اگر چہ ان کی مطلق العنانہ روش کے باعث متوسط شہری طبقے میں ان کی حمایت میں کمی واقع ہوئی تاہم عامتہ الناس میں وہ ذاتی طور پر بدستور مقبول اور ہردلعزیز رہے۔ اس دور کا ایک مبصر لکھتا ہے:۔

"ادارے۔ جنہیں بھٹو پاکستان کی سیاسی ترقی کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے بدستور ابتری کا شکار رہے۔ گو پاکستان پیپلز پارٹی سمیت سیاسی جماعتوں میں ابھی تک خون خرابہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم وہ افراتفری کا شکار تھیں۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس اکثر کورم پورا نہ ہونے کے باعث ملتوی کر دیئے جاتے تھے اور کورم پورا نہ ہونے کی وجہ وزیر اعظم اور وزرائے اعلیٰ کا کبھی کبھار ایوان میں آنا تھا۔ اعلیٰ بیوروکریسی بھی ملازمت کا تحفظ نہ ہونے کے باعث بددلی اور عدم اطمینان کا شکار تھی۔ طلباء کی تنظیمیں اور بار ایسوسی ایشنز اگر چہ مضبوط تھیں۔ تاہم وہ گورننس کے ادارے نہیں تھے۔ صرف سیکیورٹی ایجنسیاں وہ ادارے تھے (اگر انہیں واقعتاً ادارے کہا جاسکتا ہے) جو پاکستان میں 1976ء کے دوران پنپ رہے تھے"۔

اقتدار حاصل کرنے سے قبل بھٹو نے انٹیلی جنس سروسز کی صلاحیتوں اور ارادوں۔ دونوں پر شک کا اظہار کیا تھا۔ وہ انہیں "نادیدہ حکومت" سمجھتے تھے اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ان کے ساتھیوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ ان اداروں کو توڑ دیں۔ لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد بھٹو نے انہی اداروں کو سیاسی مخالفین کی جاسوسی پر مامور کر دیا اور قومی سلامتی کو لاحق خطرات کی نشاندہی کی بجائے سیکیورٹی ایجنسیوں کو دیگر مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ دو جاسوس ایجنسیاں یعنی سویلین انٹیلی جنس بیورو اور فوجی آئی ایس آئی مرکزی حکومت کے ماتحت تھیں۔ فوج کے ہر شعبے کے پاس اپنی انٹیلی جنس سروس تھی۔ اہم ترین ایجنسی "ملٹری انٹیلی جنس سروس" تھی جس کی توجہ دفاعی امور پر مرکوز تھی اور وہ براہ راست آرمی چیف کو جوابدہ تھی۔ سپیشل برانچ صوبائی حکومتوں کی صوابدید پر تھی۔ یہ ایک ملکی انٹیلی جنس کی اکائی تھی جو ہر صوبے کی پولیس فورس کے ساتھ منسلک تھی۔ بھٹو نے بدعنوانی سمیت وفاقی نوعیت کے جرائم کی تحقیقات کے لئے "دفاعی تحقیقاتی ادارہ" (ایف آئی اے) قائم کیا۔ اگر چہ ایف آئی اے بظاہر جرائم کا تحقیقاتی ادارہ تھا تاہم اسے ناقدین اور مخالفین پر ٹیکس چوری سے لیکر اپنے عرصہ اختیار کے دوران رشوت لینے تک کے الزامات عائد کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

بھٹو حکومت نے ایک نیم فوجی فیڈرل سیکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) بھی تشکیل دی جس کا کام نفاذ قانون کے لئے وفاقی حکومت کو خصوصی سپاہی مہیا کرنا تھا۔ لیکن زیادہ تر اسے حزب اختلاف کے اجلاسوں کو سبوتاژ اور سیاسی مخالفین کو خوفزدہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سیکیورٹی ایجنسیوں کے اس توسیع شدہ سیاسی کردار نے بطور ایک جمہوریت نواز یا جمہوریت پسند شخص بھٹو کی شخصیت کو مشکوک کر دیا۔ اس چیز نے ان کی منتخب حکومت کی سیاسی بنیاد کو بھی کمزور کیا اور بھٹو نے بعض فاش سیاسی غلطیوں کا ارتکاب بھی کیا:۔

"جن لوگوں کو پاکستانی حکومت کی کارگزاریاں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ درست اندازہ قائم نہیں کر سکتے کہ انٹیلی جنس ایجنسیاں صدور یا وزرائے اعظم کے سامنے ان کی حکومتوں کے خلاف کس حد تک سازشیں اور منصوبہ بندیاں پیش کرتی ہیں۔ وزیر اعظم کے گرد رفتہ رفتہ مخبروں کا ایک خفیہ اور نا قابل لمس حلقہ متشکل ہو جاتا ہے اور اس کے پاس مذکورہ حلقے سے جان چھڑانے کا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ اسے جو معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں ان کے سچ یا قابل اعتماد ہونے کے لئے وہ پھر کسی دوسرے کی رائے نہیں لیتا۔ چند ماہ کے اندر اندر اسے کاملاً الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے۔ پھر وہ اچھے بُرے سے بے نیاز مخبروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ لیکن وہ سب اس نظام کے ساتھ حد درجہ وفادار ہوتے ہیں جس نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کو اعلیٰ و ارفع مقام بخشا"۔

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں بھٹو کو معزول کرنے کے بعد انہیں ایک سیاسی مخالف کے قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران استغاثہ کی طرف سے اہم ترین گواہ ایف ایس ایف کا سربراہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے اس وعدے پر کہ اسے "وعدہ معاف گواہ" قرار دیا جائے گا۔ اس نے عدالت میں بیان دیا کہ اس نے بھٹو کی ہدایت پر قتل کے احکامات جاری کئے تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ بھٹو کی تخلیق نئی سیکیورٹی ایجنسی ان کی مدت اقتدار میں اضافے کا باعث بنتی۔ وہ ان کے لئے پھانسی کا پھندہ بن گئی۔

پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کی ذمہ داری صرف یہی نہیں تھی کہ وہ سیاسی معلومات فراہم کریں۔ اپنی خفیہ کاروائیوں کے ذریعے اہم واقعات کو متشکل کرنا بھی انہی کے ذمہ تھا۔ انٹیلی جنس سروسز نے جسطرح بھٹو کو گھیرے میں لیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ فوج اور ملاؤں کے درمیان اتحاد نے کس طرح تقویت حاصل کی حالانکہ اس وقت مذہبی جماعتیں یا فوج دونوں میں سے کوئی بھی برسر اقتدار نہیں تھا۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ہمہ جا موجودگی سے واضح ہوتا تھا کہ بظاہر ایک سیکولر حکمران بنیادی تبدیلی کا مینڈیٹ پاس ہونے کے باوجود تشکیلی اور بنیادی ڈھانچے کو تبدیل کرنے میں کیوں ناکام رہا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل مبشر حسن نے جب بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ ریاستی سیکیورٹی سروسز پر انحصار کی بجائے اپنے سیکولر اصل کی طرف واپس آجائیں اور عوام کو بنیاد بنا کر اپنی قوت کی تعمیر نو کریں تو مبینہ طور پر بھٹو نے جواب دیا تھا کہ "جو آپ مجھ سے کرانا چاہتے ہیں میں وہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا"۔

یکم مارچ 1976ء کو بھٹو نے جنرل محمد ضیاء الحق کو نیا چیف آف آرمی سٹاف نامزد کر دیا۔ جنرل ضیاء 6 دوسرے جرنیلوں سے جونیئر تھے اور فوج کے اعلیٰ اور ارفع دماغوں میں بھی ان کا شمار نہیں ہوتا تھا۔ بطور آرمی چیف ان کے ایک پیش رو لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان بتاتے ہیں کہ کسی اعلیٰ افسر نے ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں کہا تھا کہ وہ فوجی افسر بننے کے اہل نہیں تھے۔ بھٹو کے زیادہ تر بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ضیاء کو آرمی چیف بنانے کا فیصلہ آخر الذکر کے مزاج میں موجود فرماں برداری اور چاپلوسی کی بناء پر کیا۔ بھٹو نے جنرل ضیاء کے مزاج کی ان

"خوبیوں" کا مشاہدہ اس دوران کیا جب آخرالذکر میجر جنرل اور بعدازاں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ بھٹو خود لکھتے ہیں کہ ضیاء الحق کا انتخاب انہوں نے آئی ایس آئی کے چیف لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان کے مشورے پر کیا۔ بھٹو حکومت کے خلاف فوجی بغاوت، ان کی معزولی اور بعدازاں انہیں پھانسی پر لٹکانے میں جو کردار غلام جیلانی خان اور ضیاء الحق نے ادا کیا اس کے تناظر میں وہ وجوہ اہمیت اختیار کر جاتی ہیں جن کی بناء پر بھٹو نے بطور آرمی چیف ضیاء الحق کا انتخاب کیا۔

جنرل ضیاء الحق ایک تو خود مذہبی ذہن کے حامل تھے۔ دوسرے اپنے سماجی اور خاندانی پس منظر کے باعث متعدد اسلام پسندوں کے ساتھ بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ تاہم غلام جیلانی خان اپنی نجی زندگی میں سیکولر رجحانات رکھتے تھے۔ بھٹو کو اس بات پر بظاہر غلام جیلانی نے قائل کیا کہ نرم خو اور مذہب کی طرف جھکاؤ رکھنے والا آرمی چیف سویلین حکومت کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا تھا۔ ضیاء الحق کا پنجاب کے ایک آرائیں قبیلے سے تعلق تھا جو اپنی قدامت پسندی کے باعث پہچانا جاتا تھا۔ تاہم جنگجویانہ شہرت نہیں رکھتا تھا۔ بھٹو پر یقین تھے کہ ایک آرائیں کے پٹھانوں اور راجپوتوں کے ساتھ گہرے تعلقات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے اور مسلح افواج میں زیادہ نمائندگی انہی دونوں قوموں کو حاصل تھی۔ جیلانی خان نے ضیاء الحق کی وکالت کیوں کی؟ (اور ان کے گیارہ سالہ دور اقتدار کے دوران دیگر جرنیل بغیر دیکھے بھالے ایک متدین اور مذہب کی طرف واضح جھکاؤ رکھنے والے جرنیل کے اس قدر قریب کس طرح اور کیونکر رہے)۔ اس کے پس منظر میں اس دور کی اعلیٰ فوجی قیادت کی سٹریٹیجک گروہی سوچ کارفرما تھی۔ انہوں نے سوچا اس طرح عوام میں فوج کے بارے میں تاثر قائم ہو جائے گا کہ یہ اسلام کے سپاہی ہیں۔ دوسرے سال جب فوج نے بھٹو سے عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو مذکورہ تاثر بہت مفید ثابت ہوا۔

کیونکہ بھٹو پہلے ہی عوامی زندگی میں اسلام کے کردار کو وسعت دے رہے تھے لہٰذا جب ضیاء الحق نے آرمی چیف بننے کے بعد جلد ہی "ایمان۔ تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ" کو فوج کا نصب العین یا اقرار نامہ قرار دیا تو بھٹو نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ حتیٰ کہ جب وہ کور کمانڈر تھے تو چھاؤنی میں تعینات جو افسران مختلف مقابلوں میں جیت جاتے، جنرل ضیاء جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریر کردہ کتب انہیں انعام کے طور پر دیا کرتے تھے۔ اگرچہ مولانا مودودی ان کے سیاسی مخالف تھے اور جماعت اسلامی حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں کے مخلوط اتحاد کی رکن تھی۔ بھٹو بظاہر جنرل ضیاء الحق کی نظریاتی ہمدردیوں کو اپنے خلاف خیال نہیں کرتے تھے۔ بھٹو پر یقین تھے کہ ضیاء ان کی حکومت کے لئے خطرہ نہیں بنیں گے۔ بھٹو کا خیال تھا کہ بھارت کی دشمن اور اسلامی نظریے کی ضامن کے طور پر فوج کو اس کے ارتقاء کے اگلے مرحلے میں لے جانے کے لئے وہ موزوں ترین شخص تھے۔ بے شک انہوں نے غلط طور پر فرض کر لیا تھا کہ نظریاتی اعتبار سے فوج کے منصبی کام میں وسعت کا عمل اور ملک پر ان کی حکمرانی ساتھ ساتھ چلیں گے۔

لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان جنہوں نے جنرل ضیاء کے ماتحت ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کور کمانڈر اور گورنر سندھ کے طور پر کام کیا۔ وہ فوج کو "اسلامائز" کرنے کے لئے جنرل ضیاء الحق کے ابتدائی اقدامات کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:-

"وہ (ضیاء الحق) ایک متدین شخص تھے۔ جہاں انہیں موقع ملتا۔ اسلام کی تبلیغ ان کے عقیدے میں شامل تھی۔ بطور چیف آف آرمی سٹاف اپنے تقرر کے فوراً بعد انہوں نے فوج کو جو نصب العین دیا وہ 'ایمان۔ تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ' تھا۔ اپنے دوروں کے دوران اور تحریری ہدایات کے توسط سے وہ مختلف عہدوں کے حامل فوجیوں کو نماز کی تلقین کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ترجیحاً مختلف سطوح کے کمانڈرز ہی امامت کے فرائض انجام دیں۔ انہوں نے فوج کے تربیتی پروگرام میں مذہبی تعلیم بھی شامل کر دی اور فوج کے تمام یونٹوں میں مساجد اور نماز پڑھنے کے لئے بڑے کمروں کا اہتمام کیا"۔

جن دنوں بھٹو نے ضیاء الحق کو آرمی چیف نامزد کیا تقریباً وہی دن تھے کہ انہوں نے سوچا کیوں نہ ایک منتخب سیاسی راہنما کے طور پر اپنے مقام و مرتبے کی تجدید کرائی جائے۔ بھٹو نے انتخابات کا سوچا ہی تھا کہ سیاسی تجزیہ نگاروں نے انہیں شاندار فتح کا یقین دلایا۔ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) پر پابندی عائد کی جا چکی تھی اور اس کی قیادت اپنی باغیانہ روش کے باعث جیل میں بند مقدمات کا سامنا کر رہی تھی۔ نیپ نے "قومی جمہوری پارٹی" (این ڈی پی) کی شکل میں منظم ہونے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ دیگر سیکولر گروہ بھی وقفوں وقفوں سے جیل جانے اور اجلاسوں پر پابندی کی شکل میں استیصال کا شکار ہوتے رہے۔ میڈیا صرف جزوی طور پر آزاد تھا۔ اس نے عوام کو حکومت کی متعدد کمزوریوں سے بے خبر رکھا۔ سب پر مستزاد یہ کہ بھٹو نے ریاستی مشینری پر مکمل کنٹرول حاصل کر رکھا تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ مذہبی جماعتوں کی طرف سے وہ کسی بھی چیلنج کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ پروفیسر انور سید نے مذکورہ صورت حال کو اس طرح واضح کیا:-

"حزب اختلاف میں شامل اکثر جماعتیں اسلام کے ساتھ علانیہ وابستگی کی شہرت رکھتی ہیں جسے وہ نظریہ پاکستان کا مترادف خیال کرتی ہیں۔ وہ ممکنہ طور پر حکومت کو قومی نظریے کے ساتھ عدم وابستگی کا الزام دیں گی۔ 1976ء کے موسم بہار میں پہلے مدینہ سے مسجد نبوی اور پھر مکہ سے کعبے کے امام کو مدعو کیا گیا اور اس طرح حزب اختلاف میں شامل اسلام پسندوں کا زور ٹوٹ گیا۔ یہ دونوں مقامات مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات میں افضل ترین ہیں۔ یہ اعلیٰ وارفع شخصیتیں پاکستان آئیں۔ مختلف جگہوں پر نمازوں کی امامت کی اور پاکستان کے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے دلوں کو گرما دیا۔ بعد ازاں اسی سال حکومت پاکستان نے حضور ﷺ کی حیات مقدسہ پر ایک کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا اور اس پر اٹھنے والے اخراجات بھی ادا کئے۔ ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سابق صحافی اور ذی فہم و چالاک سیاستدان مولانا کوثر نیازی کو مذہبی امور کا وزیر مقرر کیا گیا۔ جن کے کرنے کا اور کوئی کام ہو نہ ہو اپنی وزارت کا جواز پیش کرنے کے لئے اسلام سے متعلقہ منصوبوں اور سرگرمیوں کی سرپرستی ضرور کرتے ہیں۔ 1976ء میں ملک بھر کے اول درجے کے ہوٹلوں کے تمام

کمروں میں قرآن پاک کے نسخے رکھوا دیے گئے۔ پاکستان کی نظر انداز شدہ اور مالی وسائل کی کمی کا شکار مساجد کو صوبائی محکمہ اوقاف کی تحویل میں دیدیا گیا۔ (اس محکمے نے ان تمام مزاروں اور خانقاہوں سے متعلقہ زمینوں اور تجارتی جائدادوں سے سالانہ کروڑوں روپے کے فنڈز اکٹھے کیے جنہیں حکومت نے 1960ء کی دہائی میں اپنی تحویل میں لے لیا تھا)۔ یہ محکمہ مزاروں اور خانقاہوں سے ملحقہ مساجد کے لئے آئمہ کرام کا انتظام بھی کرتا ہے اور انہیں تنخواہیں بھی دیتا ہے۔ کبھی کبھار ان آئمہ میں سے کوئی اپنے ذاتی نظریات رکھنے پر اصرار کر لیتا ہے تاہم ایک بڑی اکثریت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کی ترجمانی کا حق ادا کریں گے۔ غرضیکہ اپوزیشن اسلام سے متعلقہ کسی ہتھیار سے لیس ہو کر بھی حملہ آور ہو۔ بھٹو کے پاس اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی گولہ بارود موجود ہے"۔

1976ء میں بطور آرمی چیف جنرل ضیاء الحق کے تقرر کے بعد جلد ہی آئی ایس آئی نے ملک کے اندر بھٹو کی پوزیشن کے بارے میں ایک دستاویز تیار کی اور سفارش کی کہ بھٹو وقت سے پہلے انتخابات کے انعقاد کا اہتمام کریں تا کہ ان کے مینڈیٹ کی تجدید ہو جائے۔ اکتوبر میں آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان نے وزیر اعظم کو ایک اور دستاویز بھجوائی جس میں آخر الذکر اور ان کی شہرت کے بارے میں بہت اچھے الفاظ استعمال کئے گئے۔ انتخابات کے انعقاد کی تجویز کا اعادہ بھی کیا گیا۔ بعد میں جو واقعات وقوع پذیر ہوئے ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو آئی ایس آئی کی طرف سے موصول ہونے والی انتخابات کے انعقاد کی تجویز اور اس پر اصرار خاصے اہم محسوس ہوتے ہیں۔ بھٹو نے انتخابات کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ ان پر انتخابی دھاندلیوں کے الزامات عائد کئے گئے۔ عوام احتجاج کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ نتیجتاً فوج نے انہیں معزول کر دیا۔ وہ جنرل ضیاء الحق ہی تھے جنھوں نے بھٹو کو پہلے معزول کیا اور بعد میں پھانسی پر لٹکایا۔ انہوں نے بھٹو کی انتخابی حکمت عملی کو خفیہ رکھنے کی منصوبہ بندی میں آئی ایس آئی کے کردار کو یقینی بنایا۔ بھٹو کے ناقدین خالصتاً سیاسی معاملات میں لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی کے مشوروں کے اثرات کو رد کرتے ہوئے دلیل پیش کرتے ہیں کہ انٹیلی جنس سروسز کو ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا ان کے غلط استعمال کی (بدترین) مثال تھی۔ بھٹو ریاستی اداروں سے جس طرح کام لیتے تھے اس طریق کار کے بارے میں یہ جملہ یعنی "ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لئے استعمال" ضیاء دور میں اکثر و بیشتر بولا جاتا تھا۔ پاکستان کی عدالت عظمٰی کے سامنے اور سزائے موت پر عملدرآمد کے انتظار کے دوران بھٹو نے اس امکان کی نشاندہی کی تھی کہ ممکن ہے انہیں فوج اور انٹیلی جنس سروسز نے اپنی کسی سازش کے جال میں پھنسا دیا ہو۔ اگر ایسی کسی سازش کا وجود تھا تو اس کا امکانی آغاز انتخابات کی عدم شفافیت کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے احتجاج کی صورت میں ہوا۔ اس احتجاج کے توسط سے اس سازش کو آگے بڑھایا گیا۔ جو جولائی 1977ء میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعے بھٹو حکومت کی معزولی پر منتج ہوئی۔

اگرچہ بھٹو کے شکوک و شبہات کو ثابت کرنا مشکل تھا تاہم وہ کاملاً بے بنیاد بھی نہیں تھے۔ جن دنوں آئی ایس آئی انتخابات کے انعقاد کے لئے بھٹو کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اس وقت تک عوام میں پاکستانی فوج کا تاثر مکمل طور پر بحال ہو

چکا تھا۔ پاکستانی فوج کی نفری اس تعداد سے بھی بڑھ چکی تھی جو اس نے 1971ء کی جنگ سے قبل اس دور میں برقرار رکھی ہوئی تھی۔ جب مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہی ملک پاکستان کے دو صوبے تھے یعنی جب پاکستان دولخت نہیں ہوا تھا۔ بھٹو نے اپنی قابل رشک سفارتی صلاحیتوں اور مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے لئے مختلف ذرائع سے اسلحہ حاصل کیا۔ چین کی مدد سے ٹینکوں اور چھوٹے طیاروں کی ملکی پیداوار میں اضافے کا مشاہدہ کیا گیا۔ امریکہ کے ساتھ بھی پاکستان کے تعلقات مستحکم تھے۔ اگرچہ ہتھیاروں کی دوڑ کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کی امریکی خواہش کے باعث پاکستانی ابھی تک اسلحے کا کوئی بڑا نظام خریدنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ تاہم امریکہ نے 1975ء میں پاکستان (اور بھارت) کو اسلحے کی منتقلی پر جو حدود و قیود عائد کی تھیں وہ ختم کر دی گئیں۔

اندریں حالات عین ممکن تھا (اگرچہ یہ کسی طرح بھی ایک ثابت شدہ حقیقت نہیں) کہ جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھی جرنیلوں میں سے کم از کم ایک نے سوچا ہو کہ فوجی کی برتری کی تجدید کے لئے یہ ایک سنہری موقع ہے۔ تاہم پاکستان میں فوجی انقلاب کے لئے بھی سیاسی جواز درکار ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ملک جمہوری اداروں کے قیام میں ناکام ہو چکا تھا۔ تاہم یہ بدستور اس جنوبی ایشیائی روایت کا حصہ بنا رہا جس کے مطابق جواز حکمرانی کو حکمرانی کا ایک اہم عنصر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر ملک سیاسی افراتفری اور انتشار کا شکار نہ ہو تو کسی جرنیل کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اقتدار سنبھال لے یا فوجی انقلاب کا جواز پیدا کر لے۔

پاکستان کی تاریخ نے سیاسی انتشار کی تلاش کو سہل کر دیا یا پھر اسے عظمت اور بڑائی کے وہم اور خبط میں مبتلا سیاستدانوں یا کمزور سویلین اداروں کی مدد سے تراش لیا گیا۔ اپنے مخالفین کی شہری آزادیوں میں مداخلت سے لیکر خود کو اپنے حامیوں سے الگ تھلگ کرنے تک بھٹو نے متعدد سیاسی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ بطور ایک سویلین راہنما بھٹو کے جواز حکمرانی کا ماخذ عام انتخابات میں ان کی فتح تھی۔ متنازعہ ذرائع کے توسط سے حاصل شدہ انتخابی فتح بھٹو کے سیاسی جواز حکمرانی کو مشکوک بنا سکتی تھی۔ ان کی قائدانہ حیثیت کا جواز ختم کئے بغیر فوج بھٹو کی حکومت کو گرا نہیں سکتی تھی۔ یہی چیز بھٹو کو انتخابات کے انعقاد کا مشورہ دیتے وقت آئی ایس آئی کی بے چینی اور بے صبری کی وضاحت کرتی ہے۔

5 جنوری 1976ء کے دن آئی ایس آئی نے وزیراعظم بھٹو کو "عام انتخابات" کے عنوان سے ایک "انتہائی خفیہ یادداشت" ارسال کی۔ جس پر جنرل جیلانی کے دستخط موجود تھے۔ یادداشت میں درج تھا کہ بھٹو اپنی مقبولیت کے عروج پر ہیں اور چونکہ حزب اختلاف منقسم ہے۔ لہذا وہ انتخابات میں تاریخی فتح حاصل کریں گے۔ بھٹو کی خودی کو بھی یہ چیز اچھی لگی۔

بھٹو کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہ جسیم بھی تھے اور دیرینہ بھی۔ بلاشبہ قوم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ہمیں امید نہیں کہ ہم اس مختصر سی دستاویز میں ان انقلابی تبدیلیوں، اصلاحات اور کامیابیوں کی تفصیل بیان کر سکیں۔ جن کا سہرا مسٹر بھٹو کی قیادت میں اس حکومت کے سر ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ تند و تلخ اور حبس زدہ سیاسی ماحول میں ان کی قیادت تازہ ہوا کا

جھونکا اور اقتصادی افراتفری اور انتشار کے تاریک دنوں میں صبح امید ثابت ہوئی۔ ان کے دور اقتدار میں تحریک پاکستان کی روح اور جذبوں کی تجدید ہوگئی۔ انہوں نے عوام کو ان کی "روح" لوٹا دی اور نئے آئین کی طرف بڑھنے کے لئے انہیں ہمت فراہم کر دی۔ انہوں نے ملک کی خارجہ پالیسی کو ہی ماہرانہ انداز میں نہیں چلایا بلکہ گونا گوں اور شدید اندرونی مسائل پر قابو پاتے ہوئے دوسری سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کے ساتھ تعلقات کار قائم کئے اور اپنی ان خوبیوں کی بناء پر غیر ملکی راہنماؤں کی طرف سے لائق ستائش و تحسین ٹھہرائے گئے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قومی اہداف اور مقاصد کا غیر مبہم اور واضح تعین کیا گیا۔

اگرچہ آئی ایس آئی نے کہا کہ وہ چیئرمین یا ان کی حکمران جماعت کی عظیم الجثہ کامیابیوں کی تفصیل بیان کرنے یا ان کی تعریف اور مدح سرائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ایجنسی کی طرف سے بھیجی گئی 53 صفحات پر مشتمل اس دستاویز کا لہجہ خوشامدانہ تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ مقصد آئی ایس آئی کے منتخب کردہ وقت پر بھٹو کو انتخابات کے انعقاد کے لئے قائل کرنا تھا۔ اس دستاویز میں لکھا گیا کہ :-

"جہاں تک سیاسی صورت حال کا تعلق ہے۔ ملک کے محبّ وطن دانشور ابھی تک محسوس کرتے ہیں کہ مسٹر بھٹو ملک کے لئے ناگزیر ہیں اور آئندہ کچھ عرصے تک ناگزیر رہیں گے کیونکہ (1) (سیاسی) میدان میں ان کے مقام و مرتبے کی حامل یا اس سے قریب تر کوئی قیادت دستیاب نہیں۔ (2) بھٹو پاکستان کے واحد راہنما ہیں جنہیں عالمی سطح پر کوئی مقام و مرتبہ حاصل ہے یا عالمی سطح پر کسی امیج کے حامل ہیں۔ جو عالمی پاور پالیٹکس کے داؤ پیچ کا عمیق علم اور گہرا تجربہ رکھتے ہیں۔ جن کی پاکستان کے لئے تھوڑی بہت خدمات ہیں اور جو پاکستان کے استحکام اور سالمیت کی علامت ہیں۔ (3) انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے اور صوبہ بلوچستان میں علیحدگی پسندانہ رجحانات پر صورت حال کو سنگین کئے بغیر قابو پایا۔ (4) وہ واحد میانہ رو راہنما ہیں۔ باقی تمام راہنما یا تو کاملاً دائیں اور یا پھر کاملاً بائیں بازو کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان ہر دو اقسام کے راہنما ملکی یا بین الاقوامی سطح پر دشواریوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ (5) اس مرحلے پر ان کی حیثیت میں آنے والی کوئی کمزوری ملک دشمن عناصر کو طاقتور اور قوی بنا سکتی ہے۔ جن کے خلاف وہ ابھی تک جنگ کر رہے ہیں۔ حالیہ ملکی صورت حال اور عالمی فضا کو مدنظر رکھا جائے تو پاکستان احتجاجی سیاست کا متحمل نہیں ہوسکتا"۔

"حزب اختلاف کی جماعتوں کی پوزیشن میں (تاحال) کسی قابل ذکر بہتری کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکا۔ وہ ابھی تک انتشار اور بے ترتیبی کا شکار ہیں۔ مزید براں۔ تادم تحریر کوئی واضح۔ غیر مبہم اور بامقصد انتخابی اتحاد معرض وجود میں نہیں آسکا"۔

"اگر ملک گیر بنیادوں پر آج پارٹی پوزیشن کا انتہائی قدامت پسندانہ اور سرسری سا تخمینہ بھی قائم کیا جائے تو امید ہے کہ سندھ سے 75 سے 80 فیصد تک اور پنجاب سے 70 فیصد عوام اپنا حق رائے دہی حکمران جماعت کے حق میں استعمال کریں گے"۔

وزیراعظم نے آئی ایس آئی کی تجویز قبول کرتے ہوئے انتخابات کے شیڈول کا اعلان کر دیا۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کے لئے 7 مارچ 1977ء جبکہ صوبائی اسمبلی کے لئے 10 مارچ 1977ء تواریخ مقرر کی گئیں۔ آئی ایس آئی کی پیش گوئی کے برعکس مسلم لیگ اور دو سیکولر جماعتیں مذہبی جماعتوں کے اتحاد میں شامل ہو گئیں اور "پاکستان قومی اتحاد" (پی این اے) کے نام سے ایک انتخابی اتحاد قائم کر لیا گیا۔ انتخابی مہم کا آغاز ہوا تو پی این اے نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ بعض تجزیہ نگار اس قوت کا باعث شہری متوسط طبقے کو قرار دیتے ہیں جو بھٹو کی اشتراکی پالیسیوں پر نالاں تھا۔ اگرچہ وزیراعظم نے یہ تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ وہ اسلام پسندوں کے جذبات کو ترجیح دیتے ہیں تاہم اسلام پسند انہیں قبول کرنے پر (کسی صورت) تیار نہ تھے۔ انہیں ایسے لوگوں نے فنڈز مہیا کئے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ بھٹو کی (صنعتوں کو) قومیانے اور دولت کی تقسیم نو جیسی پالیسیوں کے ڈسے ہوئے تھے۔ پی این اے میں سیکولر جماعتوں کی موجودگی کے باوجود اس کی انتخابی مہم کا لہجہ ابتدا ہی سے مذہبی تھا۔

"پورے 45 دن دو مخلوط سیاسی اتحادوں کے درمیان ٹھنی رہی پی پی پی زمینداروں، دیہی غرباء اور شہروں میں مقیم ان افراد کی نمائندگی کر رہی تھی جنہیں (بوجوہ) دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ جبکہ پی این اے طاقتور متوسط طبقے کا نمائندہ اتحاد تھا۔ دونوں نے وہ لڑائی لڑی جس پر ماہرین معاشیات نے "وہسکی۔ جنگ اور اسلام" کی مہم کا لیبل چسپاں کر رکھا تھا۔ یہ بلاشبہ ان دو مختلف گروہوں کے درمیان موجودہ کھنچاؤ اور کشیدگی کی علامات تھیں جو ایک دوسرے پر اپنی مرضی مسلط کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اپوزیشن کی طرف سے بھٹو پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ بلانوش اور رنگ رلیاں منانے کے عادی تھے۔ ردعمل کے طور پر بھٹو نے کہا کہ وہ "شراب پیتے ہیں۔ لوگوں کا خون تو نہیں پیتے" جب پی این اے بھٹو پر الزامات کی بوچھاڑ کی صورت میں متوسط طبقے کی مذہبی اقدار کا تحفظ کر رہا تھا۔ اس وقت بھٹو اپوزیشن اور رائے دہندگان کو یہ باور کرانے میں مصروف تھے کہ وہ غریبوں کے نمائندہ ہیں"۔

پی این اے کی انتخابی مہم کی طاقت اور زور و شور سے ان حلقوں کے جذبات جھلکتے تھے جن سے بھٹو نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار کے دوران خود کو الگ تھلگ کئے رکھا۔ ایک امریکی سفارت کار نے لکھا:۔

"پاکستان پر 5 سالہ حکمرانی کے دور میں بھٹو نے ان غریب عوام پر اپنا جذباتی تسلط برقرار رکھا جنہوں نے 1970ء کے انتخابات میں انہیں بڑی تعداد میں ووٹ دیئے تھے۔ تاہم اس دوران انہوں نے کئی دشمن بھی بنائے۔ اپنے اقتدار کے پہلے دو سالوں میں بڑی صنعتوں کو قومیا کر انہوں نے کاروباری حلقوں کو مضطرب کر دیا۔ 1976ء میں انہوں نے آٹا۔ چاول اور کپاس کی کئی ہزار فیکٹریاں اور ملیں قومیالیں۔ یہ ایک غلط فیصلہ تھا جس نے چھوٹے صنعتکاروں اور تاجر برادری کو ناراض کر دیا۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دانشوروں۔ طلباء اور ٹریڈ یونینز کے کرتا دھرتا افراد نے محسوس کیا کہ بھٹو نے قدامت پسندانہ اقتصادی پالیسیوں کی سمت جھکاؤ دکھا کر انہیں دھوکہ دیا۔ جاگیرداروں اور پاکستان کے روایتی پاور بروکرز

کے ساتھ میل جول نے بھی انہیں ان کے اصل حامیوں کے نزدیک ناقابل بھروسہ بنا دیا۔ بھٹو کے طرزِ حکومت میں بڑھتی ہوئی مطلق العنانیت اور سیاسی مخالفین کے ساتھ ان کے خودسری پر مبنی رویے نے بہت سے لوگوں کے اذہان کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور لوگ ان سے دور ہوتے چلے گئے"۔

اس قدر شدید مخالفت کے باوجود ایک ایسے ملک میں غریبوں کی حمایت نے بھٹو کی انتخابی فتح کو یقینی بنا دیا جہاں غریبوں کی واضح اکثریت تھی۔ تاہم بھٹو کو توقع نہیں تھی کہ انتخابی مہم کے دوران پیدا ہونے والا مذہبی جوش و خروش احتجاجی سٹریٹ پاور میں بدل کر ان کی حکومت کی معزولی کا باعث بن جائے گا۔

ان انتخابات کے دنوں میں معروف امریکی دانشور مارون وین بام پاکستان میں تھے۔ ان کے خیال میں بھٹو نے انتخابات کے وقت کا جو تعین کیا وہ ان کی معاشی کامیابیوں کے ساتھ منسلک تھا۔ 1972ء اور 1975ء کے درمیانی عرصے میں افراطِ زر کی شرح اوسطاً 25 فیصد سالانہ تھی جو کم ہو کر صرف 6 فیصد رہ گئی۔ ملکی معیشت 5 فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی پذیر تھی جبکہ اس سے قبل یہ شرح 3 فیصد تھی۔ زرعی شعبہ بھی کئی سالوں پر محیط جمود کے بعد ترقی پذیر تھا۔ سرکار کی طرف سے ٹیوب ویلوں پر بھاری سرمایہ کاری کی جا رہی تھی اور کھادوں۔ زرعی ادویات اور کاشتکاری میں استعمال ہونے والے دیگر لوازمات پر سبسڈی جا رہی تھی۔

وین بام لکھتے ہیں "بھٹو کا یہ دعویٰ درست تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستانی قوم کی خود اعتمادی میں جو کمی آئی۔ اس کی بحالی اور خطے کے کھنچاؤ میں واقع ہونے والی حالیہ کمی کا کریڈٹ انہیں جاتا ہے"۔ تاہم ان مثبت پیش رفتوں کے اثرات کو بعض منفی پیش رفتوں نے زائل کر دیا۔ نہ تو بھٹو کی نافذ کردہ زیادہ تر اصلاحات کے مفادات لوگوں تک پہنچتے اور نہ ہی عام شہریوں کے ساتھ حکومت نے ایسا ہمدردانہ سلوک کیا کہ اسے قابلِ تعریف کہا جا سکے۔

طلباء اور اہلِ دانش نے سیاسی آزادیوں کی عدم فراہمی پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور حکومت کے ساتھ اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے پی این اے کی حمایت کی۔ جب بھٹو نے روایتی جاگیردار اشرافیہ کے ساتھ اپنے مراسم بڑھائے تو بائیں بازو سے تعلق رکھنے والا فعال طبقہ خاصا مایوس ہوا۔ ان میں سے بعض نے انتخابی مہم سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ "انتخابات کے دن قریب آئے تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ پی این اے کو اچھی خاصی وسیع حمایت میسر آ رہی تھی اور اسی تاثر نے پی پی پی سے بعض فاش غلطیوں کا ارتکاب کرا ڈالا۔ نتیجتاً پی این اے کو سنہری موقع میسر آ گیا کہ وہ بھٹو پر انتخابی دھاندلیوں کا الزام عائد کر سکے"۔

"پیپلز پارٹی ہل کر رہ گئی اور انتخابی مہم کے آخری دو ہفتوں کے دوران اس نے شدید جوابی حملوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تنظیمی کاوشیں دوچند کر دی گئیں اور انتخابی مہم میں شامل اہم لوگوں کے اپوزیشن پر زبانی حملوں میں شدت پیدا ہو گئی۔

انتخابات والے دن کئی پولنگ سٹیشنوں پر پولنگ گھنٹوں بندرہی۔ گن پوائنٹ پر بیلٹ باکسز اٹھوا لئے گئے۔ ایک ایک ووٹر نے کئی کئی مرتبہ اپنا حق رائے دہی استعمال کیا اور نشان زدہ بیلٹ پیپر گلیوں میں اور سڑکوں پر گرے پائے گئے۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مرکز سے وسیع دھاندلی کی ہدایات جاری نہیں کی گئی تھیں بلکہ حکمران جماعت کے مقامی کارکنوں اور مقامی افسران نے ملکر یہ سب کچھ کیا جس کا مقصد اپنی کارگزاری دکھانا اور اپنی نوکریوں اور رسوخ کا تحفظ کرنا تھا۔ پی پی کی اکثریت کو چرانے کی بجائے بڑی آہستگی سے ایک طرف ہٹا دیا گیا"۔

انتخابات کے فوراً بعد بھٹو کے حامیوں نے اپنی سہولت کے مطابق انتخابی ضابطوں میں لچک پیدا کر لی اور اس طرح اپوزیشن کو انتخابات میں دھاندلیوں کا الزام عائد کرنے کے لئے جواز میسر آ گیا۔ بھٹو خود اور ان کے تمام وزرائے اعلیٰ اپنے اپنے پارلیمانی حلقوں میں بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اپوزیشن کے زیادہ تر امیدواروں کو پولیس کے ذریعے اغوا کرا لیا گیا تا کہ وہ اپنے کاغذات نامزدگی جمع نہ کرا سکیں۔ (ان امیدواروں میں سے اکثر کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا) اگرچہ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کو یقین دہانی کرا دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے حلقوں اور اضلاع میں بآسانی کامیاب ہو جائیں گے تاہم انہوں نے یہ حربہ لڑائی جھگڑے کی فضاء پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ بعد میں پی پی کے سابق پریس سیکرٹری خالد حسن نے لکھا:۔

" بھٹو کے بلا مقابلہ انتخاب کی خبر وزارت اطلاعات و نشریات کے توسط سے قومی پریس تک پہنچی۔ سیکرٹری مسعود نبی نور نے جو ایک سرکاری ملازم تھے 3 عدد تعارفی جملوں کے ہمراہ وزیر اعظم کی تصویر مہیا کی۔ وہ جملے کم ال سنگ کی کتاب سے لئے گئے تھے۔ اخبار سے درخواست کی گئی تھی کہ تینوں میں سے ایک تعارفی جملہ تصویر کے نیچے شائع کیا جائے لیکن ڈان نے تینوں تعارفی جملے بیک وقت شائع کر کے نتائج کی ذمہ داری مذکورہ وزارت کے کندھوں پر منتقل کر دی"۔

وہ تینوں تعارفی جملے کچھ اس طرح تھے۔ "غیر متنازعہ راہنما"۔ "اعلیٰ و ارفع راہنما" اور "عظیم راہنما"۔ بلا مقابلہ انتخابات کا یہ اہتمام اور ایک منتخب راہنما کے بارے میں اس قسم کی مبالغہ آمیز زبان کا استعمال پارلیمانی جمہوریت کی روایات کے منافی تھا۔ ووٹنگ اور گنتی سے پہلے ہی انتخابی عمل کی غیر جانبداری اور شفافیت کو متنازعہ بنانے کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

انتخابات کے دن پی پی پی نے قومی اسمبلی کی 155 نشستیں جیت لیں اور استعمال شدہ کل ووٹوں کا 58 اعشاریہ ایک فیصد اس کے حصے میں آیا۔ پی این اے 35 اعشاریہ 44 فیصد ووٹ اور 36 نشستیں حاصل کر سکا۔ پنجاب میں لاہور ایک استثنیٰ رہا اور نہ حزب اختلاف صوبہ سرحد اور ان تمام بڑے شہروں میں جیت گئی جہاں اس نے بڑی بڑی ریلیاں منعقد کی تھیں۔ پنجاب میں پی این اے نے خاصی ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس صوبے کی 116 نشستوں میں سے وہ

صرف 8 حاصل کر سکا۔ ان نتائج نے بھٹو سمیت تقریباً ہر ایک کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کر دیا کہ ممکن ہے انتخابی نتائج کو تبدیل کیا گیا ہو۔ آج کے دن تک یہ بات صیغہ راز میں ہے کہ 1977ء کے انتخابات میں ہونے والی جزوی دھاندلی کا ذمہ دار کون تھا۔ پی این اے کے بعض راہنما ابھی تک بھٹو کو ذاتی طور پر انتخابی بے قاعدگیوں اور بے ضابطگیوں کا ذمہ دار خیال کرتے ہیں۔ جن جرنیلوں نے بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا ان کا خیال بھی یہی تھا۔ لیکن امریکی سفیر ہنری بائروڈ جسے بھٹو نے انتخابات کے دن شام کے وقت ٹیلی ویژن پر انتخابی نتائج دکھانے کے لئے مدعو کیا تھا وہ مختلف تصور پیش کرتا ہے:۔

"بھٹو کراچی اور پشاور میں ہار رہے تھے۔ پھر پنجاب میں ووٹوں کی گنتی شروع ہوگئی۔ بدمعاش اور لٹیرے بھی 99 فیصد ووٹ حاصل کر کے جیت رہے تھے۔ اس موقع پر بھٹو بالکل خاموش ہوگئے اور شراب کی زیادہ مقدار اپنے معدے میں اتارنے لگے۔ انہوں نے لاہور فون کیا اور پوچھا کہ وہ لوگ کیا کر رہے تھے۔ میں دوسری صبح آٹھ بجے بھٹو سے ملا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھٹو نہیں کوئی اور تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ ساری رات سو نہیں سکے تھے۔ ظاہر ہے شراب پیتے رہے ہوں گے۔ وہ حد درجہ اداس تھے"۔

پی این اے کے حامی چیخ چیخ کر انتخابی نتائج کو چیلنج کر رہے تھے اور پی پی پی اپنی "شاندار فتح" کی وجوہ کی فہرست مرتب کر رہی تھی۔ جس طرح پی پی پی کی انتخابی فتح میں مبالغہ شامل تھا۔ اسی طرح پی این اے کی طرف سے عائد کردہ الزامات بھی مبالغہ آرائی پر مبنی تھے۔ تاہم جیسا کہ وین بام لکھتا ہے "انتخابی بے قاعدگیوں کی ابتداء یا حدود جو بھی تھیں۔ چند دنوں کے اندر اندر انتخابات کے حوالے سے کی جانے والی تمام تر محنت اکارت گئی اور اس مشق کے قانونی جواز اور حیثیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا"۔

بھٹو کو اس امر کا ادراک ہوگیا کہ انتخابی نتائج میں تحریف کی گئی تھی۔ انہوں نے پی این اے کی قیادت سے فوری رابطہ کیا اور کوئی ایسا اہتمام کرنا چاہا جس کے نتیجے میں پی این اے کی نمائندگی بڑھ جاتی۔ بقول کوثر نیازی انتخابات سے اگلے دن بھٹو کے سیاسی ساتھیوں نے انہیں مطلع کیا کہ قومی اسمبلی کی 30 سے 40 نشستوں پر دھاندلی کی گئی تھی۔ بھٹو نے کہا" کیا ہم پی این اے والوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ان نشستوں پر ضمنی انتخابات ہوں تو ہم اپنے امیدوار کھڑے نہیں کریں گے؟" انتخابات کے فوراً بعد 3 دنوں کے دورانیے میں وزیراعظم نے مفتی محمود کے ساتھ کم از کم دو مرتبہ رابطہ کیا۔ یہ مذہبی راہنما پی این اے کے صدر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے لیکن پی این اے کی قیادت فیصلہ کر چکی تھی کہ گلیوں میں اور سڑکوں پر نکل کر بھٹو سے جنگ لڑی جائے گی۔

اتحاد نے 10 مارچ کو ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اور 11 مارچ کو ملک گیر ہڑتال کی اپیل کر دی۔ بعد ازاں ایک متشدد احتجاجی مہم کا آغاز کر دیا گیا جس کا ابتدائی مطالبہ یہ تھا کہ تازہ انتخابات منعقد کرائے

جائیں۔ بعدازاں مذہبی جماعتوں کی سرپرستی میں "نظام مصطفیٰ" کے نفاذ کے لئے احتجاجی تحریک شروع کردی گئی۔ جب ریلیوں کے انعقاد اور احتجاجی مظاہروں پر پابندی عائد کردی گئی تو پی این اے نے احتجاجی مظاہروں کو منظم کرنے کے لئے مسجدیں استعمال کرنا شروع کردیں۔ اگرچہ سیکولر ذہن رکھنے والے فعال لوگ بدستور پی این اے کا حصہ بنے رہے۔ تاہم مساجد کے استعمال نے بھٹو کی مخالفت میں مذہبی رنگ بھر دیا۔ تین ماہ کے مختصر عرصے میں مختلف احتجاجی مظاہروں کے دوران سیکیورٹی فورسز کے ساتھ تصادم کے نتیجے میں کم از کم 200 افراد مارے گئے۔ احتجاج کو دبانے کے لئے بھٹو فوج کی مدد مانگنے پر مجبور ہوگئے۔ فوجی افسران نے جلد ہی اپنے ہم وطنوں پر گولی چلانے کے احکامات ماننے سے انکار شروع کر دیا۔ جی ایچ کیو میں جنرل ضیاء الحق کے پرنسپل سٹاف افسر نے بعد میں لکھا کہ سیاسی صورت حال نے فوج پر شدید دباؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مظاہرین نے فوج پر الزام عائد کیا کہ وہ انتظامیہ کی طرفداری کر رہی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوج بھی احتجاجی مظاہروں میں ان کی مددگار بنے۔ بذریعہ ڈاک چلائی کی جانے والی مہم کے دوران فوجی افسران کو متعدد خطوط موصول ہوئے جن میں ان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ ایک غیر قانونی حکومت کے احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیں۔ فوجیوں پر زور دیا گیا کہ وہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لئے ایک مقبول عوامی مطالبے کی حمایت کریں۔ اس اپیل نے نفسیاتی اثرات مرتب کئے۔ رفتہ رفتہ فوجی سپاہیوں پر الٹ اثرات ہونا شروع ہوگئے کیونکہ روایتی اعتبار سے وہ مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ بعض فوجی کمانڈرز نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ اگر فوج عوامی مظاہروں کا مسلسل سامنا کرتی رہی تو اس کے عسکری نظم و ضبط کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے"۔

ضیاء کی فوجی بغاوت کے بعد بھٹو اور ان کے ساتھی سوال کرتے تھے کہ کیا "فوج پر پڑنے والا دباؤ" اور "احتجاجی مظاہروں میں پایا جانے والا مذہبی رنگ" ملک پر فوجی حکمرانی کے ایک مرتبہ پھر قیام کا کافی جواز تھا؟ اگر پی این اے اور بھٹو کے درمیان متنازعہ صرف 7 مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات کی شفافیت ہی تھی تو اس تنازعے کو کسی سیاسی سمجھوتے کے ذریعے حل کرنا ناممکن نہیں تھا۔ تعداد میں کم مگر مذہب کے ساتھ "جارحانہ وابستگی" کے حامل مظاہرین اب اسلامی نظام حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ بھٹو پر یہ الزام بھی عائد کر رہے تھے کہ وہ کسی اسلامی راہنما کی عین ضد ہیں۔ انتخابی تنازعے سے قبل ہی جماعت اسلام کے بانی مولانا مودودی نے اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں "صرف اسلامی نظام" ہی قابل قبول ہوگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ مظاہرین تازہ انتخابات سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کر رہے تھے اور بھٹو کو ہٹانے کا مطالبہ صرف فوجی بغاوت کے ذریعے ہی پورا ہو سکتا تھا۔

اپریل میں جب احتجاجی مظاہروں کو شروع ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ 6 ماہ کے اندر ملک میں شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں آجائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی انہوں نے ملک میں شراب کے استعمال۔

ہر قسم کی قمار بازی اور نائٹ کلبوں پر مکمل پابندی عائد کردی۔ پی این اے جس نے اس سے قبل انتخابی نتائج پر کوئی سمجھوتہ نہ کرنے کا اعلان کر رکھا تھا اب اس نے نظام اسلام کے نفاذ کے لئے ان اقدامات کو ناکافی قرار دیدیا۔ بھٹو سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کردیا گیا۔ سعودی عرب کے سفیر اور "تنظیم آزادی فلسطین" کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ایک رکن کے اصرار پر پی این اے جون میں بھٹو کے ساتھ مذاکرات پر متفق ہو گیا۔ اس وقت تک اسلام پسند پی این اے کی احتجاجی مہم کے مکمل کنٹرول میں تھے اور انہیں مذاکراتی کمیٹی مین بھی اہم کردار سونپا گیا۔ اگرچہ 5 جولائی 1977ء کو مذاکرات کے شرکاء کہہ رہے تھے کہ وہ تازہ انتخابات پر سمجھوتے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ لیکن فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔

فوج کا دعویٰ تھا کہ بھٹو اور پی این اے کے باہمی مذاکرات بے نتیجہ جا رہے تھے۔ لہذا فوجی مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی۔ ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ نئے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو اسلامی جماعتوں بالخصوص جماعت اسلامی نے اس تبدیلی کو جشن کے طور پر منایا اور بڑے شہروں کی مساجد کے باہر مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ جنرل ضیاء نے اعلان کیا کہ:-

"میں کاملاً واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میری کوئی سیاسی خواہشات ہیں اور نہ ہی فوج اپنی سپاہیانہ طرز زندگی سے ہٹنا چاہتی ہے۔ میرا واحد ہدف آزادانہ اور شفاف انتخابات کا انعقاد ہے۔ جو اسی سال اکتوبر میں ہوں گے۔ انتخابات کے انعقاد کے بعد جلد ہی اقتدار قوم کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں حلفاً یقین دہانی کراتا ہوں کہ اپنے اس شیڈول کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ آئندہ تین ماہ کے دوران میری پوری توجہ انتخابات کے انعقاد پر مرکوز رہے گی اور میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اپنی توانائیاں کسی اور کام پر صرف نہیں کروں گا"۔

لیکن ضیاء الحق نے انتخابات ملتوی کر دیئے اور ایک سال بعد پی این اے کو اپنی کابینہ میں شامل کرنے کے بعد ملکی قوانین اور اداروں کو اسلامائز کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ 1979ء میں ضیاء الحق نے بھٹو کو ان کے ایک سیاسی مخالف کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے پر ٹرائل کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا۔ عام انتخابات 1985ء سے قبل نہ ہو سکے۔ ان کا انعقاد بھی تمام سیاسی جماعتوں کو سیاسی عمل میں سے باہر نکالنے کے بعد عمل میں آیا۔

جنرل ضیاء الحق کے متعدد ساتھیوں اور بعض مبصرین نے مختلف اوقات پر یہ ثابت کرنے کے لئے طویل وعریض مضامین تحریر کئے کہ انہوں نے بھٹو کو معزول کرنے اور عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کا جو فیصلہ کیا اس کا باعث حالات بنے اور انہوں نے اس حوالے سے کوئی پیشگی منصوبہ بندی نہیں کر رکھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جنرل ضیاء اپنے وعدے کے مطابق انتخابات کے انعقاد کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس وقت اپنا ذہن بدلنے پر مجبور ہر گئے جب انہیں بھٹو کے "کارناموں" کا علم ہوا۔ انہیں خوف تھا کہ اگر انتخابات کے نتیجے میں بھٹو برسر اقتدار آ گئے تو وہ ان کے انتقام سے نہیں بچ

سکیں گے۔ لیکن احتجاجی تحریک کی راہنمائی کرنے والوں سے ان کے گہرے تعلقات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پہلے فوجی انقلاب کی راہ ہموار کی گئی اور پھر ضیاء نے بھٹو کا تختہ الٹ دیا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انقلاب سے قبل پیشگی سوچ بچار کر لی گئی تھی۔

آئی ایس آئی کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ بریگیڈئر افضل حسین صدیقی لکھتے ہیں کہ اپریل میں ضیاء الحق نے انہیں ہدایت کی کہ وہ بھٹو کے آبائی صوبہ سندھ کا دورہ کریں اور اندازہ لگائیں کہ کیا عوام مارشل لاء کو قبول کر لیں گے؟ 27 اپریل 1977ء کو تینوں مسلح افواج کے سربراہوں اور چیئرمین جوائنٹ چیفس کمیٹی نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا کہ وہ موجودہ "قانونی اور آئینی حکومت کی حمایت میں متحد ہیں" ماضی میں ایسے کسی بیان کی نظیر دستیاب نہیں تھی۔ اس بیان کے ذریعے جنرل ضیاء الحق کی طرف سے سویلین حکومت کو یہ پیغام پہنچ گیا کہ جب تک ممکن ہوا وہ حکومت کی حمایت کرتے رہیں گے۔ بھٹو اس وقت اپوزیشن کے ساتھ معاملات طے کر رہے تھے۔ اپنے آرمی چیف کا یہ بیان پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنے موقف کو نسبتاً سخت اور غیر لچکدار بنا لیا۔ 7 مئی 1977ء کو جنرل ضیاء کی طرف سے فوج کی تمام فارمیشنوں کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا گیا۔

"بدقسمتی سے قومی اسمبلی کے انتخابات کے بعد ملک احتجاجی سیاست کی سخت گرفت میں آ چکا ہے۔ (اندریں حالات) ہمارا فرض کیا ہے؟ ہمیں چاہئے کہ قانون کے مطابق تشکیل دی جانے والی حکومت کے احکامات کی تعمیل کریں۔ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ انتخابات شفاف نہیں تھے۔ کیا ہم فوج میں رہتے ہوئے اس حوالے سے کوئی فیصلہ دے سکتے ہیں؟ کیا ایسے معاملات کو قانون کے مطابق طے کرنے کے لئے قانون کے مطابق تشکیل دی گئی مشینری موجود نہیں؟ کیا اس نوعیت کے الزامات کی چھان بین کے لئے عدالت ہائے عالیہ اور عدالت عظمیٰ موجود نہیں ہیں؟ کیا فوج کو یہ فیصلہ کرنے کے لئے شرکائے جلوس کی بات سننی چاہئے کہ درست کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ حکومت کی قانونی حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے فوج جج کا کردار ادا نہ کرے"۔

درست سیاسی سمت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ضیاء نے اپوزیشن کے ساتھ خفیہ روابط بھی قائم رکھے۔ پی این اے کے ایک راہنما نوابزادہ نصر اللہ خان کے بقول جب اپوزیشن بھٹو کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھی۔ تو آئی ایس آئی نے پی این اے کے بعض راہنماؤں سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ بھٹو پر بھروسہ نہ کریں۔ پی این اے کے سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد بھی نوابزادہ مرحوم کے اس بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فوج نے پی این اے کے راہنماؤں کو یقین دلایا تھا کہ شفاف انتخابات کا انعقاد بھی عمل میں آئے گا اور انہیں شریک اقتدار بھی کیا جائے گا۔ بھٹو کے خلاف احتجاجی مظاہروں کے پس منظر میں کارفرما اصل قوت جماعت اسلامی تھی۔ اگرچہ فوج نے جب موثر طور پر اقتدار سنبھال لیا تو جماعت اسلامی نے اس کی حمایت کی۔ تاہم وہ مارشل لاء کے نفاذ سے قبل جنرل ضیاء الحق کے ساتھ کسی قسم کی ساز باز یا گٹھ

جوڑ کے وجود سے انکاری تھی۔ یہ ممکن ہے کہ ملٹری انٹیلی جنس میں شامل کچھ لوگوں نے اسلام پسندوں کو تشدد آمیز احتجاج کی اجازت دیدی ہو اور ادھر بعض دوسرے سیاستدانوں سے کہہ دیا ہو کہ وہ بھٹو اور اپوزیشن کے درمیان کسی بھی ڈیل یا سمجھوتے کو دشوار تر بنا دیں۔

ضیاء الحق نے یہ کہہ کر بظاہر بھٹو کی غلط راہنمائی کی کہ اگر وہ سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لئے استصواب رائے کرا لیں تو فوج اسے تسلیم کر لے گی۔ تاہم ضیاء کے سینئیر کمانڈرز مصر رہے کہ اس جمود کو ختم کرنے کے لئے تازہ انتخابات ضروری ہیں۔ ضیاء الحق کے ہاتھوں مارشل لاء کے نفاذ سے قبل متعدد ایسی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا گیا۔ جو مشکوک معلوم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر بھٹو کہتے تھے کہ انہوں نے امریکی سفارت خانے کے ایک افسر سے دوران گفتگو کہا کہ ان کے خلاف احتجاجی مظاہرے امریکہ نے منظم کرائے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کے سوا کوئی خفیہ طور پر وہ گفتگو سننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ بھٹو کو انٹیلی جنس سروسز نے ہی مطلع کیا کہ سڑکوں پر ان کے خلاف جو مظاہرے ہوئے۔ ان میں پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے بائیں بازو کے لوگ ملوث تھے۔ یہ چیز اس امر کا ثبوت ہے کہ بھٹو نے توازن قائم کرنے کے لئے دائیں بازو کی طرف جھکاؤ دکھانے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران انہیں امریکہ کے خلاف بھی باتیں کرنا پڑیں۔

پی این اے کے ساتھ مذاکرات کے عین وسط میں جب بنیادی سمجھوتہ طے پا چکا تھا۔ بھٹو جون میں سعودی عرب، ایران اور افغانستان سمیت 6 اسلامی ملکوں کے دورے پر چلے گئے۔ سرکاری سطح پر مذکورہ دورے کی کوئی وضاحت پیش نہ کی گئی کہ بھٹو کس مقصد کے تحت بیرون ملک گئے۔ ان کے اس اچانک دورے نے اپوزیشن کے ذہن میں ان کے اصل ارادے مشکوک کر دیے اور دونوں فریقین کے درمیان جو سمجھوتہ طے پا چکا تھا اس پر دوبارہ مذاکرات کرنا پڑے۔ مذاکرات کے دوران ایک مرحلے پر آئی ایس آئی کے چیف بھی بھٹو کے ہمراہ آئے اور انہوں نے پاکستان کو لاحق فوجی خطرات کے بارے میں پی این اے کے راہنماؤں کو بریف کیا۔ اپنے آخری ایام میں بھٹو نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ضیاء الحق اور آئی ایس آئی کے چیف لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان انہیں اور اپوزیشن کو متضاد مشورے دیتے رہے۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر دو فریقین اپنے اپنے موقف کو سخت اور بے لچک بنا لیں تا کہ اگر وہ باہمی اعتماد کی کمی پر قابو پانے کی کوشش کریں تو ناکام ہو جائیں۔ فوجی بغاوت کے بعد جلد ہی جنرل جیلانی آئی ایس آئی کی سربراہی سے دست بردار ہو گئے اور سیکرٹری دفاع کے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ بعد ازاں انہیں گورنر پنجاب مقرر کر دیا گیا جہاں بیٹھ کر انہوں نے صدر ضیاء الحق کی اس طرح مدد کی کہ سرپرستی کی بنیاد پر انہیں سویلین حمایت مہیا کرتے رہے۔ 5 جولائی 1977ء کو جب ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے ایسا حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کے خاتمے کے باعث کیا۔ ضیاء الحق کی فوجی بغاوت کو موثر بنانے والے افسران نے اس کاروائی کو جو خفیہ نام (کوڈ نیم) دیا وہ "آپریشن فیئر پلے" تھا۔ جو اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ اصل مقصد دست و گریباں سیاسی گروہوں کو چھڑانا اور آزادانہ انتخابات کو یقینی بنانا تھا۔ ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں نے انقلاب کو اس طرح پیش

کیا کہ وہ ایک مشکل صورت حال کا فوری ردعمل تھا۔ لیکن ان کے بیانات میں تضادات کی بھرمار پائی گئی۔ فوجی بغاوت کے بعد جلد ہی "نیوز ویک" کے ایڈورڈ بحر نے ان کے ساتھ انٹرویو کیا۔ دوران گفتگو ضیاء سے پوچھا گیا کہ " آپ نے کیسے اور کب یہ فیصلہ کیا کہ مارشل لاء کے نفاذ کا وقت آن پہنچا ہے؟" تو ان کا جواب تھا" یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا جو میں نے 4 جولائی کو شام پانچ بجے پریس کو جاری کیا جانے والا یہ بیان سنکر کہا کہ بھٹو اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اگر ان ہر دو فریقین کے مابین کوئی سمجھوتہ طے پا جاتا تو میں یقیناً وہ نہ کرتا جو میں نے کیا"۔ تاہم ضیاء کے چیف آف سٹاف نے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل جیلانی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آخر الذکر نے بھٹو کو 3 جولائی کو ہی متنبہ کر دیا تھا کہ انقلاب قریب الوقوع ہے۔ لہذا وہ اپوزیشن کے ساتھ اپنے مذاکرات کی رفتار تیز کر لیں۔

اگر چہ انقلاب کی بھرپور تیاریاں کی جا چکی تھیں تاہم زیادہ تر بیانات سے یہی پتہ چل رہا تھا کہ مذاکرات کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ بعد میں ضیاء الحق نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ خانہ جنگی کے امکانات نے انقلاب کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ مزید براں بھٹو منصوبہ بنا رہے تھے کہ اپنے حامیوں کے درمیان اسلحہ تقسیم کریں۔ جنرل عارف 20 جون کو بھٹو اور ضیاء کے درمیان ہونے والی گفتگو کی روشنی میں مذکورہ الزام کی تائید کرتے ہیں۔ بغاوت کے بعد جرنیلوں نے خانہ جنگی کی منصوبہ بندی کے الزام پر بھٹو کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا اور نہ ہی پی پی پی کے کسی حامی سے اسلحہ برآمد ہوا کہ اس قسم کی منصوبہ بندی کا ثبوت میسر آ جاتا۔

ضیاء الحق کے ایک اور فوجی ساتھی لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان کا دعویٰ ہے کہ ابتداء میں ضیاء صرف ایک غیر جانبدار ریفری بننا چاہتے تھے لیکن اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے انتخابات کے بارے میں اپنا ذہن تبدیل کر لیا۔ لیفٹیننٹ جنرل جہانداد خان لکھتے ہیں:-

"14 ستمبر 1977ء کو حیدر آباد کے دورے کے دوران جنرل ضیاء نے مجھ سے کہا کہ گزشتہ دو ماہ کے دوران بعض ایسی چیزیں ان کے علم میں آئیں جن کی بناء پر انہوں نے مستقبل میں اپنا لائحہ عمل تبدیل کر لیا۔ انہوں نے متعدد مالی، سیاسی اور انتظامی بے قاعدگیاں گنوائیں جن کا بھٹو نے ارتکاب کیا تھا اور کہا کہ نوعیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک محب وطن اور پر خلوص راہنما ایسے کاموں کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

لیکن روئیداد خان جو ضیاء الحق کے ماتحت بطور سیکرٹری داخلہ خدمات سرانجام دیتے رہے اور جو ملک کے اندر قانون نافذ کرنے والی تمام ایجنسیوں کے باس تھے، وہ ایک مختلف کہانی بیان کرتے ہیں۔ دو عشرے بعد انہوں نے لکھا:-

"مارشل لاء کے نفاذ سے عین قبل ایسے حالات موجود نہیں تھے کہ انہیں بھٹو کے خلاف بغاوت اور مارشل لاء کے نفاذ کے جواز کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ بھٹو کے خلاف قتل کیس کو دوبارہ منظر عام پر لانا، ان کی گرفتاری اور بعد ازاں ان کے

خلاف مقدمے کا قیام اور سماعت۔سب کے پس منظر میں سیاست کار فرما تھی۔جب فوج نے انہیں معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ان کی بدقسمتی پر مہر ثبت ہوگئی"۔

بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اپنے پہلے خطاب کے دوران ضیاء نے خود کو "اسلام کا سپاہی" قرار دیا۔انہوں نے اسلام کی اس روح اور جذبے کی تعریف کی جو پی این اے کے احتجاج میں نمایاں تھے۔انہوں نے کہا:۔

"ثابت ہو گیا کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے پاکستان کی بقاء اسلام کے ساتھ گہری وابستگی میں ہی مضمر ہے۔اسی کی بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظام کو متعارف کرانا اس ملک کی لازمی پیشگی ضرورت ہے"۔

انہوں نے عزم صمیم کا اظہار کیا کہ وہ مذہب کو بنیاد مان کر ایک نیا سیاسی، معاشی اور سماجی نظام قائم کریں گے۔یہ بات کہہ کر ضیاء الحق نے انتخابات کے وعدے سے منحرف ہونے کی بنیاد رکھ دی۔بعد میں انہوں نے کہا کہ وہ انتخابات کے انعقاد کے لئے نہیں بلکہ نفاذ اسلام کے لئے اقتدار میں آئے تھے۔جس طرح پی این اے میں شامل مذہبی جماعتوں نے انتخابات کے مطالبے پر مشتمل اپنے ایجنڈے کو نظام مصطفیٰ کے مکمل نفاذ کے مطالبے میں تبدیل کر دیا۔اسی طرح ضیاء الحق بھی آہستہ آہستہ لائحہ عمل بدلتے رہے۔

ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد دنوں کے اندر دو حاضر سروس اور دو ریٹائرڈ جرنیلوں پر مشتمل ایک "انتخابی سیل" تخلیق کیا۔اس سیل میں میجر جنرل راؤ فرمان علی خان کی شمولیت نے سیکولر سیاستدانوں کو کسی حد تک چوکنا کر دیا۔وہ سیاسی جوڑ توڑ کا وسیع وعریض تجربہ رکھتے تھے۔ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کی پسپائی سے قبل وہ مشرقی پاکستان کے یکے بعد دیگرے کئی گورنروں کے سیاسی مشیر رہے۔بظاہر یہ سیل سیاسی جماعتوں کے ساتھ رابطے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔کہ ان کے ساتھ ملک میں انتخابات کا پروگرام ترتیب دیا جا سکے۔لیکن در اصل وہ جس مقصد کے لئے قائم کیا گیا وہ علانیہ مقصد کی عین ضد تھا۔یکم ستمبر 1977ء کو ضیاء الحق نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران کہا کہ انتخابات کی "تاریخ" قرآن کے مندرجات میں شامل نہیں ہے۔مطلب یہ کہ وہ تاریخ کسی تقدس کی حامل نہیں۔ اسی پریس کانفرنس کے دوراج ضیاء الحق نے ایک اشارہ دیا جس سے ظاہر ہوا کہ جو جرنیل پاکستان پر پہلے حکومت کر چکے تھے (ایوب خان اور یحییٰ خان) ضیاء الحق کی سوچ بھی انہی کی سوچ کا تسلسل تھی۔ضیاء نے کہا "اس ملک کو سیاستدان نہیں مسلح افواج متحد رکھ سکتی ہیں۔جیسا کہ 1970ء میں ہونے والے انتخابات کے موقع پر جنرل یحییٰ خان نے اعلان کیا تھا کہ جن جماعتوں کے منشور نظریہ پاکستان اور نظریہ اسلام کے خلاف ہیں انہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی"۔

اگر ضیاء الحق ابتداء ہی سے چاہتے تھے کہ علمائے دین پر مشتمل ایک ایسی حکومت قائم کر دی جائے جس کی پشت پر فوج موجود رہے تو پھر وہ اور ان کے فوجی ساتھی ان دعووں میں اتنے دور کیوں نکل گئے کہ وہ تو صرف جمہوریت کی

بحالی کے لئے آئے تھے؟ پاکستان کے ہر فوجی حکمران نے فوجی بغاوت کا جواز پیش کرنے کی کوشش کے طور پر یہی کہا کہ سویلین حکومت کی ناکامی نے فوج کے لئے مقناطیس کا کام کیا۔ پاکستانی جرنیلوں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ انہیں ملک کے محافظ اور نجات دہندہ سمجھا جائے۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے کہ انہیں ایسے سازشی جرنیل خیال کیا جائے جو ذاتی اور اداراتی اختیارات کے حصول کے لئے ہمہ وقت واقعات وحوادث کو متشکل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کی اس خواہش کے پس منظر میں کارفرما بڑا محرک یہی روایت تھی کہ بطور حکمران ان کی آمد کو برمحل اور وقت کی ضرورت سمجھا جائے اور بلاشبہ ان کے بعض فیصلے عین بروقت اور برمحل بھی تھے۔ 1977ء میں ہونے والی فوجی بغاوت جس وقت پر اور جن حالات کے تحت وقوع پذیر ہوئی۔ وہ اس امر کے متقاضی تھے کہ فوجی حکمرانی کو ایک عارضی بندوبست کے طور پر پیش کیا جائے اور کم از کم اس وقت تک اسے ضرور ناگزیر سمجھا جائے جب تک تمام بنیادیں بھر نہ جائیں۔

"آپریشن فیئر پلے" اور اقتدار کے رفتہ رفتہ حصول کی کہانی فوج کی حکمرانی کو قابل بھروسہ بنانے کے لئے ضروری تھے۔ فوج کو اقتدار سے باہر ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے اور 1971ء کے واقعات جو فوج کی شکست پر منتج ہوئے، اس وقت نسبتاً تازہ تھے۔ ضیاء الحق نے ایک حد درجہ مقبول راہنما کو اقتدار سے نکال باہر کیا تھا۔ اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے قوم کو کچھ عرصہ درکار تھا تاکہ وہ فوج کو ایک مرتبہ پھر قبول کرنے کے لئے اپنا ذہن بنالے۔ ممکن ہے حکومت کی طرف مراجعت کے لئے فوج کے اندر بھی اس وقت تک سوچ ایک نہ ہو اور فوج کی اعلیٰ قیادت کو بھی ذہنی ہم آہنگی کے حصول کے لئے کچھ وقت درکار ہو۔ ادھر بیرون ملک جمی کارٹر صرف چند ماہ قبل بطور صدر امریکہ اپنے عہدہ سنبھال چکے تھے۔ جمی کارٹر نے انسانی حقوق کو اپنی خارجہ پالیسی کے پلیٹ فارم کی چھت کا شہتیر قرار دیدیا۔ صدر ضیاء الحق کو بھی اپنی فوجی آمریت کے لئے امریکی حمایت درکار تھی۔ لیکن اس حمایت کی سطح کا تعین کرنے کے لئے انہیں بھی وقت چاہیے تھا۔ جب تک انہیں یقین نہ ہو جاتا کہ اندرون ملک بھی ان کے خلاف کوئی بغاوت سر نہیں ابھارے گی اور عالمی سطح پر بھی وہ تنہائی کا شکار نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک انتخابات کے وعدے وعید کرنا اور پھر ہر مرتبہ نئے حالات کے تحت نئی وجوہ تراش کر ان وعدوں سے پیچھا چھڑانا ضیاء الحق کی مجبوری تھی۔

اپنے ہم عصر انتہائی بااختیار افراد اور حکومتوں کے تفصیلی مطالعے کے بعد ایرک نارڈلنگر لکھتا ہے "فوج عام طور پر اس سویلین حکومت کے خلاف حرکت میں آتی ہے جو اپنی کارکردگی کے دوران ایک یا دونا کامیوں سے دوچار ہو جائے"۔ فوج عام طور پر سیاست میں اپنے اداراتی مفادات کے تحفظ (یا فروغ) کے لئے مداخلت کرتی ہے۔ لیکن بااختیار فرد یا حکومت کو چاہئے کہ وہ عوامی مفادات کا تحفظ کرتی دکھائی دے۔ بقول نارڈلنگر "ایسی حکومتوں کی معزولی کا جواز پیش کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے جن کی کارکردگی کے دوران ناکامیاں اس کے شہریوں اور فوجیوں کو بیک وقت اور یکساں طور پر عزت واحترام سے

محروم کردیتی ہیں۔فوج صرف اس وقت متحرک ہوتی ہے جب سویلین حکومت کا جواز حکمرانی کمزور پڑ جائے"۔زیادہ تر انقلاب اس لئے کامیاب رہتے ہیں کہ "جب شہریوں کی بڑی تعداد اپنی حکومت کی معزولی پر بہت زیادہ خوش تو نہ ہو لیکن سیاسی طور پر بیدار عوام اس موقع پر غم وغصے کا اظہار بھی نہ کریں"۔ضیاء نے بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت کی تو آخرالذکر کے مخالفین کے علاوہ اسلام پسند بھی ان کی معزولی پر خوش ہوئے۔اپنی حکومت کے مخالفین کے خلاف جب بھٹو نے ہنگامی قوانین کا سہارا لیا تو یہ چیز ان لوگوں کی نظر میں ان کی "کارکردگی کی ناکامی" بن گئی جو توقع کر رہے تھے کہ بھٹو اپنے مسائل پر قابو پانے کیلئے جمہوری طریق کار اپنائیں گے۔1977ء کے انتخابات پر پیدا ہونے والا اختلاف اور اس اختلاف کو مٹانے کی کوشش میں کی جانے والی تاخیر نے بھٹو حکومت کے جواز حکمرانی میں دراڑ پیدا کردی۔

اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کے باوجود بھٹو نے پاکستان کے اندر ایک ایسا نیا نظام قائم کردیا جس میں سیکولر ذہن رکھنے والے شہریوں کو برتری حاصل ہوگئی۔اس نظام کو نقصان پہنچائے بغیر فوج کے لئے اقتدار کی طرف مراجعت ممکن نہ تھی اور فوج نے یہ کام اپنے اسلام پسند اتحادیوں کی مدد سے کیا۔بھٹو نئے پاکستان کو ملاؤں اور فوج کے اس اتحاد کے حملے سے نہ بچا سکے کیونکہ انہوں نے اپنے نئے پاکستان میں پرانے پاکستان کے بڑے حصے کو بھی جگہ دیدی تھی۔یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ بھٹو کے زوال کی جزوی وجہ وہ سمجھوتے ثابت ہوئے جو انہوں نے رجعت پسند قوتوں کے ساتھ کئے۔دوسری جزوی وجہ ان کی یہ خواہش تھی کہ جب وہ فوج پر نظر ڈالیں تو وہ انہیں حجم کے اعتبار سے بڑی نظر آئے۔بھٹو کے خلاف پی این اے کی تحریک کے دوران بے قابو ہوجانے والے مذہبی جذبات پاکستان پر ایک مرتبہ پھر فوجی حکمرانی کے تسلط کا باعث بن گئے اور اس مرتبہ فوجی حکمرانی اسلام پسندوں کو جیسی نظر آئی اس کی ماضی میں کوئی مثال دستیاب نہیں۔ضیاء الحق نے ملاؤں اور فوج کے اتحاد کے نتیجے میں نہ صرف اقتدار حاصل کیا بلکہ وہ گیارہ برس اتحاد کو مضبوط اور قوی تر بنانے میں مصروف رہے۔

اسلامی جمہوریہ سے اسلامی ریاست تک

جنرل محمد ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کو پاکستان کے تیسرے فوجی حکمران کے طور پر اختیارات سنبھال لئے۔ بظاہر وہ 90 دن کے اندر انتخابات کے انعقاد کے لئے آئے اور مسلسل گیارہ برس حکمران رہے۔ یہ اب تک پاکستان کے کسی بھی حکمران کا طویل ترین دور اقتدار ہے۔ 17 اگست 1988ء کو جہاز کے ایک پر اسرار حادثے میں اپنی ہلاکت تک وہ پاکستان کے حکمران رہے۔ انہیں پاکستان کو سیاسی اسلام کا عالمی مرکز بنانے کا سب سے زیادہ ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے۔ بلا شبہ ضیاء الحق پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر روشناس کرانے میں بہت دور نکل گئے۔ انہوں نے اس جہادی نظریے کی آبیاری کی جو فی الوقت اسلامی دنیا کے بیشتر حصے کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کا سبب بنا ہوا ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے انہوں نے خود کو ایک ایسا شخص سمجھا جو قوم اور ریاست کی تعمیر کے منصوبے کو آگے بڑھا رہا ہے۔ وہ منصوبہ جس کا آغاز بانی پاکستان کی وفات کے بعد جلد ہو گیا تھا۔

فوج اور سول سروس میں اپنے پیش رووں کی طرح ضیاء الحق بھی ملکی سالمیت کو یقینی بنانے کے لئے نمائندہ اداروں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق پاکستان کی بقاء کا تقاضا تھا کہ اسے ایک نظریاتی ریاست بنایا جائے جس پر فوج اور انٹیلی نس سروسز کی راہنمائی میں بڑی احتیاط سے حکومت کی جائے۔ ایوب خان، یحییٰ خان اور ان سے پہلے متعدد پاکستانی راہنماؤں کی طرح ضیاء الحق ہندو بھارت سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے بھی اسلام ہی کے نام پر قومی یگانگت چاہی اور امید رکھی کہ پاکستان کے دفاع اور معاشی ترقی کا بل امریکہ ادا کرے گا۔ انہوں نے بھی سابقہ پاکستانی حکمرانوں کی طرح " کل اسلامی اتحاد" کے خواب دیکھے اور مسلمان دنیا میں پاکستان کے لئے قائدانہ حیثیت کے حصول کی خواہش کرتے رہے۔ ضیاء الحق کے پیش رو اسلام کو صرف پالیسی کا ہتھیار خیال کرتے رہے جب کہ ضیاء الحق کے اندر ایک سچے مسلمان کی آتش ایمانی موجود تھی۔

دوسرے پاکستانی حکمرانوں کے برعکس ضیاء الحق علماء اور مذہبی جماعتوں کو ریاستی معاملات میں اہم کردار سونپنے کے خلاف نہیں تھے۔ ان کے سیکولر ناقدین سمجھتے ہیں کہ ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے اسلام کا استعمال اپنی

مرضی کے مطابق اور متکبرانہ انداز میں کیا۔ جب کہ اسلامی نظریہ پرستوں کے خیال میں انہوں نے پاکستان کو پارساؤں کی ریاست بنانے کیلئے کافی اور اطمینان بخش اقدامات نہیں کیے۔ ریاستی ضروریات اور فن حکمرانی نظریے کی بجائے سمجھوتوں کے متقاضی تھے اور ضیاء الحق نے سمجھوتے کیے۔ اگر ضیاء کے پیش رو بلحاظ دیگر غیر متجانس عوام کے لئے معمول سے ہٹے ہوئے انداز میں اسلام کو ایک اتحادی قوت کے طور پر استعمال کرتے رہے تو ضیاء بھی جزوی طور پر معمول سے ہٹے ہوئے تھے۔ ان کے وجود کے ایک حصے کو یقین تھا کہ سیاسی ذرائع کے توسط سے تجدید اسلام ممکن ہے۔

ضیاء الحق کی زندگی کی زیادہ تر تفصیلات اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ ان کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں مذہب نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کے والد اکبر علی آرمی ہیڈ کوارٹرز میں سویلین افسر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے اور مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی کی بناء پر انہیں مولوی اکبر علی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ مولوی کے لفظی معانی بھی "خدا کے لئے وقف" ہیں۔ یہ خطاب عام طور پر علمائے دین کو دیا جاتا ہے۔ ضیاء الحق تقسیم سے قبل فوج میں شامل ہوئے اور کبھی کبھار وہ اپنی مذہبی اور ثقافتی روایات کو ترک کرنے اور برطانوی ہندوستان کے ہندوستانی افسران کے مغرب زدہ طور طریقوں کو اپنانے سے انکار کر کے اپنے اعلیٰ افسران کو ناراض بھی کر دیا کرتے تھے۔ جو طرز زندگی برطانوی ہندوستان کی ہندوستانی فوج کی گھڑ سوار رجمنٹوں اور آرمڈ کور میں شامل ہندوستانی افسران نے اپنا رکھا تھا، ضیاء الحق نے اس کی راہ میں مزاحمت کی اور وہ خدا کی ذات میں یقین اور اسلامی تعلیمات کو اپنی ذاتی مزاحمت کا باعث سمجھتے تھے۔

ضیاء نے کہا "افسران اپنا فارغ وقت شراب پینے۔ قمار بازی۔ ناچنے اور موسیقی سننے پر صرف کرتے تھے۔ جبکہ میں اس دوران نماز پڑھا کرتا تھا۔ ابتداء میں مجھے کچھ تفریح بھی مہیا کی گئی وہ بھی بعض اوقات توہین کے ہمراہ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد میرے سنئیر افسران اور اساتذہ نے مجھے میرے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا"۔ ضیاء کے بھائی امین الحق بتاتے ہیں کہ ضیاء جب پاکستانی فوج میں جونئیر افسر تھے۔ وہ رمضان المبارک کے دوران روزے کے اوقات میں اپنی یونٹ کا میس بند رکھا کرتے تھے۔ مسلمان اس مہینے کے دوران گناہوں سے بچتے ہیں۔ جنرل خالد محمود عارف جو ضیاء الحق کو فوج میں کپتانی کے دور سے جانتے تھے اور بعد میں جنہوں نے ان کے چیف آف سٹاف اور وائس چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ وہ ضیاء الحق کے مذہبی رجحانات کو ان کے "غیر فوجی پس منظر اور کم مرتبہ سلسلہ نسب" سے منسوب کرتے ہیں۔ عارف کے بقول مذہب کے ساتھ ضیاء الحق کی وابستگی عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی اور واضح طور پر اس وقت نظر آئی جب انہوں نے بلند مراتب حاصل کیے۔ عارف کا دعویٰ ہے کہ ضیاء الحق کٹر مذہبی نہیں تھے۔ کیونکہ وہ اصرار نہیں کرتے تھے کہ دیگر لوگ بھی ان کے ساتھ نماز میں شریک ہوں اور انہوں نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنے ذاتی مذہبی عقائد کبھی دوسروں پر مسلط نہیں کیے تھے۔ تاہم عارف تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے قرآن و سنت کے احکامات کے مطابق ایک اسلامی ملک پر حکومت کرنے کے لئے سیاست اور مذہب کو جو یکجا کیا وہ ان کے عقیدے کا نتیجہ تھا۔

اپریل 1978ء میں ضیاء الحق نے "برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن" (بی بی سی) کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران اس خیال سے اتفاق کیا کہ پاکستان کو ہر قسم کی آلائشوں اور گناہوں سے پاک کرنا ان کی زندگی کا مشن رہا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ ایک خالص پسند مسلمان ہیں تو ان کا جواب تھا "صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک عملی مسلمان بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر اس عمل کے دوران مجھے خالص پسند قرار دیدیا جائے تو یہ رائے قائم کرنے والوں کی مرضی ہے۔ میں اپنے جملہ اسلامی عقائد میں مثالیت پسند ہوں۔ لیکن میں نے یہ اعلان کبھی نہیں کیا کہ میں ہر چیز کا علم رکھتا ہوں۔ اگر کوئی اسلام کو خالص بنا دے تو ایک اچھی چیز ہوگی"۔ ضیاء الحق نے بتایا کہ وہ خدا، اور نصرت خداوندی پر یقین کے باعث پاکستان کے لئے کوئی بڑا کام کر جائیں گے۔ جو ان کے لئے بھی فائدہ مند ہوگا۔ بعد ازاں چند سالوں کے دوران ضیاء نے متعدد مرتبہ کسی ایسے مشن کی تکمیل کے ارادے کا اظہار کیا جو انہیں خدا نے سونپ رکھا تھا۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت تک اقتدار میں رہیں گے جب تک اللہ چاہے گا۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد دنوں کے اندر ہی ضیاء الحق نے قوانین اور معاشرے کو "اسلامائز" کرنے کے عمل کا آغاز کر دیا۔ حالانکہ 5 جولائی 1977ء کے فوجی انقلاب کا مقصد عام انتخابات کی شفافیت پر پی این اے اور پی پی کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات اور تعطل کو ختم کرنا تھا اور "اسلامائزیشن" کے طویل عمل کا آغاز اس مقصد سے انحراف کے مترادف تھا۔ ضیاء الحق کے فوجی دور حکومت کے ابتدائی چند اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی نظریاتی سمت کا تعین کیا جائے اور اس سمت کا جھکاؤ "اسلامائزیشن" کی طرف ہو۔ اگر فوجی انقلاب کے بعد چند ماہ کے اندر ہی عام انتخابات کا انعقاد عمل میں آجاتا تو نئی منتخب حکومت کو ایک اہم چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے لئے ممکن نہ ہوتا کہ بڑی مقدار میں اس قانون سازی سے پہلو تہی کر سکتی جو مطلق العنان فوجی حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد ابتدائی چند ماہ کے دوران کی۔ 1978ء کے اواخر میں سرکاری سطح پر اسلام کی ایک نظریاتی توجیہہ پیش کی گئی جس پر ایک غیر ملکی مبصر نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"(پاکستان کے اندر) ایک عمومی اسلامی ماحول متشکل ہو چکا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ ہر شعبہ صدر سے متاثر نظر آرہا ہے۔ جنہوں نے امسال عمرہ بھی کیا اور حج پر بھی گئے۔ سرکاری خطوط کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے جس کا مطلب ہے اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ مختلف آسامیوں کو پر کرنے کے لئے سرکاری اداروں کی طرف سے جو اشتہارات اخبارات میں شائع کرائے جاتے ہیں ان میں درج ہوتا ہے کہ امیدوار کو خوف خدا کا حامل اور عملی مسلمان ہونا چاہئے۔ کوڑوں کی سزا عام ہے۔ عوام نے اخبارات کے مدیران کے نام جو احتجاجی مراسلے تحریر کئے ان کے نتیجے کے طور پر ٹیلی ویژن پر بڑی بڑی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں روزے کے اوقات میں کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے والی تمام دُکانیں بند رہتی ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں روزے کے اوقات میں کسی کو چائے تک پوچھی یا پلائی نہیں جاتی، "اسلامائزیشن" کے اس عمل پر منفی تبصرے

کیئے گئے۔ایک عرب مبصر نے جنرل ضیاء الحق کے اسلام کو "پیٹرو اسلام" کا نام دیا۔مساوات پارٹی کے بانی اور پی پی پی کے سابق ستون حنیف رامے نے کہا کہ جو اسلام ضیاء الحق نے متعارف کرایا وہ "تھیوکریسی" سے کم نہیں۔مختلف اخبارات کے مدیران کے نام پاکستانیوں کی طرف سے جو خطوط موصول ہوئے ان میں ایک سیکولر ریاست کے حق میں مسٹر جناح کے موقف کے حوالے بھی دیئے گئے۔2 دسمبر 1976ء (یکم محرم الحرام 1399 ہجری۔اسلامی سال کا پہلا دن) کو قوانین کی اسلامائزیشن کے بارے میں جو اعلان کیا گیا اس کا وعدہ جنرل ضیاء نے بہت پہلے کیا تھا۔یہ قوانین کی اسلامائزیشن کی سمت ابتدائی قدم تھا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا کہ چوری، شراب نوشی، زنا اور عقیدے کی آزادی کے تحفظ پر اسلامی قوانین 12 ربیع الاول (پیغمبر اسلام ﷺ کی پیدائش کا دن) سے نافذ العمل ہوں گے۔حکومت ہائی کورٹ کی سطح پر صوبائی شریعت بنچ اور سپریم کورٹ کی سطح پر اپیلیٹ شریعت بنچ تشکیل دے گی۔یہ اسلامی عدالتیں اس امر کا تعین کریں گی کہ کوئی قانون جزوی یا کلی طور پر غیر اسلامی تو نہیں۔حکومت کا فرض ہوگا کہ ان کی آراء کی روشنی میں قانون کو تبدیل کرے۔آرڈی ننس پر عملدرآمد کے لئے کسی مدت کا تذکرہ نہیں کیا گیا، شریعت بنچوں کے روبرو کوئی مقدمہ نہ بھی لایا جائے تو انہیں قوانین کی چھان بین کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ضیاء نے اسلامی معیشت کے لئے بھی ابتدائی اقدامات کیئے اور اس حوالے سے بیک وقت قانونی تقاضے بھی پورے کیئے۔مزید براں ضیاء نے کہا کہ ماہرین جونہی کوئی قابل عمل حل پیش کریں گے۔سود کی لعنت سے پاک معیشت قائم کر دی جائے گی"۔

اگرچہ ضیاء کے ساتھیوں سمیت متعدد مبصرین ان کے اسلامی جوش وجذبے کو ان کی ذاتی مذہبیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔تاہم ضیاء الحق کے بقول ان کی پالیسیاں پاکستان کے قومی مقصد کو پورا کرنے کے لئے ضروری تھیں۔پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بارے میں ایک ہمدردانہ تجزیے کی حامل کتاب "سینگ دار چاند" (Horned Moon) کے مصنف برطانوی صحافی آئن سٹیفنز کے ساتھ جنوری 1976ء میں ایک انٹرویو کے دوران جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ ان کے ارادوں اور سوچ کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا تھا۔سٹیفنز نے کہا کہ وہ یوں بات کر رہے تھے جیسے کوئی "اعزازی مسلمان" ہوں۔سٹیفنز نے فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جنرل ضیاء اسلامائزیشن پر جتنی توجہ مرکوز کر رہے تھے۔وہ پاکستان کے بنیادی اقتصادی مسائل کے لئے نقصان دہ تھی۔اس پر جنرل ضیاء الحق نے جواباً کہا:۔

"اسلام پاکستان کی بنیاد ہے۔برصغیر کے مسلمانوں کی علیحدہ ثقافت پاکستان کی اساس بنی۔برصغیر میں سے پاکستان نام کے اس ملک کو دو قومی نظریے کے تحت تراش کر نکالا گیا۔لیکن عمومی طور پر گذشتہ 30 برس اور خصوصاً گزشتہ 7 برس کے دوران ہمارے معاشرے کی اخلاقی اقدار کا ستیاناس کر دیا گیا۔آپ سنیں گے کہ پاکستان اس وقت بدعنوانی کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ڈیڑھ سال پر محیط مارشل لاء کے باوجود بدعنوانی عروج پر ہے۔لوگ بددیانت ہو چکے ہیں۔وہ راتوں رات امیر بننا اور کہلوانا چاہتے ہیں۔یہ سب صرف میرا احساس ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔جس کمزور اخلاقی دھاگے نے معاشرے کو منظم کر رکھا تھا وہ کاملاً شکستہ

ہو چکا ہے اور بنیادی طور پر یہ سب کچھ گزشتہ ساڑھے سات سالوں میں ہوا۔ بھٹو کے طرز زندگی اور عملی زندگی کے بارے میں ان کے نظریات نے اس اخلاقی دھاگے کو شکستہ کیا۔ انہوں نے طلباء کو اساتذہ، بیٹوں کو باپ، زمینداروں کو مزارعوں اور ملوں کے کارکنوں کو مل مالکان کے مقابل لا کھڑا کیا۔ یہ امر پاکستان کے اقتصادی مسائل کا باعث ہرگز نہیں کہ یہ ملک اقتصادی پیداوار دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستانیوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ وہ بغیر کام کئے کما سکتے ہیں۔ لہذا میرے خیال کے مطابق معاشرے کی مکمل اصلاح کے لئے بنیادی اور اہم ترین کام یہ نہیں کہ ہم کتنی کپاس اگا سکتے ہیں یا کتنی گندم کاشت کر سکتے ہیں۔ یہ محرکات اپنی جگہ اہم ہیں لیکن اس سے بھی پہلے اخلاقی تطہیر درکار ہے اور اس کے لئے اسلام کے سوا کوئی بنیاد میسر نہیں۔ کیونکہ اسی بنیاد پر پاکستان بنایا گیا تھا۔ ہم اپنی مرضی سے اسلام کی طرف مراجعت نہیں کر رہے بلکہ یہ حالات کا تقاضا ہے۔ اگر ہم چاہتے تو بھارت کے ساتھ بھی رہ سکتے تھے۔ اس میں کیا خرابی تھی؟ اس کی وجہ صرف اور صرف ثقافتی اور اخلاقی شعور و آگہی تھا کہ اسلام ہی ہماری واحد پناہ گاہ ہے۔ اس لحاظ سے اسلام ہی بنیادی محرک ہے۔ یہ گندم اور چاول بلکہ ہر چیز سے اہم تر ہے۔ میں زیادہ گندم اگا سکتا ہوں۔ گندم درآمد بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن درست اور صحت مند اخلاقی اقدار درآمد نہیں کر سکتا"۔

اسی انٹرویو کے دوران ضیاء الحق نے مزید کہا کہ وہ یا ان کی حکومت اسلام کو (عوام پر زبردستی) مسلط نہیں کر رہے۔ کیونکہ 99 فیصد لوگ نفاذ شریعت کے خواہاں تھے۔ انہوں نے دلیل کے طور پر کہا کہ بھٹو کے خلاف گلیوں میں جو احتجاجی مظاہرے ہوئے ان سے یہی چیز جھلکتی ہے کہ جس طرح 47-1946ء میں اسلامی اقدار کی سمت مراجعت چاہی گئی اسی طرح لوگ آج اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں۔ ضیاء الحق کے الفاظ تھے "میں لوگوں کو وہی کچھ دے رہا ہوں جو وہ چاہتے یا مانگتے ہیں"۔

یہ ایک قابل ذکر امر ہے کہ ضیاء الحق نے بھٹو کی منتخب سویلین حکومت کو اخلاقی انحطاط کا شکار اور اشتراکیت کی جانب ان کے جھکاؤ کو پاکستان میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش قرار دیا۔ ان کے خیال میں مارشل لاء معاشرے کے اخلاقی پہلوؤں کی تعمیر نو کے لئے ضروری تھا۔ اسی لئے انہوں نے بدعنوانی کی بدستور موجودگی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ڈیڑھ سال کے دورانیے پر محیط مارشل لاء کے باوجود"۔ ضیاء الحق کی بالکل واضح اور غیر مبہم سوچ تھی کہ پاکستانی فوج سویلین عوام سے برتر ہے۔ وہ اپنے فوجی پیشروؤں پر تنقید پر بھی رضا مند نہیں تھے کہ انہوں نے بھٹو سے زیادہ عرصہ کس طرح حکومت کر لی۔ حالانکہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد 30 برسوں کے دوران جو انحطاط واقع ہوا اس کے "کچھ حصے" کے ذمہ دار فوجی حکمران بھی تھے۔ ان کی یہ سوچ بھی اہم اور قابل ذکر تھی کہ اسلام پاکستان کی بنیاد بنا۔ معاشرے کی اسلامائزیشن عوام کی خواہش تھی اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عوام نے قوانین کی اسلامائزیشن کے حق میں ووٹ نہیں دیئے تھے۔ یہ معاملہ آزادی سے قبل تحریک پاکستان اور پھر ماضی قریب میں بھٹو کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے دوران طے پا چکا تھا۔

ضیاء الحق کے خیال میں پاکستان کی عافیت ہی اسلام میں مضمر تھی اور یہی وہ وصف تھا جو اس نسبتاً نئے ملک کو بھارت سے ممتاز کرتا تھا اور یہ اکیلے ضیاء الحق کی سوچ ہی نہیں تھی "دی نیویارک ٹائمز" نے اسلام آباد سے موصول ہونے والی ایک رپورٹ شائع کی جس میں درج تھا کہ ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کی وکالت کرنے والے بعض لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں قومی تشخص کا جو دیرینہ بحران پایا جاتا تھا اس کا علاج بھی اسلامائزیشن میں ہی مضمر تھا۔ اسی اخبار نے سلام آباد کے ایک آزاد خیال اور دنیادار افسر سے انٹرویو کیا جو مجموعی طور پر اسلامائزیشن کا حامی تھا۔ لیکن "بہت سے دانشوروں کی طرح" اس حوالے سے اس کے ذہن میں بھی چند تفکرات موجود تھے۔ اس افسر نے اس سوال میں اپنے موقف کو سمودیا کہ "اگر ہم مسلمان نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ کیا ہم دوسرے درجے کے ہندوستانی ہیں؟"

پاکستان کو واضح طور پر ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے متعارف کرانا بھی ایک "پروجیکٹ" تھا اور اس پروجیکٹ کے لئے ضیاء کے نزدیک ان سول اور فوجی افسران کی حمایت بھی فیصلہ کن تھی۔ جو ذاتی زندگی میں اکثر شعائر اسلامی کی ادائیگی سے بے نیاز تھے۔ تاہم سیاسی میدان میں ضیاء الحق نے منظم مذہبی جماعتوں سے رجوع کیا۔ خصوصاً جماعت اسلامی کی طرف۔ اس رجوع کے پس منظر میں دو مقاصد کارفرما تھے۔ ایک سیاسی حمایت اور دوسرے نظریاتی انسپائریشن۔ جماعت اسلامی ضیاء کی حکومت کا "ایک ستون" اور "جنرل کی اسلامی ریاست" کی پرزور حامی بن گئی۔ ضیاء الحق نے دیگر فرقہ وارانہ اور مذہبی تنظیموں کو بھی اپنی حکومت کے سویلین حامیوں کے حلقے میں شامل کرلیا۔ ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کے باعث بعض مذہبی جماعتوں پر اندرونی دباؤ بڑھ گیا۔ اس سے قبل تین عشروں تک جماعت اسلامی اپنے اس امیج کی تعمیر میں مصروف رہی کہ وہ آئین کی بالادستی پر یقین رکھتی اور زور دیتی ہے۔ مزید براں یہ کہ وہ مرکزی دھارے کی ایک سیاسی اسلامی جماعت ہے۔ جماعت اسلامی کی اعلیٰ قیادت میں شامل کچھ لوگ فکرمند تھے کہ جب جماعت کو فوجی حکومت کی حامی بلکہ اتحادی جماعت کے طور پر دیکھا جائے گا تو جمہوریت کی بحالی کے حوالے سے اس کی خوش آئند سیاسی توقعات میں کمی واقع ہو جائے گی۔ چونکہ اپنے اختیارات کو مرحلہ وار جمع کرنے کے لئے جنرل ضیاء کو آڑ کے طور پر اپنے سیاسی اتحادیوں کی حمایت درکار تھی۔ لہذا انہوں نے ان کی اس ضرورت کا ادراک کرلیا کہ وہ سیاسی اعتبار سے "اخفائے حقائق" کے خواہاں تھے۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد 3 ماہ کے اندر جنرل ضیاء نے پاکستان کی عدلیہ کو مجبور کردیا کہ وہ ان کے ماورائے آئین فوجی انقلاب کی منظوری بھی دے اور آئین کو معطل کرنے کے فیصلے کی توثیق بھی کرے۔ عدلیہ نے "نظریہ ضرورت" کے تحت جنرل ضیاء کو وسیع اختیارات سونپ دیئے کہ وہ نئے قوانین وضع کرسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ آئین میں بھی ترمیم کرسکتے ہیں۔ اس طرح کسی آئینی بنیاد کے بغیر ہی ایک فوجی حکومت آئینی جواز کو قانونی افسانہ بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ جماعت اسلامی اور ضیاء کے دیگر رفقائے کار اب کہہ سکتے تھے کہ "ہم جو کررہے ہیں آئینی فریم ورک کے اندر رہ کر کررہے ہیں"۔

اپنے اقتدار کے ابتدائی دو سالوں کے دوران ضیاء الحق نے عوام کو یہی باور کرائے رکھا کہ ان کی حکومت کو انتخابات تک ایک "عارضی اور عبوری بندوبست" سمجھا جائے۔ تاہم اقتدار کے ابتدائی چند ہفتوں کے دوران ضیاء نے سول معاملات کے لئے جو فوجی قواعد وضوابط نافذ کئے وہ ان قواعد وضوابط کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی اور جامع تھے جو ان کی پیش رو فوجی حکومتوں نے جاری کئے تھے۔ ضیاء نے انتخابات کے لئے اکتوبر کا مہینہ مقرر کر دیا اور ستمبر 1977ء میں جب انتخابی مہم زوروں پر تھی، ذوالفقار علی بھٹو کو ایک سیاسی مخالف کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک منحرف رکن پارلیمنٹ کے والد کو 3 سال قبل قتل کر دیا گیا تھا اور ورثاء نے قتل کا مقدمہ درج کراتے وقت لکھایا تھا کہ بھٹو قتل کی سازش میں شریک تھے۔ مذہبی جماعتوں اور مسلم لیگ نے بھٹو کی گرفتاری کا جشن منایا۔ انہوں نے سیاسی ریلیاں منعقد کرنا شروع کر دیں اور مطالبہ کیا جانے لگا کہ بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

18 ماہ تک بھٹو کے مقدمے کی سماعت مختلف عدالتوں میں کی جاتی رہی لیکن جس شخص کو ضیاء الحق نے معزول کیا تھا وہ اسے "منفی مگر بے پناہ فطری صلاحیتوں کی مالک شخصیت" کے طور پر پیش کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ جس نوعیت کی پروپیگنڈہ مہم جنرل شیر علی خان نے بھٹو کے خلاف 1970ء کے انتخابات کے دوران چلائی تھی، اسلام پسند میڈیا نے جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ملکر اس کی یاد تازہ کر دی۔ ضیاء الحق کے دوست عبدالقیوم نے لکھا ہے کہ اکتوبر 1977ء میں ضیاء الحق نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھٹو کی مذموم حرکات اور جرائم پر مبنی ایک "قرطاس ابیض" (وہائٹ پیپر) مرتب کرنے کا آغاز کر دیں۔ ان دنوں بھٹو کو گرفتار کیا جا چکا تھا لیکن جنرل ضیاء نے یہ ہدایت انہیں سزا ملنے سے کافی عرصہ پہلے جاری کی تھی۔ اگرچہ عبدالقیوم نے "وہائٹ پیپر" نہیں لکھا تاہم چار جلدوں پر مشتمل ایک "وہائٹ پیپر" اپریل 1979ء میں بھٹو کی سزائے موت پر عملدرآمد سے قبل شائع کر دیا گیا۔ صرف انتخابی بے قاعدگیوں پر مشتمل جلد 405 صفحات کی حامل تھی۔ جس کے ساتھ 1044 صفحات ضمیموں کے طور پر لف کئے گئے تھے۔ انہیں پھانسی پر لٹکانے سے قبل ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر "ظلم کی داستانیں" کے نام سے سلسلہ وار پروگرام سنائے اور دکھائے گئے۔ جن اسلام پسند اخبارات اور رسائل وجرائد میں "وہائٹ پیپر" کے اقتباسات شائع ہوئے۔ ان اخبارات اور رسائل پر حکومت کی طرف سے اشتہارات کی فیاضانہ بارش کی گئی۔

ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائیکورٹ نے قتل کے ایک ایسے مقدمے میں سزا سنائی جس کی قانونی حیثیت مشکوک تھی۔ جب از سر نو تشکیل شدہ عدالت عظمیٰ نے بھٹو کی سزا کی توثیق کر دی تو اپریل 1979ء میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بھٹو کے خلاف مقدمے کی سماعت کے حساس دورانئے میں اور ان کی پھانسی کے وقت جماعت اسلامی ضیاء الحق کی کابینہ کا حصہ تھی۔ وزارت اطلاعات کا اہم اور نازک قلمدان جماعت کے نامزد کردہ شخص کے پاس تھا۔ جماعت اسلامی نے اس دعوے کے ساتھ ضیاء کی کابینہ میں شمولیت اختیار کی کہ عام انتخابات کی راہ ہموار کرنے کے لئے حکومت کے ساتھ سیاسی شراکت ضروری تھی۔ ضیاء نے انقلاب سے ایک سال بعد پی این اے کے بعض ارکان کو حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ پی این اے کو

کابینہ میں نمائندگی دینے کا مقصد یہ تھا کہ بھٹو کی پھانسی کا الزام صرف فوج پر ہی نہیں جزوی طور پر ان سیاسی مخالفین پر بھی عائد کیا جاسکے۔

پی این اے تقریباً ایک سال حکومت کا حصہ بنا رہا۔ اس دوران جماعت اسلامی نے وزارتوں پر اپنا کنٹرول قائم رکھا تاکہ حکومتی سرپرستی میں اسے اپنے رسوخ کو وسیع تر کرنے کا موقع بھی ملتا رہے اور جماعت میں شامل نوجوان ساتھیوں کو روزگار کے مواقع بھی دستیاب رہیں۔ وزارت اطلاعات ونشریات کے علاوہ پانی، بجلی، پیداوار اور قدرتی وسائل کی وزارتوں کے قلمدان بھی جماعت اسلامی کے نامزد کردہ افراد کے پاس تھے۔ جنرل ضیاء نے جماعت اسلامی ہی کے ایک نظریہ پرست رکن پروفیسر خورشید احمد کو پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کا سربراہ نامزد کر دیا تاکہ معیشت کو اسلامائز کرنے کے منصوبوں کے خدوخال وضع کئے جاسکیں۔ حکومت کے ساتھ ایک سالہ رفاقت کے بعد جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے وزراء نے شکایت کی کہ اپنی محفوظ پوزیشن کے باعث بیوروکریسی کا رسوخ ان سے زیادہ تھا۔ جنرل ضیاء نے بھی محسوس کرلیا کہ ایک جدید اسلامی ریاست کے انتظام وانصرام کے لئے انہوں نے جماعت اسلامی کی اہلیت کا غلط اندازہ قائم کیا تھا۔ اس سال کے بعد پاکستان کے لئے دوغلے اسلامی نظام کو تخلیق کرنے کی ایک کوشش کے دوران ضیاء الحق نے اپنے اسلامی حلقے کو وسیع کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ انہیں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے اسلام پسند میسر آجائیں۔ اس طرح دنیا بھر کے علمائے دین اور اسلام کے روحانی راہنماؤں کی راہ کھل گئی کہ وہ ضیاء الحق کو اپنے مشورہ سے نواز سکیں۔ جنرل نے اسلامی دانشوروں اور مشائخ کی درجنوں کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کرائے۔ انہوں نے کئی احکامات جاری کئے جن میں کچھ امتناعی تھے۔ مثلاً پبلک مقامات پر پیشاب گاہوں کے قیام پر پابندی عائد کر دی کیونکہ حضرت محمد ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے بعض ایسے اقدامات کئے جن کے قابل ذکر اور اہم نتائج برآمد ہوئے۔ مثلاً ساری دنیا کے مسلمان علماء اور طلباء کے لئے ویزے کا حصول آسان کر دیا۔ نتیجتاً مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اسلام پسندوں نے اپنے صدر دفاتر پاکستان میں قائم کرلئے کیونکہ ان کے اپنے ممالک میں اسلام پسندوں کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد تھیں۔ مطلب یہ کہ انہوں نے مذکورہ پابندیوں سے بچنے کی راہ نکال لی۔

1979ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے جو حامی بھٹو کی پھانسی کی راہ میں مزاحم تھے، ان کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے حکومت کو ملنے والی جماعت اسلامی کی حمایت ضیاء الحق کے نزدیک مرکزی حیثیت اختیار کرگئی۔ بھٹو کی سزائے موت پر عملدرآمد سے ایک رات قبل جنرل ضیاء نے جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کے ساتھ 90 منٹ پر محیط ملاقات کی۔ جماعت اسلامی کے ارکان نے گلی کوچوں میں بھٹو کی موت کا جشن منایا جس پر عالمی سطح پر شدید تنقید کی گئی اور ملکی سطح پر بھی ایک حکمران جرنیل کے ہاتھوں اس کے سب سے بڑے سیاسی حریف کو سنائی جانے والی سزائے موت پر بے رحمانہ عملدرآمد کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

جماعت اسلامی کے بانی اور روحانی راہنما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ضیاء کے اسلامائزیشن پر مبنی اقدامات کی توثیق کی اور اس طرح فوجی حکومت کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے۔ مولانا نے ان اقدامات کو حکومت کے پاکستان اور اسلام کے درمیان "معاہدے کی تجدید" قرار دیا۔ جنرل ضیاء نے بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی یہ کہہ کر کردار کشی کی تھی کہ اگر انہیں عام انتخابات میں دوبارہ حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی تو ملک مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے المیے سے ایک مرتبہ پھر دوچار ہو سکتا ہے۔ ستمبر 1979ء میں مولانا مودودی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور ضیاء الحق نے جنازے میں شریک ہو کر مولانا کے لئے تعریف و توصیف کا اظہار کیا۔

اگرچہ ضیاء الحق اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے اور دونوں کا باہمی تعلق بھی خوشگوار تھا۔ تاہم دونوں کی خواہشات ہمیشہ ایک نہیں ہوتی تھیں۔ ضیاء الحق کو اس امر کا ادراک ہو گیا تھا کہ جماعت اسلامی کو ملنے والی حمایت کی بنیاد زیادہ وسیع و کشادہ نہیں لیکن اس کی تنظیمی صلاحیت اور اپنے مختلف ارکان اور عہدیداروں کو متحرک کرنے کی اہلیت واقعتاً متاثر کن تھیں۔ مزید براں جماعت اسلامی ملک کی واحد مذہبی سیاسی قوت نہیں تھی اور ضیاء الحق دوسرے اسلامی گروہوں کی حمایت کے خواہاں بھی تھے۔ جب صدر نے پاکستان کو اسلامائز کرنے کے ارادے کا اظہار کیا تو انہیں متعدد خاکے پیش کئے گئے کہ ایک اسلامی ریاست کو کیسا دکھائی دینا چاہیے۔ ضیاء الحق کو اپنے آبائی ادارے یعنی فوج اور مختلف مذہبی جماعتوں کے درمیان مفادات کی لڑائیوں سے بھی عہدہ براء ہونا پڑتا تھا۔

1979ء کے اواخر میں افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت اور بعد ازاں انکی حکومت کو دستیاب امریکی حمایت نے ملکی معاملات میں ضیاء الحق کی خود اعتمادی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ آئندہ باب میں افغانستان میں ہونے والی پیش رفتوں اور امریکہ اور پاکستان کے ان تعلقات پر بحث کی گئی ہے جو اس دور میں متشکل ہوئے جب پاکستان روسی توسیع پسندی کی راہ میں مزاحم ہونے اور اسے محدود رکھنے کے لئے فرنٹ لائن سٹیٹ کا کام دے رہا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ امریکہ کی طرف سے ملنے والی عسکری اور اقتصادی امداد کے روشن امکانات اور اضافہ شدہ عالمی حمایت نے ضیاء کو اس قابل بنا دیا کہ وہ انتخابات کے انعقاد کے وعدے کو پس پشت ڈال سکیں۔

روسی فوج نے افغانستان پر کرسمس کے دن قبضہ کیا۔ جبکہ پاکستان کے پارلیمانی انتخابات جو 17 نومبر 1979ء کو ہونا قرار پائے تھے وہ اس سے پہلے ہی ملتوی کئے جا چکے تھے۔ ادھورے اور شرمندہ تکمیل انتخابات کی طرف سفر کے دوران ضیاء الحق نے ان کے انعقاد کے لئے وضع کئے گئے زمینی قواعد کو بار بار بدلا۔ انہوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے جداگانہ طریق انتخاب متعارف کرایا اور سیاسی جماعتوں پر لازم قرار دیا کہ وہ رجسٹریشن کے تقاضے پورے کریں۔ اس طرح بھٹو کی پی پی پی سمیت کئی سیکولر جماعتیں انتخابی میدان سے باہر ہو گئیں۔ الیکشن کمیشن کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ نظریہ پاکستان کو زیر بحث لانے۔ اس کے خلاف تعصب کا اظہار کرنے۔ پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، سالمیت اور سلامتی کے خلاف

بات کرنے یا عدلیہ اور مسلح افواج کی شہرت خراب کرنے کے لئے ان کا مضحکہ اڑانے پر کسی بھی سیاسی جماعت کی رجسٹریشن منسوخ کر سکے گا۔

جب عالمی توجہ افغانستان کے اندر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں پر مرکوز ہوگئی تو جمہوریت کی طرف واپسی کے لئے صدر ضیاء پر کوئی بیرونی یا اندرونی دباؤ باقی نہ رہا۔ 1980ء کا بیشتر حصہ افغانستان سے مسلسل آنے والے پناہ گزینوں کے ساتھ نمٹنے اور کمیونسٹوں کے خلاف وسیع تر افغان مزاحمت کو منظم کرنے میں گزر گیا۔ اس سال سرکاری سطح پر اسلامائزیشن کی سمت اٹھایا جانے والا بڑا اقدام زکوٰۃ کی وصولی تھا۔ زکوٰۃ جمع شدہ اثاثوں اور بچتوں پر وہ اڑھائی فیصد سالانہ محصول ہے۔ جس کی بطور خیرات ادائیگی (صاحب نصاب) مسلمانوں پر فرض ہے۔ حکومت نے اعلان کیا کہ وہ زکوٰۃ بینک کھاتوں میں سے کاٹ کر ایک مرکزی زکوٰۃ انتظامیہ کے توسط سے تقسیم کرے گی۔

"واشنگٹن پوسٹ" نے رپورٹ شائع کی کہ "زکوٰۃ کی غریبوں کے درمیان تقسیم کے لئے ملک بھر میں مقامی کمیٹیاں قائم کی جارہی ہیں۔ صرف صوبہ سندھ میں ایسی کمیٹیوں کی تعداد 7644 ہے اور ہر کمیٹی 7 ارکان پر مشتمل ہے۔ وہ ارکان حاجتمندوں میں رقوم تقسیم کریں گے"۔ واشنگٹن پوسٹ کے رپورٹر نے مزید لکھا" ممکن ہے یہ کاروائی کمیٹیوں کے ارکان اور زکوٰۃ کے وصول کنندگان کو بدعنوان گروہوں میں تبدیل کر دے۔ دونوں گروہ ضیاء کے شکر گزار ہوں گے"۔ زکوٰۃ کے ذریعے سرکاری سرپرستی میں تشکیل دیئے جانے والے بدعنوانوں کے اس نیٹ ورک نے اس دور کے اسلام پسند گروہوں کا رسوخ بڑھادیا اور کئی نئے لوگوں یا گروہوں کے لئے بھی یہ نیٹ ورک کشش کا باعث بنا۔

پاکستان کی شیعہ آبادی نے زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی کی اس بناء پر مخالفت کی کہ ان کا مسلک زکوٰۃ کی لازمی وصولی کی اجازت نہیں دیتا۔ (ملک بھر سے) شیعے اسلام آباد میں اکٹھے ہو گئے اور عملاً دارالحکومت کا چارج سنبھال لیا۔ واشنگٹن پوسٹ کے بقول "اس کشیدگی کے دوران ضیاء کی مارشل لائی حکومت کے کاملاً بے اختیار اور بے بس ہونے میں بس معمولی کسر رہ گئی تھی"۔ اس احتجاج کے نتیجے میں اہل تشیع کو زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ ایران میں کچھ عرصہ پہلے شیعہ اسلامی انقلاب بپا ہو چکا تھا۔ زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی کے خلاف احتجاج کی کامیابی پاکستان میں شیعہ انتہا پسندی کا سبب بن گئی۔ پاکستان کی مسلمان آبادی کا کم از کم 10 فیصد اہل تشیع پر مشتمل ہے۔ حصول پاکستان کی مہم میں فرقہ وارانہ معاملات نے کوئی کردار ادا نہیں کیا گھا۔ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں مردم شماری کے سرکاری اعداد و شمار میں فرقہ وارانہ تخصصات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ زکوٰۃ کے موضوع پر طویل مباحث کے بعد شیعوں نے مطالبہ کر دیا کہ انہیں ریاست کے اندر اعلیٰ سطوح پر موثر نمائندگی دی جائے۔ جب شیعوں کے فرقہ وارانہ مفادات کو تسلیم کر لیا گیا تو شیعہ سنی کشیدگی اور کھنچاؤ میں تلخی کی مقدار بڑھ گئی اور وہ تلخی بالآخر دونوں فرقوں کے اندہشت گرد جنگ جو گروہوں کی تشکیل پر منتج ہوئی۔

ضیاء الحق فرقہ وارانہ معاملات اور مباحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اس گریز کو یقینی بنانے کے لئے انہوں نے اپنے اقتدار اور اختیارات کی بنیاد کو وسیع تر بنانے کی کوشش کی اور پی پی پی کے بعض بااثر ارکان کو حکومت میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ کاوش بھی بے ثمر ثابت ہوئی۔ آئی ایس آئی سے کہا گیا کہ یا تو وہ مقامی سیاستدانوں کو خرید لے اور یا پھر انہیں دھمکا کر فوجی حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ کرے۔ تاہم جنرل ضیاء نے ملکی سطح پر مذہب کے ذریعے جواز حکمرانی کے حصول کی کوشش ترک نہ کیں۔ امریکہ کے تدریسی شعبے سے منسلک دو اصحاب لکھتے ہیں۔ "تمام سیاق وسباق میں اسلامی سوچ ہی کارفرما تھی۔ ایک اسلامی کارگو فلیٹ، ایک اسلامی سائنس فاؤنڈیشن اور ایک اسلامی نیوز پرنٹ انڈسٹری، علاوہ ازیں آل پاکستان لان ٹینس ایسوسی ایشن نے ایک ملت کپ متعارف کرا دیا۔ ٹینس کے میدان میں مسلمانوں کی نوجوان نسل کا یہ پہلا بڑا جشن ہے"۔

افغان مجاہدین کی بھرتی، تربیت اور کاروائیوں کی ذمہ داری آئی ایس آئی کو سونپ دی گئی۔ لہذا اس کے کارکنوں اور عہدیداروں کی تعداد میں قابل ذکر اضافے کا مشاہدہ کیا گیا۔ آٹھ سالوں میں امریکہ کی طرف سے کم از کم دو ارب ڈالرز مجاہدین کی خفیہ مالی معاونت کے طور پر موصول ہوئے جو آئی ایس آئی نے تقسیم کئے۔ اس سے بھی بڑی رقوم سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کی طرف سے بھیجی گئیں۔ ایجنسی حکومت کے اتحادیوں سے استفادہ اور اس کے مخالفین کو خوفزدہ کرنے کا جو سیاسی کردار ادا کر رہی تھی۔ اب اس پر "برائی کی علامت روسی سلطنت" کے خلاف جائز جدوجہد کا غلاف چڑھا دیا گیا جو غیر ملکی ایماء پر کی جا رہی تھی۔ آئی ایس آئی کی نظامت نے اندرون ملک ایک خفیہ کاروائی بھی جاری رکھی۔ ملکی سطح پر اسلام پسندوں کے رسوخ کو بڑھانا اور حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں کو ملنے والی حمایت کو سبوتاژ کرنا اس کے اہداف میں شامل تھا۔

ایک ایسے گروہ کے ارکان مارچ 1981ء میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے بوئنگ 727 کو اغواء کرنے کے بعد کابل لے گئے جس کے سربراہ سابق وزیر اعظم بھٹو کے سب سے بڑے صاحبزادے مرتضیٰ بھٹو تھے۔ اس واردات نے حکومت کے کام کو سہل بنا دیا۔ "الذوالفقار" نامی اس گروہ نے خود کو ایک گوریلا گروہ کے طور پر متعارف کرا رکھا تھا جس کا نصب العین بھٹو کی موت کا بدلہ لینا تھا۔ طیارے کے اغواء کی وہ کاروائی 13 روز بعد ان 54 سیاسی قیدیوں کی رہائی پر اختتام کو پہنچی جنہیں ضیاء حکومت نے گرفتار کر رکھا تھا۔ اگرچہ پاکستان پیپلز پارٹی نے جس کی سربراہی اب ذوالفقار علی بھٹو کی بیوہ نصرت بھٹو اور بیٹی بے نظیر بھٹو کے پاس تھی، اغواء کی اس واردات سے کامل لاتعلقی کا اظہار کیا۔ تاہم پاکستانی حکام نے بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہوئے "الذوالفقار" کے اس اقدام کا الزام پی پی پی پر عائد کر دیا۔ بے نظیر بھٹو سمیت پی پی پی کے راہنماؤں کا موقف تھا کہ آئی ایس آئی کے اندرونی شعبے نے سیاسی مخالفت کے لئے "الذوالفقار" سے لاحق خطرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ سبوتاژ اور دہشت گردی کی کئی وارداتیں مبینہ طور پر سیکیورٹی سروسز کے ایجنٹوں نے خود منظم کیں اور الزام "الذوالفقار" پر عائد کر دیا۔ امریکی تجزیہ نگاروں کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ حکومت یا حزب

اختلاف کے الزامات کی تصدیق کر سکیں۔ تاہم ان میں سے بعض نے لکھا کہ گوریلا گروہ کے ظہور کے نتیجے میں ضیاء حکومت کے موقف کو فوقیت اور برتری حاصل ہوگئی۔ سٹیفن کوہن اور مارون وین بام نے اس دور میں لکھا کہ سبوتاژ اور دہشت گردی کی دھمکیوں نے ضیاء کے ان دلائل کو مضبوط تر کر دیا کہ پاکستان کی سلامتی کو افغانستان اور بھارت دونوں کی طرف سے خطرات لاحق تھے۔ خطرات حقیقی تھے یا خود ساختہ اور تراشیدہ، وہ ثابت کر گئے کہ فوجی حکمرانی ملک کی ضرورت تھی۔

ایک تو امریکہ کی طرف سے ملنے والی امداد نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسرے ان کا امیج بن گیا کہ قومی بحران کے موقع پر وہ ایک "مضبوط انسان" ثابت ہوئے۔ لہذا "الذوالفقار" کی واردات کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ 24 مارچ کو ایک حکم کے ذریعے انہوں نے پاکستان کا آئین تبدیل کر دیا۔ ضیاء الحق نے جو عبوری آئین نافذ کیا اس نے انہیں اختیار دیدیا کہ وہ (اصل) آئین میں مزید ترامیم بھی کر سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں عدلیہ کے اختیارات اس قدر محدود ہو گئے کہ آخر الذکر کے لئے ان کے احکامات اور فیصلوں پر اعتراض کرنا ممکن ہی نہ رہا۔ پاکستان کی عدالت عظمیٰ اور صوبائی عدالت ہائے عالیہ کے ارکان پر لازم قرار دیدیا گیا کہ وہ عبوری آئین کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ انکار کرنے والے ججوں کو فارغ کر دیا گیا۔ عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس اور دیگر اعلیٰ عدالتوں کے 12 جج "صفائی" کے اس عمل کی نذر ہو گئے۔ نتیجتاً ضیاء الحق کی مطلق العنانیت مستحکم ہوگئی۔

عبوری آئین کے تحت ان روایتی مشاورتی کونسلوں کی طرز پر "مجلس شوریٰ" کے نام سے ایک ایسی وفاقی مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں آیا جو ازمنہ وسطیٰ کے مسلمان بادشاہوں کی معاونت کیا کرتی تھیں اور سعودی عرب اور خلیجی عرب ممالک میں آج بھی موجود ہیں۔ "مجلس شوریٰ" ایک "مامور کردہ قانون ساز ادارہ" تھا۔ جس میں شامل افراد کا تعلق باقاعدہ پارلیمانی حلقوں سے تھا۔ اس میں علماء اور سابق فوجی افسران کے علاوہ 10 پیشہ وارانہ گروہوں کو نمائندگی حاصل تھی۔ اگرچہ ضیاء الحق نے وعدہ کیا تھا کہ "اس کونسل سے آمریت کی بو نہیں آئے گی" تاہم یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے ملکی آئین کو یکطرفہ طور پر تبدیل کیا اور اپنی مرضی کے افراد پر مشتمل مقننہ تشکیل دے دی۔ ضیاء الحق کا موقف تھا کہ فوج نے جن قانون سازوں کو ان کی ذہانت اور دیانت داری کی بنیاد پر چنا تھا وہ منتخب نمائندوں سے بہتر تھے۔ فوج کے خیال میں "انتخابات نے غنڈہ گردی، افراتفری اور الجھاؤ" کے سوا کسی چیز کو جنم نہیں دیا"۔

ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ زیادہ تر بڑی سیاسی جماعتوں کے صف دوم کے سیاستدانوں پر مشتمل تھی جنہیں فوجی حکومت کے ساتھ تعاون کے عوض یا تو رشوت دی گئی تھی اور یا پھر یہ کام ان سے زبردستی لیا جا رہا تھا۔ اس "بظاہر قانون ساز ادارے" میں مباحث کی نوعیت اسلامی ہوا کرتی تھی۔ اس میں اتنی تعداد میں علماء اور فعال اسلام پسند شامل تھے کہ ماضی کی کسی بھی منتخب پاکستانی مقننہ میں اس کی نظیر دستیاب نہیں۔ مجلس شوریٰ کے ارکان مستقبل میں وضع کئے جانے والے قوانین کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے پر بھی بحث کرتے تھے۔ ایک سال کے دورانیے میں متعدد انتہائی سخت اور کڑے قوانین پر بحث

ہوئی۔ ان میں منشیات کے کاروبار اور جسم فروشی پر سزائے موت، عوامی اخلاقیات پر نظر رکھنے کے لئے کمیٹیوں کی تشکیل، عورتوں کو زیورات اور زرق برق ملبوسات خریدنے سے باز رکھنے کے اقدامات، ناچ گانے پر پابندی اور فحش نگاری کے خلاف ہنگامی اقدامات جیسے قوانین شامل تھے۔ ان میں فحش کتابوں کو سرعام نذر آتش کر دینے کا قانون بھی شامل تھا۔

فوج کے اعلیٰ ترین افسران میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اپنی نجی زندگی میں شعائر اسلامی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اسلام کے نام پر حکمرانی سے احتراز نہ کیا۔ قوانین اور عدالتی اور اقتصادی نظام کی پہلے سے زیادہ اسلامائزیشن کو بھی انہوں نے (خندہ پیشانی سے) قبول کر لیا اور کسی دوسرے منظم گروپ کے حق میں اختیارات سے دست بردار ہونے سے انکاری رہے۔ جماعت اسلامی اور بعد میں جتنے مذہبی گروہوں نے ضیاء الحق کے ساتھ تعاون پر اتفاق کیا۔ وہ اسلامائزیشن کے عمل کا مشاہدہ اپنی سیاسی برتری اور بالادستی کے عدسے سے کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کی اسلامائزیشن کافی نہیں تھی بلکہ ضروری تھا کہ اسلامائزیشن جماعت اسلامی کی پارسا قیادت یا اس کے ساتھ وابستہ دیگر مذہبی جماعتوں کے توسط سے ہو۔

ضیاء الحق نے اسلامائزیشن کے لئے جو اقدامات کئے وہ شدید فرقہ وارانہ اختلافات پر منتج ہوئے اور پاکستانی معاشرے کو متعدد معاملات پر مذہبی مباحث میں الجھا گئے۔ جنرل ضیاء اور پاکستانیوں کی اکثریت کا تعلق سنی مسلک سے تھا لیکن ہر دس میں ایک پاکستانی شیعہ مسلک کا پیروکار بھی تھا۔ ضیاء الحق انسپائریشن اور اقتصادی مدد کے لئے سعودی عرب کی طرف دیکھتے تھے جبکہ پاکستانی شیعے شیعہ اکثریت کے حامل ایران میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں سے متاثر تھے جو آیت اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب کا نتیجہ تھیں۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں پاکستان کے اندر اثر و رسوخ کے لئے سعودیوں اور ایرانیوں کے درمیان مقابلہ ہوتا رہا۔ انہوں نے سنی اور شیعہ باہم حریف فرقہ وارانہ تنظیموں اور جنگ جو گروہوں کی مالی معاونت کی جس کے نتیجے میں سنیوں اور شیعوں کے درمیان کشیدگی اور کھنچاؤ میں اضافہ ہو گیا۔

ضیاء الحق نے مختلف قوانین کے ذریعے عورتوں کا مقام و مرتبہ اور منزلت کم کی اور بعض مقدمات میں عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت سے نصف معتبر قرار دے کر ان کی اہمیت کو قابل ذکر حد تک کم کر دیا۔ سیکولر، جمہوریت پسند اور عورتوں کی تنظیمیں حدود آرڈی ننس کے بھی خلاف تھیں۔ جو جنسی جرائم اور امتناعات کا احاطہ کرتا تھا اور اسی کے تحت کوڑوں جیسی اسلامی سزائیں بحال کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ انہیں ضیاء الحق سے شکایت تھی کہ اسلامائزیشن کے عمل کی رفتار سست ہے تاہم اکثر اسلامی گروہ 1988ء میں ان کی موت تک ان کا ساتھ دیتے رہے۔ اس طرح فوجی حکومت کو جواز حکمرانی حاصل رہا۔ فوج جمہوری سیاسی قوتوں بالخصوص پی پی پی کے استیصال کا جواز پیش کرنے میں کامیاب رہی اور کہا جاتا رہا کہ "یہ سب کچھ اسلامی نظام کے قیام کی خاطر کیا جا رہا ہے"۔

حقوق خواتین کے پاکستانی علمبرداروں نے محسوس کیا کہ اسلامائزیشن کے پروگرام میں عورتوں کے خلاف مخصوص تعصب پایا جاتا ہے۔ خواتین کو حکم جاری کر دیا گیا کہ وہ پبلک مقامات پر اپنے سروں کو ڈھانپ کر رکھیں۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں سمیت ریاستی ٹیلی ویژن پر بھی اس حکم پر عملدرآمد کرایا جانے لگا۔ جس طرح بطور اداکارا خواتین کے کردار کو حدود و قیود کا پابند کیا گیا، اسی طرح خواتین کی کھیلوں پر بھی کئی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ناقدین کے نزدیک اہم تر وہ تبدیلیاں تھیں جن کے نتیجے میں مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی کا وزن نصف ہو کر رہ گیا۔ مزید براں فوجداری مقدمات کی سماعت کے دوران بھی خواتین کے ساتھ امتیاز برتا جانے لگا۔ "قانون شہادت" میں اس طرح ترمیم کی گئی کہ اس میں سے قرآنی آیات کی قدامت پسندانہ توجیہات جھلکنے لگیں۔ عورتوں کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ مالی لین دین کے موقع پر کوئی دوسری عورت یا مردان کے دستخطوں کی گواہی دے۔ حالانکہ مردوں پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ "حدود" کے تحت جرائم (جن کا ذکر قرآن عظیم میں موجود ہے) میں عورتوں کی بلا تائید شہادت کو ناقابل قبول ٹھہرا دیا گیا۔ جن مذہبی پیشواؤں نے ان قوانین کی حمایت کی ان کا موقف تھا کہ "عورتیں (طبعاً) جذباتی ہوتی ہیں اور جلدی اشتعال میں آجاتی ہیں۔ ناقص العقل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی یادداشت بھی کمزور ہوتی ہے"۔ ان کے خیال میں عدالتوں کو عورتوں کے علاوہ اندھوں۔ معذوروں۔ پاگلوں اور بچوں کی گواہی بھی قبول نہیں کرنی چاہئے۔ جماعت اسلامی کے راہنما قاضی حسین احمد نے واضح طور پر کہا کہ "جو لوگ ان قوانین کی مخالفت کر رہے ہیں وہ صرف اسلام سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں"۔ انہوں نے معاشرے میں خواتین کے کردار کو یکسر تبدیل کر دینے کے جواز کے طور پر کہا "یہ قوانین عورتوں پر منفی اثرات مرتب نہیں کرتے۔ ہمارا نظام خواتین کو غیر ضروری تفکرات سے نجات دلانا اور عدالتوں میں حاضر ہونے سے بچانا چاہتا ہے"۔

تاہم حکام کے خیال میں قانونی تبدیلیاں اتنی اہم نہیں تھیں جتنی اہم وہ بظاہر نظر آ رہی تھیں۔ امریکی صحافیوں نے اپنی معمول کی رپورٹوں میں لکھا کہ اسلامی قوانین کو قانون کی کتابوں کی زینت تو بنایا جا رہا ہے لیکن ان پر عملدرآمد نہیں کیا جا رہا۔ انہوں نے لکھا" گذشتہ 18 ماہ کے دوران نہ تو کسی کے ہاتھ کاٹے گئے اور نہ ہی کسی کو سنگسار کیا گیا"۔ ایک رپورٹر نے ستمبر 1980ء میں لکھا "اسلامی قوانین کے تحت دی جانے والی انقطاعی سزائیں بکثرت موجود ہیں لیکن گزشتہ گیارہ ماہ کے دوران ان میں سے کسی پر عملدرآمد کا عوامی سطح پر مشاہدہ نہیں کیا جا سکا"۔ 8 سال بعد ایک امریکی رپورٹر نے انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا" قوانین کتابوں کا حصہ تو بن گئے لیکن کسی کے ہاتھ نہ کاٹے گئے۔ جس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹروں نے اس نوعیت کے آپریشن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک عورت کو زنا کی مرتکب ہونے پر سنگساری کی سزا تو سنائی گئی لیکن اس فیصلے کے خلاف اپیل کی جا رہی ہے اور اس کی سزا پر عملدرآمد کے امکانات حد درجہ مشکوک ہیں"۔ ایک امریکی فوجی اور وزارت مذہبی امور کے سیکرٹری آئی اے۔ امتیازی کے مابین ہوئے والی گفتگو نے اسلامی سزاؤں کے

متعلق حکومتی رویے کو بھی منکشف کر دیا۔ سیکرٹری سے پوچھا گیا کہ "جنرل ضیاء خواتین کے ساتھ اچھے سلوک کا بار بار دعویٰ کرتے ہیں لیکن حال ہی میں نئی دہلی میں منعقد ہونے والی ایشین گیمز میں پاکستانی خواتین کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اندریں حالات آپ جنرل ضیاء کے دعووں کا دفاع کس طرح کرتے ہیں؟"۔ انہوں نے جواباً کہا کہ حکومت اسلامائزیشن کے عمل کو نقصان سے دوچار نہیں کرنا چاہتی اور خواہش رکھتی ہے کہ ہمعصر معیارات کبھی کبھار بھی اس عمل پر اثر انداز نہ ہوں اور اسے متضاد فیصلے نہ کرنا پڑیں"۔ یہ جواب دینے کے بعد سیکرٹری نے خود ہی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ " کیا یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اس پر وقت ضائع کیا جائے؟۔ ہمارے پاس سوچ بچار کے لئے اہم تر موضوعات موجود ہیں"۔ بظاہر وہ سیکرٹری اسلامائزیشن کے اس پہلو کا حوالہ دے رہا تھا جو تعمیر ملک وقوم میں ممد ثابت ہو سکتا تھا۔

ضیاء الحق گیارہ سال برسر اقتدار رہے اور اس دورانئے کا بیشتر حصہ پاکستانیوں نے ان مباحث پر صرف کیا کہ اسلامی کیا چیز ہے اور غیر اسلامی کون سا کام ہے؟ اس دور کی ایک کہانی آج بھی سنائی جاتی ہے:۔

" گذشتہ موسم بہار میں کسی مسجد سے کلاک چوری کرنے کے جرم میں ایک پاکستانی نوجوان کو قطع ید کی سزا سنائی گئی۔ وہ ابھی تک جیل میں بند ہے اور اسلامی علماء فیصلہ نہیں کر پا رہے ہے کہ اس کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں یا پورا ہاتھ کاٹ دیا جائے؟ مزید براں جو انگلیاں یا ہاتھ کاٹا جائے وہ ریاست کی ملکیت ہوگا یا چور کے حوالے کر دیا جائے گا؟ کراچی کے ایک ڈرائیور کو زنا کے جرم میں سنگساری کی سزا سنائی گئی۔ وہ تا حال گواہوں کی پارسائی پر نظر ثانی کے عدالتی فیصلے کا منتظر ہے۔ کیونکہ وہ فیصلہ سزا پر عملدآمد سے پہلے ضروری ہے۔ اس موضوع پر طویل بحث چل رہی ہے کہ شدید ضربات پہنچانے یا قتل کی صورت میں قصاص یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ کے قانون پر عمل کیا جائے۔ یا دیت یعنی خون بہا کی ادائیگی کر دی جائے؟"۔

مغرب سے تعلیم یافتہ جماعت اسلامی کے ایک نظریہ پرست رکن خورشید احمد اسلام پسندوں کے موقف کو مختصراً اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "مسلمان اس عقیدے کے حامل ہیں کہ عائلی قوانین خدا کے نافذ کردہ ہیں اور کسی سیکولر حاکم کو حق حاصل نہیں کہ وہ ان کے ساتھ کھیلے"۔ پی پی پی سے وابستہ خواتین کے حقوق کے لئے فعال ایک خاتون نے سیکولر موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "اصل مسئلہ یہ ہے کہ عوام کے منتخب نمائندے پاکستان پر حکومت کریں یا یہ استحقاق علمائے دین کے اس گروہ کو سونپ دیا جائے جو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں؟"۔

ضیاء الحق کے اسلامائزیشن کے پروگرام کے دوران چند ایسے قوانین کا نفاذ عمل میں آیا جو آج کے دن تک متنازعہ ہیں۔ شعائر اسلامی کی پیروی کے حوالے سے اسلامائزیشن نے پاکستانی معاشرے کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنے اثرات اس نے فوج اور مذہبی سیاسی جماعتوں کے باہمی تعلقات پر مرتب کیے۔ جب ضیاء الحق کے اقتدار کا ایک عشرہ اپنے اختتام کو پہنچا تو ایک امریکی دانشور نے اسلامائزیشن سے نتیجہ اخذ کیا کہ "اس عمل نے ریاست کے سیاسی، قانونی، سماجی اور اقتصادی

اداروں پر معمولی اثرات مرتب کئے"۔ پاکستان کے ریاستی اداروں پر تحقیق کرنے والے ایک امریکی سکالر پروفیسر چارلس کینیڈی کہتے ہیں۔ ضیاء الحق کا پاکستان کو "واقعتاً اور صحیح معنوں میں" اسلامی بنا دینے کا مبنی بر لفاظی دعویٰ اور ان کے ناقدین کی طرف سے ان قوانین کے رجعت پسندانہ اوصاف کے متعلق دلائل ابتداء میں ایک "سیاسی شور" کے سوا کچھ نہیں تھے۔ اور یہ "سیاسی شور" کسی ٹھوس تبدیلی کا باعث نہ بن سکا۔

پاکستان کے مختلف حصوں میں اسلامی قوانین پر مختلف انداز میں عملدرآمد کرایا گیا۔ جن افراد یا خاندانوں نے طاقتور لوگوں کی حمایت کو چیلنج کیا۔ آخرالذکر نے انہیں سزا دینے یا بلیک میل کرنے کے لئے ان قوانین کو استعمال کیا۔ اسلام کا قانونی نظام عدالتوں اور اس مدون قانون کے متوازی چلتا رہا جو ہمیں برطانوی راج سے ورثے کے طور پر ملا تھا اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ کا انحصار یا تو اسلام کے ساتھ والہانہ وابستگی اور دینی جذبے پر تھا اور یا پھر مقامی حکام اور انفرادی سطح پر جج اس کا اہتمام کر سکتے تھے۔

اگرچہ ضیاء کی قانونی اصلاحات ایک عام پاکستانی شہری کے لئے کسی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکیں تاہم مختلف ریاستی اداروں میں اسلامی سیاسی گروہوں کی تعداد میں اضافے کا سبب بن گئیں اور پاکستانی ریاست اور مذہبی گروہوں کے باہمی مراسم کو ایک نئی سطح پر لے آئیں۔ لارنس زائرنگ 1950ء کی دہائی سے پاکستان کے اندر واقع ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ ضیاء الحق کے دور حکومت کو مبہم اور غیر یقینی اسلامی جمہوریہ سے مطلق العنان اسلامی ریاست تک سفر کے دوران ایک عبوری دور قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:-

"پاکستان میں اسلامی ریاست کی تشکیل یا تعمیر کا حالیہ تجربہ قوم کی سیاسی تاریخ کا نتیجہ ہے۔ آزادی سے قبل اسلام خطرے میں نہیں تھا بلکہ بہت سے مسلمان خود کو خطرات سے دوچار خیال کر رہے تھے۔ جب آزادی میسر آ گئی تو پاکستان کے مسلمان نہیں بلکہ پاکستان خود خطرات کی زد میں آ گیا۔ یہ پاکستان کو خطرات سے بچانے کی ضرورت ہی تھی جس نے فوج کو 1977ء میں اختیارات سنبھالنے پر مجبور کیا۔ اس طرح 1980 کی دہائی کے وسط میں انہیں ملکی سیاست میں نسبتاً بہتر اور برتر کردار میسر آ گیا۔ پاکستان کو فوری خطرات اندرونی قوتوں سے لاحق تھے۔ کم از کم فوجی راہنما یہی سمجھتے تھے۔ اندرونی تنازعات اور تقسیم نے ملکی اتحاد کو کمزور کیا اور بیرونی قوتوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ یہ سبق سانحہ بنگلہ دیش سے حاصل کیا گیا اور یہ بدستور فوج ہی کی ذمہ داری رہی کہ قوم کو ناگفتہ اندرونی حالات سے آگاہ کرے اور اسے غیر ملکی دشمنوں کی جارحیت سے بچائے۔ مسلح افواج ملکی مفادات اور دردمندی کی علامت بن گئیں۔ ان کا یہ وثوق پختہ تر ہو گیا کہ وہ ملکی مفادات کی بہترین نمائندگی کر سکتی ہیں اور استحکام کا حصول اور امن وامان کی بحالی انہی کی ذمہ داری ہے اور پاکستان کی نشاۃ الثانیہ کا ابتدائی تقاضا اسلام ہے۔ وہ اسلام جو پارسائی۔ نظم وضبط۔ ہم آہنگی اور محبت کا درس دیتا ہے۔ اس منصوبے میں بحث مباحثے یا اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پاکستان کی بقاء داؤ پر لگی ہوئی تھی اور وقت متقاضی تھا کہ نظریہ

پاکستان کے ساتھ بے لچک وابستگی ثابت کی جائے۔ یہ تھے وہ حالات اور دباؤ جن سے پاکستان کی اسلامی ریاست دوچار تھی"۔ ضیاء نے اپنی اسلامی ریاست کے نظریے کی بنیاد ہی فوج کی افضلیت اور فوقیت پر رکھی۔ پارسائی اور مذہبی ہم آہنگی پر اسی صورت زور دیا جاسکتا تھا جب دین کو ریاستی اداروں میں شامل کیا جاتا۔ یہ پوری مشق نہ تو تصورات اور اوہام کا مجموعہ تھی اور نہ ہی یہ کاملاً آرمی چیف کے ذاتی عقائد کا نتیجہ تھی۔ یہ پاکستانی فوج کے اس علانیہ عقیدے کی توسیع تھی کہ پاکستانی قوم کو متشکل کرنے کے لئے ایک تو مذہبی تشخص پر زور ضروری تھا۔ دوسرے ملکی دفاع اور بقاء میں فوج کی نگرانی کو فیصلہ کن حیثیت حاصل رہے گی۔ فوجی قیادت اپنے اختیارات۔ مراعات اور روز بروز بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کا جواز یہ پیش کرتی تھی کہ پاکستانی قوم اور ریاست کی تعمیر کے عمل میں یہ اس کی محنت کا صلہ ہے۔ عوامی سطح پر بھٹو کے مقبول اور ہر دلعزیز دور حکومت کے اثر ورسوخ سے پاکستان کو نجات دلانے کے لیے فوج نے جو کاوشیں کیں، ان میں سیاسی ساز باز اور گٹھ جوڑ اس کی ضرورت بن گئے اور (بالآخر) یہی وصف ضیاء الحق کے فوجی دور حکومت کی شناخت بن گیا۔ زائرنگ کے خیال میں" پاکستان کی بقاء اور ترقی ضیاء الحق کے مقاصد تھے۔ انہیں یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ ان کا اپنا تعمیر کردہ سیاسی نظام انہیں سیاسی منظر سے ہٹانے کا سبب بن جائے گا کیونکہ ان کے نزدیک سیاست ایک عارضی شے اور سیاستدان ناقابل بھروسہ مخلوق تھے۔ اسلامائزیشن میں انہیں پاکستان کی غایت وجود کی تکمیل اور قوم کا اتحاد اور قوت نظر آئے۔ ضیاء الحق کے خیال میں اسلامائزیشن کی شکل میں انہوں ے پاکستانی قوم کی تعمیر کے پروجیکٹ میں اپنا بنیادی کردار ادا کر دیا اور سمجھا کہ اسلام کی غیر مشروط افضیلت اور برتری کے اعلان کی صورت میں انہوں نے پاکستان کے تشخص اور شناخت کا مسئلہ حل کر دیا"۔

دور سے دیکھنے والوں کو ضیاء الحق ایوب خان اور یحییٰ خان سے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ ضیاء الحق انکے فوجی رفیق اور ان کا دور حکومت (1977-1988) پاکستانی فوج کی ان کاوشوں کا تسلسل تھا جو وہ پاکستان کے قومی تشخص کی تشکیل کی خاطر ریاست پر سرگروہی کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے کر رہی تھی۔ ایوب خان نے امریکہ کے ساتھ قریبی اور گہرے مراسم کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی تاکہ عسکری جدیدیت اور اقتصادی ترقی کے حصول کو ممکن بنایا جاسکے۔ یحییٰ خان نے پاکستان کی تقسیم کا خطرہ مول لے کر بھی سابقہ مشرقی پاکستان میں بھارتی رسوخ کا مقابلہ کیا۔ ضیاء الحق نے اپنی تمام تر توانائیاں پاکستان کے اندر اتحاد اور یک جہتی کو یقینی اور اسے خالص تر اسلامی ریاست بنانے پر صرف کر دیں۔ اگرچہ ہر ایک نے اپنی بنیادی توجہ ان میں سے صرف ایک پر مرکوز کی تاہم آزادی کے بعد جلد ہی پاکستان کے ہر فوجی حکمران کو پاکستان کی بقاء کے لیے 3 عناصر ایک نسخے کے طور پر پیش کئے گئے۔ ہر فوجی حکمران کے دور حکومت کے دوران مختلف ترجیحات سے کام لیا گیا لیکن ہر ایک نے اپنی مرضی کے مطابق عنصر کا انتخاب کر لیا۔

ضیاء الحق نے مسلح افواج کی برتری پر سمجھوتہ کئے بغیر سلو بلین انتظامیہ میں مذہبی راہ نماؤں اور علمائے دین کا رسوخ بڑھا دیا۔ مغرب سے تعلیم یافتہ قانون دانوں کے ساتھ ساتھ وفاقی شرعی عدالت میں مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کو بطور

جج نامزد کیا گیا۔ برطانوی راج کے تحت عام انگریزی قوانین کے متعارف ہونے کے بعد پہلی مرتبہ روایتی تعلیم کے حامل علماء کو ان اہم عہدوں پر فائز کیا گیا۔ کئی علمائے دین بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے قابل ہو گئے۔ بعض نے پاکستان ٹیلی ویژن پر آ کر لیکچر دیے اور اس طرح شہرت کے حصول کے بعد اپنی نئی اسلامی جماعتیں تشکیل دے لیں۔ نئے اخبارات اور رسائل و جرائد کی اشاعت کے آغاز کے لیے کئی اسلام پسند صحافیوں کو ملنے والی ریاستی سرپرستی ممد ثابت ہوئی۔ اسی سرپرستی کے باعث وہ حکومت کے ملکیتی میڈیا میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ بارسوخ اور بااثر ہو گئے۔

ضیاء الحق کے دور حکومت میں پاکستان کا نظام تعلیم بھی قابل ذکر تبدیلیوں کے عمل میں سے گزرا۔ ایوب خان کے فوجی دور حکومت کے بعد سے پہلی جماعت سے لیکر کالج کی سطح تک جو نصابی کتب پڑھائی جارہی تھیں وہ حکومت کی شائع کردہ تھیں۔ بالخصوص معاشرتی علوم کی کتب اس انداز میں مرتب کی گئی تھیں کہ ان میں پاکستانی تاریخ کی ایک مخصوص اور یکساں تفصیل موجود تھی۔ ضیاء الحق کے دور میں نصابی کتب اسلام پسندوں کے نظریاتی ایجنڈے کے تحت دوبارہ مرتب کی گئیں۔ پاکستانی مورخ کے کے عزیز کے خیال میں وہ نصابی کتب تاریخی غلطیوں سے اٹی ہوئی تھیں اور ان کا لازمی مطالعہ ایسے ہی تھا جیسے کسی کو پراسرار حکایتیں پڑھنے پر مجبور کر دیا جائے۔ سکول کی مختلف سطوح پر معاشرتی علوم اور مطالعہ پاکستان جیسے لازمی مضامین کی 66 کتابوں کی چھان بین کے بعد عزیز اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کتب کا مقصد ہی پاکستان میں فوجی حکمرانی کی حمایت، ہندوؤں کے لئے نفرت کی تلقین، مختلف جنگوں میں مسلمانوں کی شان و شوکت اور دلیری و شجاعت کے قصے سنانا اور ان علاقوں کی قبل از تقسیم تاریخ کو مسخ کرنا تھا جنہوں نے بعد میں پاکستان کی صورت اختیار کر لی۔

بقول عزیز۔ طلباء کو سکول کی ابتدائی جماعتوں سے ہی پڑھایا جارہا تھا کہ "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" یا "برصغیر میں مسلمانوں نے آ کر ہندو معاشرے کی اصلاح کی"۔ "ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کے دوران پارسا مسلمان اور علمائے دین بادشاہ کے انتخاب میں حصہ لیا کرتے تھے"۔ "مسلمان اس ملک میں آئے تو صاف ستھری اور شائستہ و مہذب ثقافت اور تہذیب ہمراہ لائے" یا "آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت پر ہندو اپنا تسلط جمانا چاہتے تھے۔ انگریز ہندوؤں کے طرفدار تھے لیکن مسلمانوں نے یہ فیصلہ قبول نہ کیا" وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ پاکستان ایک پیچیدہ مذاکراتی عمل میں سے گزر کر معرض وجود میں آیا اور 1858ء سے لیکر 1929ء تک برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کم از کم 64 تجاویز پیش کی گئیں۔ تاہم پاکستانی طلباء کو انتہائی سادہ اور سلیس تاریخ پڑھائی گئی۔ پاکستان کی ہر نصابی کتاب میں اسی بات پر زور دیا گیا کہ اسلام اور ہندوازم اکٹھے نہیں چل سکتے تھے۔ لہذا مسلمانوں کو ہندوستان سے الگ اور علیحدہ ہو جانا چاہئے تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے پاکستان کی تخلیق ناگزیر تھی۔ بعض کتب میں یہ بھی لکھا تھا کہ جس دن پہلے مسلمان نے برصغیر کی زمین پر پاؤں دھرا، نظریہ پاکستان

نے اسی دن جنم لے لیا تھا۔ اس طرح اس نئے ملک کی تاریخ کو آٹھ صدیاں قبل بنی امیہ کے جرنیل محمد بن قاسم کی برصغیر کے ان علاقوں کی فتح سے منسلک کر دیا گیا جو اس وقت جدید پاکستان کا حصہ ہیں۔ اگرچہ انہوں نے آزادی سے قبل ملکی تاریخ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ تاہم جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سمیت روایتی علماء کو نظریہ پاکستان کے بانی بنا کر پیش کیا گیا۔

یہ جانبدارانہ تاریخی بیان جواز پاکستان کے حق میں دلیل پر ہی ختم نہیں ہوگیا۔ تقسیم ہند کے موقع پر جو مذہبی فسادات ہوئے انہیں "ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں غیر مسلح اور نہتے مسلمانوں کا قتل عام" قرار دیدیا گیا۔ 1965ء میں ہونے والی جنگ کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں پاکستان فتحیاب رہا اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب بھارت نے "امن کی التجا" کی۔ کیونکہ وہ "پاکستانی فوج اور پاکستانی عوام سے خوفزدہ تھا"۔ ایوب خان کا تعارف ایک "پاکباز حکمران" کے طور پر کرایا گیا جس کے "پارسائی اور پاکبازی پر مبنی کاموں کی بناء پر سب اس کے ساتھ محبت کرتے تھے"۔ سقوط ڈھاکہ کی یہ وضاحت پیش کی گئی کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی "اندرونی اور غیر ملکی دشمنوں کی ملی بھگت اور بھارتی جارحیت" کا نتیجہ تھی۔ امریکہ اور روس دونوں کو پاکستان کے اسلامی نظریے کے دشمنوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی کردار کشی کرتے ہوئے لکھا گیا کہ وہ ایک ایسا آمر تھا جس نے عوام کی توقعات پر پورا اترنے کے لئے کچھ نہ کیا۔ ضیاء الحق کو کریڈٹ دیا گیا کہ جس اسلامی نظام کا خواب بانی پاکستان نے دیکھا تھا اس پر عملدرآمد کے لئے انہوں نے "قابل قدر خدمات سرانجام دیں"۔ نصابی کتب میں موجود اسلام پسندانہ تعصب نے باور کرادیا کہ لوگوں کے قلوب واذہان پر ضیاء الحق کا نظریاتی اثر ان کے دور حکومت کے خاتمے کے بعد بھی کافی عرصہ قائم رہا۔

ضیاء دور میں میڈیا اور پاکستان کے سرکاری تعلیمی نظام میں اسلام پسندوں کا کردار بڑھانے کے علاوہ اعلیٰ حکومتی ایوانوں تک اسلام پسند راہنماؤں کی دسترس بھی بڑھا دی گئی۔ ضیاء سرکاری سرپرستی میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں بھی بڑی باقاعدگی سے علماء ومشائخ کے ساتھ ملاقاتیں کرتے تھے اور ایوان صدر میں ہونے والے انفرادی اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے تھے جن کی انعقاد سے قبل خوب تشہیر کی جاتی تھی۔

ایوان صدر تک مذہبی پیشواؤں کی دسترس بڑھی تو بیوروکریسی میں بھی ان کے رسوخ میں اضافہ ہوگیا۔ سرکاری ملازمین نے ترقیوں کے حصول کے لئے شعائر اسلامی کی ادائیگی اور مذہبی وروحانی تقریبات میں ان مذہبی شخصیتوں کو مدعو کرنا شروع کر دیا جن کا ایوان صدر میں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ فوج کے اندر برطانوی راج کے کلچر کے ساتھ قرآنی مطالعاتی گروپس کے کلچر کا اضافہ بھی ہوگیا۔ ذکر، میلاد اور تبلیغ کی محافل کا آغاز ہوگیا۔ ایک غیر سیاسی تحریک تبلیغی جماعت کو فوج میں پاؤں جمانے کے لئے نسبتاً زیادہ جگہ میسر آ گئی۔ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کی روحوں کی تطہیر اور انہیں ان کے مذہبی فرائض یاد دلانا تھا۔

تبلیغی جماعت کی جڑیں پاکستان کے ان سنیوں سے جاملتی ہیں جن کا تعلق دیوبند مکتب فکر سے ہے۔ دیوبندی مذہبی معاملات میں حد درجہ قدامت پسند تھے۔ انہوں نے خود کو روایتی طور پر مغرب اور مغربیت کے اثرات سے دور رکھا ہوا تھا۔ جماعت اسلامی کے برعکس تبلیغی جماعت نہ تو کسی معاصر اسلامی انقلاب کی خواہاں تھی اور نہ ہی اس کے وابستگان سیاسی اختیارات کے سنجیدہ امیدوار تھے۔ وہ صرف سماجی قدامت پسندی پر زور دیتے تھے اور فوج کے لئے اختیارات کسی پارسا اور پاکباز اشرافیہ کو منتقل کرنے کی نسبت یہ کام آسان تر تھا۔ فوج کے خیال میں جماعت اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتیں سیاسی ایجنڈوں کی حامل تھیں جبکہ تبلیغی جماعت کا ایسا کوئی ایجنڈا نہ تھا۔ فوجی افسران اور سول ملازمین کے لئے تبلیغی جماعت کو تبلیغ کی اجازت دینا بھی نسبتاً آسان تھا کیونکہ انہیں کھلم کھلا کسی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ضیاء الحق جتنا عرصہ برسراقتدار رہے ہر سال باقاعدگی سے تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع میں شرکت کرتے رہے۔ اس طرح اقتدار کے ایوانوں میں اس گروہ کی قدرومنزلت اور رسائی میں اضافہ ہوا۔

دیوبندی علماء کا ایک گروہ "جمعیت العلمائے اسلام" کے پرچم تلے سیاست میں حصہ لیتا تھا۔ ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے تک دیوبندیوں کی بڑی تعداد سیاست میں بہت مختصر حصہ لیتی رہی۔ ضیاء الحق نے سرکاری سطح پر نماز اور روزے کی حوصلہ افزائی کی اور خواتین کے عوامی کردار کو کم کیا۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ کھلم کھلا التفات کا اظہار اور اس کے مقاصد کی وکالت کی۔ اس طرح وہ بڑی تعداد میں ان اسلام پسندوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جو اس سے پہلے غیر سیاسی ہوا کرتے تھے۔ ضیاء الحق نے اس عمل کے دوران ان کی صفوں میں سیاست داخل کردی تاکہ اگر اسلامی سیاسی جماعتیں فوجی حکومت کی حمایت سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کرلیں تو وہ لوگ پاسنگ کا کام دے سکیں۔

ضیاء الحق کی اسلامائزیشن نے اعلیٰ تعلیم کے حلقے پر قابل ذکر اثرات مرتب کئے۔ ضیاء حکومت نے اسلام پسند طلباء کے گروہوں کی حمایت اور اساتذہ کے ساتھ ان کے تصادم کی حوصلہ افزائی کی تاکہ پاکستانی یونیورسٹیوں کو سیکولر پروفیسروں سے پاک کیا جاسکے۔ سرکاری موقف یہ تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ جو پروفیسر حضرات اس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ان پر تعزیری حربے آزمائے جاتے تھے۔ اس طرح وہ نکالے جانے سے مستعفی ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ حکومت نے اسلامی مدرسوں کی جاری کردہ اعلیٰ سند کو یونیورسٹی ڈگری کے مساوی قرار دیدیا۔ اس طرح روایتی مدرسوں کے گریجویٹ اس قابل ہوگئے کہ انہیں سرکاری ملازمتوں کے حصول یا مقابلے کے امتحانات میں شرکت کے لئے اہل قرار دیا جاسکے۔ جماعت اسلامی پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اپنا رسوخ بڑھانے میں کامیاب ہوگئی اور دیوبندی مدرسوں پر خلیج فارس کی عرب ریاستوں اور نجی اداروں کی طرف سے چندوں کی بارش ہونے لگی۔ ضیاء الحق نے ملاؤں اور فوج کے درمیان اتحاد کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ اس امر کو یقینی بنایا کہ یہ تعلق آنے والے کئی سالوں تک مضبوط اور مستحکم رہے۔

جب ضیاء الحق کا مذہبی جوش وجذبہ خارجہ پالیسی سے جھلکنے لگا تو ان کی خواہشات اور امریکی پالیسیاں باہم متصادم ہو گئیں۔ 1971ء کے فوجی سانحے کے بعد جو مشرقی پاکستان کے نقصان پر منتج ہوا، پاکستانی فوج نے بھارت کے ساتھ تصادم کی پالیسی سے گریز کرنا شروع کر دیا اور اپنی تمام تر توجہ خود کو از سر نو منظم کرنے اور جدیدیت کے حصول پر مرکوز کر دی۔ امریکہ نے پاکستان کے ہاتھ عسکری ساز وسامان کی فروخت پر جو پابندی 1965ء کی جنگ کے دوران عائد کی تھی وہ 1975ء میں اٹھالی لیکن 1977ء میں ضیاء الحق کے فوجی انقلاب تک آخر الذکر نے امریکی اسلحے کا کوئی نیا نظام حاصل نہیں کیا تھا۔ ملکی سطح پر اسلامائزیشن کے ساتھ ساتھ ضیاء الحق نے پاکستان کے لئے امریکی عسکری ساز وسامان کی فروخت کی تجدید اور پہلے سے زیادہ اقتصادی امداد کے حصول پر بھی توجہ دی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی طرح ضیاء نے بھی چاہا کہ افغانستان کے اندر خفیہ کارروائیوں کے لئے انہیں امریکی حمایت حاصل ہو جائے۔ مذکورہ کارروائیوں کا آغاز 1974ء میں ہوا تھا۔ اگرچہ امریکہ نے ابتداء میں کسی دل چسپی کا اظہار نہ کیا تاہم جب افغانستان میں روسی مداخلت بڑھ گئی تو بالآخر اسے اپنی توجہ اس طرف مبذول کرنا پڑی۔

1978ء اور 1988ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ نے پاکستان کو دوطرفہ بنیادوں پر اڑھائی ارب ڈالر کی اقتصادی اور ایک ارب ستر کروڑ ڈالر کی فوجی امداد فراہم کی۔ یہ امداد بھٹو کے سویلین دور حکومت میں ملنے والی 93 کروڑ 70 لاکھ ڈالر کی امریکی اقتصادی معاونت اور 17 لاکھ ڈالرز کے امریکی اسلحے کی فروخت سے کہیں زیادہ تھی۔ دوطرفہ بنیادوں پر ملنے والی امریکی امداد کے علاوہ پاکستان نے دیگر مغربی ممالک سے بھی فیاضانہ مالی معاونت حاصل کی۔ عالمی برادری نے نہ صرف افغان مہاجرین پر اٹھنے والے اخراجات برداشت کئے بلکہ افغان مجاہدین کو بھی پاکستان ہی کے توسط سے خفیہ امداد بہم پہنچائی گئی۔ نتیجتاً پاکستان کی معیشت میں بھی مثبت اور خوشگوار تبدیلیاں آئیں اور ضیاء کے دور حکومت کو طوالت ملی۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں نے سینکڑوں ہزاروں پاکستانیوں کو روزگار کی فراہمی کی صورت میں پاکستان کی مدد کی۔ جن کی بھیجی ہوئی رقوم اندرون ملک خوشحالی کی پیام بر ثابت ہوئیں۔ سعودیوں نے اپنی سلطنت کی حفاظت کے لئے پاکستانی فوجی معاوضے پر حاصل کئے اور اس طرح پاکستان کے لئے ایک اضافی ذریعہ آمدن بن گیا۔

تاہم پاکستان کے بعض حلقے اس اقتصادی ترقی سے کوئی استفادہ نہ کر سکے۔ سندھ کے جنوبی اضلاع اور بلوچستان نے محسوس کیا کہ انہیں غیر ملکی امداد اور پاکستانی تارکین وطن کی بھیجی ہوئی رقوم کے فوائد سے دور کر دیا گیا ہے۔ باہر سے موصول ہونے والی رقوم کا بہاؤ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی طرف تھا۔ کچھ سرمایہ بلوچستان کے پشتون علاقوں میں بھی پہنچا۔ پاکستانی فوج کی اکثریت کا تعلق شمالی صوبوں سے ہے۔ خلیجی ممالک میں مقیم زیادہ تر پاکستانی تارکین وطن بھی انہی صوبوں کے رہنے والے ہیں۔ ضیاء الحق کی پالیسیوں کے اقتصادی فوائد نے پنجاب اور صوبہ سرحد کی حد تک فوجی حکومت کے مخالفین کو خاموش کرا دیا۔ خلیجی ریاستوں میں مقیم پاکستانی تارکین وطن اور ان کے اہل خانہ نے یا تو

اسلامائزیشن کے لئے ہمدردانہ رویہ اپنالیا اور یا پھر اس سے بے نیاز اور لاتعلق ہو گئے۔ وہ ان اسلام پسند مشنریوں سے بھی متاثر ہوئے جنہیں سعودی عرب کی "وہابی" مسلک سے تعلق رکھنے والی مذہبی اسٹیبلشمنٹ کی سرپرستی حاصل تھی۔

امریکہ نے نہ تو ضیاء کی اسلامائزیشن سے کوئی علاقہ رکھا اور نہ ہی ضیاء الحق کی ان کوششوں سے اسے کوئی سروکار تھا جو وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لئے کر رہے تھے۔ ضیاء الحق کے بارے میں امریکیوں کی رائے کو سٹیفن کوہن اور مارون وین بام نے بالاختصار اس طرح بیان کیا ہے کہ "اگرچہ زیادہ تر پاکستانی ضیاء الحق کو ناپسند کرتے ہیں تاہم ان لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ ایک لازمی برائی ہیں۔ ضیاء اپنے دشمنوں کے لئے بدستور ایک مشکل ہدف بنے ہوئے ہیں اور انہیں بعداز وقت ادراک ہوا ہے کہ بطور ایک کرشماتی سیاستدان ان کی جو بھی حدود و قیود ہوں وہ اقتدار میں رہنے کا فن جانتے ہیں"۔

1983ء میں ضیاء الحق کو اپنے دورِ حکومت کے پہلے سنگین ملکی چیلنج کا اس وقت سامنا کرنا پڑا جب جنوبی سندھ میں ان کی حکومت کے خلاف پرتشدد احتجاج کا آغاز ہوا۔ بھٹو کے اس آبائی علاقے کے مکینوں کو شکایت تھی کہ ضیاء حکومت نے انہیں کچھ نہیں دیا۔ وہ احتجاجی مظاہرے آٹھ جماعتوں پر مشتمل "تحریک بحالی جمہوریت" (ایم آر ڈی) کی اس ملک گیر مہم کا حصہ تھے جس میں آزادانہ اور شفاف انتخابات کے انعقاد اور مارشل لاء کے خاتمے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ پاکستان کے دیگر حصوں نے اس احتجاج میں قابل ذکر شرکت نہیں کی۔ تاہم سندھیوں نے حکومت میں عدم شمولیت سے لیکر شمالی صوبوں سے مہاجرین کی آمد کے نتیجے میں اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن جانے کے خدشات تک کئی معاملات پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے موقع غنیمت سمجھا۔ فوجی حکومت نے بے رحمانہ انداز میں اس احتجاج کو دبا دیا اور بھارت پر الزام عائد کیا کہ وہ سندھ میں بدامنی کو ہوا دے رہا ہے اور اس الزام کو ٹھوس بنانے کے لئے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے اس بیان کا حوالہ دیا جانے لگا کہ "بھارتی عوام پاکستان کی تمام جمہوری تحریکوں کی حمایت کریں گے"۔ "تحریک بحالی جمہوریت" کے احتجاجی مظاہروں پر ضیاء الحق نے جس ردعمل کا اظہار کیا اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ پاکستان کی بقاء کو اسلام اور فوجی حکومت کے ساتھ کس طرح مشروط کرتے تھے۔

"ضیاء کا دعویٰ تھا کہ مارشل لاء حکومت آئینی اور اسلامی تھی اور بطور مسلمان پاکستانیوں کا فرض تھا کہ وہ اپنی حکومت کی اطاعت کریں کیونکہ وہ اسلامی اصولوں پر کاربند تھی۔ انہوں نے اپنے اس خیال کے حق میں قرآن اور حدیث کا حوالہ دیا کہ "جب تک ملک کا سربراہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات پر عمل کرتا رہے۔ اس کی اطاعت رعایا کا فرض عین ہے"۔ اپنی حاکمیت کے جواز کو قرآن سے اخذ کرتے ہوئے انہوں نے پھر کہا کہ ان کی حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کرنے والوں کو ایک اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کا ملزم ٹھہرایا جا سکتا تھا اور اس طرح وہ خود کو اسلام مخالف سرگرمیوں میں ملوث کر رہے تھے۔

سندھ میں احتجاجی مظاہروں کے بعد ضیاء نے ایک بار پھر وعدہ کرلیا کہ وہ انتخابات کرائیں گے اور سیاسی عمل کا دروازہ کھول دیا جائے گا۔ تاہم انہوں نے واضح کردیا کہ انتخابات کے بعد بھی ملک کی باگ دوڑ انہی کے پاس رہے گی۔ ضیاء کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ منتخب سیاستدانوں کو اقتدار منتقل نہیں کریں گے۔ البتہ انہیں اقتدار میں شریک کرلیں گے۔ یکم دسمبر 1984ء کو جنرل ضیاء کے اس اعلان نے ملکی اور غیر ملکی مبصرین کو حیران کردیا کہ وہ انتخابات کو یقینی بنانے اور ملک کی نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے ریفرنڈم منعقد کرائیں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجوزہ ریفرنڈم قومی یک جہتی کے قیام میں بھی ممد ثابت ہوگا۔ ریفرنڈم کا انعقاد 20 دسمبر کو ہونا قرار پایا۔ رائے دہندگان کو صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا۔ "حکومت نے قرآن وسنت کے مطابق ملکی قوانین کی اسلامائزیشن کا جو عمل شروع کیا ہے۔ کیا آپ اس کی حمایت کرتے ہیں؟"۔ طے یہ پایا کہ اگر عوام کی اکثریت نے مذکورہ سوال کا جواب "ہاں" میں دیا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ عوام ضیاء کی حکومت کا تسلسل چاہتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے تو سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والے میڈیا کی مدد سے مہم چلائی کہ عوام اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیں۔ لیکن حزب اختلاف کو "نہ" کی مہم چلانے کی اجازت نہ دی گئی۔

ریفرنڈم کے جعلی ہونے کا صاف پتہ چل رہا تھا۔ اصل مقصد اسلامائزیشن کی آڑ میں ضیاء حکومت کے تسلسل کو یقینی بنانا تھا۔ جماعت اسلامی نے باقاعدہ مہم چلائی کہ عوام "ہاں" میں جواب دیں۔ اس کا موقف تھا کہ ریفرنڈم انتخابات کی طرف پیش رفت کا واحد ذریعہ تھا اور پاکستان کے عوام اسلامائزیشن کے خلاف ووٹ نہیں دے سکتے تھے۔ آزاد اور غیر جانبدار مبصرین نے ریفرنڈم میں متعدد بے قاعدگیوں کی نشاندہی کی۔ ان کے اندازے کے مطابق بمشکل 30 فیصد رائے دہندگان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ تاہم سرکاری سطح پر جس نتیجے کا اعلان کیا گیا اس کے مطابق 60 فیصد سے زیادہ رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا جن میں سے 97.7 فیصد نے اسلامائزیشن اور آئندہ 5 برس کے لئے ضیاء کی صدارت کے تسلسل کے حق میں ووٹ دیا۔ ریفرنڈم سے ثابت ہوگیا کہ ضیاء کی فوجی حکومت اور اس کے ساتھ (خفیہ یا علانیہ) تعاون کرنے والی اسلام پسند جماعتوں کو حاصل عوامی حمایت کی بنیاد وسیع اور کشادہ نہیں تھی۔ پاکستان میں فروری 1985ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر پارلیمانی انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا۔ مطلب یہ کہ امیدواروں کو اپنی سیاسی وابستگیوں کے اظہار کی اجازت نہیں تھی اور وہ مختلف اضلاع سے انفرادی حیثیت میں انتخابات میں حصہ لے سکتے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی سربراہی میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کردیا۔ تاہم بعض جماعتوں کے راہنما انتخابات میں حصہ لینے کے لئے اپنے جماعتی عہدوں سے مستعفی ہوگئے۔ ضیاء الحق کو امید تھی کہ جماعتی لیبل کے بغیر انفرادی طور پر نیک اور متقی لوگ منتخب ہوں گے۔ جنہیں فوج کی سرپرستی میں جماعتوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ لیکن ان کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ ضیاء الحق کی کابینہ کے زیادہ تر وزراء انفرادی حیثیت میں شکست کھا گئے۔ اس طرح جو پارلیمنٹ

معرض وجود میں آئی وہ زیادہ تر مقامی اور موثر سیاستدانوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو کچھ عرصہ پہلے تک پی پی پی کے رکن تھے۔ اسلام پسند بھی قومی اسمبلی میں اپنے ارکان کی تعداد میں قابل ذکر اضافہ نہ کر سکے۔

ضیاء الحق نے جب ایک قدامت پسند سندھی سیاست دان محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کر دیا تو اسلامائزیشن کے عمل کی رفتار سست پڑ گئی۔ محمد خان جونیجو ایک تو بلند سماجی مرتبے کے حامل نہیں تھے دوسرے انہیں عوامی حمایت حاصل نہیں تھی۔ لہذا توقع کی گئی کہ وہ فوج کی ہدایات پر عمل کرتے رہیں گے۔ یعنی انہیں جو فوج کہے گی وہ کریں گے۔ تاہم عوامی حمایت کے حصول اور بحیثیت سیاستدان اپنے مقام و مرتبے میں اضافے کے لئے قومی اسمبلی سے اپنے پہلے خطاب کے دوران ہی انہوں نے مارشل لاء کے خاتمے کا مطالبہ کر دیا۔ جونیجو، ان کی کابینہ اور قومی اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ وہ ضیاء الحق کے فیصلوں پر ثبت کی جانے والی مہر بننا پسند نہیں کریں گے اور فوج کے ساتھ براہ راست کوئی جھگڑا مول لئے بغیر اپنا آزادانہ لائحہ عمل اختیار کریں گے۔ پارلیمنٹ نے ان آئینی ترامیم کے اثرات کو کم کیا جو ضیاء الحق کے احکامات پر کی گئی تھیں۔ مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور اسلامائزیشن کے لئے جو قانون سازی کی جا رہی تھی اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ جونیجو نے سیاسی جماعتیں بھی بحال کر دیں اور خود پاکستان مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔

اگرچہ منتخب سیاستدان اسلامی قوانین کے دائرہ کار کو وسیع تر کرنے کے لئے پر جوش نہیں تھے تاہم ضیاء الحق کی طرف سے اسلامائزیشن کے حق میں بیانات کا سلسلہ جاری رہا۔ جونیجو نے کہا کہ وہ پاکستان کو اس دور میں لے جانا چاہتے ہیں جب وہ مبہم قسم کا اسلامی جمہوریہ تھا۔ انہوں نے ضیاء الحق کی شریعت پر مبنی اسلامی ریاست کو باعث تقسیم اور ناقابل عمل قرار دیا۔ 29 مئی 1988ء کو ضیاء الحق نے قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور جونیجو کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ پندرہ دنوں کے اندر انہوں نے ایک قانون نافذ کر دیا جس کے مطابق لازم قرار دیدیا گیا کہ ملک بھر کی عدالتیں تمام مقدمات کو شریعت کے مطابق فیصل کریں۔ اس طرح ایک عشرے سے زائد عرصے پر محیط اسلامائزیشن کا "مرحلہ وار عمل" ترک کر دیا گیا۔ مختلف اور مخصوص موضوعات پر از سر نو قانون سازی کی بجائے شرعی قوانین کے لئے ایسے ججوں کی ضرورت پڑ گئی جو شریعت کے مطابق فیصلے کر سکیں۔ شریعت کے تقاضوں کا تعین کرنے کے لئے علمائے دین سے مشاورت بھی ضروری ہو گئی۔

17 اگست 1988ء کو طیارے کے ایک پراسرار حادثے میں ضیاء الحق کی موت ایک ایسے دور کے خاتمے کا باعث بن گئی جسے "نیویارک ٹائمز" نے پاکستان کے لئے "ایٹم اور اسلام" کا دور قرار دیا۔ ضیاء الحق سے قبل پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور اسلام پسندوں کے فلسفہ ہائے زندگی ایک دوسرے کے مماثل بھی تھے تو دونوں کا کلچر مختلف تھا۔ مخلوط اجتماعات، شرعی قوانین کا نفاذ، قدامت پسندانہ لباس اور عوامی سطح پر شعائر اسلامی کی ادائیگی جیسے معاملات میں پاکستانی جرنیل اور سول ملازمین علمائے دین اور اسلامی پسندوں کی آراء سے متفق نہیں تھے۔ "سول ملٹری امتزاج" ایک تو پاکستانی وطنیت کا احساس

دلانے کے لئے اسلام کا نام استعمال کرتا تھا۔ دوسرے خارجہ پالیسی پر عمل کرتے وقت بھی اسلام ہی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس ثقافتی تقسیم کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بھارت کی مخالفت اور مغرب کی جانب وسطی ایشیاء اور مشرقِ وسطیٰ میں پاکستانی رسوخ میں اضافے کے لئے جو پالیسیاں اپنائی گئیں ان کے تناظر میں ریاست اسلام پسندوں کے جوش و خروش کا مکمل ادراک نہ کرسکی۔ اگرچہ "سول ملٹری امتزاج" اسلام پسندوں کو استعمال کرنے کے خلاف نہ تھا۔ تاہم اس کے دل میں ان کے لئے احترام نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ ضیاء الحق نے اسلام پسندوں کے لئے ممکن بنا دیا تھا کہ وہ محسوس کریں کہ پاکستان کی اسلامی ریاست نے انہیں بااختیار اور طاقتور بنا دیا ہے۔ پاکستان کی سول اور فوجی اشرافیہ نے بھی اب اسلام کے مذہبی پیشواؤں اور اسلامی نظریہ پرستوں کو نسبتاً زیادہ قابل قبول خیال کرنا شروع کر دیا تھا۔

افغانستان پر روسی حملے نے ضیاء الحق کو جاسوسی اور انقلاب کا وہ بڑا کھیل کھیلنے کے قابل بنا دیا جو 19 ویں صدی میں زاران روس اور برطانوی سامراج کے درمیان کھیلا جاتا رہا۔ تاہم انہیں اس کھیل کے دوران امریکی معاونت اور اسلام پسندوں کی مکمل شراکت حاصل رہی۔ افغان جہاد نے پاکستانی قیادت میں عالمگیر سطح پر تجدید اسلام کے وسیع تر منصوبے پر عملدرآمد کا دروازہ کھول دیا۔ یہ سلسلہ ضیاء الحق کے بعد بھی کافی عرصہ جاری رہا۔

افغان جہاد

پاکستان عرصہ دراز سے منتظر تھا کہ افغانستان کے اندر اس کا رسوخ بڑھے۔ لہذا اس نے امریکی امداد بخوشی قبول کر لی اور افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف گوریلا کاروائیوں کے لئے اپنی سرزمین پیش کر دی۔ جب روسی فوج افغانستان سے دست بردار ہوگئی تو اس کے بعد ہونے والی خانہ جنگی میں بھی پاکستان نے کٹر اور بے لچک نظریات کے حامل اسلام پسند مجاہدین کی مدد جاری رکھی، جس کے نتیجے میں طالبان برسر اقتدار آگئے لیکن افغانستان کے معاملات میں پاکستان کی مداخلت کو محض سوویت یونین کے خلاف امریکہ کی "پراکسی جنگ" کا منطقی یا فطری نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگرچہ آزادی کے بعد پاکستانی راہنماؤں نے فرض کر لیا تھا کہ جسطرح ہندوستان کی برطانوی حکومت افغانستان کی خارجہ پالیسی کے رخ کا تعین کرتی تھی۔ وہ اختیارات پاکستان کو ورثے میں مل جائیں گے لیکن جب پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو افغانستان نے قیام پاکستان کے منطقی جواز کو چیلنج کر دیا۔ ایک تو افغانستان نے پاکستان کو تسلیم کرنے میں نیم دلی کا مظاہرہ کیا، دوسرے اس نے افغانستان اور پاکستان کی مشترکہ سرحد سے متصل علاقے پر ملکیت کا دعویٰ کر دیا جہاں پشتون قبائل آباد تھے۔ اس طرح پاکستانی راہنماؤں کے احساس عدم تحفظ میں اضافہ ہو گیا۔ انہیں پہلے ہی یہ خدشہ لاحق تھا کہ بھارت تقسیم ہند کو کالعدم کرنا چاہتا ہے۔ افغانستان نے پاکستان کے اندر نسلی تعصب کو ہوا دینا شروع کر دی۔ اس کام میں اسے بھارت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس طرح ان پاکستانی راہنماؤں کی مشکلات اور مسائل کی فہرست میں "افغان چیلنج" کا اضافہ ہو گیا جو ایک آزاد ریاست کے طور پر پاکستان کے تشخص کو متشکل کرنے میں مصروف تھے اور پاکستان کی افغان پالیسی بھی اس کی سہ جہتی پالیسی کا حصہ بن گئی جس کا تعین پاکستانی راہنماؤں نے بڑی سوچ بچار کے بعد کیا تھا۔ پاکستان کے اندر جس نسلی وطن پرستی کو افغانستان کی حمایت حاصل تھی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اول الذکر نے اسلامی نظریے کا سہارا لیا اور موقف اختیار کیا کہ پشتونستان بنانے کی افغان خواہش دراصل پاکستان کو لخت لخت کرنے کا بھارتی منصوبہ تھا اور علاقائی رسوخ کے حصول کا ایک ایجنڈا تیار کیا جس پر عملدرآمد کے لئے امریکی معاونت طلب کر لی گئی۔

افغانستان کے ساتھ پاکستانی رویہ جزوی طور پر ان تاریخی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا جو مطالبہ پاکستان کے منظر عام پر آنے سے بھی بہت پہلے واقع ہو چکی تھی۔ 19 ویں صدی میں وسطی ایشیاء میں رسوخ قائم کرنے کے لئے روس اور برطانیہ برسر پیکار تھے۔ دونوں طاقتوں کے باہمی مقابلے کو جاسوسی اور پراکسی جنگوں کے "بڑے کھیل" (Great Game) سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جنوب کی طرف روسی سلطنت کی توسیع کو برطانیہ ہندوستان پر اپنے کنٹرول کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ ہندوستان کو "برطانوی تاج میں جڑا ہوا قیمتی نگینہ" کہا جاتا تھا جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک صدی سے زائد عرصہ صرف کیا تھا اور اس کی بھاری قیمت بھی ادا کر چکا تھا۔ روس کے خلاف دفاعی تقاضوں نے برطانوی ہندوستان کی سرحدوں کو مغرب کی جانب دھکیل دیا تھا۔ روس اور برطانیہ دونوں کو ان مسلمان قبائل کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا جنہیں روسی شہزادے الیگزینڈر گورچاکوف نے "بے آئین" یا "قانون شکن" اور برطانوی مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے "وحشیوں کے مخالفین" یا "وحشیوں کے دشمن" (Anti-barbarian) کا نام دے رکھا تھا۔ افغانستان پر براہ راست کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش میں برطانیہ کئی قیمتی جانیں گنوا بیٹھا تھا۔ افغانستان کو دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک بفر سٹیٹ سمجھتے ہوئے برطانیہ اور روس ایک دوسرے کے ساتھ فوجی تصادم سے بچے رہے۔ ایک غیر جانبدار اور آزاد افغان سلطنت کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے کچھ بے آئین قبائل کی اطاعت کے بوجھ کو ایک مقامی شہنشاہ کی طرف منتقل کر دیا۔ تاہم اس عمل میں اسے برطانیہ کی طرف سے اقتصادی اور عسکری معاونت حاصل رہی۔

برطانوی ہندوستان کے ساتھ افغانستان کی سرحد کا تعین 1893ء میں برطانیہ کے ایک سول افسر سر مارٹیمر ڈیورنڈ نے کیا تھا۔ جسے دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے قبول کر لیا۔ اس سرحد کو "ڈیورنڈ لائن" کا نام دیا گیا۔ اس طرح وہاں بسنے والے پشتون قبائل کو جان بوجھ کر تقسیم کر دیا گیا تاکہ وہ برٹش راج کے لئے پریشانی کا باعث نہ بن سکیں۔ اس سرحد کی برطانوی جانب خود مختار قبائلی ایجنسیاں تشکیل دیدی گئیں جن کا انتظام و انصرام قبائلی سرداروں کی مدد سے برطانوی پولیٹیکل افسران کے ذریعے چلایا گیا۔ قبائلی سرداروں کو باقاعدہ وظائف ملتے تھے۔ اس طرح ان کی وفاداریوں کو یقینی بنالیا گیا۔ برطانوی حکومت نے قبائلی علاقوں میں اکادکا بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے طاقت بھی استعمال کی لیکن سرحد کے ساتھ ساتھ استحکام کے عوض عام طور پر قبائل کو اکیلا اور آزاد چھوڑ دیا گیا۔

خود مختار قبائلی ایجنسیوں سے متصل قصبوں اور دیہات میں وہ پشتون آباد تھے جو براہ راست برطانوی حکومت کی عملداری میں آتے تھے۔ یہاں بھی پشتون شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں منقسم تھے جسے برطانوی راج کے مکمل صوبے کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ پشتون اگرچہ مسلمان تھے تاہم وہ عام طور پر برطانیہ کے خلاف ہندوستانی وطن پرستی کے حامی تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ نے حصول پاکستان کے لئے مسلمانوں کی علیحدگی کی جو مہم چلائی اس میں وہ تاخیر اور نیم

دلی سے شامل ہوئے۔ پشتون راہنما عبدالغفار خان نے "خدائی خدمت گار تحریک" کا آغاز کیا جنہیں ان کی سرخ وردی کے باعث "سرخ پوشوں" کا نام دیا گیا۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی۔ سرخ پوشوں اور کانگریس کے درمیان تعلق اتنا گہرا اور قریبی تھا کہ عبدالغفار خان کو "سرحدی گاندھی" کہا جانے لگا۔ حتیٰ کہ 1946ء کے انتخابات میں جن کے نتائج نے آل انڈیا مسلم لیگ کو برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کر دیا، غفار خان کے سرخ پوش اور کانگریس پشتونوں میں مضبوط سیاسی طاقت بنے رہے اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی صوبائی حکومت ان کے کنٹرول میں رہی۔

جب پاکستان کی تخلیق ناگزیر ہو گئی تو غفار خان نے مطالبہ کر دیا کہ پشتون علاقوں کو پشتونستان کی حیثیت سے آزادی دی جائے لیکن برطانویوں نے یہ مطالبہ منظور نہ کیا۔ بعدازاں شمال مغربی سرحدی صوبے کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے سوال پر استصواب رائے کا اہتمام کیا گیا۔ غفار خان اور ان کے ساتھیوں نے مذکورہ ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا اور جن رائے دہندگان نے ووٹ دیئے انہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا انتخاب کر لیا۔

پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد جلد ہی افغانستان نے پاکستان کی اقوام متحدہ میں شمولیت کے خلاف ووٹ دیا۔ افغان موقف تھا کہ افغان سرحدوں کے بارے میں افغانستان اور برطانوی ہندوستان کے درمیان جو معاہدے ہوئے تھے، اب وہ قابل عمل نہیں رہے کیونکہ جس وقت معاہدے ہوئے، اس وقت تک پاکستان نام کے کسی ملک کا وجود نہ تھا۔ افغانستان نے مطالبہ کیا کہ پشتونستان کے نام سے پشتون ریاست قائم کی جائے۔ اس طرح افغانستان میں رہائش پذیر پشتون قبائل شمالی مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے پشتونوں سے مل جائیں گے۔ پاکستان اور ایران کے بلوچ علاقوں اور ان سے متصل افغانستان کی بلوچ پٹی پر مشتمل بلوچ ریاست کے قیام کا مبہم سا مطالبہ بھی سامنے آیا۔ اس رجوعی دعوے کے سب سے بڑے اور کھلم کھلا علمبردار سردار محمد داؤد تھے جو افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ کئی سال ظاہر شاہ کے وزیراعظم بھی رہے۔

پاکستان کے نقطہ نظر کے مطابق افغانستان کے دعوے پاکستان کے زیادہ تر علاقے کو افغانستان میں شامل کرنے کے مترادف تھے۔ لہذا واضح طور پر ناقابل قبول تھے۔ افغان مطالبے کو عالمی پشت پناہی حاصل نہ ہو سکی اور اس کے فوجی ذرائع اس قدر نہ تھے کہ وہ پاکستان پر کوئی فیصلہ ٹھونس سکتا۔ اس وقت افغانستان کی کل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ اور اس کی فوج مختصر تھی۔ لہذا وہ پاکستان کے لئے خطرہ نہ بن سکا۔ عالمی برادری کی طرف سے اس کے دعوے کو کوئی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ برطانیہ مصر تھا کہ افغانستان کے ساتھ طے پانے والے معاہدے بعد میں معرض وجود میں آنے والی ایک قانونی ریاست کے ساتھ معاہدوں میں تبدیل ہو چکے تھے لہذا قابل عمل تھے۔ وہ قانونی ریاست پاکستان تھا۔ افغانستان اپنے دعوے رسمی طور پر اقوام متحدہ کے پاس لیکر نہیں گیا۔ اپنی نوزائیدہ ریاست کے مستقبل کے بارے میں پاکستانی راہنماؤں کو عدم تحفظ کا احساس

لاحق تھا۔ افغانستان اور پشتونستان کے قیام کا افغان مطالبہ بھی اس احساس کا حصہ بن گیا۔ دفاع کے حوالے سے ان خدشات کے نتیجے میں پاکستان کی عسکری تعمیر وترقی اور بڑی طاقتوں کے ساتھ اتحاد اس کی ضرورت بن گئے۔

اگرچہ بھارت نے افغان دعوے کی کھلم کھلا حمایت نہیں کی۔ تاہم پاکستان کی ابتدائی قیادت کے خیال میں بھارت نے پاکستان کے خلاف ایک بڑا منصوبہ تشکیل دے رکھا تھا اور وہ پاکستان کی سرحدوں کے متعلق افغانوں کی تشکیک کو اس منصوبے سے الگ کرنے پر تیار نہ تھا۔ پاکستان کے حامی ایک برطانوی مصنف نے پاکستان کے خدشات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ "جس وقت پاکستان معرض وجود میں آیا اگر اس وقت پاکستان مخالف مربوط تحریکیں کشمیر اور افغانستان میں جنم لے لیتیں جو دونوں مسلمانوں کی قطعی اکثریت کے حامل تھے تو ممکن ہے پاکستان نہ بنتا اور دو اطراف سے حملہ آور تحریک اسے ایک طرح سے کچل کر رکھ دیتی"۔

جن پشتونوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، پاکستان کی ابتدائی سالوں کی قیادت نے ان کا غداروں میں شمار شروع کردیا۔ نتیجتاً آزادی کے فوراً بعد مسلم لیگ غفار خان کے سیاسی گروہ کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے سے باز رہی اور یہی چیز شمال مغربی سرحدی صوبے کی سیاست کو کئی سالوں کے لئے عدم استحکام سے دوچار کرگئی۔ پاکستان کی آزادی کے بعد جلد ہی غفار خان کے بھائی ڈاکٹر خانصاحب کو شمالی مغربی سرحدی صوبے کی وزارت اعلیٰ سے برطرف کردیا گیا اور انہوں نے پاکستان کے اندر رہتے ہوئے پشتونوں کے تشخص کی بحالی کے لئے شمالی مغربی سرحدی صوبے کا نام بدلنے کی جو تجویز پیش کی تھی وہ بھی مسترد کردی گئی۔ دونوں بھائیوں، دیگر اہل خانہ اور ان کے متعدد حامیوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ اس طرح پاکستان کے پشتونوں میں جو تنازعہ آزدی سے پہلے موجود تھا وہ طوالت اختیار کرگیا۔ کئی سال بعد مغربی پاکستان کے صوبوں کو جب ایک تشخص دیدیا گیا تو بالآخر ڈاکٹر خان صاحب کو مخلوط حکمران اتحاد کا حصہ بنالیا گیا۔ تاہم جو نقصان پہنچنا تھا اس وقت تک پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ پشتونستان کے لئے افغانستان کی حمایت نے پاکستان کے نسبتاً چھوٹے اور کمزور شمالی مغربی ہمسائے کے ساتھ اس کے تعلقات کو زہر آلود کردیا تھا۔

پاکستان نے 1950ء کی دہائی میں امریکہ کے ساتھ اتحاد کی جو کوشش کیں۔ پشتونستان کے مسئلے کے ساتھ ساتھ انہوں نے صرف پاک افغان تعلقات کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ وہ کوششیں اس سمت پر بھی اثر انداز ہوئیں جو افغانستان نے بعد میں اختیار کی۔ روس کے ساتھ سرد جنگ کے دوران امریکہ نے اول الذکر کو محدود کرنے کی جو حکمت عملی اختیار کی۔ اس میں پاکستان کو "سیکیورٹی پارٹنر" بنانے کا جھانسہ دیا گیا۔ نتیجتاً امریکی ڈپلومیسی اور بیرونی ممالک کو دی جانے والی امداد کے ضمن میں افغانستان کو بالکل ہی نظر انداز کردیا گیا۔ پاکستان نے جنوبی ایشیاء میں روسی توسیع پسندی کی راہ میں دیوار بننے اور پہلی دفاعی لائن ہونے کا تاثر دیکر امریکہ کو مجبور کردیا کہ وہ اس میں دل چسپی لے اور اسے اہم خیال کرے۔ اندرون ملک اپنی برتری برقرار رکھنے اور بھارت کا سامنا کرنے کے لئے پاکستانی فوج کو اسلحہ درکار تھا۔ فوجی افسران کو ادراک تھا

کہ کمیونزم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکہ پاکستانی افواج کو جدیدیت سے ہمکنار کرنے پر رضا مند ہو جائے گا کیونکہ بھارتی خطرے کو کمیونسٹ خطرے کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پاکستانی افسران نے سوچا کہ امریکی امداد کے حصول کے لئے جغرافیائی سیاست اور ہندوکش سے آگے مغرب کی جانب حملوں کی تاریخ کو دوہرایا جائے۔ پاکستان کے مذاکرات کار اپنے امریکی ہم منصبوں سے 1950ء کی دہائی کے اوائل سے جو کہتے آرہے تھے پاکستان کے "قومی تعمیر نو بیورو" کے ایک افسر اسلم صدیقی نے 1960ء میں اس کی تفصیلات شائع کرائیں جن میں لکھا کہ :-

"متحدہ ہندوستان کے بیرونی دفاع کا تقریباً سارے کا سارا بوجھ پاکستان کو ورثے میں مل گیا جس میں اہم ترین شمال مغربی سرحد کا دفاع تھا۔ جس پر تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان کی 80 فیصد فوج تعینات رہا کرتی تھی۔ لیکن دسمبر 1947ء میں بھارتی فوج کی نقل وحرکت پاکستان کی سلامتی کے لئے اتنا بڑا خطرہ بن گئی کہ اس نے شمال مغربی سرحد پر سے اپنی ساری فوج کو ہٹا کر پاک بھارت سرحد پر تعینات کر دیا۔ پس ثابت ہوا کہ پاکستان کو جو دفاعی بوجھ اٹھانا پڑا وہ متحدہ ہندوستان کے دفاعی بوجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ پاکستان کو شمال پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے۔ وہاں پائے جانے والے رجحانات کا مشاہدہ کرنا پڑتا تھا۔ برصغیر پاک وہند کی پہلی دفاعی لائن ہندوکش میں واقع تھی۔ ہندوکش افغانستان کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ سارے ملک میں اس کے ذیلی سلسلے اور شمالاً جنوباً اس کی شاخیں موجود تھیں۔ کئی درّے اور راستے اگر چہ دشوار گزار تھے تاہم سال میں 6 ماہ کھلے رہتے تھے۔ ان درّوں میں سے کئی یا تو خود دشوار گزار تھے اور یا پھر بنجر ملکوں میں سے گزرتے تھے۔ چند ایک نے باقاعدہ شاہراہوں کی شکل بھی اختیار کر لی تھی۔ سکندر اور تیمور نے درّہ خواک سے ہندوکش کو عبور کیا۔ چنگیز خان نے درّہ شبار کا انتخاب کیا اور بابر نے اس پہاڑی سلسلے کو عبور کرنے کے لئے درّہ کپچاک کو چنا۔ روسیوں نے وادی آکسس کو کابل سے ملانے کے لئے سلانگ کو منتخب کیا"۔

صدیقی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ "سٹالن کی موت کے بعد روس نے جبری اقتصادی نفوذ کے لئے افغانستان کو اپنے پہلے ہدف کے طور پر چنا۔ لیکن یہ اقتصادی نفوذ صحیح معنوں میں جان لیوا ثابت ہوا۔ افغان فوج پر روسیوں نے عملاً اپنا کنٹرول جما رکھا تھا۔ وہ افغان فوجیوں کو تربیت بھی دیتے تھے اور مسلح بھی کرتے تھے۔ انہوں نے افغانستان کو جیٹ لڑاکا طیاروں کے علاوہ قابل ذکر مقدار میں عسکری ساز وسامان دیا۔ مزار شریف اور کابل کو ملانے والی سڑک قریب تکمیل تھی جو سٹریٹیجک اعتبار سے حد درجہ اہمیت کی حامل تھی۔ یہ سڑکیں افغانستان کو روس کے پہلو سے نکال کر روسی مدار میں لے آئیں گی"۔

جن دنوں پاکستان خود کو جنوبی ایشیاء میں روسی توسیع پسندی کے خلاف پہلی دفاعی لائن کے طور پر پیش کر رہا تھا، ان دنوں افغانستان ایک بھدی سی ڈپلومیسی میں مصروف تھا۔ اس کی کوشش تھی اسے برطانیہ کی جگہ کوئی نیا غیر ملکی سرپرست مل جائے۔ افغانستان نے 20 ویں صدی کے پہلے نصف کے دوران جو تھوڑی بہت ترقی کی۔ ہندوستان کے برطانوی

حکمرانوں نے اسے برقرار رکھنے کے لئے افغان حکمرانوں کی مدد کی۔ جب برطانیہ جنوبی ایشیاء سے دست بردار ہوا تو افغانستان کے شاہی خاندان کو کسی ایسے ملک کی ضرورت محسوس ہوئی جو انہیں عسکری اور اقتصادی معاونت فراہم کر سکے۔

کسی غیر ملکی سہارے کی تلاش میں جو کاوشیں افغانستان نے کیں۔ انہیں پاکستان کے ساتھ تصادم کی افغان پالیسی نے جزوی نقصان پہنچایا اور جزوی طور پر واشنگٹن کی ناکافی توجہ انہیں نقصان سے دوچار کر گئی۔ امریکہ نے اپنا اتحادی بنانے کے لئے نسبتاً بڑے ملک یعنی پاکستان کا انتخاب کیا اور نادانستگی میں افغانستان کو روس کی جھولی میں جا گرنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ افغان اشرافیہ مغرب کے ساتھ اپنے تعلقات کو ترجیح دیتی تھی۔ لہذا اس کے توسط سے امریکہ 1953ء تک افغانستان کی غیر ملکی تجارت، غیر ملکی امداد اور ثقافتی روابط پر چھایا رہا۔ اس وقت مبادلات زر کی مقدار 10 لاکھ ڈالرز سالانہ سے بھی کم تھی۔ اپنے ملک کو جدت سے ہمکنار کرنے کی خواہش کے حامل والے افغانوں نے چاہا کہ انہیں اپنے ملک کی ترقی کے لئے زیادہ امداد میسر آئے اور وہ اس امریکی موقف پر پریشان تھے کہ افغانستان ابھی صنعتی ترقی کے قابل نہیں ہوا۔ امریکی امداد آبپاشی کے ایک منصوبے تک محدود رہی جو کبھی پایہء تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اس کے علاوہ امریکہ نے چند زرعی اور تعلیمی منصوبوں کے لئے امداد مہیا کی۔

50-1949 میں پاکستان کے ساتھ سرحدی تصادموں اور پاکستان کی طرف سے افغانستان کو تیل کی رسد پر پابندی کے نتیجے میں چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا افغانستان شدید مشکلات کا شکار ہو گیا کیونکہ افغانستان عملاً استعمال کی ہر چیز پاکستان کی بندرگاہ کراچی کے راستے درآمد کرتا تھا۔ 1950ء میں روس نے افغانستان کو "مال کے بدلے مال" کی بنیاد پر ایک معاہدے کی پیش کی جو آخر الذکر نے (فوراً) قبول کر لی۔ جس کے مطابق افغانستان کی اون اور کپاس کے بدلے روس کو تیل مہیا کرنا تھا۔ اس طرح شاہی دربار میں موجود روس نوازوں کو روس کی وکالت کرنے اور یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ وہ افغانستان کو جدیدیت سے ہمکنار کرنے کے لئے مالی امداد دینے کو تیار ہے۔ جبکہ امریکہ اس مقصد کے لئے افغانستان کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ امریکہ نے افغانستان کے لئے "امدادی پیکج" پر عملدرآمد کا آغاز 1956ء میں اس وقت کیا جب روس کی طرف سے امداد کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا۔ 1968ء تک افغانستان روس سے 55 کروڑ ڈالرز کی امداد وصول کر چکا تھا جبکہ اس دوران امریکہ سے اسے صرف 25 کروڑ ڈالر بطور امداد ملے۔

جس افغان راہنما نے روسی امداد قبول کی وہ پشتونستان کے سب سے بڑے وکیل سردار محمد داؤد کے سوا کوئی نہیں تھا۔ سردار داؤد 1953ء میں افغانستان کے وزیر اعظم بنے۔ اس طرح پاکستان کے لئے آسان ہو گیا کہ وہ پشتونستان کے مطالبے کو افغانستان میں روسی اثر و نفوذ کی کوششوں کے ساتھ منسلک کر سکے۔ پاکستان اس وقت تک خود کو خطے میں ایک فیصلہ کن امریکی اتحادی ثابت کر چکا تھا اور افغانستان کے بارے میں اس کے خیالات نے ان کاوشوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا جو امریکہ افغانستان کی ترقی کے ضمن میں کر رہا تھا۔ کیونکہ پاکستان کی فوجی اشرافیہ افغانستان کو پاکستان کا ایک اہم

حلقہ رسوخ خیال کرتی تھی، پاکستانی فوج نے افغانستان میں روسی رسوخ کو ختم کرنے کے لئے وہاں کی شاہی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی بجائے اس ملک میں روسی تجاوزات کو نمایاں کرنا شروع کر دیا تا کہ سوویت روس کو محدود کرنے کی امریکی حکمت عملی میں بطور اتحادی پاکستان کی اہمیت اور افادیت کو ثابت کیا جا سکے۔

ابتداء میں پاکستان نے افغانستان پر جو توجہ مرکوز کی اس کی صرف یہی وجہ نہیں تھی کہ امریکی امداد حاصل کی جا سکے۔ آزادی کے بعد جلد ہی پاکستانی فوج کو فکر لاحق ہو گئی تھی کہ ان کا زمینی دفاع خاطر خواہ حد تک مضبوط نہیں تھا۔ پاکستان کی ابتدائی فوجی قیادت چونکہ ہندوستانی فوج کا حصہ تھی، لہذا اسے برطانویوں نے ان خطوط پر تربیت دی تھی جو "برٹش راج" کی ترجیحات اور حکمت عملی سے مطابقت رکھتے تھے۔ برطانوی سلطنت کی نوعیت بین الاقوامی تھی۔ لہذا برطانیہ اپنی سلطنت کے ایک حصے کے دفاع کے لئے دوسرے حصے اور اس کے وسائل پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ مزید براں برطانیہ نے ہندوستان کے دفاع کی جو حکمت عملی تشکیل دے رکھی تھی، اس کے مطابق مغرب میں افغانستان کے ساتھ ملحقہ سرحد سے لیکر مشرق میں برما تک ایک ہی یونٹ تھا۔ پاکستانی جرنیلوں کو برطانوی سلطنت کے دفاع کی جو تربیت دی گئی تھی۔ اس سے انہوں نے نسبتاً بہت چھوٹے ملک کی دفاعی حکمت عملی تشکیل کرتے وقت استفادہ کیا۔ وہ چھوٹا سا ملک جو 1971ء تک دو صوبوں یا دو بازوؤں پر مشتمل تھا اور اسے اس ملک یعنی بھارت سے خطرات لاحق تھے جو قبل از تقسیم برطانوی ہندوستان کا دل ہوا کرتا تھا۔ پاکستانی جرنیلوں کی یہ سوچ حد درجہ ناقص ثابت ہوئی کہ بھارت کے خلاف مشرقی پاکستان کا دفاع ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر بنیاد کے حامل مغربی پاکستان میں مضمر تھا۔ یہ سوچ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران آزمائش پر پوری نہ اتر سکی۔ پاکستانی جرنیلوں کی دوسری سٹریٹیجک سوچ کہ پاکستان اور افغانستان کے دفاع کو ایک کر دیا جائے، افغانستان میں پاکستان کے پیچیدہ کردار پر منتج ہوئی۔ اس کردار کا آغاز 1979ء میں افغانستان پر سوویت حملے سے بہت قبل ہو چکا تھا۔ جو طالبان کے عروج و زوال تک جاری رہا۔

کئی سالوں سے بھارت کے ساتھ کھلے تصادم تلے افغانستان کے بارے میں پاکستانی ارادے دب کر رہ گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کے دوران کلیدی کردار ادا کرنے کے بعد پاکستان نے افغانستان میں بہتر سٹریٹیجک پوزیشن کے حصول کی کاوشیں شروع کر دی تھیں۔ افغانستان کے بارے میں پاکستان کی افسر شاہانہ فوجی قیادت کے ابتدائی نظریات کو صدیقی بالاختصار اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:-

"افغانستان پاکستان کے لئے بہت زیادہ اور خصوصی اہمیت کا حامل ملک ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ ملک ہندوکش کی اس طرف سے آنے والی طاقتوں کی گزرگاہ بنا رہا ہے، جن کی منزل برصغیر پاک و ہند تھا اس کا دفاع اس رسوخ پر منحصر تھا جو اس کے حکمران کوہ ہندوکش کے اردگرد علاقوں میں رکھتے تھے۔ ہندوکش کے اس پار سے جو خطرات لاحق تھے۔ فریزر ٹائیلر ان سے اس قدر متاثر تھا کہ اس کی رائے کے مطابق افغانستان اور پاکستان کا کوئی مشترکہ ایکشن ہی ان خطرات کی راہ میں

حائل ہوسکتا تھا۔اس کے خیال میں اس مسئلے کا واحد حل کسی نہ کسی صورت ان دونوں ریاستوں یعنی پاکستان اور افغانستان کو ایک کر دینے میں مضمر تھا۔کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ریاستوں یعنی پاکستان اور افغانستان کے ذہنی اور سیاسی اختلافات کے باعث ان کا ایک ہونا ممکن نہیں۔ممکن ہے ایسا ہی ہو۔لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ اگر دونوں ملک پر امن طور پر ایک نہ ہو سکے تو انہیں طاقت کے بل بوتے پر ایک کرنا پڑے گا اور بزور ایک ہونے کا مطلب الجھاؤ ہے اور وہ الجھاؤ بالآخر دونوں ملکوں کی تباہی پر منتج ہوگا۔دراصل یہ امکانات اسلامی تہذیب کے اندر موجود نسل پرستانہ اختلافات اور نظریے کے درمیان کش مکش کے ساتھ منسلک ہیں۔اگر اسلام کو دوبارہ ایک طاقت بنانا مقصود ہے تو اسلامی نظریے کو نسل پرستی کے خلاف فتح حاصل کرنا ہوگی"۔

پاکستان کی دفاعی اسٹیبلشمنٹ کی سوچ کی بازگشت کے طور پر صدیقی ہندوستان پر ہونے والے مختلف حملوں کا حوالے دیتے ہوئے کہتے ہیں" کیونکہ زیادہ تر حملہ آور افغانستان کے راستے آئے۔مزید براں جن علاقوں پر مغربی پاکستان مشتمل ہے وہ تاریخی اعتبار سے افغانستان کے ساتھ وابستہ تھے۔لہذا پاکستان کے دفاع کو یقینی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں ہمعصر ریاستوں کو ایک کر دیا جائے۔اس دلیل کے تحت سوویت یونین کے اثر ونفوذ کی روک تھام کے لئے افغانستان کو پاکستان کے ساتھ ملنا ہوگا اور چونکہ پاکستان افغانستان کی نسبت بڑا ملک ہے لہذا اس الحاق میں اس کا کردار بھی زیادہ ہوگا"۔تاریخ کا ایک بار پھر حوالہ دیتے ہوئے صدیقی کہتے ہیں کہ پاکستان کا مغرب کی سمت جھکاؤ اس کے دفاع کو مضبوط بنا دے گا۔مزید براں افغانستان اور ایران بھارت کے خلاف پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔

لیکن نسلی اور گروہی وطن پرستی کے حامی افغانوں پر پاکستان کی اس سٹریٹیجک سوچ کا کوئی اثر نہ ہوا۔جو افغان اسلامی نظریے کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اسلام کی شان وشوکت کی تجدید کے عمل میں پاکستان کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ صرف وہی اپنے ملک کو پاکستان کے اتحادی ملک میں تبدیل کر سکتے تھے۔1960ء کی دہائی کے اوائل میں پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیاں پاکستان کے اسلام پسند سیاسی گروہوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ کہ وہ افغانستان میں نظریاتی اتحادی تلاشنے کی ترقی پسندانہ پالیسی پر عمل کریں۔

1971ء تک پاکستان بھارت کے ساتھ برسر پیکار رہا۔اس دوران افغانستان کی اہمیت ثانوی ہو چکی تھی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہو چکا تھا۔اس تبدیلی نے پاکستان کے سٹریٹیجک منصوبہ سازوں کو مشرقی پاکستان کے دفاع کی سوچ سے آزاد کر دیا۔1947ء کے بعد پشتونستان کے بارے میں افغان پروپیگنڈہ پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان وقتاً فوقتاً تصادم ہوتے رہے۔شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں وقفے وقفے سے ابھرنے والی بغاوتوں سے افغانستان کو مواقع ملے کہ وہ پاکستان کے لئے دشواریاں پیدا کرتا رہے اور بجائے اس کے کہ پاکستان بغاوتوں کا باعث بننے والے مقامی محرکات سے نمٹتا۔وہ افغانستان اور بھارت کو ان بغاوتوں کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا۔پاکستان کے قبائلی علاقہ

جات میں پاکستانی افسران اس بات پر زور دیتے رہے کہ اگر چہ غیر ملکی ہاتھ بغاوتوں کو ابھارنے میں مصروف ہیں۔ تاہم متحد کرنے والی اصل طاقت اسلام ہے۔ حکومت نے بلوچوں اور پشتونوں کے قبائلی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے علماء اور مشائخ کو تعینات کیا۔ پاکستان کی طرف سے اپنے استیصال کے ردعمل کے طور پر بلوچ اور پشتون وطن پرست بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دانشوروں اور سیاسی طور پر سرگرم لوگوں کے اتحادی بن گئے۔ اس طرح پاکستان کا یہ دعویٰ کہ ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں کے رسوخ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک ایسی پیش گوئی بن گیا جسے اس نے خود ہی سچ ثابت کر دکھایا۔ اس دوران افغانستان کے ان شہری سیاسی حلقوں میں بھی روسی رسوخ میں اضافہ ہو گیا جو افغانستان کے شاہی حکمرانوں سے خوش نہیں تھے۔

1973ء میں سردار محمد داؤد نے افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کا تختہ الٹ دیا۔ اول الذکر ظاہر شاہ کے چچازاد بھائی تھے اور انہیں ایسے فوجی افسران کی پشت پناہی حاصل تھی جو روس کے تربیت یافتہ تھے۔ داؤد نے بادشاہت کو ختم کرتے ہوئے افغانستان کو جمہوریہ قرار دیدیا جس کے وہ خود صدر بن گئے۔ ماسکو کی ہدایات کے تحت "افغان کمیونسٹ پارٹی" کے بڑے دھڑے "پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان" نے سرادداؤد کی حمایت کی اور اس کے بعض ارکان افغانستان کی کابینہ میں بھی شامل ہو گئے۔ عوام میں پی ڈی پی اے کی جڑیں عنقا تھیں۔ ایک مبصر نے لکھا کہ پی ڈی پی اے کے ارکان کی تعداد زیادہ سے زیادہ 5 یا 6 ہزار تھی۔ تاہم یہ جماعت افغان اشرافیہ کے ایک منظم گروپ کی نمائندگی کرتی تھی اور سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ اس کے تعلقات خاصے گہرے تھے۔ داؤد کا فوجی انقلاب اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ تعلیم یافتہ شہری اشرافیہ اصلاحات کے نفاذ اور جدیدیت کے حصول کے عمل کی رفتار سے مطمئن نہیں تھی۔

"داؤد نے 1973ء میں اقتدار پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ 1953ء سے 1973ء تک روس افغانستان کو ایک ارب پچاس کروڑ ڈالرز کی امداد دے چکا تھا۔ یہ امداد امریکی امداد کے 3 گناہ سے بھی زائد تھی۔ جس کا حجم صرف 45 کروڑ ڈالرز تھا اور تقریباً 3 سے لے کر 4 ہزار تک روسی ماہرین افغانستان میں مختلف سطوح پر کام کر رہے تھے"۔

داؤد حکومت کی خواہش تھی کہ افغانستان کی ترقی کی رفتار میں اضافہ کیا جائے اور ابتداء میں وہ روسی امداد کے حصول کے لئے بے چین بھی تھی۔ داؤد حکومت نے اپنے ابتدائی دو سالوں کے دوران 70 نئے منصوبوں پر دستخط کئے جو روسی امداد کے رہین منت تھے۔ افغانستان کی ترقی کی رفتار میں اضافہ داؤد کے ایجنڈے کا صرف ایک حصہ تھا۔ 1973ء کے فوجی انقلاب کی جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ ظاہر شاہ افغانستان کی سرحد سے متصل پاکستانی صوبوں میں رونما ہونے والے واقعات کا شدید ردعمل ظاہر کرنے میں ناکام رہے تھے۔ داؤد اور ان کی پشت پناہی کرنے والے پشتون قوم پرستوں اور کمیونسٹوں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے پشتون اور بلوچ گروہوں کے ایماء پر ان کے معاملات میں افغان حکومت کی فعال مداخلت پاکستان کو "ڈیورنڈ لائن" پر مذاکرات کا دوبارہ آغاز کرنے پر مجبور کر دے گی۔

اس وقت پاکستانی فوج 1971ء میں بنگلہ دیش میں شکست کھانے کے بعد اقتدار سے دست بردار ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کی سویلین حکومت کی حمایت کر رہی تھی۔ 1971ء کے جن انتخابات نے بھٹو کو مغربی پاکستان پر حکومت کرنے کا منڈیٹ دیا۔ وہی انتخابات بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں نسل پرست نیشنل عوامی پارٹی کو دوسری بڑی جماعت بنا گئے۔ نیپ کے راہ نما خان عبدالولی خان پشتون وطن پرست عبدالغفار خان کے بیٹے تھے لہذا ان پر یہ الزام عائد کرنا حد درجہ سہل تھا کہ وہ پشتونستان کا حصول چاہتے ہیں۔

بھٹو نے اپنے مطلق العنانہ رجحانات پر قابو پالیا اور ابتداء میں بلوچ اور پشتون راہنماؤں کو اقتدار میں شریک کر لیا۔ لیکن اس شراکت اقتدار کے آغاز کو چند ماہ ہوئے تھے کہ آئی ایس آئی نے بھٹو کو نیپ کے منصوبوں سے آگاہ کر دیا۔ انہیں بتایا گیا کہ نیپ بلوچستان میں مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کا ارادہ رکھتی ہے۔ آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان نے بھٹو کو خفیہ معلومات فراہم کیں کہ اسلام آباد کے عراقی سفارت خانے میں اسلحے کی ایک کھیپ پہنچی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اسلحہ بلوچستان میں متوقع بغاوت کے دوران استعمال کے لئے منگوایا گیا تھا۔ جیلانی خان کی اشیر باد پر بھٹو نے فیصلہ کیا کہ سفارتی آداب اور تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عراقی سفارت خانے سے ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے اسلحہ برآمد کیا جائے۔ بغاوت کی منصوبہ بندی کا الزام عائد کرتے ہوئے بھٹو نے بلوچستان کی حکومت برخاست کر دی۔ اس اقدام کے خلاف احتجاج کے طور پر سرحد حکومت بھی مستعفی ہو گئی۔ جلد ہی بلوچستان کو باغی صوبہ قرار دیدیا گیا اور وہاں بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوج بھیج دی گئی۔ نیپ پر پابندی عائد کر دی گئی اور ولی خان اور ان کے ساتھیوں کو جیل بھیج دیا گیا۔

بلوچ اور پشتون وطن پرستوں نے افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج کی اس کاروائی کی توجیہہ یہ کی کہ بھٹو اور فوج دونوں ارتکاز اقتدار کی خواہش رکھتے ہیں۔ پاکستان نے عراقی سفارت خانے سے اسلحے کی بازیابی کو فوجی کاروائی کے جواز کے طور پر پیش کیا۔ تاہم امریکی سفارتکاروں اور پاکستان کے انٹیلی جنس حکام کو ابتداء سے ہی علم تھا کہ عراقی سفارت خانے میں چھپایا گیا اسلحہ ایرانی بلوچستان کے باغیوں کو دینے کے لئے منگوایا گیا تھا اور یہ اس حمایت اور امداد کا ردعمل تھا جو ایران عراق کرد باغیوں کو فراہم کر رہا تھا۔ کیونکہ حزب اختلاف میں شامل سیاسی جماعتیں شروع سے ہی بھٹو کے ارادوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ لہذا انہوں نے سمجھا کہ آخرالذکر عراقی سفارت خانے سے اسلحے کی بازیابی کی آڑ میں اپوزیشن کی سربراہی میں تشکیل شدہ ایک صوبائی حکومت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بھٹو کے ایک قریبی ساتھی رفیع رضا نے تسلیم کیا کہ اگر عراقی سفارت خانے سے اسلحہ نہ بھی برآمد ہوتا تو بھٹو بلوچستان میں نیپ کی حکومت کو معزول کر دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مسلح بغاوت کا الزام عائد کرنے کے بعد قبائلی بلوچ قیادت کے خلاف فوجی کاروائی نے ایک وسیع تر قبائلی بغاوت کو ہوا دی۔ پاکستانی فوج نے بغاوت کو کچلنے کے لئے افغان سرحد کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر کاروائی کی۔ اس لڑائی کے دوران 3300 پاکستانی فوجی اور 5300 بلوچ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بلوچستان میں پاکستانی فوج کی کاروائی 4 سال جاری رہی۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ممکن ہے مذکورہ کاروائی پاکستان کے اس سٹریٹیجک منصوبے کا حصہ ہو جس کے تحت وہ افغانستان میں اپنا رسوخ بڑھانے کے لئے کسی طے شدہ کوشش سے قبل بلوچ اور پشتون صوبوں پر قابو پانا چاہتا تھا۔ جب بھٹو کے فوجی جانشین جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں اقتدار حاصل کیا تو ان بلوچ اور پشتون راہنماؤں کو رہا کر دیا گیا جن پر پاکستان نے بغاوت کا الزام عائد کیا تھا اور بلوچستان میں فوجی کاروائی ختم کر دی گئی۔ "باغیوں" کو معاف کر دیا گیا اور ان میں سے بعض کو تلافی کی پیش کش بھی کی گئی۔ اگر وہ بغاوت واقعتاً پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرہ ہوتی تو اس کے خلاف فوجی کاروائی فوراً ختم نہ کی جاتی۔

بلوچوں نے پاکستانی فوج کے خلاف چھوٹے پیمانے پر جو جنگ لڑی اس کے دوران افغانستان میں سردار داؤد کی عوامی حکومت نے پروپیگنڈے اور چھوٹے ہتھیاروں کی فراہمی کی صورت میں بلوچوں کی مدد کی۔ بلوچستان میں فوجی کریک ڈاؤن کے دوران فرار ہو جانے والے بلوچ اور پشتون راہنماؤں کو کابل میں ریاستی مہمانوں کا درجہ دیا گیا اور افغانستان کے اندر اپنی کاروائیوں میں اضافے کے لئے پاکستان کو جو جواز درکار تھا وہ حاصل ہو گیا۔ ادھر داؤد حکومت نے افغانستان کے لئے روسی امداد میں اضافے کی کامیاب کوششیں کیں اور اپنی حکومت میں بعض کمیونسٹوں کو شامل کر لیا۔ سردار داؤد کا یہ اقدام امریکہ کے لئے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوا۔ جلد ہی امریکی سی آئی اے، پاکستانی آئی ایس آئی اور شاہ ایران کی ساوک نے کابل میں مشترکہ کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ جس کے نتیجے میں افغانستان سرد جنگ کی دشمنیوں اور سازشوں کا گڑھ بن گیا۔ اس پر سلیج ہیریسن نے لکھا "جوں جوں دھڑے بندی، بدعنوانی اور سیاسی بے یقینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ غیر ملکی پشت پناہی کی حامل طاقتوں نے اقتدار کی اس کشمکش کی تیاری کے لئے پوزیشنیں سنبھالنا شروع کر دیں جو بڑے داؤد کی موت کے بعد متوقع تھی۔

خفیہ سازشوں کے اس کھیل میں پاکستان کو اپنے اور اتحادیوں کے رسوخ میں اضافے کے لئے توسط کے طور پر افغانستان کے اسلام پسند دستیاب تھے۔ افغانستان میں مذہبی جذبات کو ہمیشہ غالب حیثیت حاصل رہی اور 19ویں صدی کے بیشتر حصے میں اس محرک نے برطانوی اثر و نفوذ کے خلاف فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ شاہ امان اللہ (1919ء سے 1929ء تک) نے افغانستان کو مغربی اقدار کے مطابق ڈھالنے کی جو کوششیں کیں۔ قدامت پسند مذہبی راہنماؤں نے انہیں ناکام بنا دیا اور بعد میں شاہ محمد نادر خان کی حکمرانی کے دور میں جب پشتونوں کی بادشاہت بحال ہوگئی تو پشتون قبائل نے اس کے لئے علماء کی حمایت کا اہتمام بھی کر دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مذہبی اسٹیبلشمنٹ کے رسوخ میں قابل ذکر اضافہ کیا گیا۔

افغانستان کے 1931ء کے آئین کے نتیجے میں ایک "دوہرا قانونی نظام" معرض وجود میں آگیا۔ شرعی عدالتوں کے ساتھ ساتھ اسلامی عدالتیں بھی قائم کر دی گئیں۔ ظاہر شاہ نے 1950ء میں کابل یونیورسٹی میں مذہبی علوم کا ایک شعبہ قائم کر دیا اور اپنے مشیروں میں علمائے دین کو بھی شامل کر لیا۔ 1964ء میں افغانستان کا جو آئین منظور ہوا اس میں سیکولر قوانین کو فوقیت دی گئی۔ تاہم اسلام کے مقدس مقام کو بھی تسلیم کیا گیا اور طے پایا کہ جہاں سیکولر قانون کا اطلاق نہ ہو سکا۔

وہاں شرعی قانون کو بروئے کار لایا جائے گا۔ سیاسی گروہوں نے 1960ء کی دہائی میں ایک منتخب پارلیمنٹ بھی قائم کر لی۔ ان گروہوں میں کمیونسٹ پی ڈی پی اے بھی شامل تھی۔ اسلام پسند گروہوں نے اکٹھے ہو کر ایک سیاسی تحریک کا آغاز کر دیا جس کا مقصد افغانستان کو شرعی قوانین کی بنیاد پر ایک اسلامی ریاست بنانا تھا۔

پاکستان کی جماعت اسلامی نے افغانستان کے بعض اسلام پسند راہنماؤں کے لئے بیک وقت "ماڈل" کا کام بھی دیا اور ان کی معتبر مشیر بھی بن گئی۔ 1960ء کی دہائی میں جماعت اسلامی نے دنیا کے بیشتر حصوں کے اسلام پسند گروہوں کے ساتھ روابط قائم کر لئے۔ جماعت اسلامی کے بانی مولنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے کئی زبانوں میں ترجمے کیئے گئے اور ان کے پیش کردہ دلائل متعدد ممالک میں پھیلے ہوئے اسلام پسندوں کے مربوط سلسلوں کو متحرک کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔ پاکستان کے قریب ترین ہمسائے کی حیثیت سے مولانا مودودی کی تحریروں کے فارسی اور پشتو ترجمے سب سے پہلے افغانستان پہنچائے گئے۔ جماعت اسلامی کو سعودی عرب سے بھی مالی اعانت موصول ہوئی اور سعودی سرپرستی میں چلنے والے "رابطہ العالم الاسلامی" نے بھی اسے مالی مدد دی تاکہ مختلف زبانوں میں ترجمہ شدہ یہ مواد پوری دنیا بالخصوص ان علاقوں میں پہنچایا جاسکے جہاں کمیونسٹوں کا اثر ورسوخ نسبتاً زیادہ تھا۔ وسطی ایشیاء کے جن علاقوں میں مسلمان آباد تھے وہ بھی جماعت اسلامی کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ جماعت نے اس خطے میں آباد مسلمانوں سے رابطے شروع کر دیئے۔ انہیں کمیونزم اور کمیونسٹوں کے مظالم کی کہانیاں سنانا ایک مشن یا پروجیکٹ کے طور پر اپنا لیا۔

لاہور میں جماعت اسلامی کے صدر دفتر کے ساتھ ایک "دارلفکر" بھی قائم کر دیا گیا۔ جہاں سے ان مظالم کی تفصیلات شائع کی گئیں جو 1960ء کی دہائی کے اواخر میں کمیونسٹوں نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے۔ جماعت اسلامی سے وابستہ رسائل و جرائد اور اخبارات نے ان نظریات کو بڑھا چڑھا کر دنیا بھر میں پھیلایا۔ "ریڈرز ڈائجسٹ" کی طرز پر چھپنے والے ایک ماہانہ رسالے "اردو ڈائجسٹ" نے دنیا بھر کے مسلمانوں پر زور دیئے رکھا کہ جہاں جہاں ان کے ہم مذہب کمیونسٹوں کی زیادتیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ انہیں آخر الذکر کے پنجہ استبداد سے رہائی دلانا اور ان علاقوں کو آزاد کرانا مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔ ابتداء میں مشرقی ترکستان اور چین کے صوبہ ژن ژیانگ کے مسلمانوں کے بارے میں بھی کہا گیا کہ انہیں بھی آزاد کرایا جائے۔ لیکن چین اور پاکستان کے درمیان قریبی اور دوستانہ تعلقات نے ان کی آزادی کو کم اہم بنا دیا۔ جماعت اسلامی نے وسطی ایشیاء کے لئے جو وسیع تر منصوبہ تشکیل دیا اس میں افغانستان کو مرکزی اور فیصلہ کن رابطے کی حیثیت حاصل تھی۔

1972ء میں ان غیر رسمی اسلام پسند گروہوں میں سے "جمعیت اسلامی افغانستان" ابھر کر سامنے آئی جو 1960ء کی دہائی سے موجود چلے آ رہے تھے۔ صرف نام کی حد تک ہی مماثلت نہیں تھی۔ کابل یونیورسٹی سے وابستہ مذہبی علوم کے پروفیسر برہان الدین ربانی کی سربراہی میں تشکیل دی جانے والی اس جماعت اور پاکستان کی جماعت اسلامی کے درمیان اس کے علاوہ بھی کئی اقدار مشترک تھی۔ مولانا مودودی اور مصر کی اخوان المسلمین سے انسپائر ہو کر اس جماعت نے چاہا کہ

معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر نو اسلامی اصولوں کی ایک مخصوص توجیہہ کے مطابق کی جائے۔ ربانی ایک نسل پرست تاجک تھے۔ ان کے پاکستانی حامیوں نے انہیں صرف افغانستان کی حد تک ہی اپنا رسوخ بڑھانے کے لئے مناسب نہیں جانا۔ بلکہ سوویت یونین کے اندر تاجکوں میں اسلامی انقلاب کے شعلے بھڑکانے کے لئے بھی انہی کو توسط بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ربانی کے ابتدائی مقلدین کابل یونیورسٹی کے دو طلباء احمد شاہ مسعود اور گلبدین حکمت یار تھے۔ بعد ازاں افغانستان میں جو واقعات رونما ہوئے، ان دونوں نے ان میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔

اسلامی ریاست کے بارے میں جمعیت اسلامی کی قدامت پسندانہ سوچ افغان اشرافیہ کے ایک مخصوص حصے کے لئے ناقابل قبول ٹھہری۔ مذکورہ اشرافیہ کے ارکان بعض معاملات، بالخصوص قومی زندگی میں خواتین کی شرکت جیسے معاملات میں اسلامی روایات سے صرف نظر کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد جلد ہی کابل یونیورسٹی کے کیمپس میں اسلام پسندوں اور کمیونسٹوں کے درمیان تصادم ہوا۔ 1973ء میں داؤد کے انقلاب کے بعد جمعیت اسلامی نے جمہوریہ افغانستان میں کمیونسٹوں کے اثر و رسوخ کو چیلنج کر دیا اور داؤد کے سیکولر رجحانات کی راہ میں مزاحمت کی۔ داؤد نے ربانی کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے اور آخر الذکر اپنے کلیدی حامیوں کے ہمراہ فرار ہو کر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان کے اندر ابتداء میں ربانی گروپ کی میزبانی جماعت اسلامی نے کی۔

اگرچہ ربانی اور جمعیت اسلامی افغانستان کے ارکان اور پاکستان کے اسلام پسندوں اور ریاست کے درمیان ابتدائی گٹھ جوڑ کے ٹھوس شواہد دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم افغانستان اور وسطی ایشیاء کے لئے جماعت اسلامی اور پاکستان کی سیکیورٹی سروسز کے مقاصد ایک تھے۔ جس طرح جماعت اسلامی سوویت وسطی ایشیاء میں اسلام کے حوالے سے بیداری اور شعور و آگہی پیدا کرنے کی خواہاں تھی۔ اسی طرح پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز نے بھی اس امر کا ادراک کر لیا تھا کہ کمیونزم کے ساتھ مبارزت کے دوران اگر مذہبی جوش و خروش بھی شامل ہو جائے تو پاکستان اس میدان میں بڑا اور اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ آئی ایس آئی اور آئی بی افغانستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اگرچہ ان دنوں افغان اسلام پسندوں اور آئی ایس آئی کی سرگرمیاں ایک نہیں تھیں۔ تاہم جماعت اسلامی کے افغان روابط اور سرپرست آئی ایس آئی کے متوقع خفیہ معاون تھے۔

1973ء میں پشاور پہنچنے کے فوراً بعد ربانی کو آئی ایس آئی نے مالی مدد پیش کر دی اور ان کے کچھ ساتھیوں نے فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ اس الزام سے انکاری ہونے کے لئے کہ افغانستان کو غیر مستحکم کرنے میں پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کوئی کردار ادا کر رہی ہیں۔ ابتداء میں یہ ذمہ داری نیم فوجی فارمیشن "فرنٹیر سکاؤٹس کو سونپی گئی۔ افغانستان پر روسی حملے سے قبل اسلام پسندوں کی بغاوت کے دوران پاکستان نے جو کردار ادا کیا، پاکستان کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ افسران ماضی قریب تک اس کی تقلیل کرتے رہے۔ 1979ء میں افغانستان پر روسی حملے کے بعد اسلام پسندوں نے پاکستان کی سرپرستی میں جو بغاوت

کی، اس نے امریکی اشیر باد پر روسی قبضے کے خلاف جہاد کی شکل اختیار کر لی۔ افغان مجاہدین کے حق میں بڑی بڑی خفیہ کاروائیوں نے بطور امریکی اتحادی پاکستان کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا۔ سوویت یونین کی افغانستان سے دست برداری کے بعد جب امریکہ افغانستان سے لاتعلق ہو گیا اور ایٹمی پروگرام کے ردعمل کے طور پر پاکستان کی امداد بھی بند کر دی تو پاکستان نے دعویٰ کیا کہ امریکہ نے اس کی سرزمین پر بیٹھ کر اپنی حریف سپر پاور کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑی اور اسے استعمال کرنے کے بعد اس سے دھوکہ کیا۔ بعض امریکی دانشوروں نے کبھی کبھار پاکستان کے سرکاری موقف کی حمایت بھی کی اور لکھا کہ:۔

"افغانستان میں روس کی تاریخی شکست میں پاکستان نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس نے تقریباً 35 لاکھ افغان پناہ گزینوں کی میزبانی کی۔ امریکی اسلحے کی ہر کھیپ اسی کے توسط سے افغان مجاہدین تک پہنچی۔ اس طرح اس نے اپنے استحکام اور سلامتی کو داؤ پر لگا دیا۔ اس پر ابھی تک جنگ کے اثرات باقی ہیں۔ ایک ایسی قوم کے طور پر جس کے مذہبی نظریات اسے ذاتی یا سیاسی دوستوں کی وفاداری اور مستقل مزاجی پر اعتماد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پاکستان کے لئے کشمیر کے حوالے سے امریکہ کی بے نیازی اور جنوبی ایشیاء میں جوہری پھیلاؤ پر دوہرے امریکی معیار نا قابل فہم ہیں"۔

افغانستان پر روسی قبضے کے خلاف مسلح جدوجہد کے دوران افغان مجاہدین تک امریکی اسلحہ پہنچانے میں پاکستان نے جو کردار ادا کیا وہ اس قابل تھا کہ افغانستان میں اس کے اصل ارادوں سے صرف نظر کیا جاتا۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار تھی کہ اس نے 1979ء میں افغانستان پر روسی قبضے کی راہ میں جو مزاحمت کی اس کا مقصد صرف امریکہ کو اپنا احسان مند نانا ہی نہیں تھا بلکہ اسے جو اسلحہ اور سرمایہ امریکہ کی طرف سے موصول ہوا، یا جو حمایت اور امداد یورپی اور عرب ممالک نے پیش کی اس کی مدد سے وہ اس قابل ہو گیا کہ افغانستان کے اندر جس کاروائی کا آغاز اس نے 1973ء میں کیا تھا اس میں وسعت پیدا کر سکے۔

پشاور پہنچنے اور پاکستان کی طرف سے ملنے والی حمایت یا مدد پر دستخط کرنے کے بعد افغانستان کے اسلام پسندوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ 1976ء میں گلبدین حکمت یار نے "جمعیت اسلامی" سے الگ ہو کر اپنی "حزب اسلامی" تشکیل دے لی۔ حزب اسلامی نے بھی اپنی کاروائیاں پاکستان میں بیٹھ کر کیں۔ ربانی محتاط انداز میں مرحلہ وار آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اقتدار کے حصول یا حصول کی کوشش سے قبل وہ اس حمایت کو وسیع البنیاد بنالیں جو انہیں دستیاب تھی۔ مولانا مودودی کی طرح وہ بھی اسلامی انقلاب کی کاوشوں کے آغاز پر مسلح جدوجہد شروع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے یا ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جسے دہشت گردی کا نام دیا جا سکتا۔ اگرچہ مولانا مودودی کے مقلدین گذشتہ کئی عشروں سے مسلح جدوجہد میں مصروف تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی کسی تحریر میں تشدد کی وکالت یا تبلیغ نہیں کی تھی۔ ربانی بھی ابتدائی مراحل میں جمعیت اسلامی کو جنگ جو گروہ یا گوریلا فوج میں تبدیل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم جب روس نے افغانستان پر قبضہ کر لیا تو ان کی جماعت نے مجاہدین کے ہراول دستے کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف حکمت یار ابتداء سے ہی انقلابی طریقے اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے جنگجویانہ مزاج نے جلد ہی انہیں آئی ایس آئی کا منظور نظر بنا دیا۔ جو اس وقت افغانستان میں کسی پائیدار اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھنے کی بجائے داؤد حکومت پر عسکری دباؤ ڈالنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھی۔ آئی ایس آئی مستقبل کے ان افغان راہنماؤں پر بھی قریبی نظر رکھے ہوئے تھی جن کا زیادہ جھکاؤ پاکستان کی سمت تھا۔ ایک نسل پرست پشتون ہونے کے ناطے حکمت یار اس کردار کے لئے بہت موزوں تھے۔

1973ء اور 1977ء کے درمیان پاکستان اور افغانستان کے مابین ایسی جنگیں لڑی جاتی رہیں جنہیں چھوٹے پیمانے کی "پراکسی جنگوں" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سردار داؤد نے پاکستان میں بلوچ باغیوں کی مدد کی جبکہ پاکستان ان اسلام پسند افغان باغیوں کی حمایت کرتا رہا جنہوں نے پشاور کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ اس دور کے پاکستانی حکام کے بیانات اس امر کی نشاندہی کرتے تھے کہ افغان اسلام پسندوں کی سرپرستی کا آغاز بھٹو نے سردار داؤد کی اس حمایت کے ردعمل کے طور پر کیا جو وہ پاکستان کے بلوچ اور پشتون باغی گروہوں کو مہیا کر رہے تھے۔ تاہم پاکستان کی خفیہ کارروائیوں سے افغانستان کے معاملات میں پاکستان کے طویل المیعاد مفادات کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔

بھٹو نے فروری 1973ء میں بلوچستان کی صوبائی حکومت کو معزول کیا تھا۔ اس کے بعد جلد ہی وہاں بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ سردار داؤد نے ظاہر شاہ کے خلاف انقلاب 17 جولائی 1973ء کو بپا کیا۔ اس کے فوراً بعد ربانی، مسعود اور حکمت یار پشاور پہنچ گئے۔ داؤد کے برسراقتدار آنے سے پہلے ہی بلوچ پاکستانی فوج سے جنگ کر رہے تھے اور جب افغانستان کو "افغان جمہوریہ" قرار دیا گیا اس وقت پاکستان افغان اسلام پسندوں کی میزبانی کر رہا تھا۔ برسراقتدار آنے کے بعد داؤد نے بلوچ باغیوں کے لئے تربیتی کیمپ قائم کئے اور پاکستان کے خلاف جنگ کے لئے 10 سے 15 ہزار قبائلیوں کو تربیت دی گئی۔ انہوں نے کابل کے ایک مرکزی چوک کا نام بھی "پشتونستان چوک" رکھ دیا۔

داؤد نے بلوچ قبائلیوں کے ایماء پر جو کارروائیاں کیں اور جس طرح پشتونستان کا پروپیگنڈہ کیا وہ آئی ایس آئی کی طرف سے ربانی اور حکمت یار کی حمایت کا ایک مزید امکانی سبب ہو سکتا ہے۔ پاکستان نے افغانستان کے اندر اپنا رسوخ بڑھانے پر بہت غور کیا۔ اسی غور و خوض کے نتیجے میں اسلام پسندوں کی بغاوت کا منصوبہ تشکیل دیا گیا۔ جنرل خالد محمود عارف ان دنوں پاکستان کے جنرل ہیڈ کوارٹرز میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ بعد ازاں وہ جنرل ضیاء الحق کے پرنسپل سٹاف افسر بن گئے۔ ان کے بقول جولائی اگست 1973ء میں پاکستان کے دفتر خارجہ میں "افغان سیل" بنا دیا گیا تھا۔ انہوں نے افغانستان کے اندر انٹیلی جنس کی کارروائیوں میں آئی ایس آئی کے کردار کی وضاحت بھی کی ہے اور حکمت یار، ربانی اور افغانستان کے جلاوطن بادشاہ ظاہر شاہ کے ساتھ آئی ایس آئی کے رابطوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

پاکستان کے تربیت یافتہ افغان باغی کابل حکومت کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ روس کے مقابلے میں شاہ ایران نے داؤد حکومت کو اقتصادی تعاون کی جو پیش کش کی، وہ زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ داؤد کے اندرونی حلقے میں شامل کمیونسٹوں کے مخالفین کمیونسٹوں کے ساتھ شراکت اقتدار کے سخت خلاف تھے۔ ان کی مخالفت 1975ء کے اوائل میں داؤد حکومت سے کمیونسٹوں کے مکمل صفائے پر منتج ہوئی۔ داؤد نے فوراً ہی روایتی اسلامی راہنماؤں کی مدد چاہی۔ شاہ ایران کے کہنے پر افغانستان اور پاکستان کے درمیان اختلافات دور کرانے کے لئے داؤد اور بھٹو کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا۔ جولائی 1977ء میں بھٹو نے حکومت کی معزولی کے باعث مذاکرات کا سلسلہ ترک کیا۔ چند ماہ بعد جنرل ضیاء الحق نے مذاکرات دوبارہ شروع کر دیئے۔

افغانستان کے کمیونسٹوں اور سوویت یونین سے دور ہونے کے لئے سردار داؤد نے قدامت پسند عرب حکومتوں، ایران اور امریکہ کے ساتھ نئے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیئے۔ اس وقت غیر ملکی امداد پر افغانستان کا انحصار بڑھ چکا تھا۔ 78-1977ء میں افغانستان کے بجٹ اخراجات کا 60 فیصد غیر ملکی امداد کا رہین منت تھا۔ داؤد نے مغرب اور مغرب نواز ہمسایہ ریاستوں سے رابطہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ افغانستان کو ملنے والی غیر ملکی امداد کے ذرائع تبدیل کرتے رہے اور سوویت یونین کے ساتھ ان کے خصوصی تعلقات کمزور پڑتے گئے۔ مارچ 1978ء میں سردار داؤد پاکستان آئے اور پاکستان کے ساتھ ایک ایسے معاہدے کے قریب پہنچ گئے جس کے نتیجے میں افغانستان ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لیتا اور پشتونستان کی حمایت کا سلسلہ ترک کر دیتا۔ جس کے بدلے بلوچوں اور پشتونوں کو پاکستان کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری مل جاتی۔ خارجہ پالیسی میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ملکی محاذ میں بھی قابل ذکر تبدیلیاں آ گئیں۔ داؤد نے پی ڈی پی اے کے خلاف کریک ڈاؤن کیا اور پاکستان کے بلوچوں اور پشتونوں کو مطلع کر دیا کہ افغانستان اب ان کے لئے پناہ گاہ نہیں بنے گا۔

"27 اپریل 1978ء کو کمیونسٹ نواز فوجی افسروں کی بغاوت کے نتیجے میں داؤد حکومت کو معزول اور داؤد کو قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ اس وقت تک داؤد کمیونسٹوں کا مکمل صفایا نہیں کر سکے تھے۔ بغاوت کی قیادت انہی افسران نے کی جو 5 سال قبل داؤد کو اقتدار دلانے میں مد ثابت ہوئے تھے۔ انقلاب کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ بغاوت آخری لمحے کی کاروائی تھی جو روسی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور فوجی مشیروں کی مدد سے افغانوں نے کی۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس وقت کیا جب کوئی چارہ کار نہ رہ گیا۔ پی ڈی پی اے کے جن راہنماؤں کو داؤد نے قید کر رکھا تھا بغاوت میں ملوث فوجی افسران نے انہیں رہا کر دیا اور پی ڈی پی اے کے چوٹی کے راہنماؤں کو نئی انقلابی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا گیا"۔

پاکستان نے نئی حکومت کو تسلیم کر لیا اور افغانستان کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی قائم رکھے۔ لیکن افغانستان میں کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد اسلام پسندوں کی جس بغاوت کو پاکستان کی پشت پناہی حاصل تھی اس میں تیزی

آ گئی۔ ستمبر 1978ء میں جنرل ضیاء الحق اور نئے افغان صدر نور محمد ترکئی کے درمیان ایک ملاقات کے دوران دونوں راہنماؤں نے اپنے بنیادی عقائد میں واضح اختلاف پایا۔ جنرل عارف لکھتے ہیں "دو مسلمان اسلامی فلسفے کی توجیہہ پر متفق نہ ہوئے"۔ ضیاء الحق کے ساتھ ترکئی کا تعارف ایک "کامریڈ" کے طور پر کرایا گیا۔ انہوں نے پاکستانی راہنما کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز ہی اس بات سے کیا کہ افغانستان کی تاریخ کے بارے میں ان کی ذاتی رائے کیا ہے۔ انہوں نے ضیاء کو بتایا کہ افغانستان کا شاہی خاندان دوسو سال تک افغان قوم کا استحصال کرتا رہا۔ اب سب کچھ عوام کا ہے۔ حالیہ انقلاب نے ایک کروڑ دس لاکھ لوگوں کو اس سرزمین کا مالک بنا دیا ہے۔ اس پر ضیاء نے ترکئی کو یاد دہانی کرائی کہ مسلمانوں کو چاہئے تمام جائیداد کا مالک خدا کو سمجھیں اور آدمی کو خدا کا نامزد کردہ نگران خیال کریں۔ ترکئی نے جواباً کہا "ساری زمین اس کی ہے جو اس میں ہل چلاتا ہے"۔

ضیاء الحق نے ترکئی سے کہا کہ وہ خدا سے خوف کھائیں اور خدا کے عائد کردہ فرائض کو تسلیم کریں۔ اس پر ترکئی نے جو بتصرہ کیا وہ کچھ اس طرح تھا "خدا عادل و منصف ہے۔ ہمیں ایک عادل و منصف خدا سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ انسانوں کی خدمت خدا کی خدمت کے مترادف ہے"۔ یہ کہہ کر ترکئی نے پاکستان کی "سینٹو" کی رکنیت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ پاکستان امریکہ سے جو چاہتا تھا وہ اسے نہیں مل سکا۔ ضیاء الحق نے دوران گفتگو شاہ ایران کے لئے ادب واحترام کا اظہار کیا تو ترکئی نے اس پر طنزیہ ریمارکس دیئے۔ اگرچہ دونوں راہنماؤں نے باہمی اختلافات کو پرامن انداز میں دور کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا تاہم ضیاء الحق نے ایک ایسے شخص کی زندگی کو سہل بنانے کی ضرورت محسوس نہ کی جس کے عقائد اور مفادات ان کے اسلام پسندانہ خیالات کی عین ضد تھے۔ پاکستان ان اسلام پسند جماعتوں کی حمایت کرتا رہا جو کابل سے باہر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے تھیں اور رسمی طور پر ان کی ذمہ داری نیم فوجی فرنٹیئر سکاؤٹس سے لیکر آئی ایس آئی کو سونپ دی۔

ضیاء الحق نے اندازہ قائم کیا کہ افغانستان میں ان کے اسلام پسند اتحادیوں کو اہمیت حاصل کرنے کے لئے اب زیادہ وقت درکار نہیں ہوگا اور وہ افغان حکومت کے لئے "محض باعث پریشانی" نہیں رہ جائیں گے۔ جونہی پی ڈی پی اے نے اپنی انقلابی سماجی اور معاشی پالیسیوں پر عملدرآمد کا آغاز کیا، نئے نظام کے خلاف کابل میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ جس نے افغانستان کے دیہی علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ زرعی اصلاحات کے تحت ملکیتی زمین کی حد 15 ایکڑ مقرر کر دی گئی۔ نتیجتاً زمینداروں کی بڑی تعداد حکومت کی دشمن بن گئی۔ ایک طرف مذہبی اور روایتی قبائلی راہ نماؤں کے لیے احترام نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی اور دوسری طرف حکومت نے روایتی سماجی اقدار کو حکماً بدلنے کی کوشش شروع کر دی۔ نتیجتاً افغان عوام بڑی تعداد میں ناراض اور کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اس طرح اسلام پسندوں کے لئے مشتعل عوام میں سے باغی بھرتی کرنا سہل ہو گیا۔ جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی تو پہلے ہی فعال تھیں۔ متعدد نئے افغان گروہ منظم ہونے لگے۔ کمیونسٹ مخالف

جماعتوں کی راہنمائی کا فریضہ ان قدامت پسند سیاستدانوں اور قبائلی راہنماؤں نے انجام دیا جنہیں یا تو افغانستان کے نئے سیاسی نظام سے نکال دیا گیا تھا اور یا پریشان اور تنگ کیا جا رہا تھا۔

اپریل 1978ء میں رونما ہونے والے افغان انقلاب کے بعد جلد ہی پاکستان نے اپنے "افغان سیل" کو دوبارہ فعال کر دیا۔ جنرل عارف اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ سیل کا کام دستیاب معلومات کا تجزیہ اور متبادل پالیسیاں تجویز کرنا تھا۔ دفاعی منصوبوں کو بھی وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا کیونکہ غیر مستحکم افغانستان نے پاکستان کے دفاع پر منفی اثرات مرتب کئے تھے۔ لیکن افغان سیل کا بنیادی فرض یہی رہا کہ ایک تو افغانستان میں کمیونسٹوں کی حکمرانی کے خلاف مزاحمت کو مربوط بنایا جائے اور دوسرے پاکستان اور مذکورہ مزاحمت کے لئے عالمی سطح پر حمایت حاصل کی جائے۔ دسمبر 1978ء میں جب افغانستان میں پی ڈی پی اے کی حکومت نے سوویت یونین کے ساتھ دوستی کے معاہدے پر دستخط کئے، پاکستان نے امریکی امداد کے مطالبے کی تجدید کے ذریعے واشنگٹن میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں لیکن کارٹر انتظامیہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حتیٰ کہ کابل میں فروری 1979 میں امریکی سفیر کے قتل کی اہمیت کو بھی شاہ ایران کے زوال اور آیت اللہ خمینی کی طہران واپسی نے کم کر دیا۔ پاکستانی حکام نے افغانستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں واشنگٹن کی عدم دلچسپی کی شکایت کی۔ جنرل عارف نے اس دور کی ضیاء حکومت کے جذبات کی بازگشت کے طور پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھا" کارٹر انتظامیہ اپنے معمولات میں مگن تھی جیسے یہ واقعات معمول کے واقعات ہوں"۔

انقلاب ایران پاکستان اور امریکہ کے درمیان "انٹیلی جنس تعاون" کی تجدید میں مد ثابت ہوا اور پاکستان نے افغانستان سے بعد میں جو حاصل کرنا چاہا اس کی راہ ہموار ہوگئی۔ ایران میں انقلاب کے باعث امریکہ وہاں اپنی ان چوکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا جو اس نے جاسوسی کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کو سننے کے لئے قائم کر رکھی تھیں۔ جب امریکہ نے ضیاء الحق سے کہا کہ وہ مواصلاتی انٹیلی جنس کو یکجا کرنے کے لئے تعاون کریں تو آخر الذکر فوراً تیار ہو گئے۔ اگرچہ امریکی مبصرین نے فوری طور پر اپنے اڈے پاکستان میں قائم نہ کئے، تاہم سی آئی اے نے حساس آلات کے ذریعے ٹیلی فون یا وائرلیس پر ہونے والی گفتگو سننے کے لئے پاکستان کی صلاحیت بڑھانے کی خاطر پاکستانی انٹیلی جنس کے ساتھ ملکر کام کیا۔ اس نوعیت کی تنصیبات سے استفادہ کرتے ہوئے جو اعداد و شمار اکٹھے کئے گئے وہ امریکی انٹیلی جنس تک پہنچا دیئے گئے۔ اس طرح امریکی سی آئی اے اور پاکستانی آئی ایس آئی کے قریبی باہمی تعلقات کی بنیاد رکھ دی گئی۔ جولائی 1979ء میں صدر کارٹر نے افغانستان کی "اسلام پسند مزاحمت" کے لئے خفیہ امداد کے ایک اوسط درجے کے پروگرام کی منظوری دیدی جو پاکستان کے توسط سے افغان اسلام پسندوں تک پہنچائی گئی۔ رابرٹ گیٹس اس وقت سی آئی اے کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا (بعد میں وہ ڈائریکٹر سی آئی اے بن گیا)۔ اس نے اپنی یادداشتوں میں ان واقعات کا تسلسل بیان کیا ہے جو اس ابتدائی خفیہ کاروائی پر منتج ہوئے:-

" کارٹر انتظامیہ نے 1979ء کے اوائل میں صدر ترکئی کی روس نواز مارکسسٹ حکومت کے خلاف برسرپیکار باغیوں کی خفیہ مدد کے امکانات کی تلاش شروع کردی۔ 5 مارچ 1979ء کو سی آئی اے نے ایس سی سی (سپیشل کوآرڈی نیٹنگ کمیٹی) کو افغانستان سے متعلقہ خفیہ کاروائی کے متعدد متبادلات بھجوائے۔ جس میمو کے تحت وہ بھیجے گئے اس میں لکھا گیا کہ باغیوں نے حکومت کے خلاف اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کردیا ہے اور حیران کن کامیابیاں حاصل کرچکے ہیں۔ میمو میں یہ بھی لکھا گیا کہ روسی کمیونسٹ افغان حکومت کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں پر پریشان ہیں اور روسی میڈیا امریکہ۔ پاکستان اور مصر پر باغیوں کی مدد کا الزام عائد کر رہا ہے۔ اگلے روز ایس سی سی کا اجلاس ہوا اور سی آئی اے سے درخواست کی گئی کہ خفیہ کاروائی کے نئے متبادلات بھیجے۔ اس دوران سعودی عرب کے ایک اعلیٰ افسر نے افغانستان میں روس کی راہ میں مزاحم ہونے کے امکان کا تذکرہ کیا اور کہا کہ باغیوں کی امداد کے بارے میں سعودی حکومت سرکاری سطح پر امریکہ کو تجویز بھیجنے پر غور کر رہی ہے۔ ڈائریکٹوریٹ آف آپریشنز کے میمو میں لکھا گیا کہ سعودیوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سرمایہ بھی فراہم کریں اور پاکستانیوں کی حوصلہ افزائی بھی کریں اور امکانی طور پر دوسری حکومتوں سے بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ کم ازکم خفیہ مدد ضرور فراہم کریں گی۔ میمو میں یہ بھی درج تھا کہ اگرچہ روسیوں کی طرف سے باقاعدہ فوج بھیجے جانے کا کوئی امکان نہیں تاہم وہ اپنی رسد اور عسکری مدد میں بآسانی اضافہ کرسکتے ہیں۔ مزید براں اگر وہ ملک پر فوجی قبضے کا فیصلہ کرلیں تو انہیں روکنے کی کوئی عملی راہ دستیاب نہیں۔ لیکن اس قسم کا کوئی بھی اقدام انہیں خطے میں شدید نقصان سے دوچار کردے گا۔

30 مارچ 1979ء کو ڈپٹی نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر ڈیوڈ آرون نے ایک تاریخی منی ایس سی سی اجلاس کی صدارت کی جو تین ہفتے قبل منعقد ہونے والے اجلاس کا تسلسل تھا۔ منی ایس سی سی کے اجلاس میں سیاسی معاملات کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ ڈیوڈ نیوسم نے کہا کہ سوویت یونین کے حالیہ رجحان اور افغانستان میں اس کی موجودگی کو یکسر پلٹ دینا، پاکستانیوں کو اپنے مفادات اور روسی مداخلت پر اپنے تفکرات سے آگاہ کرنا اور پاکستانیوں اور سعودیوں پر واضح کردینا کہ ہم تیسری دنیا میں روسیوں کے اثرونفوذ کی وسعت کی راہ میں مزاحم ہونے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں، امریکی پالیسی ہے۔ محکمہ دفاع کے نمائندے والٹ سلوکومبے نے پوچھا کہ اگر افغان بغاوت کو جاری رکھا جائے تو کیا روسیوں کو ویت نام جیسی دلدل میں پھنسایا جاسکتا ہے؟ آرون نے یہ کلیدی سوال پوچھ کر بات ختم کردی کہ کیا بغاوت میں تعاون اور اسے برقرار رکھنے کا کوئی فائدہ بھی ہوگا یا ہم محض روسیون کو بہت بڑا خطرہ بنا کر پیش کرنے کا خطرہ مول لے رہے ہیں؟ افغانستان میں خفیہ کاروائیوں کے متبادلات پر غور کے لئے 6 اپریل کو ایس سی سی کا جو اجلاس منعقد ہوا اس سے ایک دن قبل سوویت این آئی او آرنلڈ ہورلک نے ٹرنر کو ایک دستاویز بھجوائی جس میں درج تھا کہ روس کس نوعیت کا ردعمل ظاہر کرسکتا ہے۔ ہورلک نے لکھا کہ اگر روسی ترکئی کو برسراقتدار رکھنے کا پختہ ارادہ کرلیں تو کوئی خفیہ کاروائی ان کی راہ نہیں روک سکتی اور باغیوں کو ملنے والی غیرملکی امداد کو وہ اپنی روزبروز بڑھتی ہوئی مداخلت کے جواز کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ تاہم اس نے مزید لکھا کہ وہ ایسا ضرور کریں گے کیونکہ پہلے بھی وہ اسی قسم کے الزامات عائد کر رہے ہیں۔ اس دستاویز پر سب سے نیچے لکھا تھا کہ خفیہ کاروائی

روسیوں کے اخراجات بڑھا دے گی اور بہت سے ملکوں کے اندران کے بارے میں مسلمانوں کی رائے بھڑک اٹھے گی۔ قابل ذکر خفیہ امریکی امداد کے پروگرام میں خطرات مضمر ہیں۔ عام حالات میں شاید وہ براہ راست اور شدید مداخلت کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ لیکن باغیوں کو دی جانے والی خفیہ امریکی مدد صورت حال کو یکسر بدل کر رکھ دے گی"۔

گیٹس کے بقول 6 اپریل 1979ء کو ایس سی سی کے اجلاس میں افغان مزاحمت کی مدد کے متعدد متبادلات پر غور کیا گیا اور فعال کردار کو عمومی ترجیح دی گئی لیکن وہ ترجیح صرف "غیر مہلک تعاون" کے لئے تھی۔ اس دوران سی آئی اے کو اطلاع موصول ہوئی کہ ممکن ہے چین بھی افغان مجاہدین کو اسلحہ فراہم کر دے۔ پاکستان اور چین کے درمیان قریبی تعلقات کی بناء پر ایک "محفوظ مفروضہ" قائم کر لیا گیا کہ پاکستان نے چین کو قائل کر لیا ہوگا کہ وہ اول الذکر کے اقدامات کی حمایت کرے۔ گیٹس تصدیق کرتا ہے کہ صدر جمی کارٹر نے مجاہدین کی خفیہ امداد کے پہلے اجازت نامے پر افغانستان پر روسی حملے سے تقریباً 6 ماہ قبل 3 جولائی 1979ء کو دستخط کئے۔ لیکن کارٹر کے پہلے اجازت نامے میں صرف:-

"باغیوں کے پروپیگنڈے کی حمایت اور افغانستان کے اندر دیگر نفسیاتی کاروائیاں، کسی تیسرے ملک میں ریڈیو سٹیشن کی تنصیب جو افغان عوام کی دسترس میں ہو اور افغان باغیوں کو یک طرفہ طور پر یا کسی تیسرے ملک کے توسط سے نقدی یا غیر فوجی ساز وسامان کی فراہمی شامل تھے۔ افغنستان کی مدد کا آغاز چھوٹے حجم سے ہوا۔ ابتداء میں 5 لاکھ ڈالرز سے کچھ زائد رقم مختص کی گئی جو ساری تقریباً 6 ہفتوں کے اندر تقسیم کر دی گئی"۔

جنرل ضیاء الحق اپنے افغان آپریشن کے لئے امریکی امداد کی کم سطح پر مطمئن نہیں تھے۔ وہ جان گئے کہ شاہ ایران کے زوال نے امریکی پالیسی سازوں کو نروس کر دیا ہے۔ 1950ء کی دہائی میں جس طرح ایوب خان کمیونزم کے خلاف مختلف معاہدوں میں شریک ہوئے تھے ضیاء الحق بھی چاہتے تھے کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان اتحاد کی تعمیر نو کم وبیش انہی خطوط پر کی جائے۔ اپنے فوجی انقلاب کے وقت ضیاء الحق نے 90 دن کے اندر اندر انتخابات کے انعقاد کا جو وعدہ کیا تھا۔ اسے بار بار توڑنے اور مقبول عوامی راہنما وزیر اعظم بھٹو کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد انہیں ملک کے اندر بھی جواز حکمرانی کے حوالے سے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اگر افغانستان میں اسلام پسندوں کے جہاد کو وسعت دینے کے لئے امریکی امداد میسر آجاتی تو وہ اس حمایت کو برقرار رکھنے میں ممد ثابت ہو سکتی تھی جو انہیں فوج کی طرف سے مل رہی تھی۔ تاہم 1950ء کی دہائی میں جب ایوب خان نے قومی دفاع کے امریکی شعبے میں رسوخ حاصل کیا تھا اس کے مقابلے میں پاکستان کے بارے میں امریکی رائے اب زیادہ منقسم تھی۔ بھارتی جمہوریت کے مقابلے میں پاکستانی سیاست پر فوج کے تسلط میں تسلسل اور پاکستان کے خفیہ جوہری پروگرام کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات نے واشنگٹن کے مختلف حلقوں کو اضطراب سے دوچار کر دیا تھا۔

ضیاء الحق کو اپنے امریکی ناقدین کے شکوک وشبہات پر بھی قابو پانا پڑا۔ انہوں نے ایسے امریکیوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دی جو روس کو محدود رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے افغانستان میں بغاوت کی سطح کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور کہا کہ پاکستان میں کیمونزم کی توسیع کی راہ میں حائل ہونے کی سکت موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں افغانستان سے کیمونزم کی بساط لپیٹی اور روسی وقار اور شہرت میں کمی کی جاسکتی تھی بشرطیکہ پاکستانی اور امریکی انٹیلی جنس سروسز مشترکہ کاوشیں کریں۔ اگرچہ اسلام آباد پاکستانی سرزمین پر سے سرکاری سطح پر اس قسم کی کاروائیوں کے وجود سے ہمیشہ انکاری رہا تاہم امریکی صحافیوں کو اجازت دیدی گئی کہ وہ ان پاکستانی کاوشوں کی رپورٹ مرتب کرلیں جو کیمونسٹ مخالف افغان گوریلوں کی تربیت کے ضمن میں کی جارہی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے لئے امریکی امداد میں اضافے کے حق میں امریکی رائے عامہ کو متشکل کیا جاسکے۔ اس طرح "واشنگٹن پوسٹ "2 فروری 1979ء کو یہ شائع کرنے کے قابل ہوگیا کہ پاکستان میں مختلف مقامات پر کم از کم دو ہزار افغانوں کو تربیت دی جارہی ہے اور ان کی حفاظت پر پاکستانی فوج کے جوان مامور ہیں۔ افغانستان سے کیمونزم کو مار بھگانے کی ان پاکستانی کاوشوں کو افشاء کرنے کے بعد ضیاء الحق یہ توقع کرنے میں حق بجانب تھے کہ امریکہ کے اندر روس مخالف انتہا پسند حلقے پاکستانی کاز کے حق میں اکٹھے ہوجائیں گے۔

ایک طرف پاکستان اپنی افغان مہم کی خاطر امریکی امداد کے حصول کے لئے بے چین تھا اور دوسری طرف پاکستانی افسران کو یہ کہتے بھی سنا گیا کہ پاکستان کے دفاع کے لئے اگر امریکہ نے وسیع پیمانے پر کوئی ٹھوس ضمانت نہ دی تو "روسی غضب" کا شکار ہونے کے امکانات کو رد کیا جاسکتا۔ ضیاء الحق صرف ان باغیوں کے لئے امریکی امداد کے طالب نہیں تھے جن کی وہ پہلے ہی پشت پناہی کررہے تھے بلکہ وہ پاکستان کی مسلح افواج کے لئے بھی امریکی تعاون چاہتے تھے۔ افغانستان میں بغاوت کو وسعت دے کر ہی پاکستان امریکہ کے لئے کوئی خدمت بجا لاسکتا تھا اور اس خدمت کے عوض وہ زیادہ اقتصادی اور عسکری مدد کا خواہاں تھا۔ گیٹس نے امریکی امداد کے لئے ضیاء الحق کی لابنگ کی تفصیلات بتائی ہیں جو انہوں نے حملے سے قبل چند مہینوں کے دوران کی۔

اگست 1979ء کے اواخر میں پاکستانی صدر محمد ضیاء الحق امریکہ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ آخر الذکر افغانستان میں برسرپیکار باغیوں کے لئے اسلحہ اور دیگر ساز وسامان فراہم کرے۔ انہوں نے مزید تاکید کے لئے پاکستان میں امریکی سفیر سے ملاقات کی اور کہا کہ جب وہ اگلے ماہ یعنی ستمبر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے نیویارک جائیں گے تو وہاں یہ معاملہ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ سطح پر بھی اٹھائیں گے۔ ادھر پاکستانی انٹیلی جنس ہمیں الگ مجبور کررہی تھی کہ دن بدن وسیع تر ہوتی ہوئی افغان بغاوت کے لئے فوجی ساز وسامان کی صورت میں امداد مہیا کی جائے۔ جب سی آئی اے کے ڈائریکٹر سٹینفیلڈ ٹرنر نے یہ سب سنا تو اس نے ڈی او پر زور دیا کہ باغیوں کو مزید مدد بہم پہنچانے کے لئے حرکت میں آجائے۔ انہوں نے باغیوں کے لئے پاکستانیوں یا سعودیوں کے توسط سے مواصلاتی آلات اور مہلک

عسکری سازوسامان خریدنے کے لئے پاکستان کو فنڈز اور باغیوں میں تقسیم کرنے کے لئے ہماری طرف سے اسی مالیت کے فوجی سامان کی فراہمی سمیت امداد میں اضافے کے متعدد متبادلات اپنائے"۔

اس مرحلے پر سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے درمیان تعاون کے باوجود سیاسی سطح پر امریکہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات میں کوئی خاص گرمجوشی موجود نہیں تھی۔ 21 نومبر 1979ء کو جماعت اسلامی سے وابستہ طلباء کی ایک تنظیم نے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کو ان افواہوں کی بنیاد پر نذر آتش کر دیا جن کے مطابق مکہ میں مسلمانوں کی مقدس ترین مسجد یعنی خانہ کعبہ پر قبضے میں امریکہ کا ہاتھ تھا۔ سفارت خانے کے متعدد افسران جلتی ہوئی عمارت کے اندر پھنس کر رہے گئے اور اگرچہ بطور آرمی چیف ضیاء الحق کی رہائش گاہ اور راولپنڈی میں فوج کا جی ایچ کیو اس مقام سے نصف گھنٹے کی ڈرائیو سے بھی کم فاصلے پر واقع تھے۔ تاہم فوج اور امن وامان بحال کرنے والے دیگر اداروں کے ارکان چار گھنٹے بعد جائے واردات پر پہنچے۔ اس حادثے کے نتیجے میں دو امریکی اور امریکی سفارت خانے کے دو پاکستانی ملازمین اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کراچی میں واقع امریکی قونصلیٹ پر حملے کی اسی قسم کی ایک کوشش نسبتاً اعتدال پسند طالب علم راہنماؤں اور پولیس میں تعاون کے باعث ناکام بنا دی گئی۔

اگرچہ پاکستان نے بعد میں سفارت خانے کی تعمیر نو پر اٹھنے والے اخراجات کی ادائیگی سے اتفاق کر لیا تاہم اس واقعے نے امریکی سفارت کاروں کو چوکس کر دیا کہ پاکستان کے اسلام پسندوں میں امریکہ مخالف جذبات موجود ہیں۔ انہیں یہ شک بھی گزرا کہ ممکن ہے اس وقوعے میں پاکستانی حکومت بھی ملوث ہو۔ امریکی حکام کے درمیان کافی عرصہ اس واقعے میں پاکستانی حکومت کے کردار پر بحث ہوتی رہی۔ وہ حیران تھے کہ سفارت خانے کو بچانے کے لئے پاکستانی فوج نے پہنچنے میں تاخیر کیوں کی؟ اس کے مقابلے میں 1999ء میں جب پاکستانی فوج نے فیصلہ کیا کہ وزیراعظم نواز شریف کو جنرل مشرف کی ریٹائرمنٹ کا اعلان نہیں کرنے دیا جائے گا تو بالکل وہی فاصلے فوج نے 35 منٹ میں طے کر لئے اور صورت حال پر قابو پا لیا۔ 1979ء میں امریکی سفارت خانے کو نذر آتش کر دینے والے اس واقعے کے بارے میں امریکہ کے اندر جو مختلف خیالات پائے گئے۔ انہیں ڈینس ککس اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"اگرچہ پاکستانی حکام نے افسر شاہانہ رکاوٹوں، تیاری کے فقدان اور نااہلی کو فوج کے تاخیر سے پہنچنے کے اسباب قرار دیا۔ تاہم سخت خیالات کے حامل امریکی مختلف انداز میں سوچتے ہیں۔ کچھ امریکیوں کے خیال میں پاکستانیوں نے یہ سوچ کر مداخلت میں ہچکچاہٹ دکھائی کہ ممکن ہے خانہ کعبہ پر قبضے میں امریکہ کے ملوث ہونے کی افواہیں درست ہوں۔ دیگر امریکیوں کے خیال میں پاکستانیوں نے امریکیوں کو ہلکا سا سبق سکھانا چاہا۔ کچھ امریکی ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ پاکستانی انٹیلی جنس نے طلباء کو امریکہ کے سفارتی مراکز کے سامنے احتجاجی مظاہروں پر اکسایا۔ (واضح رہے کہ راولپنڈی۔ لاہور اور کراچی تینوں شہروں میں امریکی سفارتی مراکز پر حملے کئے گئے) لیکن جب مظاہرے شروع ہو گئے تو بات انٹیلی جنس کے ہاتھ سے نکل گئی"۔

ضیاء الحق نے اس واقعے کو اس امر کی ایک اور شہادت کے طور پر پیش کیا کہ جذباتی اور مشتعل پاکستانی قوم پر قابو پانے اور مذہبی جوش وخروش کا رخ امریکہ کی طرف سے موڑ کر روس کی جانب کرنے کے لئے ایک مضبوط جرنیل درکار ہے۔ ضیاء الحق خود کو امریکہ کا ایسا دوست ثابت کرنا چاہتے تھے جو اپنی عوام کے امریکہ مخالف جذبات کے باوجود ایک مضطرب خطے میں امریکی مفادات کا دفاع کرنے کا خواہش مند تھا۔ ایسا کرنے والے وہ پہلے پاکستانی جرنیل نہیں تھے اور ہم پھر بھی مشاہدہ کرتے رہیں گے کہ وہ اس حوالے سے آخری پاکستانی جرنیل بھی نہیں ہوں گے۔

اس دوران افغانستان کے اندر حالات وواقعات ایسا رخ اختیار کر گئے کہ ضیاء الحق کی خواہشات پوری ہوگئیں۔ وہ بھاری مقدار میں امریکی امداد کے حصول میں بھی کامیاب ہو گئے اور افغانستان میں جس جہاد کی وہ پہلے ہی حمایت کر رہے تھے۔ اسے بھی کیفیتی وسعت دے دی۔ پی ڈی پی اے جتنی دیر موجود رہا۔ بالترتیب "خلق" اور "پرچم" کے اشاعتی ناموں سے موسوم دو دھڑوں پر مشتمل رہا۔ مزید براں ہر دھڑے کے اندر شخصیتوں کے درمیان تصادم ہوتے رہے۔ اپریل 1978ء میں جب فوجی بغاوت کے نتیجے میں پی ڈی پی اے برسراقتدار آیا تو اس کے بعد چند مہینوں کے اندر اندر "خلق" نامی دھڑا "پرچم" کے راہنماؤں کو بیرون ملک سفیر بنانے کی صورت میں جلاوطن کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ "خلق" کے اندر ہونے والی اقتدار کی کشمکش حفیظ اللہ امین کو برسراقتدار لے آئی جو ایک کٹر وطن پرست اور آزاد منش انسان تھے۔ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد پر رعونت قسم کی خود اعتمادی کا مظاہر کیا۔

امین نے ستمبر 1979ء میں ترکئی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بعد افغانستان کا صدر بننے کے لئے اپنی پوزیشن کو مجتمع کر لیا۔ اس وقت تک پی ڈی پی اے کی حکومت نے روسی ہدایات کی زیادہ پرواہ کرنا ترک کر دیا تھا۔ قدامت پسند افغانوں میں بھی وہ اپنے مخالفین کی تعداد میں اضافہ کر رہی تھی اور جن باغیوں کو پاکستان کی پشت پناہی حاصل تھی انہوں نے بھی اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے تھے۔ حفیظ اللہ امین کے ارتکاز اقتدار کے رجحان کے باعث پی ڈی پی اے کے اندر برادر کش جنگ وجدل کا آغاز ہوگیا۔ جس نے افغان حکومت کو کمزور کر دیا۔ اس دوران امین ملے جلے تاثرات دیتے رہے جن میں یہ تاثر بھی شامل تھا کہ ممکن ہے وہ کابل میں روسی اثر ونفوذ کم کر دیں۔ اس وقت بیمار لیونڈ برزنیف روس کے حکمران تھے۔ انہوں نے سوچا کہ ممکن ہے امریکی شاہ ایران کے زوال کا انتقام افغانستان میں مداخلت کی صورت میں لینا چاہیں اور امین ان کے لئے اس عمل کو سہل بنا دیں۔

روس نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حاشیہ نشین اور طفیلی ریاستوں میں سے ایک کم ہو جائے۔ وہ ان تبدیلیوں پر متفکر تھا۔ لہذا اس نے 1979ء میں کرسمس کے دن افغانستان پر فوج کشی کر دی۔ امین کو قتل کر دیا گیا اور پی ڈی پی اے کے "پرچم" دھڑے کے ایک راہنما ببرک کارمل کو جو ان دنوں مشرقی یورپ کے ایک ملک میں بطور سفیر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ روسیوں نے افغانستان کا نیا سربراہ مقرر کر دیا۔ روسیوں کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے کارمل کی درخواست پر فوجی مداخلت

کی جو آخرالذکر نے ایک سال قبل طے پانے والے معاہدہ دوستی کی روشنی میں کی تھی۔ لیکن یہ دعویٰ انتہائی کھوکھلا تھا۔ روسی حملے کے ردعمل کے طور پر دنیا بھر میں اضطراب پھیل گیا۔ یہ حملہ روسیوں کے مستقبل کے ارادوں کی نشاندہی کرتا تھا۔ روسی حملے سے قبل واشنگٹن میں افغانستان کی صورت حال کے بارے میں دو آراء پائی جاتی تھیں۔ کچھ امریکی افغانستان کی کمیونسٹ حکومت کو روسیوں کی طفیلی حکومت سمجھتے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ افغانستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا دونوں بڑی عالمی طاقتوں کے درمیان موجود دشمنی سے کوئی تعلق نہیں۔

اس وقت عالمی فضا اور روسیوں کی توسیع پسندی کے حقیقی خطرات کے پیش نظر کچھ ماہرین کا خیال تھا کہ روس نے افغانستان پر حملے کی صورت میں جنوب مغربی ایشیاء تک اپنا رسوخ بڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں روس کا حتمی مقصد خلیج فارس پر اپنا تسلط جمانا تھا۔ کیونکہ ایران اس وقت انقلاب کے شکنجے میں تھا۔ لہٰذا اس خطے کے دفاع کے لئے مغربی حکمت عملی میں پاکستان کو اہم اور کلیدی مقام حاصل تھا۔ ضیاء الحق جس لمحے کے منتظر تھے وہ آن پہنچا تھا۔ بظاہر انہوں نے پاکستان کے دفاع کے حوالے سے خوفزدگی کا تاثر دیا لیکن اپنے قریبی معتمد اور آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل اختر عبدالرحمٰن سے کہہ دیا کہ وہ پاکستان کے ہمسایہ ملک پر سوویت قبضے کے خلاف وسیع پیمانے پر گوریلا جنگ کا منصوبہ تشکیل دیں۔ انہیں یقین تھا کہ اب وہ امریکہ کو قائل کرلیں گے کہ آخرالذکر پاکستان کی شرائط پر پاکستان کو اپنا اتحادی بنائے۔

آئی ایس آئی کے بعض سابق افسران جنہیں جنرل اختر عبدالرحمان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا وہ مصر ہیں کہ روس کے خلاف وسیع تر مزاحمت کا آئیڈیا پاکستانی انٹیلی جنس کے سربراہ کی طرف سے موصول ہوا اور ضیاء الحق نے ایک فوجی حکمت عملی کے طور پر قابل عمل خیال کرتے ہوئے اس کی توثیق کردی۔ بریگیڈیئر محمد یوسف جو 1983ء اور 1987ء کے درمیان آئی ایس آئی میں "افغان آپریشن" کے کرتا دھرتا رہے۔ وہ گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی کا سہرا جنرل اختر عبدالرحمٰن کے سر باندھنے پر مصر ہیں اور کہتے ہیں کہ جنرل اختر نے ایسی منصوبہ بندی کی کہ روسیوں کو ضربات بھی پہنچیں اور انہیں پاکستان پر جوابی وار کرنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ بریگیڈئر یوسف رقمطراز ہیں:-

"جنرل اختر عبدالرحمان کے خیال میں افغان مزاحمت کی حمایت میں اسلام کا ہی نہیں، پاکستان کا دفاع بھی مضمر تھا۔ وہ کہتے تھے کہ افغان مزاحمت کو روسیوں کے خلاف پاکستان کے پیشگی دفاع کا حصہ بن جانا چاہئے۔ اگر افغانستان پر آسانی سے قبضہ کر لینے دیا گیا تو انہیں پاکستان میں داخل ہونے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی اور امکانی طور پر وہ صوبہ بلوچستان کے راستے آئیں گے۔ جنرل اختر نے گوریلا جنگ کے ذریعے روسیوں کی شکست کا ایک مضبوط اور مدلل کیس تیار کیا۔ ان کے خیال میں افغانستان کو روسیوں کے لئے ویت نام بنایا جاسکتا تھا یعنی جو حال ویت نام میں امریکیوں کا ہوا تھا۔ وہی حال افغانستان میں روسیوں کا ہوگا۔ انہوں نے ضیاء کو فوجی متبادل اختیار کرنے پر قائل کیا۔ مطلب یہ کہ پاکستان

اسلحے، گولہ بارود، روپے پیسے، تربیت، انٹیلی جنس اور کاروائی کے دوران ہدایات کی شکل میں گوریلوں کو خفیہ مدد فراہم کرے گا۔ اس پر مستزاد وہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے سرحدی علاقے افغان پناہ گزینوں اور گوریلوں کو پناہ گاہ کے طور پر مہیا کردے گا۔ ضیاء نے اس امر سے اتفاق کیا کہ اگر گوریلوں کو سرحد پار کوئی پناہ گاہ میسر نہ ہو تو اس قسم کی مہمات میں فتح حاصل نہیں کی جاسکتی"۔

بقول بریگیڈئر یوسف، ضیاء الحق نے افغانستان کو روسیوں کے لئے ویت نام بنانے کے فیصلے سے جو اتفاق کیا اس کے پس منظر میں صرف عالمی سلامتی کا خیال ہی کارفرما نہیں تھا۔ اپنی حکومت کی بقاء اور مسلمان دنیا میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی روایتی پاکستانی خواہش، اسلام کے ذریعے ملکی اتحاد کا حصول اور مغربی ممالک سے اقتصادی اور عسکری امداد کی وصولی جیسے مقاصد نے بھی ان کے فیصلے میں اہم محرکات کا کام دیا۔

1979ء میں ضیاء الحق نے اپنے سابقہ وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ یہ واقعہ دنیا بھر میں اضطراب کا باعث بنا اور عالمی سطح پر اس کی مذمت کی گئی۔ پاکستان کے اندر اور پاکستان سے باہر ان کا امیج بری طرح متاثر ہوا اور وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ ایک کمیونسٹ سپر پاور کے خلاف جہاد کی حمایت اور مدد (اگر چہ اس حمایت یا مدد کو سرکاری سطح پر کبھی تسلیم نہیں کیا گیا تھا) کو انہوں نے مغرب سے دوبارہ ہمدردی حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ امریکہ سے بھرپور مدد کی توقع کی گئی۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ناطے وہ اپنے مسلمان ہمسائے کی مدد کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ تمام مذہبی، سٹریٹیجک اور سیاسی محرکات ایک ہی سمت نشاندہی کرتے تھے۔ ضیاء کے لئے آخری محرک جنرل اختر عبدالرحمٰن کی یہ دلیل تھی کہ اگر سوویت یونین پاکستان کے خلاف براہ راست تصادم پر نہ اتر آئے تو فوجی حکمت حد درجہ جامع تھی۔ مطلب یہ کہ "پانی بہت زیادہ گرم نہ ہو جائے تو"۔ اسلام کے چیمپین کے طور پر ضیاء نے عرب دنیا میں بہت شہرت کمائی اور مغرب کے نزدیک وہ کمیونسٹ جارحیت کے خلاف چیمپین کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

اگر چہ پاکستان 1973ء سے افغان اسلام پسندوں کی پشت پناہی کر رہا تھا اور خفیہ امریکی امداد کا آغاز روس کی افغانستان میں فوجی مداخلت سے کئی ماہ قبل ہو چکا تھا۔ ضیاء الحق نے امریکی مذاکرات کاروں کو تاثر دیا کہ پاکستان کو روس کی طرف سے خطرہ لاحق تھا۔ انہوں نے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ روسیوں کے لئے ویت نام کی طرح دلدل بنانے کا موقع موجود ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ امریکہ پاکستان کے دفاع اور سلامتی کی ذمہ داری قبول کرے اور پاکستان جو تعاون کرے امریکہ اس کی مناسب قیمت ادا کرے۔ ضیاء الحق نے امریکہ سے یہ یقین دہانی بھی طلب کی کہ پاکستان کو بھارت کے ممکنہ حملے سے بھی بچایا جائے گا۔ جمی کارٹر کے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر برزنسکی نے پاکستان کو برملا یقین دہانی کرائی کہ "امریکہ پاکستان کی پشت پر رہے گا" اور 1959ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان ہونے والے دفاعی معاہدے کی شرائط اور شقوں پر بھی زور دیا۔ اس معاہدے میں واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ پاکستان پر کمیونسٹ حملے کی صورت میں امریکہ اس

کی مدد کو پہنچے گا۔ برزنسکی نے بعد میں لکھا کہ "پاکستانیوں کو خطرہ تھا کہ وہ روس کا اگلا ہدف ہوں گے"۔ لیکن برزنسکی نے واضح طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ بھارت کی طرف سے حملے کی صورت میں امریکہ کسی قسم کی مدد کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتا۔

روس کی طرف سے کسی ممکنہ فوجی کاروائی کا خوف پاکستان کو مجاہدین کی حمایت میں اضافے سے نہ روک سکا۔ برزنسکی کے دورہ پاکستان وسعودی عرب کے دوران ایک "وسیع تر خفیہ ایکشن پروگرام" زیر بحث آیا۔ بقول برزنسکی ضیاء الحق نے ان سے کہا کہ اول الذکر پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان تعاون کی اہمیت پر زور دیں۔ لہذا امریکہ نے سعودی عرب سے وعدہ لیا کہ وہ اسلحے کی خریداری میں پاکستان کو مالی معاونت مہیا کرے گا اور اس کے عوض پاکستان سعودی عرب کے دفاع کے لئے اپنی فوج بھجوائے گا۔ اہتمام کر لیا گیا کہ جتنی امداد امریکہ فراہم کرے گا۔ مجاہدین کو اتنی ہی امداد سعودی عرب دے گا۔ سی آئی اے کے رابرٹ گیٹس نے لکھا" جولائی 1980ء تک وہ خفیہ پروگرام ڈرامائی توسیع اختیار کر گیا۔ اس میں ہر قسم کا اسلحہ اور مجاہدین کے لئے فوجی مدد شامل تھی۔ مجاہدین کا پاکستان پر انحصار بہت بڑھ گیا۔ آخر الذکر اسلحے کی رسد بڑھانے پر متفق ہو چکا تھا"۔

افغانستان پر روسی حملے کے بعد چند ماہ کے اندر پاکستان نے اپنی خفیہ کاروائیوں کے لئے زیادہ مقدار میں امریکی مدد کے حصول کا اہتمام کر لیا۔ سعودی عرب نے بھی امریکہ کے برابر امداد دینا شروع کر دی۔ ضیاء الحق اپنی حکومت کے لئے بھی اقتصادی اور عسکری مدد کے خواہاں تھے۔ وہ امریکہ سے روس کے ساتھ براہ راست ٹکر لینے کا عوضانہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان نے افغانستان کے اندر مداخلت پر بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور مزید امریکی امداد کی امید پر ضیاء الحق اس مداخلت کی سطح میں اضافہ کرتے رہے۔ انہیں اپنی خفیہ کاروائیوں کے لئے امریکی امداد کے حصول پر کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ بلکہ امریکہ نے تو افغانستان پر روسی یلغار سے پہلے ہی پاکستان کو امداد دینا شروع کر دی تھی۔ پاکستان کے فوجی راہنما امریکہ کے ساتھ اتحاد کے نتیجے میں جن فوائد کی توقع رکھتے تھے۔ ضیاء الحق پاکستانی معیشت اور فوج کے لئے وہ بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ روسی توسیع پسندی کے خلاف جدوجہد میں مصروف فرنٹ لائن سٹیٹ کے فوجی حکمران کی حیثیت سے احترام اور جواز حکمرانی کے بیک وقت خواہاں تھے۔

کارٹر انتظامیہ نے ابتداء میں 40 کروڑ ڈالر کی اقتصادی اور عسکری امداد کا پیکج دیا جو پاکستان کی توقعات سے کم تھا۔ برزنسکی نے بجٹ کی قلت اور انسانی حقوق اور جوہری عدم پھیلاؤ کے حوالے سے پاکستان کے مشکوک ماضی کو امداد کے نسبتاً کم حجم کی وجوہ قرار دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے 18 جنوری 1980ء کو صحافیوں کے لئے بریفنگ کے دوران اس امریکی امداد کو "مونگ پھلی" کے نام سے موسوم کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ "یہ تو روس کے ساتھ مزید مخالفت مول لینے کے مترادف ہے جو اس خطے میں اس وقت امریکہ سے زیادہ رسوخ رکھتا ہے"۔ اپنے 18 جنوری کے بیان کے ذریعے دراصل ضیاء الحق اس سے کہیں زیادہ امریکی امداد کے حصول کے لئے سودے بازی کر رہے تھے۔

اگرچہ ضیاء الحق نے امریکی امداد کی برملا پیش کش کو ناکافی قرار دیا۔ تاہم وہ خفیہ امریکی اعانت قبول کرتے رہے۔ مجاہدین کی مدد کے لئے سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے درمیان تعاون تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ چند ماہ کے دوران سعودی عرب سے ملنے والی امداد کا حجم پاکستان کے افغان جہاد کی ضروریات کے حجم کے برابر ہوگیا۔ اگر ضیاء الحق روسیوں کے لئے پریشانی پیدا کرنے کے بعد واقعتاً پریشان ہوتے تو وہ پاکستان کے دفاع اور سلامتی کے لئے امریکی امداد کا مسئلہ حل کئے بغیر مجاہدین کے ساتھ اپنی وابستگی کی سطح میں اضافہ نہ کرتے۔ ضیاء الحق نے واضح طور پر اندازہ قائم کرلیا تھا کہ خفیہ امریکی تعاون امریکہ کے محکمہ دفاع میں پاکستان کی پوزیشن کو مضبوط بنانے میں ممد ثابت ہوگا اور مزید امداد کی راہ ہموار کردے گا۔

ضیاء الحق کا منصوبہ اس وقت ثمر بار ہوا جب 1980ء کے انتخابات کے نتیجے میں رونالڈ ریگن صدر امریکہ منتخب ہو گئے۔ ریگن انتظامیہ کو انسانی حقوق یا جوہری عدم پھیلاؤ کے حوالے سے پاکستان کے ریکارڈ کی کارٹر انتظامیہ کی نسبت کم پرواہ تھی۔ حکومت سنبھالنے کے بعد ابتدائی چند مہینوں کے دوران ہی ریگن انتظامیہ نے پاکستان کے لئے اقتصادی اور عسکری امداد کی مد میں 3 ارب 20 کروڑ ڈالرز مختص کر دیے اور طے پا گیا کہ یہ امداد آخر الذکر کو 5 سال کے دورانیے میں دی جائے گی۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ایک یادداشت میں اس امداد کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا گیا "اس طرح پاکستان کو اپنے دفاع کے حوالے سے ہمارے وعدوں پر اعتبار آ جائے گا اور امریکہ اس امداد کو اپنے علاقائی مفادات کے تحفظ کے عوض جوابی فوائد سمجھتا ہے"۔ امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ الیگزینڈر رایم ہیگ جونیئر نے پاکستانی حکام سے یہ تک کہہ دیا کہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے بارے میں امریکہ کے اندر جو تحفظات پائے جاتے ہیں وہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کے ضمن میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں کریں گے"۔ دوسرے لفظوں میں نئی امریکی انتظامیہ نے پاکستان تک اپنا یہ خفیہ پیغام پہنچا دیا کہ جب تک اسلام آباد ایٹمی دھماکہ نہ کرے۔ اس وقت تک پاکستان کا جوہری پروگرام امریکہ کے لئے قابل قبول رہے گا۔

پاکستان کے جوہری پروگرام کے باعث اس پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ امریکی کانگریس نے وہ اٹھا لیں اور پاکستان کی حکومت کو جلد ہی امریکی امداد ملنا شروع ہوگئی۔ یہ تبدیلیاں ریگن کے برسر اقتدار آنے کے بعد مختصر عرصے میں رونما ہوئیں۔ 1986ء میں امریکی امداد کے پروگرام پر نظر ثانی کی گئی اور 6 سال کے لئے اس مد میں امریکہ نے 4 ارب 2 کروڑ ڈالر مختص کر دیئے۔

امریکہ کی طرف سے عسکری امداد ملنے پر پاکستانی فوج خوش ہوگئی اور ضیاء الحق کے اقتدار کے تسلسل کے لئے حمایت میں اضافہ ہوگیا۔ امریکہ نے پاکستان کے قرضے بھی جزوی پر ری شیڈول یا معاف کر دئے۔ امریکی امداد ملنا شروع ہوئی تو دیگر مغربی اور عرب ممالک کی طرف سے بھی امداد موصول ہونے لگی۔ امریکہ نے سعودی عرب اور تیل کی دولت سے مالا مال ممالک کے ساتھ جو پاکستان کے دفاعی تعلقات استوار کرائے، ان کا ایک اضافی فائدہ ہوا۔ خلیج فارس کی ریاستوں میں

بے شمار پاکستانی کارکنوں کو روزگار مل گیا۔ جہاں اس وقت بڑے بڑے اور جسیم ترقیاتی منصوبے جاری تھے۔ پاکستانی تارکین وطن نے جو رقوم وطن بھجوائیں، وہ اور امداد کا بہاؤ یکجا ہو کر پاکستانی معیشت میں تیز رفتار ترقی کا باعث بن گئے۔

ضیاء الحق افغان جہاد کو اپنے دور حکومت کی پالیسیوں کا مرکز خیال کرتے تھے۔ جب امریکہ کے ساتھ پاکستان کے دفاعی رشتے مستحکم ہو گئے تو آخر الذکر کی طرف سے مجاہدین کو ملنے والی امداد کے معیار اور مقدار میں ڈرامائی اضافے کا مشاہدہ کیا گیا۔ افغانستان کے اندر ہونے والی لڑائی سے بچ کر سرحد پار پہنچنے والے پناہ گزینوں کے بہاؤ نے پاکستان کو اس قابل کر دیا کہ انہیں بڑی تعداد میں پشاور میں منظم کی جانے والی افغان مزاحمتی تنظیموں میں بھرتی کر سکے۔ اگرچہ مجاہدین کو اسلحہ اور روپیہ سی آئی اے کی طرف سے فراہم کیا جا رہا تھا۔ تاہم ان کی بھرتی، تربیت اور سیاسی کنٹرول کی ذمہ داریاں آئی ایس آئی کے ہاتھ میں رہیں۔ افغانستان میں کارروائیوں کے حوالے سے جو معاملات امریکہ اور پاکستان کے درمیان طے پائے، ان میں سی آئی اے کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے صحافی سٹیو کول لکھتا ہے:-

"ضیاء نے سی آئی اے کی رقوم اور اسلحے پر کنٹرول حاصل کرنا چاہا اور کامیاب رہے۔ وہ مصر تھے کہ مجاہدین کو بھیجا جانے والا ہر ڈالر اور ہر بندوق پاکستان کے ہاتھوں سے گزر کر جائے۔ یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا کہ کون سے گوریلوں کو امداد پہنچانی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سی آئی اے پاکستان کی سرزمین پر بیٹھ کر افغانستان کے لئے بادشاہ گر بنے۔ پہلے چار سال کے دوران ایسے روابط اور کارروائیوں کی تعداد بہت کم ہے جو سی آئی اے نے اپنے طور پر کیں۔ سی آئی اے کے پیچیدہ معاملات سے آگاہ رہنے کے لئے ضیاء اپنے بھوری آنکھوں والے معتمد، قابل بھروسہ اور سب سے بڑے جاسوس جرنیل اختر عبدالرحمٰن کا توسط استعمال کرتے تھے۔ آخر الذکر آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ضیاء نے اختر کو بتا دیا تھا کہ سی آئی اے سے کام لینا اور اسے پاس رکھ کر بھی اس سے دور رہنا ان کا کام تھا۔ اختر عبدالرحمٰن نے بعض ایسے ضوابط وضع کئے جن کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا گیا کہ افغان باغیوں کے ساتھ آئی ایس آئی ہی کا رابطہ رہے۔ کسی امریکی، سی آئی اے کے کسی نمائندہ یا اور کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ سرحد پار کرے اور جا کر مجاہدین سے ملے۔ پاکستان کے اندر اسلحے کی نقل و حمل اور افغان کمانڈروں کے مابین تقسیم کا کام آئی ایس آئی کے افسران کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا"۔

1980ء کے اواخر تک تقریباً 10 لاکھ افغان پناہ گزینوں کے طور پر پاکستان پہنچ چکے تھے۔ 1988ء تک یہ تعداد 30 لاکھ ہو گئی۔ ان پناہ گزینوں نے روسی حملے کے نتیجے میں پھیلنے والی شورش کے باعث افغانستان چھوڑا۔ جب مجاہدین کے گوریلا حملوں نے افغانستان کو روسیوں اور افغان کمیونسٹوں کے لئے غیر محفوظ بنا دیا تو چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں میں امن و امان کی صورت حال نازک ہو گئی۔ کچھ پناہ گزین مذہبی ذہن رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاشتکار تھے جنہوں نے کمیونسٹوں کے کفر سے بچنے کے لئے دیہی علمائے دین کے کہنے پر اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ متوسط درجے سے تعلق رکھنے

والے پیشہ وارانہ مہارت کے حاملین، زمیندار، چھوٹے دوکاندار، سرکاری ملازمین، شاہی فوج سے تعلق رکھنے والے افسران اور کاروباری لوگ بھی پاکستان اور ایران کی سمت رخ کرنے والے پناہ گزینوں کے سیل بے کراں کے ساتھ آن ملے۔

پاکستان نے افغان پناہ گزینوں کے لئے خیمہ بستیاں قائم کر دیں۔ایسی بستیاں زیادہ تر شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں قائم کی گئیں۔ پناہ گزینوں پر اٹھنے والے اخراجات بنیادی طور پر "اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین" نے ادا کئے۔ پناہ گزینوں کو بنیادی خدمات کی فراہمی کے لئے پاکستان کے ایک سول ملازم کو بھی کمشنر برائے افغان مہاجرین مقرر کیا گیا۔پاکستانی افسران نے مجاہدین کے گروہوں کو ایک غیر سرکاری فریضہ بھی سونپ دیا کہ جب پناہ گزین پاکستان پہنچیں تو ان کی رجسٹریشن کی جائے۔اس طرح امداد تک مہاجرین کی رسائی اور مجاہدین کی ان سات جماعتوں میں سے کسی ایک کی رکنیت کے درمیان تعلق پیدا ہو گیا جنہیں پاکستان نے تسلیم کر رکھا تھا۔جب پاکستان کے توسط سے امریکی اور سعودی امداد ملنا شروع ہوئی، اس وقت تک 1973ء سے فعال جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کے علاوہ بھی دو بنیاد پرست جماعتیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ایک تو "اتحاد اسلامی" تھی جس کے سربراہ وہابی عالم دین عبدالرب رسول سیاف تھے۔دوسری جماعت حزب اسلامی کا دوسرا دھڑا تھا جس کی سربراہی کے فرائض پشتون عالم دین یونس خالص ادا کر رہے تھے جو 1979ء میں حکمت یار کے گروہ سے الگ ہوئے تھے۔ان کے علاوہ تین اعتدال پسند گروہ بھی تھے جن کی قیادت ایسے قدامت پسند راہنما کر رہے تھے جو انتہا پسند اسلام پسندوں کے فلسفہ حیات سے متفق نہیں تھے۔ اگر چہ پاکستان نے ان سات گروہوں کو ہی کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن اس کی واضح وابستگی جمعیت اسلامی اور حکمت یار کی حزب اللہ کے ساتھ تھی۔ جن کے ساتھ وہ عرصہ دراز سے مل کر کام کر رہا تھا۔سیاف نے وہابی مسلک کے ساتھ اپنی وابستگی کے باعث سعودی عرب کی اشیر باد اور سرپرستی بھی حاصل کر لی تھی۔مغربی سفارت کار اور صحافی تین اعتدال پسند گروہوں کو ترجیح دیتے تھے۔لیکن کیونکہ پاکستان نے انہیں بہت کم روپیہ اور اسلحہ مہیا کیا لہذا ان کے سیاسی اور فوجی مقلدین کی تعداد محدود تھی۔

ابتداء میں پاکستان نے جن افراد کو مہاجرین کا کمشنر مقرر کیا۔ان میں سے ایک عبداللہ بھی تھے جن کا جماعت اسلامی کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔مجاہدین کے ساتھ آئی ایس آئی کے برتاؤ کے عین مماثل عبداللہ بھی یہی کوشش کرتے تھے کہ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں امداد دینے والے ممالک کا اثر و رسوخ محدود رہے۔ اگر چہ اصولاً پناہ گزینوں کے انصرامی معاملات کا جہاد یا فوجی سرگرمیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لیکن پناہ گزینوں کے کیمپ مجاہدین کے بھرتی مرکزوں میں تبدیل ہو گئے۔ پناہ گزینوں کے مذہبی اور سیاسی جذبات سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدین بھرتی کرنے والے افراد پناہ گزینوں کی احتیاجات سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔نوجوان پناہ گزینوں کو روزگار تو دستیاب نہیں تھا لیکن مجاہدین کے طور پر ملازمت کی پیش کش کی جاتی تھی۔آہستہ آہستہ پاکستانی حکام نے پناہ گزینوں میں ایسا تعلیمی نظام متعارف کرا دیا

کہ نوجوان افغانوں نے "جہادی کاز" اپنالی اور اسلام پسندوں کے فلسفہ حیات سے اتفاق کرنا شروع کر دیا۔ ضیاء الحق نے سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے اسلام پسندوں کے عطیات کی حوصلہ افزائی بھی کی تا کہ افغان پناہ گزینوں اور پاکستانی عوام کے لئے مساجد اور مدرسے تعمیر کئے جا سکیں۔

افغان جہاد جوں جوں وسعت اختیار کرتا گیا، پاکستان کے اندر اسلام پسندانہ نظریات کے اثرات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ضیاء الحق کے ذہن میں یہ بات ہر وقت رہتی تھی کہ افغان پناہ گزینوں اور مجاہدین پر ان کا کنٹرول برقرار رہے۔ لہذا وہ اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی ہی وہ واحد پاکستانی جماعت نہ ہو جو ان کے ساتھ اپنے روابط رکھے۔ بارسوخ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علمائے دین پر مشتمل "جمیعت العلمائے اسلام" کا ایک دھڑا بھی عرب ممالک سے موصول ہونے والے عطیات کی تقسیم میں شامل ہو گیا۔ ان عطیات سے مدرسے بھی قائم کئے گئے۔ اپنے "پین اسلامک" جوش و خروش کے تحت ضیاء الحق نے دنیا بھر سے رضا کاروں کو پاکستان آ کر مجاہدین کے ہمراہ تربیت حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔ 1984ء میں شمالی افریقہ کے ملک مراکش سے لیکر جنوبی فلپائن میں منڈاناؤ تک کے اسلام پسند پاکستان پہنچ گئے۔ ان میں سے بعض نے پاکستانی مدرسوں میں اپنا نام درج کرالیا اور بعض کا اندراج اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ہو گیا۔ علاوہ ازیں "مورو اسلامک لبریشن فرنٹ" (یہ گروپ فلپائن کے مسلمان علاقوں میں اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا) اور "روہنگیا مسلم لبریشن فرنٹ" (یہ گروہ برما کی مسلمان اقلیت کے لئے خود مختاری کے حصول کے لئے کوشاں تھا) جیسی تنظیموں نے اسلام آباد میں اپنے دفاتر کھول لئے۔ ان کا مقصد اپنے نصب العین کے حصول کے لئے آزادانہ بیانات دینا اور فنڈز اکٹھے کرنا تھا۔ تاہم یہ دفاتر زیادہ بڑے نہیں تھے۔

ان بین الاقوامی مجاہدین نے سعودی عرب میں تشکیل دی جانے والی تنظیم "رابطہ العالم الاسلامی" سے سرمایہ حاصل کیا۔ "رابطہ" نے عرب "اخوان المسلمین" کے ارکان کو مالی اعانت کے ذریعے اس قابل کر دیا کہ وہ پاکستان تک سفر بھی کر سکیں اور مہاجرین اور مجاہدین سے ملکر کام بھی کریں۔ "موتمر العالم اسلامی" نے جو 1949ء میں پاکستان میں سابق مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی کی قیادت میں تشکیل دیا گیا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیاء کے مسلمانوں کے ساتھ رابطے کئے۔ موتمر کے قیام کے بعد سے حکومت پاکستان اسے معمولی سی سالانہ گرانٹ فراہم کر رہی تھی۔ جب افغان مجاہدین کے لئے امریکہ اور سعودی عرب کی طرف سے امداد کا بہاؤ شروع ہوا تو موتمر کی گرانٹ میں اضافہ ممکن ہو گیا اور اسلام آباد کی بڑی مسجد اس کے حوالے کر دی گئی تا کہ وہاں وہ اپنا صدر دفتر قائم کر لے۔ "موتمر العالم اسلامی" جہاد کے پیغام اور اسلامی مقاصد کے لئے پاکستان کی کوششوں کو دنیا بھر میں پھیلانے میں ممد ثابت ہوا۔

ان دنوں جو اہم ترین شخصیت پاکستان پہنچی وہ فلسطینی دانشور عبداللہ عظام تھے۔ انہوں نے افغان جہاد میں غیر ملکی مجاہدین کی شرکت کے لئے "مکتب الخدمات" قائم کیا اور مسلمانوں کو قرآن اور حدیث کے ذریعے یاد دہانی کرائی کہ جہاد

کے ساتھ تعاون ان کے فرائض میں شامل ہے۔ جن لوگوں نے عظام کی آواز پر لبیک کہا ان میں ایک خوشحال اور متمول سعودی خاندان کا چشم و چراغ اسامہ بن لادن بھی شامل تھا۔ عظام 1984ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور "مکتب الخدمات" کو فنڈز فراہم کرنا شروع دیئے۔ ان کی خدمات کے نتیجے میں جہادی سرگرمیوں کے لئے بھرتی ہونے والے غیر ملکیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

ان دنوں جو مغربی صحافی افغانستان پر رپورٹنگ کر رہے تھے ان کی نظر افغان مہاجرین کے لئے ریلیف ورک پر ہی ٹھہرتی تھی کیونکہ اس میں مغربی ممالک کی حکومتیں اور این جی اوز اہم کرار ادا کر رہی تھیں۔ افغان جہاد کو وہ افغانوں کی جدوجہد آزادی کا نام دیتے تھے اور اس میں سی آئی اے کا کردار نمایاں کر کے پیش کرتے تھے۔ افغانوں کے لئے جو کاوشیں امریکہ کی سربراہی میں کی جارہی تھیں ان کے متوازی اسلام پسندوں نے کتنے عطیات جمع کئے اور کتنی رقم خرچ کی، کوئی نہیں جانتا۔ ان غیر ملکی مجاہدین کی تعداد کے بارے میں بھی قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا جو ان دنوں پاکستان کے راستے افغان جہاد میں شرکت کے لئے گئے۔ آئی ایس آئی واحد تنظیم تھی جسے روس مخالف جہاد میں شریک ہونے والے مغربی ممالک کے باشندوں اور اسلام پسندوں کی تعداد کا علم تھا۔ کیونکہ تمام جہادی معاملات اسی کے ہاتھ میں تھے۔

اگرچہ ضیاء الحق افغان جہاد کے لئے امریکی سرمائے اور اسلحے کے حصول کے شدید خواہاں تھے تاہم انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ امریکی مقاصد ان مقاصد سے مختلف تھے جن کا انہوں نے پاکستان کے نصب العین کے طور پر تعین کر رکھا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بعض مقاصد وہ وفاداروں اور معتمدین کے ایک مختصر سے گروہ کی مدد سے ہی حاصل کر سکتے تھے۔ اس حوالے سے صحافی ضیاء الاسلام انصاری ضیاء کی شاطرانہ سوچ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:-

"بطور ایک پاکستانی سپاہی اور عملی مسلمان ضیاء الحق پر وثوق تھے کہ اسلامی تصورات کو پاکستان کی سماجی زندگی میں اس حد تک رسوخ حاصل ہونا چاہئے کہ جو لوگ اس ملک کو لادینیت اور سوشلزم کی طرف لے جانا چاہتے ہیں ان کے ارادے ناکام ہو جائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان اسی صورت میں ایک خود کفیل، مستحکم اور مضبوط ملک بن سکتا ہے اگر اسے اسلامی دنیا، جنوبی ایشیاء اور مغربی ایشیاء میں اہم اور مضبوط مقام حاصل ہو اور وہ اس قابل ہو کہ ملحقہ ملکوں اور خطوں میں تجدید اسلام کی تحریکوں کو تقویت دے سکے۔ انہیں یہ ادراک بھی تھا کہ مشرقی پاکستان کے نقصان نے پاکستان کو مشرق بعید سے دور کر دیا تھا۔ پاکستان کے اس متوقع دائرہ اثر میں ایران اور وسطی ایشیاء میں مسلمانوں کی اکثریت کی حامل سوویت ریاستوں سمیت افغانستان سے ترکی تک کا علاقہ شامل تھا"۔

انصاری کے خیال میں ضیاء الحق وہ شخص تھے جن کے خیال میں ملک کے اندر اسلامائزیشن کے حوالے سے ان کی پالیسیاں پاکستان کو ان لوگوں کے مقابلے مضبوط کر دیں گی جو پاکستان کو اسلام سے دور لے جانے کی سازشیں کر رہے

ہیں۔ اسلامی اصولوں کو ملکی آئین اور قوانین کا حصہ بنا کر وہ اس دن تک پہنچنے کی راہ ہموار کر رہے تھے جب معاشرے کے نسبتاً چھوٹے یا نچلے طبقات مزید اسلامائزیشن کے حق میں متحرک ہو جائیں گے۔ ساتھ ساتھ افغان جہاد پاکستان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ ایک ایسا اسلامی نظریاتی بلاک تخلیق کر سکے۔ جو ایک قدرتی اسلامی انقلابی تحریک کا ذریعہ بن جائے۔ ایسی تحریک جو بغداد پیکٹ جیسے مصنوعی معاہدوں کی جگہ سنبھال لے اور ایشیاء اور افریقہ کے مسلمانوں کی عظمتوں کے ایک نئے دور کے آغاز کا باعث بن جائے۔

ایک طرف ضیاء الحق افغانستان میں اپنے نظریاتی خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف امریکہ کے مقاصد مخصوص اور کسی حد تک محدود تھے۔ امریکہ افغانستان میں روس کے اس رسوخ کا خاتمہ چاہتا تھا جو تیسری دنیا میں اس کے وسیع تر اثر و نفوذ کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے نزدیک جہاد افغانستان خفیہ جنگوں میں محض سب سے بڑی جنگ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ دوسری یعنی چھوٹی جنگیں نکارا گوا اور انگولا میں لڑی جا رہی تھیں۔ مقصد سوویت یونین کو سزا دینا تھا۔ اسے بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچانا اور اس کی شہرت کو ممکنہ حد تک خراب اور داغدار کرنا تھا۔ سی آئی اے کے اعداد و شمار کے مطابق 1981ء سے 1986ء تک افغانستان۔ نکارا گوا اور انگولا میں روس نے 13 ارب ڈالرز خرچ کئے۔ افغانستان میں 18000 روسی ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔ جبکہ امریکہ نے 1981ء اور 1989ء کے درمیان خفیہ امداد کی صورت میں افغان مزاحمت پر صرف 2 ارب ڈالرز خرچ کئے اور روسیوں کے ساتھ "پراکسی" جنگوں میں اس کا کوئی فوجی ہلاک نہیں ہوا۔

جب امریکہ نے 1986ء میں مجاہدین کو زمین سے فضا میں مار کرنے والے جدید مزائل فراہم کرنے کا فیصلہ کیا تو روس کو فضائی قوت کی صورت میں مجاہدین پر جو برتری حاصل تھی وہ غیر موثر ہو کر رہ گئی۔ عالمی میڈیا میں مجاہدین کو "حریت پسند" کا نام دیا گیا اور ان کی فتوحات روس کی توہین کی علامت بن گئیں۔ 88-1987ء تک امریکہ نے افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کر لئے اور اصلاح پسند میخائل گورباچوف کی قیادت میں روسی افغانستان کی دلدل سے نکلنے کے لئے مذاکرات پر آمادہ ہو گئے۔

ضیاء الحق نے 1985ء میں پاکستان میں پارلیمانی انتخابات کرائے اور ایک سویلین کو وزیر اعظم نامزد کر دیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ایک کمزور آدمی ہے اور ان کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے گا۔ نئے وزیر اعظم محمد خان جونیجو آہستہ آہستہ پریس کی آزادی میں اضافہ کرتے رہے اور مارشل لاء اٹھانے کا مطالبہ کر دیا۔ اگرچہ ضیاء الحق نے ایک سال تک محمد خان جونیجو کو افغانستان کے بارے میں بریفنگز سے دور رکھا۔ تاہم آخر الذکر نے خارجہ پالیسی میں مداخلت کر دی۔ 1986ء میں جونیجو امریکہ گئے اور امریکی مذاکرات کاروں سے کہا کہ اگر افغانستان کا مسئلہ گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ امریکی موقف کی حمایت کریں گے۔ انہوں نے اپنے وزیر مملکت برائے امور خارجہ زین نورانی کو ہدایت جاری کر دی کہ

بیرون ملک جن سفارت خانوں سے جتنے تار موصول ہوں وہ صدر سے پہلے انہیں دکھائے اور پڑھائے جائیں۔ نورانی بھی جونیجو کی طرح ایک سیاستدان تھے لہذا انہوں نے بھی اس ضرورت سے اتفاق کیا کہ عالمی تعلقات میں سویلین حکومت کا کردار زیادہ ہونا چاہئے۔ یہ معمول ختم ہوگیا کہ سفارتی تبدیلیوں اور پیش رفتوں کی اطلاع ہر حالت میں پہلے صدر ضیاء کو پہنچائی جائے۔

ضیاء الحق نے جس وزیر اعظم کو معزول کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ جونیجو نے 1986ء میں اسی کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو جلاوطنی ختم کر کے پاکستان آنے کی اجازت دیدی۔ بے نظیر بھٹو کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ جلاوطنی کے دوران بے نظیر بھٹو نے مغربی صحافیوں، سفارتکاروں اور امریکی کانگریس کے کچھ ارکان پر اپنا خوشگوار تاثر چھوڑا تھا۔ اگرچہ مس بھٹو نے امریکہ پر تنقید کے حوالے سے احتیاط کا دامن تھامے رکھا۔ تاہم انہوں نے پاکستان کی افغان پالیسی کے پس پردہ منطق کو برملا اور کھلم کھلا چیلنج کردیا۔

جب تک ضیاء الحق نے اختلاف رائے کو چھپائے اور دبائے رکھا۔ افغان جنگ کے خلاف پاکستانی رائے عامہ کا محرک ان کے اندازوں میں شامل نہیں تھا۔ لیکن جب افغان جنگ میں پاکستان کے کردار کے خلاف رائے عامہ کا کھلم کھلا اظہار ہونے لگا تو اسلام پسند جماعتوں کی طرف سے ملنے والی حمایت ضیاء الحق کے لئے ناکافی ہوگئی۔ افغان مہاجرین جن کی تعداد اس وقت 30 لاکھ تک پہنچ چکی تھی وہ پاکستان کا سیاسی توازن خراب کرنے لگے اور ان کی موجودگی نے کئی سماجی مسائل کو جنم دیدیا۔ پاکستان اوسطاً سالانہ 20 ہزار افغان مہاجرین کو تربیت دے رہا تھا۔ (بمطابق سرکاری اعداد و شمار) پاکستان کی اسلام پسند جماعتیں بھی افغان مجاہدین کے ساتھ ساتھ اپنے وابستگان کو تربیت دلا رہی تھیں۔ نتیجتاً سیاسی تصادم شروع ہوگئے۔ خصوصاً کالجوں کے کیمپس سیاسی تصادموں کا مرکز بن گئے۔ بھاری مقدار میں جو اسلحہ افغان مجاہدین تک پہنچتا تھا وہ مختلف ملکوں سے سیدھا کھلی مارکیٹ میں آنے لگا اور "برائے فروخت" ٹھہرا۔ پاکستان اور افغانستان کی سرحد سے متصل علاقہ افیون اور ہیروئن سمیت ہر قسم کی اجناس کی سمگلنگ کا مرکز بن گیا۔ یہ الزامات زد زبان خاص و عام ہوگئے کہ آئی ایس آئی کے افسران اور اہلکاران نے جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ اسلحے اور منشیات کا کاروبار سر عام شروع کردیا۔ پاکستان کے کئی شہروں میں امن و امان کی صورت حال ابتر ہوگئی۔ کئی پاکستانی اس صورت حال کا ذمہ دار افغان جنگ کو ٹھہرا رہے تھے۔ اس دوران امریکہ اور روس افغانستان پر معاہدے کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت تک عام پاکستانی سمجھوتے کے لئے تیار ہوگئے۔

امریکی سفارت کاروں نے جونیجو کی حوصلہ افزائی کی اور انہوں نے اپریل 1988ء میں افغانستان سے روسی فوجوں کی دست برداری کا وہ معاہدہ قبول کرلیا جو اقوام متحدہ نے مذاکرات کے بعد تشکیل دیا تھا۔ ضیاء الحق اور آئی ایس آئی مصر تھے کہ ایسا کوئی بھی معاہدہ قبول کرنے سے قبل اس امر کا تعین حد درجہ ضروری تھا کہ روسیوں کی رخصتی کے بعد افغانستان پر حکمرانی کون کرے گا؟۔ تاہم جنیوا میں طے پانے والے سمجھوتوں میں یہ مسئلہ حل طلب چھوڑ دیا گیا۔ امریکی حکام کا خیال تھا کہ روسیوں کے نکل جانے کے بعد پی ڈی پی اے کی حکومت چند ہفتوں کے اندر مجاہدین کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی۔ ضیاء الحق کو یقین تھا کہ مجاہدین آپس میں لڑنا ترک کردیں گے۔

ضیاء الحق کو سب سے زیادہ یہ فکر لاحق تھی کہ افغانستان سے روسی فوج کی رخصتی کے بعد امریکہ اول الذکر کی اس سوچ سے اتفاق نہیں کرے گا جس کے تحت وہ ایک ایسا افغانستان چاہتے تھے جو پاکستان کے ساتھ قریب ترین اور بہترین مراسم رکھے۔ ضیاء الحق کو امید تھی کہ وہ روس اور امریکہ کی مسلح باہمی چپقلش کے دوران ہی افغانستان پر کوئی سیاسی حل مسلط کر دیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہوں نے اپنے پسندیدہ افغان راہنما گلبدین حکمت یار کو افغان مجاہدین کی مخلوط حکومت کے سر پر بٹھا کر جس طرح امریکہ کے ہاتھوں روس کی شکست کا اہتمام کیا تھا۔ اول الذکر کو اس کی محنت کا صلہ دلا دیں۔ امریکہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف اس بات پر قناعت کرنا چاہتا تھا کہ روسیوں کے افغانستان سے نکلنے کے بعد اپنی فتح کا اعلان کر دے۔

بالآخر ضیاء الحق نے عوامی سطح پر جینوا سمجھوتوں سے اتفاق کر لیا جن کے تحت سوویت فوج کے افغانستان سے اور افغان پناہ گزینوں کے پاکستان سے واپس جانے اور افغانستان سے سوویت فوجوں کی واپسی اور دونوں سپر طاقتوں کی طرف سے افغانستان میں اپنے اپنے موکلین کو اسلحے کی آخری کھیپ کی ترسیل کے لئے ڈیڈ لائن مقرر کر دی گئی۔ ڈیڈ لائن دینے کا مقصد یہ تھا کہ آئی ایس آئی سی آئی اے سے اسلحے کی ایک اضافی کھیپ وصول کر سکے۔ اس اسلحے کا یہ استعمال طے پایا کہ اس کی مدد سے مجاہدین کابل میں روس کی نصب کردہ نجیب اللہ حکومت سے چھٹکارہ حاصل کر سکیں گے۔

مئی 1988ء میں ضیاء الحق نے افغانستان سے روسی فوج کی واپسی کے بعد افغان جہاد کے آخری مرحلے کے لئے امریکی اسلحے کی بڑی کھیپ وصول کر لی تو انہوں نے پارلیمنٹ کو تحلیل اور محمد خان جونیجو کی حکومت کو معزول کر دیا۔ ان اقدامات نے اس قدامت پسند مخلوط سیاسی اتحاد کو منقسم کر دیا جو ضیاء کی دس سالوں پر محیط کاوشوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اسلام پسند گروہ خصوصاً جماعت اسلامی عوامی سطح پر جنرل ضیاء کی طرف سے طاقت کے اس آخری اظہار سے متفق نہیں تھی۔ ضیاء ملک کے اندر بھی سیاسی اعتبار سے تنہا ہو گئے اور امریکی امداد بھی غیر یقینی ہو گئی۔ ضیاء نے آئی ایس آئی کی مدد سے ایک ریفرنڈم کی منصوبہ بندی کی جس کے ذریعے وہ پاکستان کی اسلامائزیشن کے عمل کی تکمیل کے لئے حتمی اور قطعی اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

17 اگست 1988ء کو ضیاء اور ان کے کلیدی جرنیل طیارے کے ایک پراسرار حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ مرنے والوں میں پاکستان میں امریکی سفیر اور افغان جہاد کے معمار جنرل اختر عبدالرحمٰن بھی شامل تھے۔ جنہیں کچھ عرصہ قبل جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی تھی۔ ان کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ضیاء الحق کے جانشین ہوں گے۔ جو لوگ پاکستان کی اسلامائزیشن اور اسلامی احیاء کے حوالے سے ضیاء الحق کی پالیسیوں سے متفق تھے انہوں نے محسوس کیا کہ افغان مجاہدین ایک ہی ضرب میں اپنے دو بارسوخ ترین سرپرستوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ضیاء الحق کی موت کے باوجود پاکستانی فوج نے جہاد یا افغانستان میں رسوخ حاصل کرنے کی حکمت عملی کو ترک نہیں

کیا۔ افغانستان پر ہونے والے جینوا سمجھوتوں کے مذاکرات کے دوران پاکستانی اور امریکی مفادات میں جو تقسیم نظر آئی تھی اس نے امریکی ارادوں کے بارے میں پاکستان کے دفاعی شعبے کو ہمیشہ سے زیادہ مشکوک کر دیا۔ ضیاء الحق کی جان لینے کے لئے جن ممکنہ سازشوں کا جائزہ لیا گیا۔ ان میں امریکہ پر بھی شک کا اظہار کیا گیا۔ آئی ایس آئی کے ایک سابقہ افسر نے لکھا:۔

["امریکی حکومت نے ضیاء کی موت پر چند حقیقی آنسو بہائے۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا موقف تھا کہ ضیاء اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ روسیوں کے افغانستان سے رخصت ہو جانے کے بعد امریکیوں کی ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ کابل کی کمیونسٹ حکومت کی جگہ اسلامی بنیاد پرست برسر اقتدار آ جائیں۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ ضیاء یہی چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں ضیاء ایران سے براستہ افغانستان پاکستان تک پھیلا ہوا ایک مضبوط اسلامی بلاک تشکیل دینا چاہتے تھے۔ جس کے اندر بالآخر روس کے ازبک۔ ترکمانی اور تاجک صوبے بھی شامل ہو جائیں گے۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک اس وسیع و عریض علاقے کا 'سبز' ہونا افغانستان کے 'سرخ' ہو جانے سے بھی بدتر تھا"]

جو بڑی خفیہ کاروائیاں اور امدادی پیکج پاکستان اور امریکہ کے درمیان قریبی تعلقات کی بنیاد بنے۔ وہی دونوں ملکوں کے درمیان فاصلوں میں اضافے کا باعث بن گئے۔ سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد کے دوران اسلام پاکستان کی سرکاری پالیسیوں کا اہم محرک بن چکا تھا۔ آئی ایس آئی کا حجم بہت بڑھ چکا تھا۔ اس کی خفیہ کاروائیوں کی صلاحیت 10 گناہ ہو چکی تھی۔ پاکستان کی ملکی اور خارجہ پالیسیوں میں یہ ادارہ اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ اسلام پسند گروہ پاکستان کی فوج اور سیکیورٹی سروسز کے ساتھ گہرے مراسم استوار کر چکے تھے اور ان پر اثر انداز بھی ہو رہے تھے۔ اسلام پسندوں نے پاکستان کی قومی سلامتی کا ایجنڈا بڑی وفاداری سے اپنا رکھا تھا اور نتیجتاً ان افسران کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی جو اسلام پسندوں کے اس نقطہ نظر سے متفق تھے کہ اس ریاست کو "مزید مذہبی" ہونا چاہیئے۔

جس طرح پاکستان اپنے معرض وجود میں آنے کے وقت سے امریکی امداد کا خواہاں تھا اسی طرح وہ اب بھی چاہتا تھا کہ امریکہ اقتصادی اور دفاعی شعبے میں اس کی مدد کرے۔ لیکن پاکستان کے فوجی افسران ہمیشہ سے زیادہ اس بات پر قائل ہو چکے تھے کہ انہیں اپنے لائحہ عمل کا تعین خود کرنا چاہیئے اور امریکہ اور پاکستان میں تعلقات کی واحد عملی بنیاد یہ ہو کہ دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کریں۔ پاکستان کی فوجی قیادت کا خیال تھا کہ اگر پاکستان کے قول و فعل میں تضاد بھی ہو تو امریکہ کو اس کے ساتھ گزارہ کرنا پڑے گا اور پاکستان نے اپنے لئے خطے اور دنیائے اسلام کی قیادت کا جو کردار چنا تھا وہ اس سے کم پر قناعت یا سمجھوتہ نہیں کرے گا۔

دیگر ذرائع سے فوجی حکمرانی

اپنی موت کے وقت ضیاء الحق ہر طرح اور کاملاً با اختیار تھے۔ وہ صدر پاکستان ہونے کے ساتھ ساتھ آرمی چیف بھی تھے۔ کسی نے ان کی اچانک موت کی صورت میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کر رکھی تھی۔ 1973ء کے آئین میں ضیاء الحق کی طرف سے کی گئی ترمیم کے مطابق بالواسطہ طور پر منتخب سینیٹ کے چیرمین غلام اسحاق خان تھے۔ وہ انتہائی سنیر اور بزرگ بیوروکریٹ اور صدر ضیاء کے معتمد ترین سویلین ساتھی تھے۔ جب ضیاء الحق کی موت کی تصدیق ہوگئی تو اس کے فوراً بعد وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ نے انہیں جی ایچ کیو آنے کی دعوت دی۔ اگرچہ وہ ملاقات فوجی ہیڈ کوارٹر میں ہوئی۔ لیکن چونکہ غلام اسحاق خان نے جرنیلوں کی برتری کو ذہنا تسلیم کر رکھا تھا۔ لہذا ملاقات کے دوران دونوں نے پاکستان کی مستقل اسٹیبلشمنٹ کی نمائندگی کی۔ اس ملاقات کے فوراً بعد غلام اسحاق خان صدر پاکستان بن گئے اور اسلم بیگ نے آرمی چیف کا عہدہ سنبھال لیا۔

ضیاء الحق کے لئے سرکاری سطح پر بہت بڑے جنازے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ان کے حامیوں اور افغان پناہ گزینوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا۔ اسحاق خان اور بیگ پاکستان کو درپیش چیلنجوں سے نبرد آزما ہو گئے۔ اگرچہ انہوں نے تبدیل شدہ حالات کے تناظر میں بہت غور کیا تاہم اسٹیبلشمنٹ کی دونوں شخصیتیں اس حق میں تھیں کہ پاکستان کی روایتی پالیسیوں کو برقرار رکھا جائے۔ افغانستان سے روس کی دست برداری قریب الوقوع تھی۔ لہذا 1992ء کے بعد امریکی امداد کے جاری رہنے کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی اور 4 ارب 2 کروڑ ڈالرز کے جس امریکی امدادی پیکج پر عملدرآمد کا آغاز 1986ء میں ہوا تھا۔ 1992ء اس کا آخری سال تھا۔ پاکستان اور امریکہ کے درمیان اس سوال پر اختلافات پائے جاتے تھے کہ کابل کی کمیونسٹ حکومت کی جگہ کس قسم کی حکومت کو لینی چاہیے کیونکہ افغانستان میں اس کے مفادات ماند پڑ چکے تھے۔ لہذا امید کی جا رہی تھی امریکہ نے جن دو معاملات یعنی جوہری پھیلاؤ اور جمہوریت کے فقدان کو گذشتہ کئی سالوں سے نظر انداز کر رکھا تھا ان کے حوالے سے وہ پاکستان پر اپنا دباؤ بحال کر دے گا۔

اسحاق خان اور اسلم بیگ نے افغانستان کے اسلام پسندوں کی پشت پناہی پر مبنی ضیاء الحق کی پالیسی کو اس امید پر جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا کہ کچھ عرصہ بعد امریکہ کو قائل کر لیں گے کہ وہ پاکستان کو اپنی منتخب کردہ راہ پر چلنے دے۔ اگرچہ بیگ اپنی نجی زندگی میں ضیاء الحق بلکہ اسحاق خان جتنے بھی شعائرِ اسلامی کے پابند نہیں تھے۔ تاہم پاکستان کے تشخص اور شناخت کے طور پر اسلام اول الذکر اور آخر الذکر کے درمیان کبھی مسئلہ نہیں بنا۔ جن مسائل نے ضیاء الحق کے جڑواں جانشینوں کو فکر مند کر رکھا تھا۔ ان کا تعلق پاکستان کی دفاعی پالیسی سے تھا۔ ضیاء الحق کی زندگی میں بھی اسلم بیگ کا موقف ہوا کرتا تھا کہ پاکستان امریکہ کے سامنے جرات اور حوصلے سے کام لے۔ بقول بیگ "اس مضطرب خطے میں امریکہ اپنے واحد اتحادی کو نظر انداز کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا"۔

جنرل بیگ اس بات پر بھی پختہ یقین رکھتے تھے کہ پاکستان کی جوہری صلاحیت اس کا سب سے بڑا اسٹریٹیجک اثاثہ ہے۔ جنرل بیگ کا خیال تھا کہ امریکہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں ختم کرانے کے لئے جوہری پروگرام کو ملتوی کرنے کی بجائے اس کی رفتار بڑھا دی جائے اور اس کا برملا اظہار کر دیا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جوہری طاقت سے مسلح پاکستان پاک امریکہ تعلقات میں کشیدگی کا باعث بننے کی بجائے تعلق میں تسلسل کے لئے ایک اور بنیاد فراہم کر دے گا اور پاکستان کی مدد ہی میں امریکیوں کا مفاد مضمر ہوگا اور اگر پاکستان اپنی اسی راہ پر چلتا رہا تو امریکہ اس بات پر بھی رضامند ہو جائے گا کہ اول الذکر افغانستان میں اپنی مرضی کے مطابق قیادت کو برسر اقتدار لے آئے۔ وہ ایک اور پہلو سے بھی سوچتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر پاکستان جمہوریت کی طرف پیش رفت کا اظہار کر دے تو اپنی جوہری طاقت کے بارے میں پرعزم ہونے کا جواز بھی پیدا کر لے گا۔

لیکن بیگ کو اس امر کا ادراک بھی تھا کہ ملک پر اپنے ایک جرنیل کی گیارہ سالوں پر محیط آمریت کے نتیجے میں بطور ایک ادارہ فوج اپنی مقبولیت کھو بیٹھی تھی۔ ضیاء الحق کی موت سے چند دن قبل جی ایچ کیو کے قریب ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے عوام کے فوج مخالف جذبات کو ہوا دی۔ ایک باوردی جونیئر فوجی افسر کو ایک ٹریفک حادثے کا ذمہ دار خیال کرتے ہوئے پیٹا گیا۔ اچانک اکٹھا ہو جانے والے ایک ہجوم نے اس فوجی افسر کو پیٹنے کے بعد ملک پر فوجی تسلط کے خلاف نعرے بھی لگائے۔ اس نوعیت کے واقعات سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ آئندہ ملک پر براہ راست فوجی حکمرانی کی حوصلہ شکنی کی جاتی۔ فوج اقتدار اپنے پاس رکھ سکتی تھی لیکن اس کے لئے اسے استیصالی رویہ اپنانا پڑتا۔ پاکستان میں پہلے اس نوعیت کے رویے کا تجربہ نہیں کیا گیا تھا اور زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ فوج کے سخت رویے کو عوام قبول ہی نہ کرتے۔ دوسرا متبادل یہ تھا کہ حکومت کے چہرے کو سویلین بنا دیا جائے۔ اس طرح فوج اس عوامی نفرت سے محفوظ رہتی جو سویلین زندگی میں باوردی لوگوں کی مداخلت کے باعث جنم لیتی ہے۔

فوج کی کرشمہ زائی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ میجر جنرل شیر علی خان نے 1969ء میں یحییٰ خان کو بتا دیا تھا کہ فوج اس وقت تک ہی ملک پر حکومت کر سکے گی جب تک عوام اسے ایک "پراسرار تشخص" اور "جادوئی طاقت" سمجھتے رہیں گے۔

ان کے ذہن میں ہوگا کہ فوج مصیبت کے وقت ان کے کام آئے گی اور اس کی نجات دہندہ ثابت ہوگی۔ جنرل بیگ کے خیال میں فوج کے مفاد میں یہی تھا کہ وہ ایک سویلین حکومت کا تاثر دے یعنی لوگ یہی سمجھیں کہ ان پر فوجی نہیں بلکہ سویلین حکمران حکومت کر رہے ہیں۔ بیگ نے فیصلہ کیا کہ سلسلہ وہیں سے شروع کیا جائے جہاں سے ٹوٹا تھا اور غلام اسحاق خان کو اجازت دے دی کہ وہ پارلیمانی انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیں۔ آئی ایس آئی نے "اسلامی جمہوری اتحاد" (آئی جے آئی) کے نام سے ایک مخلوط اتحاد تشکیل دیدیا۔ یہ اتحاد اسلام پسندوں اور فوج کی "پراکسی" ثابت ہوا۔ ادھر سویلین راہنما انتخاب لڑنے میں مصروف ہوگئے اور ادھر بیگ نے عوام کی نظروں میں فوج کے وقار کی بحالی کا کام شروع کر دیا۔

1988ء کے انتخابات کی مہم کے آغاز پر ہی بے نظیر بھٹو اور پی پی پی کو ملنے والی حمایت وسیع البنیاد تھی۔ ضیاء الحق کی گیارہ سالہ حکمرانی کے بعد پی پی پی کو تبدیلی لانے والی جماعت سمجھا گیا۔ آئی جے آئی کو ایسے افراد اور جماعتوں پر مشتمل اتحاد خیال کیا گیا جو جنرل ضیاء کی حامی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آئی جے آئی برسر اقتدار آنے کے بعد ضیاء کی پالیسیوں کو جاری رکھے گا۔ آئی ایس آئی نے نہ صرف آئی جے آئی کو فنڈز فراہم کیے بلکہ اس کے ایماء پر غلیظ حیلوں حربوں پر مبنی انتخابی مہم بھی چلائی۔ بیگ نے بے نظیر بھٹو سے رابطہ کیا اور آخر الذکر کو یقین دہانی کرائی کہ انتخابات آزادانہ اور شفاف ہوں گے۔ تاہم حکومت نے اعلان کر دیا کہ شناختی کارڈ کے بغیر کوئی ووٹر اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کر سکے گا۔ بیگ اس پابندی کو برقرار رکھنے کے لئے عدالتوں پر بھی اثر انداز ہوئے۔ اس طرح 20 فیصد ووٹر اپنے حق رائے دہی سے محروم ہوگئے۔ جن میں زیادہ تعداد شہری مزدوروں اور دیہی کسانوں کی تھی۔ یہی دو طبقے پی پی پی کے نسبتاً زیادہ حامی تھے۔

فوج انتخابی نتائج پر اثر انداز ہونے کی خواہاں تھی لیکن انتخابات کے دوران دھاندلی پر بھی تیار نہ تھی۔ فوج نے سوچ رکھا تھا کہ اگر انتخابات کے نتیجے میں آئی جے آئی نے حکومت تشکیل دے لی تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں اور اگر شومئی قسمت پی پی پی برسر اقتدار آگئی تو بھی اس کے پاس واضح اور قطعی اکثریت نہیں ہوگی۔ ایسی صورت میں اس پر چیک رکھا جا سکے گا۔ اس امر کا امکان بھی موجود تھا کہ پی پی پی ایک کمزور مخلوط اتحاد کی سربراہ بن کر حکومت تشکیل دے لیتی۔ دونوں صورتوں میں فوج اس پر نظر رکھنے کی پوزیشن میں تھی۔

انتخابی مہم کے دوران رہبرانہ کردار جماعت اسلامی کو سونپا گیا۔ جماعت اسلامی کے نئے سربراہ قاضی حسین احمد نے ابتداء میں آئی جے آئی میں شمولیت اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ جماعت اسلامی کو وسیع البنیاد حمایت حاصل نہیں تھی۔ لہذا وہ خود کو جماعت اسلامی سے الگ تشخص ثابت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ خود کو عوامی راہنما کے طور پر متعارف کرائیں۔ قاضی حسین احمد نے اس امر کا ادراک کر لیا کہ فوج کے ساتھ ساز باز کے ذریعے پی پی پی کی راہ روکنے کی بجائے اگر وہ جمہوری عمل میں شریک ہو جائیں تو جماعت کے لئے سودمند رہے گا اور اس کے مفادات کی بہتر طور پر حفاظت ممکن ہو جائے گی۔ لیفٹیننٹ جنرل اختر عبدالرحمٰن کے جانشین اور آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل

نے قاضی حسین احمد پر واضح کر دیا کہ آئی جے آئی کی رکنیت کا انحصار محض آخر الذکر کی رضامندی پر نہیں ہوگا۔ یعنی یہ رکنیت "آپشنل" نہیں ہوگی بلکہ اگر جماعت نے فوج اور آئی ایس آئی کی اندرون ملک سیاسی حکمت عملی کی حمایت نہ کی تو افغانستان اور جہاد کی آئندہ کارروائیوں میں اس کا کردار متاثر ہوگا۔

جنرل گل نے ایک جذباتی دلیل بھی دی کہ اگر بھٹو کو نہ روکا جاتا تو اسلام پسندوں کی کاز کو نقصان پہنچنے کا امکان موجود تھا۔ جنرل گل اور ان کے نائب بریگیڈئر امتیاز احمد نے اسلام پسندوں کو بتایا کہ "بے نظیر بھٹو امریکیوں کے ساتھ وعدہ کر چکی ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کر دیا جائے گا۔ وہ افغانستان میں مجاہدین کی فتح کی راہ میں بھی مزاحم ہوں گی اور جہاد کشمیر کے منصوبوں کو بھی سبوتاژ کر دیں گی۔ اگرچہ اس وقت تک کشمیر میں جہاد کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ تاہم آئی ایس آئی بظاہر اس کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ ملک کے اندر سیاسی کش مکش اور فوج کا قومی دفاع کا نظریاتی ایجنڈہ آپس میں گڈمڈ ہو چکے تھے۔

جماعت اسلامی نے نہ صرف آئی جے آئی کی ہمرکاب ہونے کا فیصلہ کر لیا بلکہ آئی ایس آئی کے پیش کردہ دلائل کے مطابق بے نظیر بھٹو کے خلاف مہم چلانے کی ٹھان لی۔ جلد ہی جماعت اسلامی نے بے نظیر پر الزام عائد کرنے شروع کر دئے کہ وہ امریکی مفادات کے فروغ میں مصروف ہیں اور پاکستان کے جوہری پروگرام کو فروخت کر دینے کے منصوبے تیار کر رہی ہیں۔ آئی ایس ائی نے دیگر اسلام پسند گروہوں بالخصوص ضیاء کے حامی دیوبندی گروہ جمعیت العلمائے اسلام کی حوصلہ افزائی بھی کی کہ وہ کہنا شروع کر دیں کہ اسلام کسی عورت کو اسلامی ریاست کی سربراہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ جوہری معاملے کے حوالے سے چلائی جانے والی مہم نے اسلام پسندوں کو یہ دعویٰ کرنے کے قابل بنا دیا کہ وہ پاکستان کی جوہری صلاحیت کے نگہبان اور محافظ ہیں۔ اگرچہ یہ دلیل عوام کے نزدیک قابل قبول نہ ٹھہر سکی کہ کسی عورت کو وزیر اعظم نہیں بنایا جا سکتا۔ تاہم پاکستان کے مذہبی حلقوں کے ساتھ بے نظیر بھٹو کے مراسم میں کشیدگی در آئی۔ آئی ایس آئی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگئی کہ بے نظیر کے لئے آنے والے کئی سالوں کے دوران بھی اسلام پسندوں کے ساتھ تعلقات کی بحالی کو دشوار بنا دیا جائے۔

1988ء میں ہونے والے انتخابات میں پی پی پی نے پارلیمنٹ کے ایوان زیریں کی 215 میں سے 92 نشستیں جیت لیں۔ آئی جے آئی کے حصے میں 54 نشستیں آئیں۔ ان نتائج کے باوجود آئی ایس آئی نے کوشش کی کہ آئی جے آئی کی سربراہی میں ایک مخلوط اتحاد تشکیل دیدیا جائے۔ آئی جے آئی نے انتخابات میں دوہری قیادت کے تحت حصہ لیا تھا۔ اس کے صدر بزرگ سیاستدان غلام مصطفیٰ جتوئی تھے جن کا تعلق بھٹو کے آبائی صوبہ سندھ سے تھا۔ وہ بے نظیر کے والد کی کابینہ میں بھی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ تاہم آئی جے آئی کے سب سے باوسیلہ راہنما نواز شریف تھے۔ وہ ایک نوجوان صنعتکار تھے جنہیں ضیاء الحق نے وزیر اعلیٰ پنجاب نامزد کیا تھا۔ نواز شریف آئی جے آئی میں شامل سب سے بڑی جماعت

پاکستان مسلم لیگ کی سربراہی کے لئے کوشاں تھے۔ نام کی حد تک پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو تھے۔ انتخابات میں جونیجو کی طرح جتوئی بھی پی پی پی کے ایک امیدوار سے اپنی آبائی نشست پر ہار گئے۔ دوسری طرف نواز شریف نے پنجاب میں اپنی وزارت اعلیٰ سے فائدہ اٹھایا اور صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی۔ آئی ایس آئی وزارت عظمیٰ کے لئے جتوئی کی حمایت نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی آبائی نشست پر ہی انتخاب ہار چکے تھے۔ ادھر نواز شریف کو وزیراعظم نامزد کرنے کا مطلب سندھیوں کی مزید ناراضگی مول لینے کے مترادف تھا کیونکہ وہ فوجی حکومت کے دوران پنجابیوں کے تسلط سے پہلے ہی نالاں تھے۔

پارلیمانی حساب کتاب کے تحت کام کرتے ہوئے فوجی قیادت نے مسئلے کا ایک حل نکال لیا۔ وہ اس طرح کہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم بنا دیا جائے اور ادھر پنجاب کے وزیراعلیٰ کے عہدے کے لئے ایک مرتبہ پھر نواز شریف کی مدد کی جائے اور اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ پنجاب سب سے بڑا صوبہ تھا۔ اس طرح نواز شریف کے ذریعے بے نظیر بھٹو پر قابو پایا جا سکے گا۔ کیونکہ اول الذکر پنجاب حکومت کے سربراہ بھی تھے اور حزب اختلاف کے حقیقی سربراہ کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ اس طرح بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان کشیدگی فوج اور آئی ایس آئی کو ملکی سیاست پر اثر انداز ہونے کا موقع دیتی رہے گی۔

اگرچہ انتخابات کے نتائج کے مطابق پی پی پی سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آ چکی تھی۔ تاہم غلام اسحاق خان نے بے نظیر کو وزیراعظم نامزد کرنے کے لئے پندرہ دن انتظار کیا۔ ان پندرہ دنوں کے دوران اقتدار کے لئے جو سودے بازیاں ہوئیں ان میں ایک طرف بے نظیر بھٹو تھیں اور دوسری جانب غلام اسحاق خان جنرل بیگ اور پاکستان میں امریکی سفیر رابرٹ اوکلے تھے۔ صدارتی انتخابات جلد ہی متوقع تھے۔ بے نظیر نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں امریکہ کو بدستور رسوخ حاصل رہے گا۔ ایک ریٹائرڈ جرنیل صاحبزادہ یعقوب خان جو 1982ء اور 1987ء کے درمیانی عرصے میں پاکستان کے وزیر خارجہ رہ چکے تھے اور جنہیں ضیاء الحق نے اپنی موت سے چند ماہ قبل اسی پوزیشن کے لئے پھر نامزد کر دیا تھا۔ انہیں بے نظیر بھٹو نے بدستور وزیر خارجہ بنائے رکھا۔ جو اس امر کی علامت تھی کہ سابقہ خارجہ پالیسی کا تسلسل قائم رکھا جائے گا۔ وزیر دفاع کے عہدے کے لئے فوج کی رائے کو اولیت دی گئی۔ جبکہ ایک سنیئر سرکاری ملازم کو بدستور اقتصادی مشیر کے عہدے پر فائز رکھا گیا۔ بے نظیر بھٹو نے یہ وعدہ بھی کیا کہ دفاعی اخراجات کم نہیں کئے جائیں گے اور جنرل بیگ کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ فوج کو جو مراعات اور فوائد حاصل تھے ان کا تسلسل بھی برقرار رکھا جائے گا۔ اس دور کے بے نظیر بھٹو کے مشیروں میں سے ایک نے بعد میں لکھا:-

"اسٹیبلشمنٹ نے بے نظیر بھٹو کو بطور وزیراعظم صرف گوارا کرنے کی حد تک قبول کیا۔ جنرل بیگ کو جب بھی موقع ملتا وہ انہیں بتا دیتے تھے کہ انہوں نے بادشاہ گر کا کردار ادا کیا۔ جنرل بیگ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم بے نظیر بھٹو پر بھی دباؤ

شرائط عائد کردیتے جو ہم نے افغانستان کی عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے عائد کر رکھی ہیں تو آج وہ وزیر اعظم نہ ہوتیں۔ ایک اور موقع پر پریس کے اس تبصرے پر کہ فوج نے خارجہ پالیسی وزارت خارجہ سے ہائی جیک کر لی ہے۔ جنرل بیگ نے تلخی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر فوج چاہتی تو اس سے بڑی چیزیں ہائی جیک کر سکتی تھی"۔

بے نظیر بھٹو نے یکم دسمبر 1988ء کو بطور وزیر اعظم حلف اٹھایا اور اعلان کر دیا کہ وہ سیاسی قیدیوں کو رہا اور طلبا و مزدور تنظیموں کو بحال کر دیں گی اور پریس پر سے حکومتی کنٹرول ختم کر دیا جائے گا۔ انہوں نے فوج اور غلام اسحاق خان کو سراہا کہ کئی سال کی مخالفت کے بعد بطور وزیر اعظم انہیں قبول کر لیا گیا۔ اخباری نمائندوں اور مبصرین نے لکھا کہ جو انہیں اذیت دیتے رہے اور جنہوں نے ان کے حامیوں کے گرد گھیرا تنگ کئے رکھا وہی اب انہیں سیلیوٹ کر رہے تھے اور ان کے تحفظ کے داعی تھے۔ بعض نے یہ سوال بھی پوچھا کہ آیا انہیں حکومت کرنے کی اجازت بھی دی جائے گی یا نہیں؟۔ بے نظیر کے حلف اٹھانے سے چند دن بعد سول ملٹری بیوروکریسی اور سیاسی قیادت کے درمیان معاملات دشوار ہو گئے۔ فون کالز کہیں اور ملا دی جاتی تھیں۔ فائلیں گم ہونا شروع ہو گئیں اور آئی ایس آئی کے جنرل حمید گل بے نظیر کے ذاتی ملازمین کو بلیک میل کرنے لگے۔ وزیر اعظم ہاؤس کے اس ماحول کی تفصیل برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب نے اپنے ایک مضمون میں بیان کی۔ سنیئر سول ملازمین نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ انہیں یہ تبدیلی قبول نہیں۔ روس کے ایک اغواء شدہ جہاز کو پاکستان میں اترنے کی اجازت دی۔ یہ واقعہ اس دن رونما ہوا جس دن بے نظیر بھٹو نے اپنا عہدہ سنبھالا۔ اس سلسلے میں ان سے مشورہ نہیں کیا گیا۔

مزید براں غلام اسحاق خان اور جنرل بیگ کے ساتھ اقتدار شیئر کرنے کے لئے بے نظیر بھٹو کو نواز شریف کے ساتھ بطور وزیر اعلیٰ پنجاب گزارا کرنا پڑا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ہوا کہ مرکزی حکومت کا ملک کے سب سے بڑے صوبے پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ نواز شریف نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ مبنی بر کشیدگی رویہ اپنائے رکھا۔ زیادہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ بھی کیا اور وفاقی حکومت کی حاکمیت کے لئے چیلنج بنے رہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس سے قبل نسبتاً چھوٹے صوبے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرتے رہے۔ وہ پنجاب کے تسلط کو ناپسند کرتے تھے اور یہ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ پنجاب کی صوبائی حکومت مرکزی حاکمیت کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور آئین کے تحت مزید صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

نواز شریف دو سطوح پر بے نظیر بھٹو کی حکومت پر حملہ آور ہوئے۔ ایک طرف وہ ان اسلام پسندوں کے ساتھ ملکر بے نظیر بھٹو کے نظریاتی جھکاؤ کے بارے میں استفسار کرنے لگے جو آئی جے آئی کے اندر نواز شریف کے اتحادی تھے۔ دوسری طرف نواز شریف نے پنجابیوں میں بھی صوبائی عصبیت داخل کر دی اور وہ بے نظیر بھٹو کے سندھی ہونے کے باعث ان کی مخالفت پر اتر آئے۔ آئی ایس آئی کی مدد سے نواز شریف دوسرے صوبوں کی لسانی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کرنے میں بھی

کامیاب ہو گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اب پنجابی راہ نما نے بھی صوبائی خود مختاری کا مطالبہ داغ دیا ہے۔ لہذا اس کے حصول کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

بے نظیر بھٹو نے پنجاب اسمبلی میں نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کے ذریعے ان سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا یہ فیصلہ انہوں نے اپنی جماعت کے اندر سے تجاویز موصول ہونے پر کیا۔ پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت کا متعدد آزاد ارکان پر انحصار تھا اور پی پی پی نے کوشش کی کہ ان آزاد ارکان میں سے بعض کو ترغیبات کے ذریعے نواز شریف کی مخالفت پر آمادہ کر لیا جائے۔ لیکن چونکہ نواز شریف کو مضبوط حلقوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ پیسہ بھی ان کے پاس وافر تھا۔ وہ بے نظیر سے بڑھکر ضرررساں ثابت ہو سکتے تھے۔ انہی وجوہ کی بناء پر وہ اس کھیل میں بے نظیر کی نسبت زیادہ طاق تھے۔ لہذا انہوں نے اپنے خلاف عدم اعتماد کی کوشش ناکام بنادی۔ بعد ازاں نواز شریف کی ٹکراؤ کی پالیسی ختم کرانے کے لئے وفاقی حکومت نے ان کے خاندان کی صنعتی سلطنت اور اقتصادی مفادات کو زک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ ٹیکس چوری، بنکوں کے قرضوں کی عدم ادائیگی اور دیگر سنگین بدعنوانیوں اور بے قاعدگیوں کے 160 الزامات نواز شریف، ان کے خاندان اور ان کے کاروباری اور سیاسی رفیقوں کے خلاف عائد کئے گئے۔ پاکستان ریلوے پر یکدم منکشف ہوا کہ کراچی کی بندرگاہ سے شریف فاؤنڈریز کا سکریپ لاہور پہنچانے کے لئے ان کے پاس ویگنیں دستیاب نہیں تھیں۔ (واضح رہے کہ پاکستان ریلویز وفاقی حکومت کے ماتحت ہے)۔

نواز شریف نے ان دھمکیوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے اطمینان کے لئے یہ ہی کافی تھا کہ انہیں فوج کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ وقفے وقفے سے صدر یا آرمی چیف سے تحفظ کی درخواست کرتے رہے۔ ان کی یہ اپیلیں فوج کو موقع فراہم کرتی رہیں کہ وہ پس پردہ سیاسی ترکیبیں لڑاتی رہے۔ اس طرح "سول ملٹری اسٹیبلشمنٹ" سے تعلق رکھنے والے ان افراد کے ارادے واضح طور پر پورے ہوتے نظر آئے جنہوں نے سیاستدانوں کے ساتھ شراکت اقتدار کے تصور کو نیم دلی سے قبول کیا تھا۔ وہ اس امر کو ثابت کرنے پر تلے بیٹھے تھے کہ سیاست دان حکومت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان تصادم کی اس فضا نے بے نظیر کے مقام و مرتبے اور شہرت کو متاثر کیا۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکی دانشور لارنس زائرنگ لکھتا ہے:-

"بے نظیر بھٹو کے سربراہ حکومت منتخب ہو جانے کے بعد اندرونی سیاسی کشمکش نے پاکستان کے سیاسی منظر کو پریشان کن اور تلخ بنا رکھا ہے۔ پاکستان کو اس اندرونی سیاسی کش مکش کی قیمت بھی ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ اگرچہ اظہار رائے کی آزادی نسبتاً زیادہ مقدار میں دستیاب ہے۔ تاہم فوری مسائل کو حل کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ وزیر اعظم کو حاصل شدہ اکثریت متزلزل ہے۔ اپنی حکومت کے استحکام کے لئے انہیں فوج کے رسوخ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح نہ صرف

توانائیاں ضائع ہوتی ہیں بلکہ قومی اور علاقائی نوعیت کے مسائل پر سے توجہ ہٹانا پڑتی ہے۔ سماجی انصاف کے مسائل ابھی تک حل طلب ہیں اور بنیاد پرستی پر مبنی جو قوانین عورتوں کی توہین کا باعث بن رہے ہیں ابھی تک ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکی۔ معیشت بھی اپنی راہ سے ہٹ چکی ہے۔ جس کے باعث غریبوں کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے پر بھی بوجھ بڑھ گیا ہے۔ ان محاذوں پر بے اثر ہونے کی مبینہ وجہ چور دروازے کی سیاست ہے۔ کیونکہ پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنی معمولی اکثریت کو برقرار رکھنے کے لئے کئی حلقوں کو مطمئن کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان مسائل کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے فقدان کی وجوہ بھی حکومتی ڈھانچے کی حدود و قیود اور مالی وسائل کی کمی ہیں"۔

زائرنگ لکھتا ہے کہ نواز شریف کی کارگزاری نے ضیاء کے دور کے مطلق العنانہ طرز حکومت کی یاد تازہ کردی۔ انہوں نے صدر مملکت اور مسلح افواج کو برملا دعوت دی کہ وہ ملکی سیاست میں براہ راست مداخلت کریں۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو عوام سے ملنے والے مینڈیٹ کے بل بوتے پر برسراقتدار آئیں تاہم بطور وزیر اعظم عہدہ سنبھالنے کے صرف ایک سال بعد زائرنگ نے نشاندہی کردی کہ وہ اپنے اقتدار کے تسلسل کے لئے بظاہر مسلح افواج پر انحصار کر رہی تھیں۔

1988ء میں ہونے والے انتخابات اور مابعد واقعات نے آئندہ گیارہ سالوں کے لئے پاکستانی سیاست کا رخ متعین کردیا۔ 1988ء میں جب بے نظیر بھٹو نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا اس وقت انہیں حکمرانی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ جس وقت ان کے والد وزیر اعظم پاکستان تھے وہ کالج کی طالبہ تھیں اور ضیاء کی حکمرانی کے دور میں بے نظیر بھٹو نے زیادہ عرصہ جیل میں گزارا اور یا پھر جلاوطن رہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی گیارہ برس اپوزیشن کی سیاست کرتی رہی اور پاکستان میں اس کے اکثر عہدیداروں اور کارکنوں کو مختلف النوع سختیاں برداشت کرنا پڑیں۔ ان کے والد کے ہمعصر سیاستدان یا تو محض اس لئے ان سے نفرت کرتے تھے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھیں اور یا پھر ان کی کم عمری کے باعث ان کا احترام نہیں کرتے تھے۔ پی پی پی سے تعلق رکھنے والے جن افراد کو حکومت کرنے کا تجربہ تھا ان میں سے اکثر فوج کے معاون بن چکے تھے اور بے نظیر بھٹو کے پاس صرف ناتجربہ کار انقلاب پسند اور مثالیت پسند رہ گئے۔ صورت حال کی خرابی کا ایک سبب اور بھی تھا۔ جب وہ برسراقتدار آئیں تو غلام اسحاق خان، جنرل بیگ، جنرل گل اور نواز شریف نے انہیں پہلے دن سے ہی اپنا مخالف یا دشمن سمجھا اور اسلام پسندوں نے ان پر فقرے کسنے شروع کردئے۔ ان کی طرف سے بے نظیر بھٹو کے عقیدے اور حب الوطنی کو بھی مشکوک ٹھہرانے کی کوششیں کی جاتی رہیں اور سیکیورٹی سروسز بے نظیر بھٹو پر تازہ حملوں کے لئے مختلف الزامات کی صورت میں انہیں مستقلاً "گولہ بارود" فراہم کرتی رہیں۔

جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد عام انتخابات کی منصوبہ بندی کے دوران آئی ایس آئی نے پہلے ہی اسلامی معاملات کو بے نظیر بھٹو کی "بہت بڑی کمزوریوں" کی صورت میں پیش کر رکھا تھا۔ اگرچہ آئی جے آئی کے 80 فیصد انتخابی امیدواروں کا تعلق پاکستان مسلم لیگ سے تھا۔ تاہم اس امر کو یقینی بنایا گیا کہ یہ بھی 9 جماعتوں پر مشتمل ہو۔ تا کہ اسے اس

"پاکستان قومی اتحاد" (پی این اے) کے مقابل سمجھا اور رکھا جاسکے جس کے پلیٹ فارم سے 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مہم چلائی گئی تھی۔ پی این اے بھی 9 جماعتوں پر مشتمل تھا۔ اتحاد میں شامل 9 جماعتوں میں سے 6 مذہبی جماعتیں تھیں۔ جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام کے ایک دھڑے کے علاوہ اس میں جمعیت المشائخ، جمعیت اہل حدیث، نظام مصطفیٰ گروپ اور حزب جہاد شامل تھے۔ اگر چہ یہ چھوٹے چھوٹے گروہ تھے تاہم اس امر کو یقینی بنایا گیا کہ اسلامی معاملات و مسائل زندہ رہیں اور جو اسلامی جذبات عوام کو بھٹو کے مقابلے میں سڑکوں پر کھینچ لائے تھے۔ ان کی صاحبزادی کے پیدا کردہ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کی تجدید کی جاسکے۔

انتخابی مہم کے دوران آئی جے آئی سے تعلق رکھنے والے کچھ مذہبی راہنماؤں نے بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ کو "چوڑیاں پہننے والے مجرموں کا جتھہ" قرار دیا۔ بے نظیر بھٹو کی ایک ایسی مغرب زدہ عورت کے طور پر تصویر کشی کی گئی جو اقتدار میں آنے کے بعد پاکستانیوں کو اخلاق باختہ بنادے گی۔ بڑے بڑے پاکستانی شہروں میں بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو کی ایسی تصاویر پر مشتمل پوسٹر آویزاں کیئے گئے جن میں انہیں تیراکی کے لباس میں ملبوس دکھایا گیا۔ اس قسم کے پوسٹر ہوائی جہازوں سے بھی زمین پر گرائے گئے۔ جب نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے انتخابی مہم کے دوران یہ مواد استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو جنرل بیگ کے ایک قریبی دوست اور لاہور سے تعلق رکھنے والے تاجر کے توسط سے اس مقصد کے لئے "لاہور ایروو کلب" سے تربیتی جہاز کرائے پر حاصل کیئے گئے۔ اسلام پسندوں کے ترجمان "ہفت روزہ تکبیر" میں وہ تصاویر شائع کرائی گئیں جن میں نصرت بھٹو کو امریکہ کے صدر فورڈ کے ساتھ اس دوران ناچتے دکھایا گیا جب وہ پاکستان کی خاتون اول کے طور پر واشنگٹن گئیں۔ آئی ایس آئی کے بریگیڈیئر امتیاز احمد نے اسلام پسندوں کے اخبارات اور رسائل و جرائد کو یہ تصاویر مہیا کیں۔ بطور وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے انتخاب کے بعد جلد ہی متعدد علماء نے فتویٰ جاری کر دیا کہ کوئی عورت کسی اسلامی ریاست میں سربراہ حکومت نہیں بن سکتی۔ فتوے کے اجراء کے بعد ان مدرسوں میں اسلامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جو اسلامی جہاد کے ساتھ قریبی تعلق کی شہرت رکھتے تھے۔ جماعت اسلامی کے راہنما قاضی حسین احمد نے ہدایت جاری کی کہ نہ تو ایک مغرب زدہ عورت اور اخلاقی زبوں حالی کے الزامات پر ان کے خلاف مہم چلائی جائے اور نہ ہی ایک عورت ہونے کے ناطے ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کیا جائے۔ انہوں نے دلیل کے طور پر کہا کہ وہ انتخاب جیت کر آئی ہیں اور ان کی جیت ثابت کرتی ہے کہ لوگ اس قسم کے دلائل کا اثر نہیں لیتے۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر دراصل قومی دفاع کے معاملات کے حوالے سے غیر معتبر ہیں۔ قاضی حسین احمد کے خیال میں ناقدین کو اپنی تمام تر توجہ اس نقطے پر مرکوز کر دینی چاہیے تھی کہ وہ ایک "سیکیورٹی رسک" ہیں۔ ان کے خیال میں وہ ایک ایسی شخصیت تھیں جن پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور جہاد افغانستان کے حوالے سے اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چھوٹی مذہبی جماعتوں نے ثقافتی معاملات میں ان پر تنقید کو ترجیح دی۔ بالآخر آئی جے آئی نے ان دونوں پہلوؤں کو اپنالیا۔

میڈیا میں آزادی کے آغاز کے طور پر پاکستان ٹیلی ویژن نے موسیقی کے مقبول پروگرام دکھانا شروع کر دیئے۔ خاتون گلوکاراؤں اور اداکاراؤں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ ننگے سر ٹیلی ویژن کی سکرین پر آسکتی ہیں۔ ضیاء الحق کے دور کی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ بے نظیر بھٹو خود محتاط رہتی تھیں اور عوامی اجتماعات میں سر ڈھانپ کر آتی تھیں۔ لیکن اس کا اسلام پسندوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے نئی ثقافت کے خلاف ٹیلی ویژن سٹیشنوں کے باہر مظاہرے شروع کر دیئے اور حکومت پر الزام عائد کیا کہ وہ فحاشی کے فروغ کے ذریعے اسلامی اخلاقیات کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

اسلام پسندوں کی ان مہمات کا ملکی سیاسی صورت حال پر قابل ذکر اثر نہ ہوا۔ لیکن 12 فروری 1988ء کو برطانوی مصنف سلمان رشدی کی تصنیف "شیطانی آیات" کے خلاف اسلام آباد میں ہونے والا مظاہرہ متشدد احتجاج میں بدل گیا۔ جب مسلمانوں کی توجہ اس کے بعض اقتباسات کی طرف مبذول کرائی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں پیغمبر اسلام کی توہین آمیز پیروڈی بیان کی گئی تھی۔ لیکن اس وقت تک کتاب کو شائع ہوئے ایک سال بیت چکا تھا اور مسلمان دنیا میں اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ بالآخر جب پاکستان کے مذہبی سیاستدان مولانا کوثر نیازی نے اس کتاب پر سلسلہ وار مضامین لکھے اور شائع کرائے تب جا کر اس کی اصلیت کا علم ہوا۔ وہ مضامین پاکستانی پریس میں چھپے۔ کوثر نیازی نے لکھا کہ آئی ایس آئی کے ایک سنیئر افسر نے انہیں وہ کتاب بھجوائی۔ اس کے قابل اعتراض اور گستاخانہ جملے باقاعدہ نشان زدہ تھے۔ تاکہ وہ نمایاں اور اجاگر ہو جائیں۔ کوثر نیازی ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں مذہبی امور کے وزیر تھے۔ ضیاء الحق کی فوجی بغاوت کے بعد جلد ہی انہوں نے پیپلز پارٹی سے کنارہ کر لیا تھا جس وقت انہوں نے رشدی کی کتاب کے بارے میں مضامین تحریر کیئے۔ اس وقت وہ سیاسی اعتبار سے بے منزل تھے۔ آئی ایس آئی نے انہیں موقع فراہم کر دیا کہ اس طرح وہ اپنے سیاسی نصیب کی تجدید کر لیں۔ جہاں تک آئی ایس آئی کے سیاسی مقاصد کا تعلق تھا وہ اسی عمل کا اعادہ کر رہی تھی جسے ماضی میں پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کامیابی سے انجام تک پہنچاتی رہیں۔ اسے توقع تھی کہ مذہبی اعتبار سے ایک جذباتی مسئلے کو اچھال کر وہ سویلین حکومت کو پریشان کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اردو پریس میں مولانا کوثر نیازی کے مضامین کی اشاعت کے بعد ایک اور جہاندیدہ مذہبی شخصیت نے "علماء کانفرنس" طلب کر لی جس میں احمد رشدی کے خلاف کاروائی کا مطالبہ کیا گیا۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں مولانا نیازی تحریک پاکستان میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ آزادی کے بعد وہ تقریباً ہر اس مذہبی و سیاسی مہم کا حصہ بنے رہے جو سیاست میں فوجی مداخلت پر منتج ہوئی۔ ابتداء انہوں نے 1953ء میں احمدیوں کے خلاف مظاہروں میں شرکت سے کی۔ حکومت نے "شیطانی آیات" پر پہلے سے ہی پابندی عائد کر رکھی تھی اور بھٹو انتظامیہ میں شامل افسران کو اس بات کا علم نہ تھا کہ علماء کے تازہ احتجاج کے حوالے سے کس قسم کے ردعمل کا اظہار کیا جائے۔ جن اسلام پسندوں نے احمد رشدی کی تصنیف کے خلاف احتجاجی مظاہروں کو منظم کیا ان کا موقف تھا کہ اس کی اشاعت دراصل اسلام کے خلاف امریکیوں اور صیہونیوں کی

سازش کا نتیجہ تھی۔ 12 فروری 1989ء کو جب دونوں نیازیوں کی راہنمائی میں اسلام آباد میں احتجاجی مظاہرہ ہوا تو شرکائے جلوس نے امریکہ کے انفارمیشن سنٹر کی عمارت پر حملہ کر دیا۔ مظاہرین نے جو پوسٹر اور بینر اٹھا رکھے تھے۔ ان پر درج تھا "امریکہ اور اسرائیل اسلام کے دشمن ہیں"۔ عمارت کے اندر موجود امریکیوں اور پاکستانیوں کی جانیں بچانے کے لئے ہجوم کو منتشر کرنا ناگزیر تھا۔ اس مقصد کے لئے پولیس کو گولی چلانا پڑی۔ پانچ مظاہرین جاں بحق ہو گئے۔

پاکستان میں ہونے والے متشدد مظاہروں نے احمد رشدی کی کتاب پر عالمی توجہ مبذول کرا دی اور آیت اللہ خمینی نے مصنف کے خلاف فتویٰ جاری کر دیا کہ وہ گستاخ رسول ﷺ ہے۔ پاکستان کے اندر بے نظیر کے خلاف مذہبی جماعتوں کی نفرت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا اور ان کی مغرب نواز نوزائیدہ انتظامیہ بھی اسی نفرت کا شکار ہو گئی۔ امریکی پبلشرز اس سے قبل بے نظیر بھٹو کی خودنوشت سوانح حیات "دختر مشرق" کے نام سے شائع کر چکے تھے۔ اس کتاب نے بے نظیر کے ناقدین کو اس قابل کر دیا کہ وہ اول الذکر کی مغرب نوازی اور ان کی تصنیف کے درمیان کوئی ربط قائم کر سکیں۔ بے شک وہ ربط یا تعلق حد درجہ کمزور ہو۔ جس وقت امریکی "انفارمیشن سنٹر" پر حملہ کیا گیا وہاں سی این این کے نمائندے بھی موجود تھے اور امریکیوں نے اپنے گھروں کے اندر بیٹھ کر دیکھا کہ بے نظیر بھٹو کے پاکستان میں امریکی پرچم کو نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ نتیجتاً یہ تصور گہنا گیا کہ بے نظیر امریکہ نواز یا امریکہ کی دوست تھیں۔ آئی ایس آئی اس سارے معاملے میں اپنے کردار کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ امریکی سفیر نے کہا کہ مظاہرین کسی "بیرونی قوت" کے زیر اثر تھے۔ لیکن بے نظیر بھٹو کی حکومت کے بارے میں ایسے کسی شک کا اظہار نہ کیا۔ رابرٹ اوکلے نے کہا:-

"اگرچہ اس احتجاجی مظاہرے سے سرمائے کی بو آتی ہے۔ تاہم یقین سے کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔ روایتاً یہاں لیبیا اور ایران کا پیسہ چلتا ہے۔ ہمیں پتہ چل جائے گا۔ روس پاکستان یا امریکہ کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی افغانستان کے معاملات سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں"۔ پرتشدد مظاہرے میں آئی جے آئی کے کردار اور آئی جے آئی کو حاصل آئی ایس آئی کی معاونت کے پیش نظر امریکی سفارت خانے کو کسی اندرونی سازش کے امکان کا جائزہ لینا چاہئے تھا۔ اگر لیبیا، ایران یا روس بھی ملوث تھا تو مظاہرین پر اثر انداز ہونے کے لئے مذہبی راہنماؤں کا توسط ضروری تھا۔ جو آئی جے آئی کا حصہ تھے اور آئی ایس آئی کے ساتھ ان کے روابط بہت قریبی تھے۔

بے نظیر بھٹو نے انتہائی نامساعد حالات میں حکومت کا آغاز کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ حالات پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے اور مسائل کا حجم بڑھتا گیا۔ بے نظیر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے بعد گورننس کا جو طریق کار طے کیا گیا اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اتنی با اختیار نہیں تھیں۔ جتنے با اختیار ان ملکوں کے وزرائے اعظم ہوتے ہیں۔ جہاں پارلیمانی جمہوریت رائج ہے۔ اگست 1990ء میں اپنے عہدے سے معزولی تک صدر اور آرمی چیف کے ساتھ وقتاً فوقتاً بے نظیر بھٹو کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ایک مبصر لکھتا ہے "بے نظیر کی حکومت کو ایک مخالف فوجی اسٹیبلشمنٹ کی موجودگی میں کام کرنا پڑا جو

انہیں ان کے عہدے سے معزول کرنے کے کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھی اور ان کی حکومت کے حقیقی رویے نے ایسے متعدد مواقع فراہم کئے"۔ بے نظیر بھٹو کی غلطیوں کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:-

"وفاقی حکومت ابتداء ہی میں صوبوں کے ساتھ قابل عمل تعلق پیدا کرنے میں ناکام ہوگئی۔ جتنی دیر بے نظیر بھٹو حکمران رہیں بلوچستان کی صوبائی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات کشیدگی کا شکار رہے۔ نواز شریف کے ساتھ سیاسی مخالفت نے پنجاب میں ان کا رسوخ کم کر دیا۔ ادھر ان کے آبائی صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں اس قدر متشدد مظاہرے ہوئے کہ آزادی کے بعد ان کی کوئی نظیر دستیاب نہیں تھی۔ مزید براں پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان پر شدید بدعنوانیوں کے الزامات عائد کئے جانے لگے۔ اہم تر امر یہ تھا کہ بے نظیر نے براہ راست یا بالواسطہ بار بار فوج کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ ہمہ طاقتور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل کو برطرف کرنے کے بعد ایک ریٹائرڈ جرنیل کو ان کی جگہ ڈائریکٹر جنرل مقرر کر دیا۔ بعد ازاں بے نظیر نے صدر کو بائی پاس کرتے ہوئے چیرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف ایڈمرل سروہی کے بارے میں اعلان کر دیا کہ آخر الذکر ریٹائر ہونے والے ہیں"۔

"سول ملٹری امتزاج" اور بے نظیر بھٹو کے درمیان ایک اور بنیادی تنازعہ بھی تھا۔ نوجوان وزیر اعظم کو پاکستان میں جمہوریت کی علامت سمجھا جانے لگا۔۔ ان کی کامیابی کا مطلب ملک پر اسٹیبلشمنٹ کے کنٹرول کا خاتمہ تھا۔ امریکہ کے اندر بے نظیر کو حد درجہ سراہا گیا اور امریکیوں کے ہاں انہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس کا مطلب یہ اخذ کیا گیا کہ فوج روایتی انداز میں امریکہ سے مدد مانگتی تھی۔ جبکہ بے نظیر اس کے ساتھ آزادانہ تعلق بھی قائم کر سکتی تھیں۔ بے نظیر نے مدد کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ پاکستان کے اندر براہ راست سرمایہ کاری کی جائے۔ انہوں نے "ایشیاء میں مثال قائم کرنے" اور امریکہ کے ساتھ ملکر "جمہوریت کے فروغ کی حوصلہ افزائی" کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ خطرہ پیدا ہوگیا کہ بے نظیر بھٹو کی آزاد جبلت پاکستان کی مستقل اسٹیبلشمنٹ کی عشروں پر محیط پالیسی کے خاتمے کا باعث بن جائے گی۔ اسلام کی قدامت پسندانہ توجیہات کو قومی یک جہتی کا باعث تجھنے کی بجائے بے نظیر بھٹو نے جمہوریت کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے نزدیک امریکہ صرف اسلحہ اور فوجی ساز و سامان کا فراہم کنندہ ہی نہیں۔ ایک طویل المیعاد دوست بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اہم تر بات یہ تھی کہ بے نظیر بھٹو بھارت کے ساتھ تعلقات کے ایک نئے دور کے آغاز کی سنجیدہ کوششیں کر رہی تھیں۔

"بے نظیر بھٹو کو اقتدار اسنبھالے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ بھارت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سارک سربراہ کانفرنس میں شرکت کے لئے اسلام آباد آئے۔ انہوں نے پاکستان کی کرشماتی شخصیت کی حامل نوجوان وزیر اعظم کی اس تجویز سے فوراً اتفاق کر لیا کہ سارک سربراہ کانفرنس کے بعد دونوں ملکوں کے راہنما دوطرفہ دوروں کا آغاز کر دیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی بھارت کے ساتھ تعلقات میں بہتری اور دونوں ملکوں کے درمیان موجود تنازعات کا حل نکالنے کی خواہاں تھی۔ بے نظیر بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے بعد اتنی جلدی بھارتی وزیر اعظم کی آمد کا اصل مقصد یہ تھا کہ دونوں ملکوں

کے درمیان اچھلتی کودتی گیند کو کسی طرح ساکن کیا جائے تاکہ امن کی کوئی راہ نکل آئے۔ دفتر خارجہ اور دیگر متعلقہ وزارتوں اور محکموں سے کہا گیا کہ ماضی میں دونوں ملکوں کے درمیان قیام امن کے لئے موصول ہونے والی تجاویز کا ازسرنو اور بغور جائزہ لیں اور ان کی روشنی میں معاہدات کے مُسودے تیار کریں جو اس موقع پر پیش کئے جا سکیں یا انہیں قیام امن کی خاطر آگے بڑھایا جا سکے۔ امریکیوں نے ہمیں بتایا کہ راجیو نے بھی امور خارجہ کی وزارت اور دیگر متعلقہ محکموں کو ہدایت جاری کردی تھی کہ وہ بھی اپنی نئی پرانی فائلیں کھنگالیں تاکہ جتنی تعداد میں ممکن ہوں۔ معاہدے کئے جا سکیں"۔ (یہ تفصیلات بے نظیر بھٹو کے خارجہ امور کے مشیر اقبال اخوند نے بیان کی ہیں)۔

بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کی ملاقات ہوئی تو مبصرین نے سوچا کہ یہ نئی نسل ماضی کی تلخیوں کو دفن اور تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے میں حد درجہ ممد ثابت ہوگی اور دونوں ملکوں کے لئے یہ قیادت بہترین رہے گی۔ بے نظیر بھٹو کی عمر اس وقت 35 برس اور راجیو گاندھی کی 44 برس تھی۔ دونوں میں سے کسی نے ذاتی طور پر تقسیم کی تلخیوں کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور دونوں اپنے اپنے ملک کی خوشحالی اور جدیدیت چاہتے تھے۔

بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کی ملاقات کے دوران فیصلہ کیا گیا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کی جوہری تنصیبات پر حملہ نہیں کریں گے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تعاون کے فروغ کیلئے ایک مشترکہ وزارتی کمیٹی تشکیل دیدی گئی۔ دوطرفہ تجارت کو فروغ دینے کے لئے بھی ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ بے نظیر بھٹو نے روایتی ہتھیاروں میں کمی کی جو تجویز پیش کی۔ راجیو گاندھی نے اس سے بھی اتفاق کیا۔ وہ سیاچین گلیشئر پر مذاکرات کی تجدید پر بھی متفق ہو گئے۔ بھارت کے ساتھ سمجھوتوں کے بارے میں فوج میں حساسیت پائی جاتی تھی۔ اس کے پیش نظر بے نظیر نے اس سارے عمل میں محتاط رہنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن فوج اور اس کے اسلام پسند اتحادیوں نے بے نظیر کے محتاط اقدامات کے باوجود فرض کر لیا کہ وہ بے قابو ہو چکی تھیں۔

اس وقت بے نظیر بھٹو اس امر سے بے خبر تھیں کہ آئی ایس آئی متنازعہ جموں و کشمیر میں اسلام پسند جنگ جوؤں کی مدد سے گوریلا بغاوت کی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ فوج نے اپنے جو سٹریٹیجک منصوبے تیار کر رکھے تھے ان پر عملدرآمد کی راہ میں بے نظیر بھٹو کی وہ کوششیں مزاحم تھیں جو وہ بھارت کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کے لئے کر رہی تھیں۔ دوسرے وہ روایتی فارمولہ متاثر ہو رہا تھا جس کے تحت عوام کی توجہ غیر ملکی دشمن پر مرکوز کرائی جاتی تھی۔

جب راجیو گاندھی کے دورہ اسلام آباد کے انتظامات کو حتمی شکل دیدی گئی تو پاکستان کے زیر قبضہ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے اعلان کر دیا کہ وہ کشمیر پر بھارتی قبضے کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرہ منظم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عبدالقیوم آئی جے آئی کے اتحادی تھے اور پاکستانی فوج اور انٹیلی جنس کے ساتھ قریبی روابط کی شہرت رکھتے تھے۔ اگر

حکومت انہیں مظاہرہ کرنے کی اجازت نہ دیتی تو بے نظیر بھٹو کے خلاف ایک اور الزام آئی جے آئی کے ہاتھ آجاتا کہ "وہ بھارت کے لئے نرم گوشہ رکھتی ہیں"۔ دوسری طرف ایک پرتشدد مظاہرہ بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے درمیان ملاقات کی افادیت کم کردیتا اور ماحول میں تلخی در آتی۔

بالآخر قیوم خان اور آئی جے آئی سے تعلق رکھنے والے ان کے حامیوں کو مظاہرہ کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ لیکن طے پایا کہ جس جگہ دونوں وزرائے اعظم کے درمیان مذاکرات ہوں گے۔ مظاہرے کا اہتمام اس مقام سے بہت دور کیا جائے گا۔ لیکن یہ اجازت آئی جے آئی کو بے نظیر بھٹو پر بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کی خواہش رکھنے اور مسئلہ کشمیر کے حل کا مطالبہ نہ کرنے جیسے الزامات عائد کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے درمیان سربراہ ملاقات کے بعد چند ماہ کے اندر اندر کشمیر میں بدامنی کا دور دورہ ہو گیا۔ بعدازاں کشمیر میں ہونے والی بغاوت کو پاکستانی حمایت میسر آ گئی۔ (باب نمبر 7 میں اس بغاوت اور مبینہ پاکستانی حمایت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے)۔ 1990ء کے اوائل میں ابھی بے نظیر بھٹو ہی پاکستان کی وزیراعظم تھیں جب پاک بھارت تعلقات ایک مرتبہ پھر شدید کشیدگی کا شکار ہو گئے۔ ایک امریکی دانشور کے الفاظ ہیں "ان دنوں پاک بھارت تعلقات میں کشیدگی کی جس مقدار کا مشاہدہ کیا گیا اس کی 1971ء کی جنگ کے بعد کوئی نظیر دستیاب نہیں تھی بے نظیر بھٹو کی بھارت پالیسی پر اسلام پسندوں کی بے تحاشا تنقید اور کشمیر کے اندر آئی ایس آئی کی طرف سے باغیوں کی خفیہ حمایت نے باہم ملکر پاکستانی وزیراعظم کے لئے ناممکن کر دیا کہ وہ بھارت کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کے منصوبوں کی تکمیل کر سکیں"۔

بے نظیر بھٹو کا موقف تھا کہ کشمیر میں آئی ایس آئی نے باغیوں کی جو مدد کی انہیں اس کی پیشگی خبر نہ تھی۔ انہوں نے کہا "جب کشمیر میں بدامنی شروع ہوئی تقریباً ہر ایک کا خیال یہی تھا کہ اس کی نوعیت مقامی ہے۔ آئی ایس آئی اور جنرل بیگ نے مجھے بتایا کہ وہ کشمیریوں کو غیر فوجی مدد فراہم کر رہے ہیں"۔ ممکن ہے غیر فوجی مدد سے مراد روپیہ پیسہ ہو۔ یہ بیان بے نظیر بھٹو کے عمومی اور سرکاری موقف سے بھی مطابقت رکھتا تھا کہ ہم حق خود ارادیت کا عزم رکھنے والے کشمیریوں کی اخلاقی اور سفارتی مدد کر رہے ہیں۔ کشمیر میں بغاوت کی حمایت کے منصوبے غالباً اس وقت بھی زیر غور تھے جب مئی 1989ء میں بے نظیر بھٹو نے آئی ایس آئی کی کمان تبدیل کی تھی۔ ان کے مذکورہ اقدام کو حکومت پر اپنا کنٹرول مجتمع کرنے کی کاوشوں کا حصہ سمجھا گیا۔ فوج کی ناراضگی کی اصل اور ٹھوس وجہ بھی یہی تھی کہ بے نظیر بھٹو نے جب حمید گل کو ہٹا کر ان کی جگہ ایک ریٹائرڈ جرنیل کو تعینات کیا تو کشمیر میں بغاوت کے منصوبے میں دراڑ پیدا ہو گئی۔ پاکستان کے جوہری پروگرام اور افغان جہاد کے حوالے سے فوج بے نظیر بھٹو پر مسلسل شک کرتی رہی۔ پاکستان کی افغان پالیسی کے بارے میں بے نظیر نے وزارت خارجہ کے موقف سے اتفاق کیا لیکن وہ موقف اسلام پسند دھڑوں کے ساتھ پاکستانی فوج کے جانبدارانہ رویے کی نفی پر مبنی تھا۔

جب بے نظیر بھٹو نے اپنا عہدہ سنبھالا۔ روس نے اپریل 1988ء میں ہونے والے جنیوا سمجھوتوں کے تحت افغانستان سے اپنی فوج کے انخلاء کا آغاز کر دیا تھا۔ فروری 1989ء تک انخلاء کا عمل مکمل ہو گیا۔ افغانستان میں نجیب اللہ کی کمیونسٹ حکومت قائم رہی جسے کابل اور دیگر بڑے شہروں پر کنٹرول حاصل تھا۔ روسیوں کی دست برداری کے بعد امریکہ اور پاکستان کے پالیسی سازوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ نجیب اللہ حکومت کا کیا کیا جائے۔ دونوں ملکوں کے سفارت کاروں کی اکثریت کا خیال تھا کہ مذاکرات کے ذریعے معاملات کو طے کرنے کے لئے وہ ایک مناسب وقت تھا۔ اس طرح کمیونسٹ مخالف مجاہدین کے متعدد دھڑوں اور افغانستان کے کمیونسٹوں کو شراکت اقتدار کا موقع مل جاتا۔ بے نظیر بھٹو اسی سیاسی حل کی حامی تھیں۔ آئی ایس آئی کو پاکستان کے اسلام پسندوں کی برملا حمایت حاصل تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ افغانستان کے مسلمان بنیاد پرستوں کو تقویت دی جائے۔ بالخصوص اس دھڑے کی مدد کی جائے جس کے سربراہ مغرب مخالف انقلابی باغی راہنما گلبدین حکمت یار تھے اور وہی دھڑا افغانستان میں روسیوں کی رخصتی کے بعد سیاسی طاقت کے طور پر حاوی ہو جائے۔ آئی ایس آئی نے مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ افغانستان کے بڑے شہروں پر سامنے سے حملہ آور ہوں۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ ابتداء میں امریکہ نے آئی ایس آئی کے منصوبوں کی حمایت کی لیکن یورپی اور کچھ امریکی سفارت کاروں نے مستقبل کے لئے افغانستان کی حکومت کی تشکیل پر پاکستانی پالیسی کے تسلط کو خطرناک خیال کیا۔ 1989ء کے اوائل میں ایک مرحلہ پر آئی ایس آئی نے پاکستانی شہر پشاور میں عبوری افغان حکومت اس امید پر تشکیل دے دی کہ عالمی برادری اسے تسلیم کر لے گی۔ تاہم جب تک اس نے افغانستان کے ایک بڑے شہر پر کنٹرول حاصل نہ کر لیا۔ بے نظیر بھٹو نے سفارتی سطح پر مذکورہ عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیے رکھا۔ نتیجتاً آئی ایس آئی کی راہنمائی میں جلال آباد پر کیا جانے والا حملہ ناکام رہا۔ عبوری حکومت کو پاکستان کی جماعت اسلامی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ جماعت اسلامی نے اس کے حق میں ریلیاں بھی منعقد کیں۔ پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت نے آئین پاکستان کو نظر انداز کر دیا۔ جس کے مطابق خارجہ پالیسی کے جملہ حقوق صرف اور صرف مرکزی حکومت کے حق میں محفوظ ہیں اور افغانستان کی عبوری حکومت کے راہنماؤں کی لاہور آمد پر سرکاری سطح پر ان کا استقبال کیا۔

آئی ایس آئی کے سربراہ کے طور پر جنرل حمید گل نے اعلان کر دیا کہ وہ افغان پالیسی میں وزارت خارجہ کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور مجاہدین کے پاس وزیر خارجہ صاحب زادہ یعقوب خان کے شائستہ طور طریقوں کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق کابل میں ایک اسلام پسند حکومت کا قیام ہی افغان جہاد میں پاکستان کے ایک عشرے پر محیط کردار کا منطقی عوضانہ تھا۔ فوج کے اکثر سینئر افسران اور آئی ایس آئی کے ذمہ دار حکام جنرل گل کے اس خیال سے متفق تھے۔

بے نظیر بھٹو نے افغان پالیسی کو جس طرح ہینڈل کیا اس پر فوج کی پریشانی کے بارے میں جنرل خالد محمود عارف رقمطراز ہیں:-

"افغانستان پر بے نظیر بھٹو کی حکومتی پالیسی مختلف تھی۔ وہ مجاہدین کی کاروائیوں کو فضول اور بے کار سمجھتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ اس تنازعے کا جلد از جلد کوئی حل نکل آئے۔ وہ کسی متبادل ایکشن پلان کے حق میں نہیں تھیں۔ ناکافی سیاسی حمایت اور ماہرانہ راہنمائی کے فقدان کے باوجود آئی ایس آئی کی نظامت کو ہی کام کا سارا بوجھ اٹھانا پڑ رہا تھا۔ 1989ء کے اوائل میں آئی ایس آئی نے سی آئی اے کی شہہ پر مجاہدین سے کہا کہ وہ جلال آباد پر قبضے کے لئے روایتی فوجی حملہ کر دیں۔ لیکن وہ مشن ناکام ہوگیا۔ نیم تربیت یافتہ گوریلہ جنگجو ایک ایسے شہر پر کامیاب حملہ نہ کر سکے جو دفاعی نقطہ نظر سے محفوظ تھا۔ ناقابل وضاحت وجوہ کی بناء پر جن اعلیٰ سطحی اجلاسوں میں افغانستان کے بارے میں پالیسی فیصلے کئے گئے ان میں امریکی سفیر رابرٹ اوکلے بھی شریک ہوئے۔ وہ رابرٹ اوکلے جنہیں "وائسرائے آف پاکستان" کی عرفیت سے پکارا گیا۔ ضیاء کو شک تھا کہ کسی مرحلہ پر امریکہ پاکستان کو بیچ نہ ڈالے۔ انہوں نے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹوریٹ کو ہدایت جاری کر دی تھی کہ امریکی پاکستان کی سرزمین پر مجاہدین راہنماؤں اور کمانڈروں سے اپنے طور پر ملاقات نہ کر سکیں۔ ان کی زندگی میں اس پالیسی پر من دمن عمل کیا جاتا رہا۔ ان کی موت کے بعد صورت حال بدل گئی۔ بے نظیر کی کمزور حکومت امریکی دباؤ کو برداشت کرنے سے قاصر تھی۔ امریکی افسران نے مجاہدین راہنماؤں سے براہ راست ملاقاتوں کا آغاز کر دیا۔ پاکستانی افسران کو نظر انداز کر دیا گیا۔ امریکیوں کے اپنے پالیسی مقاصد تھے۔ انہوں نے اعتدال پسندوں کی جانب جھکاؤ کا اظہار کرتے ہوئے افغان راہنماؤں سے کہا کہ وہ پاکستان اور اپنے درمیان فاصلہ رکھیں۔ کیونکہ پاکستان بنیاد پرست افغان راہنماؤں کے لئے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ افغان راہنماؤں نے امریکیوں کی یہ ہدایت پاکستانی حکام تک پہنچادی۔

فوج کے خیال میں بے نظیر بھٹو امریکیوں کے بہت قریب تھیں اور چاہتی تھیں کہ کابل میں پاکستان نواز اسلام پسندوں کی حکومت بنے نہ بنے مسئلہ افغانستان حل ہو جائے اور وہاں پر تشدد تصادم رک جائیں۔ وہ گئیں تو افغانستان کے معاملات میں فوج کے موقف کو پذیرائی ملی۔ بجائے اس کے کہ وہ پاکستانی فوج کو سویلین قیادت کی ماتحتی کا درس دے اور اس حوالے سے اپنا رسوخ استعمال کرے۔ امریکہ نے فوج کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کر دیا۔ رابرٹ اوکلے اور اس دور کے دیگر امریکی افسران جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ آئی ایس آئی کی وضع کردہ افغان پالیسی کی حمایت جاری رکھ کر امریکہ نے سخت غلطی کی۔ ان دنوں عالمی سلامتی کے معاملات کے لئے امریکہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری دفاع رچرڈ آرمیٹج تھے۔ اوکلے کے الفاظ تھے "ہم 1989ء میں طویل عرصے تک اپنی اصل راہ بھولے رہے اور جو کردار آئی ایس آئی آزادانہ ادا کر رہی تھی اسے سمجھنے سے قاصر رہے"۔

پاکستان کے جوہری پروگرام کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ جس پر موثر کنٹرول سویلین وزیراعظم کو نہیں فوج کو حاصل تھا۔ پاکستان کے جوہری پروگرام کو امریکہ کیوں نہ روک سکا؟ اس پر کنٹرول کیوں حاصل نہ کر سکا؟ یہ اس کتاب کا موضوع نہیں۔ جوہری پروگرام کا ذکر بھی صرف پاکستانی فوج اور پاکستان کے اسلام پسند گروہوں کے درمیان خفیہ اتحاد کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ پاکستان کے جوہری پروگرام کا آغاز 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ہوا۔ تاہم اس کی صحیح شکل وصورت ضیاء الحق کے اسلامائزیشن کے دور میں سامنے آئی۔ ضیاء الحق کے بعد وہ پروگرام اس مرحلے میں داخل ہو گیا جہاں پاکستان چھپا نہیں سکتا تھا کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کا حامل ہے۔ پاکستان کی فوج اور انٹیلی جنس سروسز نے اسلام پسندوں کی طرف رجوع کیا کہ وہ ایک جوہری صلاحیت کے حامل پاکستان کے حق میں مظاہرے کریں۔ اسلام پسندوں نے اعلان کر دیا کہ اگر اس مرحلے پر پاکستان نے جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے ضمن میں عالمی پابندیاں قبول کیں تو یہ غداری ہوگی۔

کیونکہ ضیاء کے دور حکومت میں امریکہ دیگر اہم امور کی طرف متوجہ تھا لہذا پاکستان جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف رہا۔ ضیاء الحق کہہ چکے تھے کہ وہ اس حوالے سے امریکہ کو کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کریں گے۔ ضیاء الحق جس پریشانی سے امریکہ کو بچانا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ پاکستان یا تو اعلان کر دے کہ وہ ایٹمی اسلحہ تیار کر چکا ہے اور پھر کہہ دے کہ وہ ایٹمی اسلحے کی تیاری کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔ امریکی کانگریس نے قانون بنا دیا کہ اگر امریکی صدر یہ سرٹیفکیٹ نہ دے کہ پاکستان کے پاس ایٹمی اسلحہ نہیں ہے تو آخر الذکر کی امداد منقطع کر دی جائے۔ ضیاء الحق اور اور ریگن انتظامیہ کے درمیان معاہدہ طے پا گیا کہ پاکستان یورینیم کو 5 فیصد سے زیادہ افزودہ نہیں کرے گا۔ لیکن جون 1989ء میں جب بے نظیر بھٹو نے بطور وزیراعظم پاکستان واشنگٹن کا دورہ کیا تو اس حد کو عبور کیا جا چکا تھا۔ بش سینئر انتظامیہ نے اسی سال کے اوائل میں اقتدار سنبھالا تھا اور سمجھتی تھی کہ پاکستان ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔ امریکی انتظامیہ نے اشارہ دیدیا کہ اگر پاکستان امریکہ کو ایٹمی ہتھیار نہ ہونے کی تازہ یقین دہانی نہیں کرائے گا تو امریکی صدر یہ سرٹیفکیٹ جاری نہیں کریں گے کہ پاکستان جوہری اسلحہ نہیں رکھتا۔

بھرپور مذاکرات کے بعد امریکہ نے یہ شرط واپس لی کہ پاکستان یورینیم کو 5 فیصد سے زیادہ افزودہ نہیں کرے گا اور بے نظیر بھٹو کے اس وعدے پر یقین کر لیا کہ پاکستان یورینیم کو اس حد تک افزودہ نہیں کرے گا کہ وہ ایٹمی اسلحے کی تیاری میں استعمال ہو سکے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر ویبسٹر نے بے نظیر بھٹو کو ایک بریفنگ دی جس کا موضوع تھا "واشنگٹن پاکستان کے جوہری پروگرام کے بارے میں کیا جانتا ہے"؟ امریکہ کو امید تھی کہ پاکستان کی سویلین وزیراعظم ایٹمی سائنس دانوں اور فوج پر کچھ نہ کچھ قدغن ضرور عائد کریں گی۔ جب یورینیم کی افزودگی کی حدود پر سمجھوتہ ہو گیا تو امریکی صدر نے کانگریس کے نام ایک سرٹیفکیٹ جاری کر دیا کہ "اگرچہ پاکستان اپنی خفیہ تنصیبات پر جوہری سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے

ہے تاہم آج اس کے پاس ایٹم بم موجود نہیں"۔ پاکستان کے لئے امریکی امداد کا تسلسل بحال ہو گیا اور جوہری ہتھیاروں کی تیاری کے پروگرام کا تسلسل بھی نہ ٹوٹا۔

واشنگٹن میں بے نظیر بھٹو نے جو کامیاب مذاکرات کئے انہیں سراہنے کی بجائے انتہا پسند اسلام پسندوں اور جرنیلوں نے کہنا شروع کر دیا کہ رفتہ رفتہ امریکی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کیا جا رہا ہے۔ آئی جے آئی کے ایک اجلاس کے دوران جمعیت العلمائے اسلام کے راہنما مولانا سمیع الحق نے کہا کہ "پاکستان کی ایٹمی اسلحے کی صلاحیت کو ایک مغرب زدہ عورت کی قیادت میں محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ انہیں ملت اسلامیہ کے پہلے جوہری بم کی تیاری کو یقینی بنانے سے زیادہ امریکی رضامندی کا حصول درکار ہے"۔

ستمبر میں فوج نے ضرب مومن کے نام سے ایک بڑی فوجی مشق کا اہتمام کیا۔ میڈیا میں اس کی خوب تشہیر کی گئی۔ مشق کا اصل مقصد عوام کی نظر میں فوج کا تاثر بحال اور اس منفی تاثر کے اثرات کو زائل کرنا تھا جو ایک عشرے سے زائد عرصے پر محیط فوجی حکمرانی کا فطری نتیجہ تھے۔ دوران مشق جنرل بیگ اور ان کے قریبی ساتھیوں نے پاکستانی صحافیوں سے رابطہ کیا۔ ایسے کسی رابطے کی ماضی میں کوئی نظیر دستیاب نہیں تھی۔ انہوں نے میڈیا کے سامنے برملا تسلیم کیا کہ پاکستان نے جوہری متبادل کو ہرگز ترک نہیں کیا اور پروگرام جاری ہے۔ جنرل بیگ نے پاکستان کی میزائل سازی کی صلاحیت کا پہلی مرتبہ اقرار کرتے ہوئے کہا کہ "جوہری بم اور میزائل سازی کی صلاحیت نے پاکستان کی فوج کی جنگی صلاحیت میں قابل ذکر اضافہ کر دیا ہے اور آئندہ یہ دونوں ملکر ڈیٹرنس کا کام دیں گے"۔ پاکستان کی جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت کے بارے میں یہ تصدیقی بیان پاکستان کے اس سرکاری موقف کی نفی تھا کہ "پاکستان کو نہ تو ایٹمی اسلحہ درکار ہے اور نہ ہی اس کا ایٹمی پروگرام اس مرحلے میں ہے کہ کہا جا سکے ایٹمی اسلحے کی تیاری زیادہ دور نہیں رہ گئی"۔

یورینیم کی جس سطح تک افزودگی کا ضیاء الحق نے امریکہ سے وعدہ کیا تھا۔ جب بات اس سے بڑھ گئی تو جنرل بیگ نے چاہا کہ انہیں "سیاسی آڑ" مہیا کی جائے اور بے نظیر بھٹو یورینیم کی طے شدہ سطح سے زیادہ افزودگی کی ذمہ داری اپنے سر لے لیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں۔ جب امریکہ نے غلام اسحاق خان۔ جنرل بیگ اور وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی وعدہ خلافی کے ثبوت مہیا کئے تو بیگ امید کر رہے تھے کہ ان کے دفاع کے لئے بے نظیر بھٹو ایٹمی اسلحے کی تیاری سے منکر ہو جائیں گی۔ یا اس فیصلے کی ذمہ داری خود قبول کر لیں گی۔ بے نظیر نے دونوں میں سے کوئی کام بھی نہ کیا۔ یہ چیز بھی امریکہ کی ناراضگی کا باعث بنی۔ کیونکہ وہ توقع کر رہا تھا کہ جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والی پاکستان کی مغرب نواز وزیراعظم اپنے جرنیلوں کو ایٹمی اسلحے کی تیاری سے باز رکھیں گی۔ جب ایک مرتبہ امریکی حکومت کو اس امر کا ادراک ہو گیا کہ سویلین وزیراعظم فوج کے ہاتھ نہیں روک سکیں بلکہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو گئیں تو اس بات کا امکان کم رہ گیا کہ بے نظیر کی معزولی کی صورت میں امریکہ احتجاج کرے گا۔

تاہم پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو یہ احساس ضرور تھا کہ اگر بے نظیر بھٹو کو ان کے عہدے سے ہٹایا گیا تو امریکہ کسی نہ کسی ردعمل کا اظہار کرے گا۔ بعض مبصرین کا خیال تھا کہ بے نظیر کی معزولی کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا گیا کہ امریکہ کی طرف سے زیادہ مخالفت نہ ہو۔ بے نظیر بھٹو کو کویت پر عراقی حملے سے 4 دن بعد یعنی 6 اگست کو ان کے عہدے سے برطرف کیا گیا۔ صدر اسحاق خان نے ایمرجنسی بھی نافذ کردی۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ بے نظیر بھٹو کی معزولی کا مطالبہ فوج نے کیا تھا۔ جنرل بیگ کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے بے نظیر بھٹو کی معزولی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اور یہ اسحاق خان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ امریکہ نے چونکہ خلیج فارس میں کسی امکانی جنگ پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔ لہذا اس نے بے نظیر بھٹو کی معزولی کو پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دیدیا۔

بدعنوانی اور نا اہلی کو بے نظیر بھٹو کی معزولی کی وجوہات کے طور پر پیش کیا گیا۔ انہی الزامات کی بناء پر ضیاء الحق نے دو سال قبل محمد خان جونیجو کی حکومت کو برطرف کیا تھا۔ دراصل افغان پالیسی پر دونوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا۔ ضیاء الحق کی طرف سے جونیجو حکومت پر عائد کئے گئے الزامات نے پاکستانیوں کو حیران کر دیا تھا۔ کیونکہ نہ تو اس دورانیے میں بدعنوانی کا کوئی سکینڈل منظر عام پر آیا اور نہ ہی بظاہر وہ حکومت نا اہل تھی۔ جس دن بے نظیر بھٹو نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ آئی ایس آئی نے ان کی معزولی کی منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی ایس آئی کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا مستقل ہدف بنی رہی۔ یہ حکومت پاکستان پیپلز پارٹی کے ان ارکان کی سرپرستی کر رہی تھی جن پر ماضی میں سختیاں کی گئی تھیں اور اب طویل عرصے کے بعد انہوں نے اقتدار کی شکل دیکھی تھی۔ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری نے بھی بیوی کی حکومت کے دوران اپنی کاروباری مصروفیات ترک نہ کیں اور اپنے دوستوں کو حکومتی ٹھیکے دلا کر انہیں ممنون کرتے رہے۔ آئی ایس آئی ایوان وزیراعظم سے متعلقہ بدعنوانیوں کو میڈیا تک پہنچاتی رہی۔ آئی جے آئی کے عائد کردہ الزامات ان پر مستزاد تھے اور جب بے نظیر بھٹو کی حکومت کو معزول کیا گیا۔ اس وقت تک یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ " حکومت بدعنوان ہے "۔

تیسری دنیا کے کئی دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے ایک مخصوص طبقے میں بھی بدعنوانی اور اقرباء پروری عام ہے۔ سرکاری ملازمین اور فوجی افسران بے شمار غیر معمولی فوائد اور مراعات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود بدعنوانی سے بالا ہرگز نہیں ہیں۔ جہاں تک سیاستدانوں کا تعلق ہے ایک تو وہ طویل عرصوں کے لئے اقتدار سے باہر رہتے ہیں دوسرے کبھی کبھار انہیں جیل یاترا بھی کرنا پڑتی ہے۔ لہذا وہ اپنی مدت اقتدار کے بارے میں پر وثوق نہیں ہوتے اور اس حوالے سے عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ ان میں رشوت اور " کک بیکس " کے توسط سے اپنی جیبیں بھرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ بدعنوانی کے لئے کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا اور وہ سیاسی طور پر نامزد کردہ ہوں یا مستقل ملازمین۔ پاکستان کے بہت سے افسران ایسے ہیں جنہیں رشوت پیش نہیں کی جا سکتی اور وہ اپنی دیانتداری کے باعث مشہور ہیں۔ تاہم ملکی سیاست میں اپنی

مداخلت کے جزوی جواز کے طور پر فوج نے 1950ء کی دہائی سے سیاستدانوں اور سیاسی کارکنوں کو بدعنوان مشہور کر رکھا ہے۔ 1988ء میں "جزوی سویلین حکومت" کے آغاز ہی سے ان سیاستدانوں پر پے در پے بدعنوانی کے الزامات عائد کئے جاتے رہے جو دفاعی اسٹیبلشمنٹ کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکاری تھے۔ مقصد ان سے نجات حاصل کرنا تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بے محل نہیں ہوگا کہ 1990ء میں بے نظیر بھٹو کو معزول کر دینے کے بعد ان کے اور ان کے شوہر کے خلاف متعدد مقدمات قائم کئے گئے۔ ان مقدمات کو دائر کرنے کے لئے ایک ریٹائرڈ سول ملازم روئیداد خان کی سربراہی میں "خصوصی احتساب سیل" کا قیام عمل میں آیا۔ 1993ء تک ان مقدمات میں سے کسی پر سزا نہ دی جا سکی۔ 1993ء میں بے نظیر بھٹو کے منتخب جانشین نواز شریف کو ایسے ہی الزامات پر معزول کر دیا گیا اور بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر کے خلاف مقدمات کی سماعت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ بے نظیر بھٹو کی معزولی سے چند ماہ بعد نیو یارک میں "ایشیاء سوسائٹی" سے خطاب کے دوران امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے تسلیم کیا کہ پاکستان میں بدعنوانی کے الزامات کی نوعیت سیاسی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کو بدعنوانی کے الزامات کا ہدف بنا لیا گیا۔ جبکہ باقی سب کی بدعنوانیاں نظر انداز کر دی گئیں۔ اس پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے اوکلے پر الزام عائد کیا کہ وہ پاکستان میں وائسرائے کا کردار ادا کر رہے تھے۔

بے نظیر بھٹو کو معزول کر دینے کے بعد فوج نے آئی جے آئی کے صدر غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ بعد ازاں 1990ء کے انتخابات کے دوران آئی ایس آئی نے پاکستان پیپلز پارٹی کی مخالف تمام جماعتوں کے درمیان ایک "ڈیل" کا اہتمام کیا۔ اس طرح ایک بڑا "بے نظیر بھٹو مخالف اتحاد" معرض وجود میں آ گیا۔ نتیجتاً تقریباً ہر حلقے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار کے خلاف صرف ایک (متفقہ) امیدوار کو کھڑا کیا گیا۔ آئی ایس آئی نے نقدی کی صورت میں بھی بہت سا روپیہ تقسیم کیا۔ اس سرمائے کا جزوی فراہم کنندہ کراچی کا ایک بینکار تھا۔ جسے بعد میں کھاتہ داروں کی رقوم غبن کرنے کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ 1995ء میں اس بینکار کی گرفتاری کے بعد ایک ایسے اکاؤنٹ کا انکشاف ہوا جس میں 15 کروڑ روپیہ موجود تھا۔ وہ رقم انتخابات کے دوران سیاسی رشوتوں کے لئے محفوظ سرمائے کے طور پر رکھی گئی تھی جس کا بندوبست آئی ایس آئی نے کیا تھا۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل اسد درانی نے ایک حلفیہ بیان میں تسلیم کیا کہ انہوں نے 6 کروڑ روپیہ 1990ء کے انتخابات کے دوران بے نظیر بھٹو کے 20 مخالف سیاستدانوں میں تقسیم کیا۔

جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد پاک فوج پاکستانی سیاست میں پس منظر میں رہ کر جو کردار ادا کرتی رہی۔ اس کے بارے میں فوج کے رویے کو 1997ء میں عدالت عظمیٰ میں دائر کی جانے والی ایک پٹیشن پر جنرل بیگ کے ردعمل نے ظاہر کر دیا جنرل بیگ نے صاف کہہ دیا کہ چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر جو اقدامات کر رہے ہیں۔ ان کے ضمن میں وہ کسی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں تھے اور "آرمی چیف کے بغیر کوئی یہ اختیار نہیں رکھتا کہ ان سے پوچھے انہوں نے کیا کیا اور کیوں کیا"۔ جنرل بیگ اور لیفٹیننٹ جنرل اسد درانی کا موقف تھا کہ انہوں نے قومی مفاد میں ہی فنڈز اکٹھے کئے اور

قوم کے مفاد میں ہی انہیں تقسیم کیا۔ جنرل بیگ کے جانشین جتنے بھی آرمی چیف آئے انہوں نے مذکورہ بالا اکاؤنٹ کے بارے میں کبھی کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ ملکی سیاست کو اس کی اپنی ڈگر پر نہ چلنے دینا فوج کا اجتماعی چوائس تھا۔

1990ء میں ہونے والے انتخابات میں آئی جے آئی کی فتح کے بعد جنرل بیگ مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعظم بنانا چاہتے تھے۔ لیکن نواز شریف نے کئی دوسرے جرنیلوں کی حمایت اور اشیر باد حاصل کرلی۔ ان جرنیلوں میں قابل ذکر جنرل حمید گل تھے اور یہ حمایت نواز شریف نے علاقائی سیاست کی بنیادوں پر حاصل کی۔ آئی جے آئی نے بظاہر پنجاب میں شاندار فتح حاصل کی تھی اور نواز شریف کا موقف تھا کہ پنجابی عوام انہیں وزیر اعظم دیکھنا چاہتے ہیں۔ پنجابی جرنیلوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور نومبر 1990ء میں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان بن گئے۔

1990ء میں آئی جے آئی کی انتخابی مہم کو منظم کرنے کی تقریباً ساری ذمہ داری جنرل حمید گل نے اٹھا رکھی تھی۔ آئی ایس آئی میں ان کے سابق ماتحت افسران ان کے معاون تھے۔ نواز شریف اور جماعت اسلامی نے بے نظیر بھٹو کو "سیکیورٹی رسک" قرار دیدیا۔ بے نظیر بھٹو پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے ان سکھ باغیوں کی شناخت بھارت تک پہنچادی جن کے پاکستانی انٹیلی جنس کے ساتھ رابطے تھے۔ یہ ایک معمول سے ہٹا ہوا الزام تھا کیونکہ پاکستان کا سرکاری موقف تھا کہ بھارتی پنجاب میں سکھوں نے جس بغاوت کا 1983ء میں آغاز کیا۔ اس میں پاکستان کا کوئی کردار نہیں تھا۔ ان پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ اگر وہ بدستور وزیر اعظم پاکستان رہتیں تو ایٹمی پروگرام ترک کر دیتیں اور اسے بین الاقوامی معائنے کے لئے کھول دیتیں۔ نواز شریف نے وعدہ کیا کہ ایک تو وہ مسلح جدوجہد کے ذریعے کشمیر حاصل کرلیں گے اور دوسرے پاکستان کو ہر صورت میں اور ہر قیمت پر ایٹمی طاقت بنایا جائے گا۔ پولنگ ختم ہونے کے بعد جب نتائج وصول ہونا شروع ہو گئے تو جو صحافی ٹیلی ویژن پر ان پر تبصرہ کر رہے تھے۔ جنرل گل نے انہیں بلا کر کہا کہ وہ انتخابات کے انعقاد کو امریکی امداد کی بحالی کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کریں۔ جنرل بیگ اور جنرل گل اس وقت یہی سمجھتے تھے کہ پاکستان کی سٹریٹیجک اہمیت اور ایٹمی صلاحیت امریکہ کو مجبور کر دے گی کہ وہ پاکستان پر سے انتخابات سے چند ہفتے قبل عائد کی جانے والی پابندیاں اٹھالے۔ جرنیلوں کی خواہش تھی کہ وہ انتخابی نتائج کو اپنی "سرپرست سپر پاور" کے ساتھ سودے بازی کے دوران اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کریں۔

آئی جے آئی کی انتخابی مہم کے لہجے کا تعین مصطفیٰ جتوئی اور نگران وزیر اطلاعات نے کیا۔ بے نظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی پر الزام عائد کیا گیا کہ صیہونیوں کے ساتھ ان کے قریبی روابط ہیں۔ ایک مبصر لکھتا ہے کہ "پاکستان کے نگران وزیر اطلاعات نے یہ پوچھ کر بے نظیر بھٹو کی حب الوطنی کو چیلنج کر دیا کہ آخر الذکر نے تعلقات عامہ کے امریکی ماہر مارک سیگل کی خدمات کیوں حاصل کیں جو ایک معروف صیہونی تھا۔ آئین کے مطابق نگران حکومت کی ذمہ داری صرف

آزادانہ انتخابات کے انعقاد تک محدود تھی۔ اس نے بے نظیر بھٹو کو" پاکستان کی سلامتی کے لئے بہت بڑا خطرہ" قرار دیا۔ کیونکہ انہوں نے صدر۔ فوجی اسٹیبلشمنٹ اور عدلیہ تینوں کی مخالفت کی تھی۔

واشنگٹن کے "قومی جمہوری ادارے"(National Democratic Institute-NDI) نے پاکستان کے انتخابات کا جائزہ لینے کے لئے ایک عالمی وفد بھجوایا جس نے الیکشن کو متنازعہ قرار دیا۔ اس وفد نے قبل از انتخابات اور انتخابی عمل کے دوران متعدد نقائص کی فہرست مرتب کی۔ تاہم وہ وفد اس انتخابی فراڈ کو نہ پکڑ سکا جو بڑے منظم انداز میں کیا گیا تھا اور انتخابی نتائج کو پاکستانی عوام کی خواہش یا مرضی کے طور پر قبول کر لیا۔ این ڈی آئی نے اپنی رپورٹ میں آئی جے آئی کی انتخابی مہم کو اس طرح بیان کیا:۔

"آئی جے آئی کے ارکان نے بے نظیر بھٹو کی صلاحیتوں کو ہی چیلنج نہیں کیا بلکہ ایک خاتون ہونے کے ناطے مسلمان ریاست پر ان کے حق حکمرانی پر بھی بے تحاشا تنقید کی۔ انتخابی مہم کے دوران بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو کے خلاف سب سے بڑا حربہ اور آئی جے آئی کا کامیاب ترتیب ہتھیار امریکہ اور نام نہاد بھارتی صیہونی لابی کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ مذکورہ لابی کے بارے میں تاثر دیا گیا کہ بھارت اور اسرائیل کے ساتھ اس کے تعلقات قابل رشک ہیں۔ جبکہ وہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کی دشمن ہے۔ خصوصاً بھٹو خواتین پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو فروخت کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گی۔ آئی جے آئی کی مہم وطن پرستی پر مبنی تھی۔ جس کے دوران بے نظیر بھٹو کی حب الوطنی کو بار بار مشکوک ٹھہرایا گیا۔ سابق وزیر اعظم پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ پاکستان میں امریکی رسوخ کے قیام کا باعث بنیں۔ امریکی کانگریس کی رائے کو اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ سرکاری اخبارات میں ان کے بھارت اور دیگر پاکستان مخالف گروہوں کے ساتھ روابط کی رپورٹیں شائع کرائی گئیں۔ ان مضامین میں سے ایک ایسا مضمون بھی تھا جو ایک من گھڑت خط پر مبنی تھا۔ مبینہ طور پر وہ خط بے نظیر بھٹو نے "امریکہ کی خارجہ امور پر سینیٹ کمیٹی" کے سٹاف کے ایک رکن کے نام لکھا تھا۔

فوج کی طرف سے آئی جے آئی اور اس کی اتحادی مذہبی رجحانات کی حامل یہود مخالف اور امریکہ مخالف جماعتوں کو انتخابی مہم کے دوران فوج کی طرف سے رقوم کی فراہمی کی رپورٹوں پر بھی نو تشکیل شدہ نواز شریف حکومت کے ساتھ امریکی حکومت کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ انتخابات سے چند دن قبل صدر بش نے کانگریس کے نام یہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا کہ پاکستان کے پاس ایٹمی اسلحہ نہیں ہے۔ اگرچہ "یو ایس ایڈ" نے اپنے پہلے سے جاری پروگراموں پر عملدرآمد کا سلسلہ منقطع نہ کیا۔ تاہم یکم اکتوبر 1990ء کے بعد پاکستان کے لئے امریکی امداد کا بہاؤ جامد ہو گیا۔ "یو ایس ایڈ" اس وقت پاکستان میں تقریباً ایک ارب ڈالرز کے منصوبوں پر کام کر رہا تھا۔ امریکی افسران نے اس مفروضے کی بنیاد پر اپنا کام جاری رکھا کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان اصل بندھن ہی امریکی امداد ہے۔ (اور اس کی بحالی ناگزیر ہے)

وہ نواز شریف کے تاجر نواز وعدوں پر مطمئن تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جسطرح وہ نواز شریف کے سیاسی "گاڈ فادر" جنرل ضیاء الحق کے ساتھ گزارہ کرتے رہے۔ اسی طرح نواز شریف اور ان کے مذہبی جھکاؤ کے ساتھ اپنے معاملات چلاتے رہیں گے۔

نواز شریف نے وزیر اعظم منتخب ہو جانے کے بعد خود کو نظریاتی اقتدار کی بجائے کاروباری ذہن کا حامل ثابت کرنے کو ترجیح دی۔ انہوں نے اپنے ایک بیان میں وعدہ کیا کہ ان کی حکومت ایسی مضبوط حکومت ہوگی جو پاکستان کی ترقی۔ اسے اقتصادی پس ماندگی کی دلدل سے باہر کھینچنے اور صنعتی و زرعی انقلاب بپا کرنے میں انتہائی اہم اور جاندار کردار ادا کرے گی۔ ان کی تاجر نواز پالیسیوں نے انہیں امریکہ نواز بنا دیا۔ وہ پاکستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں کے خاتمے کے لئے بے قرار تھے۔ تاکہ امریکی امداد کے بہاؤ کا ایک بار پھر آغاز ہو جائے اور امریکی قرضوں کی مدد سے سرمایہ کاری سہل ہو جائے۔ محض رد عمل جاننے کے لئے نواز شریف نے بھارت کے وزیر اعظم چندرا شیکھر کی طرف دونوں ملکوں کے تعلقات کو معمول پر لانے کے عمل کے آغاز کے لئے تجاویز بھجوائیں۔ ان کے خیال میں اس طرح پاکستان کی معیشت کی بحالی کا تیز رفتار آغاز ہوگا۔ انہوں نے ایک مرحلے پر واشنگٹن کے ایک "ترغیب کار"(Lobbyist) سے کہا کہ وہ ایک ایسے معاہدے کے خدوخال وضع کرے جس کے تحت قرضوں کو معاف کرانے اور دیگر اقتصادی فوائد کے عوض پاکستان اپنے متنازعہ جوہری پروگرام پر امریکی اعتراضات دور کر دے۔ نواز شریف اپنی اس سوچ کا جراتمندی کے ساتھ اور بانگ ڈہل اظہار کرتے تھے کہ وہ پاکستان کو اقتصادیات کے میدان میں جنوبی ایشیاء کے "ٹائیگرز" کے ہم پلہ بنا دیں گے۔ نواز شریف نے پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے ساتھ بھی اپنے مراسم بدستور برقرار رکھے۔ بطور وزیر اعظم نواز شریف کی پہلی مدت اقتدار متنازعہ پالیسیوں اور ترجیحات کا دور تھا۔ ایک کاروباری آدمی کے طور پر ان کے قلب و ذہن سے معاشی اصلاحات چمٹی ہوئی تھیں اور وہ اقتصادیات میں حکومتی کردار کو کم کر دینا چاہتے تھے۔ وہ نجکاری اور ڈی ریگولیشن کے عمل کو ممکنہ حد تک تیز رفتار بنانا چاہتے تھے

آئی ایس آئی نے افغانستان میں اسلام پسندوں کی حکومت کے قیام کی کاوشیں بھی جاری رکھیں اور بھارت کے زیر قبضہ کشمیر کے اندر گوریلا کاروائیوں کا آغاز بھی کر دیا۔ صدر اسحاق خان اور جنرل بیگ ایٹمی پروگرام کے رول بیگ کا تذکرہ سننا ہی پسند نہیں کرتے تھے۔ نواز شریف نے آئی ایس آئی کی افغان پالیسی اور کشمیر میں نئی مہم جوئی دونوں سے اتفاق کر لیا۔ جلد ہی انہوں نے ایٹمی تجربے پر بھی غور و فکر شروع کر دیا۔ صرف 1991ء میں خلیجی جنگ کے موقع پر نواز شریف نے اپنے آرمی چیف سے اختلاف کیا۔ جنرل بیگ چاہتے تھے کہ پاکستان عراق کے حق میں اپنا جھکاؤ ظاہر کرے۔ انہوں نے امریکی تسلط کے خلاف "سٹر ٹیجک سرکشی" کی وکالت کی۔ اسلام پسندوں نے پاکستان کے شہروں میں امریکی کاروائیوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے اور نواز شریف کے قریبی ساتھیوں کو شک گزرا کہ پر ہجوم امریکہ مخالف

مظاہروں کے بعد جنرل بیگ فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ خلیجی جنگ خصوصی طور پر ایک حساس معاملہ تھا۔ کیونکہ اس میں پاکستان کے دیرینہ محسن سعودی عرب کے مفادات مضمر تھے۔

عراق کے خلاف امریکی سربراہی میں جو مخلوط اتحاد تشکیل پایا پاکستان سمیت اکثر مسلمان ممالک نے اس میں شمولیت اختیار کر لی اور جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو پاکستان نے اپنے آپ سعودی عرب میں اپنی فوج کا ایک ہنگامی دستہ روانہ کر دیا۔ جنرل بیگ واحد استثنیٰ تھے ورنہ نواز شریف اور دیگر جرنیلوں کے نزدیک امریکہ سے سرکشی اختیار کرنا اور چیز تھی اور بڑے مسلمان ممالک کی قیادتوں کو ناراض کرنا بالکل ہی الگ بات تھی۔ دیگر جرنیلوں کی رضامندی سے نواز شریف نے جنرل بیگ کے جانشین کے نام کا اعلان آخر الذکر کی ریٹائرمنٹ کی معینہ تاریخ سے چند ماہ پہلے ہی کر دیا۔ نتیجتاً جنرل بیگ ایک "لنگڑی بطخ" بن گئے۔ اس کے بعد بھی نواز شریف اس قابل نہیں تھے کہ بڑی تبدیلیوں کی حامل پالیسیوں پر عملدرآمد کرا سکتے کیونکہ انہیں ابھی صدر اسحاق خان کے رسوخ سے بنرد آزما ہونا تھا۔

نواز شریف نے ابتداء میں "سول ملٹری امتزاج" کی اس بنیادی سہ جہتی پالیسی میں کوئی مداخلت نہ کی جس پر سالہا سال سے عمل کیا جا رہا تھا اور اپنے ذاتی رسوخ کو ممکنہ حد تک بڑھانے پر اپنی توجہ مرکوز کئے رکھی۔ انہوں نے بریگیڈئیر امتیاز احمد کو سویلین "انٹیلی جنس بیورو" (IB) کا سربراہ مقرر کر دیا۔ بریگیڈئیر امتیاز آئی جے آئی کی تشکیل میں اس وقت ممد ثابت ہوئے تھے جب وہ آئی ایس آئی کے اندرونی سیاست کے شعبے کے انچارج تھے۔ بریگیڈئیر امتیاز فوج سے تو ریٹائر ہو چکے تھے۔ لیکن انہوں نے آئی ایس آئی میں ملازمت کے دوران بنائے گئے مراسم کو قائم رکھا ہوا تھا۔ اب وہ صدر کے خلاف نواز شریف کے لئے ایک نیا "اتحاد" تشکیل دینے میں مصروف ہو گئے۔ امتیاز چاہتے تھے کہ افغانستان اور کشمیر پر پاکستان اپنی پالیسیاں برقرار رکھے اور امریکہ کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت سخت رویہ اپنائے۔ انہوں نے ذہن بنا رکھا تھا کہ موجودہ پالیسیوں پر عملدرآمد کے دوران نواز شریف کو ان پر مکمل کنٹرول حاصل رہے۔ بریگیڈئیر امتیاز کی مدد سے نواز شریف نے بے نظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنا رویہ سخت رکھا اور ان پر دباؤ ڈالتے رہے۔

نواز شریف "انٹیلی جنس بیورو" کی مدد سے اپنا رسوخ بڑھا رہے تھے۔ یہ ملٹری انٹیلی جنس سروسز کا ایک حریف ادارہ تھا۔ امریکی رپورٹر سٹیو کول نے اس دل چسپ صورت کو "تعاقبی کھیلوں کے سیاسی کلچر" کا نام دیا۔ کول لکھتا ہے "ایم آئی" (ملٹری انٹیلی جنس)، "آئی بی" (انٹیلی جنس بیورو) اور "آئی ایس آئی" (انٹر سروسز انٹیلی جنس) جیسے سرنامیے اور مخفف روزمرہ گفتگو میں استعمال کئے جانے لگے۔ بقول کول "غیر مصدقہ رپورٹیں ٹیلی فون پر لی جانے والی کن سوئیوں۔ خفیہ وڈیو فلموں اور جنسی بلیک میلنگ جیسے مواد سے بھری ہوتی تھیں۔ ہر اہم اور نمایاں شخصیت اس امر سے آگاہ تھی کہ فون پر اس کی گفتگو سنی جا رہی ہے"۔ پاکستانی اخبارات کی رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے کول لکھتا ہے کہ نواز شریف ٹیلی فون پر ممبئی میں اپنی کسی گرل فرینڈ کو سنانے کے لئے محبت بھرے گیت گنگناتے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ گرل فرینڈ بھارت کی طرف سے جاسوسی،

پر مامور کی گئی ہو۔ مذکورہ رپورٹیں انٹیلی جنس سروسز کی فراہم کردہ ان اطلاعات پر مبنی تھیں جو ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سے اخذ کی گئی تھیں۔ ایک علیحدہ اخباری رپورٹ شائع ہوئی جسے کسی اور انٹیلی جنس سروس سے منسوب کیا گیا۔ اس کے مطابق بے نظیر بھٹو کراچی میں اپنی رہائش گاہ کو ایک ایسی دہشت گرد تنظیم کے خفیہ صدر دفتر کے طور پر استعمال کر رہی تھیں جسے بھارت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ان ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں سیاسی نظام کمزور تر ہوتا گیا اور فوج اور انٹیلی جنس سروسز کا شمار پاکستان کے بادشاہ گروں میں ہونے لگا۔

جوہری پروگرام میں پاکستان کی پیش رفت اور آئی ایس آئی کی طرف سے کشمیر میں باغیوں کو دی جانے والی مدد کے باعث پاک امریکہ تعلقات میں کشیدگی کا عنصر بڑھ گیا۔ نواز شریف کی حکومت نے برملا تسلیم کر لیا کہ "پاکستان جوہری ہتھیار بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔ نتیجتاً اس موضوع پر پایا جانے والا تعطل ختم ہو گیا۔ یہ انکشاف پاکستان کے سیکرٹری خارجہ شہر یار خان نے واشنگٹن پوسٹ کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران کیا۔ بقول شہر یار انہوں نے یہ تاثر دور کرنے کی کوشش کی کہ پاکستانی حکومت کے قول و فعل میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوشش امریکی پالیسی میں کسی تبدیلی کا باعث نہ بن سکی کیونکہ سرد جنگ ختم ہو چکی تھی۔ لہذا پاکستان میں امریکہ کی دلچسپی ختم ہو رہی تھی۔ واشنگٹن میں نواز شریف کی سفیر عابدہ حسین نے پاک امریکہ تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان میں امریکہ کی اتنی ہی دلچسپی رہ گئی ہے جتنی پاکستان مالدیپ میں رکھتا ہے"۔

پاکستانی فوج کی طرح نواز شریف کی حکومت بھی بعض نظریات کی اسیر تھی۔ امریکہ پاکستان کی حکومت کے مقابلے میں پاکستان فوج کے ساتھ زیادہ خلیقانہ مراسم رکھتا تھا۔ نواز شریف امریکی دورے کے لئے دعوت نامہ حاصل کرنے میں ناکام رہے جبکہ پاکستانی جرنیل امریکہ کی مرکزی کمان کے ساتھ ملاقاتوں کے لئے واشنگٹن آتے جاتے رہے۔ بش انتظامیہ کے محکمہ دفاع نے سوچا کہ خلیج فارس میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستان ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی فوج کو موقع مل گیا کہ وہ خود کو اپنے امریکی ہم منصبوں کے لئے تعدیلی قوت ثابت کر سکے۔ اس طرح ان پالیسیوں کے الزامات بھی پاکستان کی سویلین حکومت کے سر تھوپ دیئے گئے جو فوج اور آئی ایس آئی کی وضع کردہ تھیں۔ اب فوج اس پوزیشن میں تھی کہ وہ امریکہ کے ساتھ سویلین قیادت کی تبدیلی کی بات کر سکے اور وعدہ کر لے کہ مذکورہ تبدیلی کے رونما ہونے کے بعد مختلف پالیسی وضع کی جائے گی۔

جنرل بیگ کے جانشین جنرل آصف نواز نے کوشش کی کہ نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان مصالحت کرا دیں۔ تاکہ پاکستانی سیاست سے اس "بگاڑ پن" کا خاتمہ ہو جائے جو 1988ء کی انتخابی مہم کے دوران در آیا تھا۔ تمام پاکستانی جرنیلوں کی طرح جنرل آصف نواز بھی پاکستان کی زندگی میں فوج کے برتر کردار کے قائل تھے تاہم انہیں فوج کی حدود وقیود کا بھی ادراک تھا۔ وہ پاک فوج کے اندر اسلام پسندوں کے روز افزوں رسوخ کو دیکھ کر چوکنے ہو گئے اور

چاہا کہ پاکستانی فوج میں کچھ نہ کچھ پیشہ ورانہ خصوصیات بھی پیدا ہو جائیں جو سیاست اور نظریات کی نذر ہو چکی تھیں۔ آصف نواز افغانستان میں بھی پاکستان کے نقصانات کو کم کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ پاک امریکہ تعلقات کو بھی از سر نو استوار کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ سویلین حکومت موثر ہو اور فوج غیر پیشہ ورانہ مصروفیات سے مرحلہ وار دستبردار ہو جائے تا کہ سیاسی عمل اطمینان بخش طور پر جاری رہے۔ آصف نواز اس سوچ کے حامل تھے کہ فعال پارلیمانی جمہوریت کی بنیاد رکھنے کے لئے دونوں بڑی جماعتوں کے قائدین کے درمیان کوئی سمجھوتہ طے پا جائے۔

جنرل آصف نواز نے نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان ملاقات کا اہتمام کیا لیکن نواز شریف نے آخری وقت پر انکار کر دیا۔ فوج اور انٹیلی جنس سروسز کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر بے نظیر بھٹو کے ساتھ ان کا کوئی سمجھوتہ ہو گیا تو وہ فوج کے سیاسی متوسل کا مقام کھو بیٹھیں گے۔ ان کے مشیروں کا موقف تھا کہ بلاشبہ آصف نواز فوج کے سربراہ تھے لیکن "فوج" نہیں تھے۔ نواز شریف قائل ہو گئے کہ فوج کی "اداراتی رائے" کے مطابق پارلیمنٹ کے اندر "محب وطن" نواز شریف اور "غدار" بے نظیر کا مل بیٹھنا اور معاملات کو افہام و تفہیم سے چلانا کوئی مستحسن اقدام نہ تھا۔ اس طرح نواز شریف نے سویلین سیاست کو تقویت دینے کا ایک موقع کھو دیا۔

آصف نواز 1993ء میں ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال کر گئے اور ان کے جانشین کی نامزدگی پر نواز شریف اور اسحٰق خان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ اسحٰق خان نے اپنے ایک پشتون ساتھی جنرل عبدالوحید کو آرمی چیف نامزد کر دیا اور نواز شریف سے نجات حاصل کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ آصف نواز کی طرح جنرل وحید بھی سیاست میں فوج کی مداخلت کم کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن انہوں نے جو چاہا ان کی زیر کمان فوج کے لئے "حکم" کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ فوج نے اپنا سیاسی کردار جاری رکھا اور اس کے اس طرز عمل کو اسلام پسندوں کی حمایت بھی بدستور حاصل رہی۔

نواز شریف نے بھی ضیاء الحق کی طرح اسلام پسندوں کو خوش کرنے کے لئے ٹی وی کی سکرین پر آنے والی خواتین کے سروں پر دوپٹے دلوا دیئے۔ 1992ء کی اولمپک کھیلوں میں حکومت نے ٹیلی ویژن پر خواتین کے تیراکی کے مقابلے دکھانے سے انکار کر دیا کیونکہ "اسلامی حساسیت" کے لئے خواتین کا تیراکی کا لباس غیر معقول تھا۔ تاہم اسلام پسندوں نے "مزید" پر زور دیئے رکھا۔ کم از کم تین مواقع ایسے آئے جب عالمی معاملات پر نواز شریف کے نسبتاً معتدل خیالات اور ان کے اسلام پسند اتحادیوں کا انقلابی "پین اسلامک" موقف باہم متصادم ہو گئے۔ 1991ء کی خلیجی جنگ کے دوران اسلام پسندوں کی حمایت صدام حسین کے عراق کو حاصل تھی۔ جبکہ نواز شریف حسب سابق سعودی عرب اور امریکہ کے حامی رہے۔ جب بھارت کے شہر ایودھیا میں ہندو قوم پرستوں نے ایک تاریخی مسجد کو مسمار کر دیا تو ردعمل کے طور پر پاکستانی

اسلام پسندوں نے پاکستان میں واقع ہندوؤں کے مندروں پر حملے شروع کر دئے۔ نتیجتاً نواز شریف حکومت نے ان کے خلاف کریک ڈاؤن کیا۔ افغانستان میں بھی پاکستانی حکومت نے اپنا جھکاؤ اعتدال پسندوں کے حق میں ظاہر کیا جب کہ اسلام پسند اور آئی ایس آئی بدستور مجاہدین کے بنیاد پرست گروہوں کی حمایت کرتے رہے۔

اگرچہ آصف نواز کے ذاتی خیالات مختلف تھے پھر بھی وہ آرمی چیف تھے اور نواز شریف وزیر اعظم۔ اس کے باوجود پاکستان کی طرف سے کشمیری جنگجوؤں کو ملنے والی حمایت میں اضافے کا مشاہدہ کیا گیا۔ نتیجتاً امریکہ نے پاکستان کو تنبیہہ جاری کردی کہ ممکن ہے اسے "دہشت گردوں کی سرپرست ریاست" قرار دیدیا جائے (اس کتاب کے ساتویں باب میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے)۔

افغانستان میں نجیب اللہ کی حکومت 1992ء تک یعنی پورے 4 سال روسی فوج کی عدم موجودگی میں بھی قائم رہی۔ اقوام متحدہ نے کوشش کی کہ مذاکرات کے ذریعے مجاہدین اور سابق کمیونسٹوں کے درمیان "شراکت اقتدار" کی بنیاد پر کوئی مخلوط اتحاد معرض وجود میں آجائے۔ لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی اور مجاہدین کے مختلف گروہ آپس میں ہی لڑتے بھڑتے رہے۔ اس طرح ان کے لئے عسکری فتح کا حصول ممکن نہ رہا۔ آئی ایس آئی کی مستقل کوشش رہی کہ پشتون اسلام پسند گلبدین حکمت یار اور ان کی حزب اسلامی کی "کاز" کو فروغ دیا جائے۔ لیکن اسلام پسند افغانستان کے شہروں پر کنٹرول کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ مارچ 1990ء میں آئی ایس آئی کی سرپرستی میں فوجی بغاوت کے ذریعے نجیب اللہ کی حکومت کو معزول کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی کیونکہ مجاہدین کے 7 میں سے 6 گروہوں نے افغان جرنیل شاہنواز تنائی کی اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش میں تعاون سے انکار کر دیا۔ مجاہدین کے گروہ نسل پرستی اور نظریات پر مبنی دشمنیوں کے باعث بکھر گئے اور آئی ایس آئی کے لئے اپنے متوسل حکمت یار کو اقتدار میں سے قابل ذکر حصہ دلانا ممکن نہ رہ گیا۔

1992ء کے اوائل میں نواز حکومت کے وزیر خارجہ نے عندیہ دیا کہ افغانستان میں ایک عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے اقوام متحدہ نے کابل کی سابق کمیونسٹ حکومت سمیت تمام گروہوں کو یکجا کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے۔ پاکستان کی سویلین حکومت اس سے اتفاق کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ پاکستان اسلام پسندوں کی حکومت بنانے پر اصرار ترک کر چکا تھا اور افغانستان میں اس کے اسلام پسند متوسلین کو اقتدار میں آئی ایس آئی کی ایک عشرے پر محیط توقعات سے کم حصے پر اکتفا کرنا تھا۔

فروری 1992ء میں نجیب اللہ کا ایک کمانڈر جنرل عبدالرشید دوستم اول الذکر کو چھوڑ کر تاجک کمانڈر احمد شاہ مسعود کی سربراہی میں فعال ایک غیر پشتون اتحاد سے جاملا۔ اگرچہ ابتداء میں احمد شاہ مسعود برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی کا حصہ تھا۔ تاہم مستقبل میں افغانستان کے نسلی گروہوں کے درمیان اقتدار کی تقسیم پر اس نے حکمت یار جیسے پشتون راہنماؤں

سے اختلاف کیا۔ روایتی طور پر افغانستان کے "پاور سٹرکچر" پر پشتون حاوی تھے اور یہی چیز مستقبل کے افغانستان کے بارے میں آئی ایس آئی کی سوچ کا حصہ تھی جس میں حکمت یار اور دیگر اسلام پسند پشتون راہ نما بھی شریک تھے۔ لیکن اس سوچ میں اسلامی قانون کو قابل ذکر مقام حاصل تھا۔ دوسری طرف احمد شاہ مسعود ایسا بندوبست چاہتے تھے جس میں اقتدار تاجکوں جیسی نسلی اقلیتوں کے ہاتھ میں رہے۔ دوستم ایک نسل پرست ازبک تھے۔ انہوں نے مسعود کے ساتھ ملکر مشترکہ جدوجہد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دوستم کا لشکر 40 ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا جن کے پاس ٹینک، توپ خانہ اور جنگی طیارے بھی تھے۔ احمد شاہ مسعود کے مجاہدین اور دوستم کے جنگجو مل کر کابل کے مضافات میں پہنچ گئے۔ اس موقع پر نجیب اللہ نے بنیاد پرستی کے خلاف مشترکہ جدوجہد کا مطالبہ کردیا اور امریکہ سے معاونت کی اپیل کردی۔

آئی ایس آئی احمد شاہ مسعود کی نسبت حکمت یار کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتی تھی۔ کیونکہ اول الذکر ایک تو نسل پرست اور دوسرے آزاد خیال تھا آئی ایس آئی نے افغانستان میں پاکستانی رسوخ کا وسیع تر ایجنڈا تشکیل دے رکھا تھا۔ بلکہ وہ اس سے بھی آگے جانا چاہتی تھی۔ مسعود نے اس ایجنڈے کی تکمیل کے دوران استعمال ہونے سے انکار کردیا اور آئی ایس آئی کے لیے قابل اعتماد نہ رہا جب مسعود نے دوستم کی مدد سے کابل شہر کے گرد اپنی فوج پھیلادی۔ حکمت یار نے شہر پر قبضے کے لیے اپنے منصوبے تشکیل دینا شروع کردیئے آئی ایس آئی کے حکام پاکستانی ہیلی کاپٹروں پر کابل شہر کے باہر حکمت یار کے اڈے پر پہنچے جن کی زیر ہدایت آخر الذکر نے کمیونسٹ پارٹی کے ایک اور دھڑے کے ساتھ مذاکرات شروع کردیئے کہ وہ حکمت یار کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دے امریکی اور سعودی سفارت کاروں کی مدد سے نواز شریف نے کوشش کی کہ مجاہدین کے مختلف دھڑے ایک مشترکہ عبوری حکومت تشکیل دینے پر رضامند ہوجائیں۔ اسطرح شدید مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ایک سمجھوتہ طے پایا گیا۔ مسعود اور حکمت یار دونوں نے بظاہر اس سمجھوتے کو قبول کرلیا لیکن اپنے جنگ جوؤں کو کابل شہر کی طرف ہانکتے رہے۔ احمد شاہ مسعود اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اس موقع پر سیٹو کول نے لکھا:۔

"حکمت یار اور آئی ایس آئی دونوں بے رحم خواہشات کا حامل ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔ تاہم دونوں ابھی تک ثابت نہیں کرسکے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے اہل ہیں"

ادھر مسعود اور دوستم کی مشترکہ فوجوں نے کابل کا نظم ونسق سنبھال لیا اور ادھر مجاہدین کے مختلف دھڑوں کے درمیان خانہ جنگی کا آغاز ہوگیا۔ یہ خانہ جنگی کابل کی تباہی اور طالبان کے عروج پر منتج ہوئی۔ میدان جنگ میں کمانڈر عارضی اتحاد بناتے رہے اور کسی مضبوط مرکزی حکومت کے فقدان کے باعث وہ "وار لارڈز" بن گئے۔ کابل نسل پرستانہ اور نظریاتی تقسیم کے حوالے سے شطرنج کی بساط بن چکا تھا۔ پاکستان کی افغان پالیسی بے ترتیبی اور ابتری کا شکار ہوگئی۔ نواز شریف اور وزارت خارجہ نے مجاہدین کے ان دھڑوں کے ساتھ اپنے روابط از سر نو استوار کرلئے جنہوں نے روسیوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ تاہم آئی ایس آئی نے حکمت یار اور دیگر بنیاد پرست دھڑوں کی حمایت جاری رکھی۔ نواز شریف اپنا پورا وزن

افغان اسلام پسندوں کے پلڑے میں نہ ڈال سکے اور پاکستان کے جن اسلام پسند اتحادیوں کے ساتھ ان کے تعلقات پہلے ہی کشیدگی کا شکار تھے۔ وہ ان سے مزید دور ہو گئے۔ 1993 کے اوائل میں آئی جے آئی کا وجود ختم ہو گیا اور نواز شریف اپنی جماعت پاکستان مسلم لیگ کے بینر تلے حکومت کرنے لگے۔

جنوری 1993 میں آرمی چیف جنرل آصف نواز کی اچانک موت کئی مہینوں پر محیط سیاسی انتشار پر منتج ہوئی۔ ان کی اہلیہ نے الزام عائد کیا کہ وہ طبعی موت نہیں مرے اور اشارتاً کہا کہ ان کے شوہر کو زہر دینے کی سازش میں وزیر اعظم بھی ملوث ہو سکتے تھے۔ اگرچہ عدالتی کمیشن کسی سازش یا زہر کا سراغ نہ لگا سکا تاہم یہ داستان ایک "تعاقبی کھیل" کا حصہ بن گئی اور نواز شریف نے ٹیلی ویژن پر خطاب کے دوران صدر اسحٰق خان پر الزام عائد کیا کہ وہ ان کی حکومت کو ختم کرنے کے در پے ہیں۔ اسحٰق خان نے اگلے ہی روز بدعنوانی اور بد انتظامی کے الزامات عائد کرتے ہوئے نواز شریف کو معزول اور ایک عبوری نگران وزیر اعظم کا تقرر کرنے کے بعد پارلیمنٹ تحلیل کر دی۔

پاکستان کی عدالت عظمیٰ نے غلام اسحاق خان کے ہاتھوں نواز شریف کی معزولی کو غیر آئینی قرار دیدیا اور وہ انتہائی مختصر عرصے کے لئے ایک بار پھر وزیر اعظم پاکستان بن گئے۔ نواز شریف اور اسحاق خان کے درمیان تصادم برقرار رہا۔ جسے نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان نفاق نے مزید ہوا دی اور بالآخر فوج آن دھمکی جس نے اسحاق خان اور نواز شریف دونوں کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ فوج نے چند ٹیکنو کریٹس چنے اور ان پر مشتمل ایک نگران حکومت تشکیل دیدی۔ نگران وزیر اعظم معین قریشی "عالمی مالیاتی فنڈ" (آئی ایم ایف) میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جنہیں پاکستان سے رخصت ہوئے 3 عشرے بیت چکے تھے۔ معین قریشی اور جنرل عبدالوحید کی غیر جانبداری کے باعث پاکستان میں نسبتاً شفاف انتخابات منعقد کرائے گئے۔

1993ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی نے چند اسلام پسندوں پر مشتمل ایک نئے اور آزاد اتحاد "پاکستان اسلامک فرنٹ" (پی آئی ایف) کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا اور ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ 207 نشستوں پر مشتمل قومی اسمبلی کی صرف 9 نشستیں اسلام پسندوں کے حصے میں آئیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے پاکستان "دو جماعتی سیاست" کی طرف رجوع کر چکا تھا۔ نواز شریف کی دائیں بازو کی مرکزی جماعت پاکستان مسلم لیگ نے 39 اعشاریہ 7 فیصد ووٹ اور 72 نشستیں اور بے نظیر بھٹو کی بائیں بازو کی مرکزی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے 38 اعشاریہ ایک فیصد ووٹ اور 86 نشستیں حاصل کیں۔ بے نظیر بھٹو ایک مخلوط حکومت کی سربراہ کے طور پر دوسری مرتبہ وزیر اعظم بن گئیں۔

پنجاب کے ایک بلوچ قبیلے کے سربراہ فاروق لغاری کو صدر پاکستان چن لیا گیا۔ اگرچہ لغاری 1970ء کی دہائی سے پاکستان پیپلز پارٹی کے رکن چلے آ رہے تھے۔ وہ سول ملازم بھی رہے اور اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ان کے تعلقات

خوشگوار اور قریبی تھے۔ کیونکہ پارلیمانی جمہوریت کی روایت کے مطابق کسی غیر جانبدار شخصیت کو عہدہ صدارت پر فائز ہونا چاہیئے تھا۔ لہذا لغاری نے پی پی پی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ بے نظیر بھٹو کو لغاری پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ ضیاء حکومت اور ان کے سیاسی کیریئر کے دوران ہمیشہ ان کے ساتھ رہے تھے۔ لیکن لغاری نے اپنا وزن اسٹیبلشمنٹ کے پلڑے میں ڈالدیا اور 3 سال بعد بے نظیر بھٹو کی حکومت کو معزول کردیا۔

اپنی دوسری مدت اقتدار کے دوران بے نظیر بھٹو نے تہیہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کے "سول ملٹری امتزاج" کے ساتھ نہیں الجھیں گی اور اپنی توجہ قوم کے معاشی اور سماجی مسائل پر مرکوز رکھیں گی۔ حکومت کی "سٹریٹیجک سمت کے "تعین کا کام بدستور فوج اور آئی ایس آئی کے ذمہ رہا۔ تاہم دونوں نے یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی کہ تمام امور کاملاً سویلین حکومت کے کنٹرول میں ہیں اور وہ ہمہ مقتدر ہے۔ آئی ایس آئی 1948ء میں معرض وجود میں آئی اور کئی عشرے نظروں میں آئے بغیر اپنے کام میں مصروف رہی۔ حتیٰ کہ ضیاء حکومت کے دور میں بھی آئی ایس آئی کے افسران اور اہلکاروں سے کہا گیا تھا کہ وہ افغان جہاد کو منظم اور ملکی سیاست میں دخیل ہوتے وقت اپنے آپ کو ہرگز نمایاں نہ کریں۔ لیکن 1988ء سے 1993ء تک آئی ایس آئی، آئی جے آئی کے معاملات میں کھلم کھلا دخیل رہی۔ جب بے نظیر بھٹو دوسری مرتبہ وزیراعظم پاکستان بنیں اس وقت جنرل حمید گل اور ان کے کلیدی ساتھی ملکی سیاست میں برملا ملوث تھے اور آئی ایس آئی کا نام عامتہ الناس کی زبان پر چڑھ چکا تھا۔ اسی طرح "ملٹری انٹیلی جنس" کی نظامت کے بارے میں بھی یہ تاثر عام ہوگیا کہ وہ سویلین حکومتوں کی معزولی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مزید برآں ایم آئی کے سربراہ یکے بعد دیگرے آئی ایس آئی کے سربراہ بننے لگے تو اس کی اہمیت دوچند ہوگئی۔

مئی 1993ء میں جب لیفٹیننٹ جاوید اشرف قاضی کو آئی ایس آئی کا سربراہ مقرر کیا گیا تو انہوں نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ آئی ایس آئی کو ایک بار پھر "نادیدہ" بنادیں گے۔ یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ آئی ایس آئی "بادشاہ گر" اور پس منظر میں رہ کر فعال رہتی ہے۔ اس تاثر کے باعث رفتہ رفتہ فوج کی کرشمہ زائی متاثر ہونے لگی۔ ان دنوں جو "تعاقبی کھیل" پاکستانی سیاست کی پہچان بنے ہوئے تھے وہ بدستور کھیلے جاتے رہے۔ لیکن آئی ایس آئی کی پراسراریت میں اضافہ ہوگیا۔ آئی ایس آئی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ جو خفیہ اقدام بھی کرے اس کا الزام کسی سویلین پر دھر دیا جائے۔

دوسری مرتبہ برسراقتدار آنے کے بعد پہلے سال کے اندر اندر بے نظیر بھٹو نے عالمی مالیاتی اداروں کی اعانت سے ایک قابل ذکر اور مفید "سوشل ایکشن پروگرام" کا آغاز کردیا۔ اس پروگرام کا مقصد عوام کو بنیادی سماجی خدمات۔ ابتدائی تعلیم کے مواقع اور صحت عامہ وخاندانی منصوبہ بندی جیسی سہولیات کی فراہمی تھا۔ دیہی عوام کو پینے کے لئے صاف پانی کی فراہمی اور سیوریج سسٹم کا قیام بھی اسی پروگرام میں شامل کردیا گیا۔ جو تجارتی اور صنعتی ادارے ریاست کی ملکیت تھے، ان کی نجکاری کا عمل بھی نسبتاً زیادہ زور شور سے شروع ہوگیا۔ توانائی کے شعبے میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کا پروگرام بنالیا گیا اور صرف 1994ء میں 16 ارب 50 کروڑ ڈالرز کی سرمایہ کاری کے سمجھوتے طے پاگئے۔

امریکہ نے 1992ء میں پاکستان کو دھمکی دی تھی کہ اسے دہشت گردی کی سرپرست ریاست قرار دیدیا جائے گا۔ بے نظیر نے کوشش کی کہ پاک امریکہ تعلقات میں سردمہری کی جگہ گرمجوشی لے لے۔ نواز شریف کی معزولی اور آئی ایس آئی کے سربراہ کی تبدیلی اس دھمکی کی شدت میں کمی کا باعث بن گئی۔ امریکہ نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے ردعمل کے طور پر 1990ء میں اس پر جو پابندیاں عائد کی تھیں۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے کلنٹن انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے کہ وہ اٹھالی جائیں۔ ایک مرحلے پر صدر کلنٹن نے تجویز پیش کر دی کہ 1985ء میں منظور کیا جانے والا وہ قانون منسوخ کر دیا جائے جس کے تحت پاکستان کی ایٹمی پیش رفت کے باعث اس کی عسکری امداد بند کر دی گئی تھی۔ ان کا موقف تھا کہ امریکی خارجہ پالیسی کو چند مخصوص ریاستوں پر پابندیاں عائد کرنے اور انہیں ہدف بنانے تک محدود نہ رکھا جائے۔ کلنٹن انتظامیہ کا ارادہ تھا کہ پاکستان کو وہ ایف سولہ لڑاکا طیارے فراہم کر دیئے جائیں جن کی وہ قیمت بھی ادا کر چکا تھا اور اس کی ایٹمی سرگرمیوں کے جمود کی عدم تصدیق کی بناء پر اسے نہیں دیئے جا رہے تھے۔ اس طرح امریکی انتظامیہ اپنے اس غیر حقیقت پسندانہ مقصد سے دستبردار ہوگئی کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کر دے اور اشارہ دیدیا کہ پاکستان نے ایٹمی پروگرام کو جامد کر دینے کی جو پیش کش پہلے کی تھی امریکہ اسے قبول کرنے پر رضامند ہے۔

صدر کلنٹن کی اس تجویز کو کانگریس کے ان ارکان کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے خلاف تھے۔ مزید براں پاکستانی فوج نے بھی اس تجویز کی حمایت نہ کی۔ ڈینس ککس کے بقول "ان دنوں پاکستان کے آرمی چیف جنرل عبدالوحید امریکہ کا دورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی اور واضح کر دیا کہ ایف 16 یا کسی اور چیز کے عوض پاکستان ایٹمی پروگرام سے دست بردار نہیں ہوگا۔ اگر ملک کی سیاسی قیادت نے اس حوالے سے کسی سمجھوتے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر بھی دیا تو بھی فوج اپنے خیالات کو منظر عام پر ضرور لائے گی۔ جنرل وحید کا لہجہ دھمکی آمیز تھا"۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت پھر بھی اس پوزیشن میں تھی کہ پاکستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں میں کچھ رعایت حاصل کر لے۔ پاکستان نے 1993ء میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے دہشت گرد حملوں کے مفرور "ماسٹر مائنڈ" رمزی یوسف کی گرفتاری میں امریکی حکام کی مدد کی۔ اپریل 1995ء میں بے نظیر امریکہ کے دوسرے سرکاری دورے پر جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں جب وہ گرفتاری عمل میں آئی لہذا اہم اور بروقت ثابت ہوئی۔ امریکی کانگریس کے 1994ء میں منعقد ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں جوری ری پبلکن سینیٹ معرض وجود میں آئی۔ کولوریڈو سے اس کے رکن سینیٹر ہینک براؤن نے اس کے سامنے خارجہ تعلقات کے قانون میں ایک ترمیم پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ اس کے تحت پاکستان F-16 طیاروں کے سوا وہ تمام عسکری ساز و سامان حاصل کر سکتا تھا جسے امریکہ نے جامد کر رکھا تھا۔ مزید براں امریکہ میں پاکستان کے فوجی افسران کی تربیت کا سلسلہ بھی بحال کر دیا گیا۔

سینیٹر براؤن کی تجویز کردہ ترمیم نے اقتصادی معاونت، درآمد برآمد کے لئے بینکوں کے قرضہ جات اور "اوورسیز انویسٹمنٹ کارپوریشن" کی طرف سے ان قرضہ جات کے لئے ضمانت کی فراہمی کی راہ بھی ہموار کردی اور پاکستان امریکہ سے 36 کروڑ 80 ڈالرز کی مالیت کا عسکری ساز و سامان حاصل کرنے کے قابل ہو گیا۔ مزید برآں وہ 12 کروڑ ڈالرز بھی اسے واپس مل سکتے تھے جو اس نے مختلف اشیاء کی خریداری کے لئے 1990ء سے قبل ادا کر دیئے تھے۔ لیکن مطلوبہ اشیاء اسے مہیا نہیں کی گئی تھیں۔

امریکہ نے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج سے بھی رابطے جاری رکھے۔ سیکرٹری دفاع ولیم پیری جنوری 1995ء میں اسلام آئے اور "اعلیٰ سطحی مذاکرات" کی بحالی پر متفق ہو گئے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ پاکستانی فوج کے ساتھ مشترکہ مشقیں بھی کی جائیں گی۔ فوجی تعلیم کا تبادلہ بھی ہو گا اور قیام امن کی سرگرمیوں پر بھی سیر حاصل مباحث کئے جائیں گے۔ اس وقت پاکستان نے اقوام متحدہ کے امن دستوں کی صورت میں اپنے 3000 فوجی بوسنیا اور صومالیہ بھجوا رکھے تھے۔ ان پاکستانی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد امریکی فوج سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیاء میں اس کی حکمت عملیوں کے لئے پاکستان مد ثابت ہو سکتا تھا۔ پاکستانی فوج چاہتی تھی کہ وہ دنیا کے مختلف حصوں میں امن دستوں کی شکل میں خدمات سرانجام دیتی رہے کیونکہ اس طرح وہ اپنے افسروں اور جوانوں کے لئے رقم کما سکتی تھی۔ پاکستانی فوج کی بیرون ملک سرگرمیوں کے باعث عالمی توجہ اس کی اندرون ملک ریشہ دوانیوں سے بھی ہٹی رہتی تھی۔

بے نظیر بھٹو کی مدت اقتدار کے مثبت پہلوؤں کو بعض سیاسی تبدیلیوں اور پر تشدد واقعات نے گہنا دیا۔ انہوں نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار بنانا چاہے۔ کیونکہ پچھلی مرتبہ وہی ان کی حکومت کے خاتمے کا باعث بنی تھی۔ لیکن اس کوشش کے دوران وہ اپنے سویلین مخالفین کے ساتھ سیاسی سمجھوتوں کی ضرورت کو نظر انداز کر گئیں۔ اسٹیبلشمنٹ نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ایک مخصوص حکمت عملی کے تحت قبول کیا تھا۔ انٹیلی جنس سروسز کا ایک حصہ انہیں اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتا رہا اور دوسرا ان کے خلاف سرگرم رہا۔ بے نظیر بھٹو نے نواز شریف سمیت اپنے سیاسی حریفوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح سویلین کو سویلین سے لڑانے کا موقع اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ لگ گیا۔

دو چیلنجوں نے بے نظیر بھٹو کو کمزور کیا۔ ایک تو پاکستان کے سب سے بڑے شہر کے تجارتی مرکز میں پر تشدد واقعہ اور دوسرے اپنے بھائی مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ ان کے کشیدہ تعلقات جو 16 سال جلاوطن رہنے کے بعد پاکستان لوٹے تھے۔ ضیاء حکومت نے مرتضیٰ بھٹو کو دہشت گرد تنظیم "الذوالفقار" کا سرغنہ قرار دے رکھا تھا۔ جو 1980ء اور 1984ء کے درمیان پر تشدد اقدامات کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اپنی جلاوطنی کے دوران مرتضیٰ بھٹو نے کچھ عرصہ کابل میں گزارا اور پھر پاکستان واپسی تک وہ دمشق میں شام کی حکومت کے زیر حفاظت رہے۔

آئی ایس آئی نے 1980ء کے اواخر میں مرتضٰی بھٹو سے رابطہ کر لیا تھا۔ بے نظیر بھٹو 1988ء میں جب پہلی مرتبہ وزیراعظم بنیں تو بعض سیاسی دشواریوں کے پیش نظر اپنے بھائی کو وطن واپسی کی اجازت نہ دے سکیں۔ اپنے والد کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی دونوں بہن بھائی آپس میں سیاسی اختلاف رکھتے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے لئے پارلیمانی سیاست کی راہ چن لی اور مرتضٰی بھٹو نے خود پر "ایک انتہا پسند اور انقلابی شخص" کا لیبل لگوا لیا۔ بے نظیر بھٹو کا خیال تھا کہ قانون کی بالادستی قائم رہے اور مرتضٰی بھٹو پاکستان اس وقت لوٹیں جب پاکستانی عدالتیں انہیں ہر قسم کے الزامات سے مبرا قرار دیدیں۔ اسی چیز نے دونوں کے درمیان موجود اجنبیت اور بیگانگی میں اضافہ کر دیا۔

1993ء میں مرتضٰی بھٹو نے اپنے آبائی ضلع میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نامزد کردہ سرکاری امیدوار کے خلاف انتخاب لڑا۔ اگرچہ وہ جلاوطنی کے دوران سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے لیکن ان کا دھڑا سیاسی رسوخ کے حصول میں ناکام رہا۔ بے نظیر بھٹو وزیراعظم پاکستان منتخب ہو گئیں تو مرتضٰی بھٹو سخت اور چبھتے ہوئے بیانات کے ذریعے بہن کو چیلنج کرتے رہے۔ اخبارات نے اس "لڑائی" کو "بھٹو خاندان کی جنگ" کا نام دیا۔ مرتضٰی بھٹو جلاوطنی ترک کرنے کے بعد پاکستان آئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ بعدازاں وہ عدالتی حکم پر رہا ہو گئے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں کوئی قابل ذکر تقسیم پیدا نہ کر سکے لیکن میڈیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہے اور نتیجتاً بے نظیر موثر طور پر حکومتی امور نہ نمٹا سکیں۔

"الذوالفقار" کے ایام عروج میں ہی آئی ایس آئی نے مرتضٰی بھٹو پر الزام عائد کر دیا تھا کہ ان کے غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں۔ بالخصوص بھارتی انٹیلی جنس کے ساتھ روابط ہیں۔ جب بھائی نے بہن کی حاکمیت کو چیلنج کیا تو بے نظیر حکومت کو بتایا گیا کہ مرتضٰی بھٹو کے پیروکاروں میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کے ایجنٹ بھی موجود ہیں۔ 20 ستمبر 1996ء کو کراچی میں ان کی رہائش گاہ کے باہر پولیس نے انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ یہ واقعہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے لئے "دوہرا المیہ" ثابت ہوا۔ نہ صرف انہوں نے اپنا واحد زندہ بچا ہوا بھائی کھو دیا بلکہ نومبر 1996ء میں جب صدر لغاری نے ان کی حکومت کو معزول کیا تو ان کے شوہر آصف علی زرداری پر مرتضٰی بھٹو کے قتل کا الزام بھی عائد کر دیا گیا۔ پاکستان کے ساحلی شہر کراچی میں ہونے والے پرتشدد واقعات کے نتائج نے بے نظیر حکومت کو مرتضٰی بھٹو کے ساتھ تنازعے سے بھی زیادہ نقصانات سے دوچار کیا۔ 1980ء کی دہائی کے وسط میں کراچی کی سیاسی قیادت "مہاجر قومی موومنٹ" (ایم کیو ایم) کے پاس آ گئی۔ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کے مفادات کی محافظ ہے۔ ایم کیو ایم نے یہ کہہ کر مہاجروں کو یکجا اور متحد کیا کہ شمالی ہندوستان کے اردو بولنے والے باشندوں نے تخلیق پاکستان میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ لیکن سیاسی اقتدار اور اقتصادی فوائد میں ان کے حصے کو روز بروز کم کیا جا رہا تھا۔

ایم کیو ایم کے راہ نما الطاف حسین ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ انہوں نے پاکستان پر پنجابیوں اور سندھ پر سندھیوں کے تسلط کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ پاکستان کے مہاجرین کی اکثریت انہی صوبوں میں قیام پذیر ہے۔ 1988ء

سے ایم کیوایم پارلیمانی سیاست میں ایک طاقتور دھڑے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کراچی اور صوبہ سندھ کے دیگر شہری علاقوں میں ایم کیوایم نے قومی اور صوبائی اسمبلی کی اکثر نشستیں جیت لیں۔ 1990-1988ء میں ایم کیوایم نے آئی ایس آئی کے ایماء پر پہلے بے نظیر بھٹو اور پھر نواز شریف کے ساتھ اتحاد کرلیا۔ اس طرح وہ اقتدار کے پارلیمانی توازن پر اثر انداز ہوتی رہی۔ ایم کیوایم نے اپنا ایک جنگجو شعبہ بھی تشکیل دیا۔ جو کراچی کی بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی شہری آبادی میں پرتشدد واقعات، لوٹ مار اور اغواء برائے تاوان جیسے سنگین جرائم میں ملوث رہا۔ 1992ء میں الطاف حسین نے جلاوطنی اختیار کرلی اور فوج نے کراچی میں ایم کیوایم کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا۔ ایم کیوایم کا ایک حریف دھڑا بھی معرض وجود میں آ گیا۔ جس نے اس ایم کیوایم کے خلاف مورچے بنا لئے جس کے سربراہ الطاف حسین تھے۔ ایم کیوایم نے الزام عائد کیا کہ فوجی کارروائی کا مقصد امن وامان کی بحالی نہیں۔ بلکہ مہاجروں کو ہدف بنانا تھا۔

1993ء میں لغاری کو صدر منتخب کرنے میں ایم کیوایم نے پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی۔ لیکن یہ دونوں جماعتیں سندھ میں "شراکت اقتدار" پر متفق نہ ہو سکیں۔ بے نظیر بھٹو جب دوسری مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہوئیں تو افتتاحی تقریب سے چند ماہ بعد ایک پاکستانی دانشور نے لکھا۔

"سندھ میں مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیوایم) اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان شراکت اقتدار پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ یہ عدم اتفاق ایم کیوایم کے دو دھڑوں کے درمیان خانہ جنگی میں بدل گیا۔ اس خانہ جنگی کو سول اور ملٹری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے خفیہ کردار، انتہا پسند شیعہ اور سنی تنظیموں کے فرقہ وارانہ ٹکراؤ اور امکانی طور پر بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ایجنٹوں نے ملکر ہوا دی اور کراچی میں "سب کے خلاف سب کی جنگ" جیسی صورت حال پیدا ہوگئی۔ 1994ء میں تقریباً 800 افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ ان میں بعض نامور شخصیات بھی شامل تھیں"۔

تقریباً ایک سال بعد ایک امریکی مبصر نے کراچی شہر کی صورت حال کو "حکومت کا تقریباً عدم وجود" قرار دیا اور اس کی مختلف جہتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ (1) نسل پرستی (مہاجر۔ پٹھان۔ سندھی۔ بہاری۔ سب ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند تھے) (2) فرقہ واریت (سنی بمقابلہ شیعہ تصادم عروج پر تھے) (3) اسلامی بنیاد پرستی بمقابلہ سیکولرزم (4) معیشت (5) اقتدار کے لئے جدوجہد اور شراکت اقتدار کے فقدان اور (6) منشیات اور منشیات کی نقل وحمل جیسے عوامل نے کراچی کو اپنی سخت گرفت میں لے رکھا تھا۔

بے نظیر نے فیصلہ کیا کہ کراچی کی پرتشدد صورت حال کا مقابلہ آہنی ہاتھ سے کیا جائے۔ ان کی پالیسی تھی کہ ریاستی طاقت اور پاکستان پیپلز پارٹی کی وسیع البنیاد حمایت کو یکجا کر دیا جائے۔ تاکہ جرائم پیشہ عناصر اور باغیوں کی سرکوبی کی جا سکے۔ کراچی کے مختلف مضافات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جرائم پیشہ افراد اور ایم کیوایم کے جنگ جوؤں کی

نشاندہی کی اور پولیس اور نیم فوجی دستوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ بعض مقامات پر انتہائی خراب شہرت کے حامل افراد کو زندہ گرفتار نہ کیا گیا اور ماورائے عدالت ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ حکومتی کوششوں کے باعث کئی مہینوں پر محیط پرتشدد واقعات کے بعد کراچی میں بظاہر امن لوٹ آیا۔ لیکن حکومت کے پرتشدد اقدامات نے کراچی کے باسیوں کو ناراض کر دیا۔ کراچی پاکستان کی اقتصادیات کا محور تھا۔ شہر میں ہونے والے پرتشدد واقعات نے ملکی معیشت کو نقصان سے دوچار کیا اور سرمایہ کاروں کا اعتماد بھی اٹھ گیا۔

فوجی ذرائع سے کراچی میں امن کے حصول کے دوران فوج اور آئی ایس آئی نے بے نظیر بھٹو کا پورا پورا ساتھ دیا۔ فوج کا خیال تھا کہ کراچی میں بدامنی دراصل کشمیر میں بھارتی مصائب کا ردعمل تھا۔ نتیجتاً پاکستان نے 1994ء میں کراچی میں بھارتی قونصل خانہ اس الزام پر بند کر دیا کہ شہر میں انتشار کے پس پردہ خفیہ بھارتی مداخلت کارفرما تھی۔

بے نظیر بھٹو کی دوسری مدت اقتدار کے دوران بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں باغیوں کے لئے پاکستانی حمایت عروج پر پہنچ گئی۔ جماعت اسلامی اور دیگر تنظیموں نے سرعام جہاد کشمیر کے لئے رضا کار بھرتی کرنا شروع کر دئے۔ حکومتی موقف یہی رہا کہ کشمیر میں کشمیری حریت پسند ہی اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ پاکستانی میڈیا نے کشمیر میں جہاد کے دوران "شہید" ہونے والے پاکستانیوں کی رپورٹیں باقاعدہ شائع اور نشر کرنا شروع کر دیں۔ ایک پاکستانی جریدے "ھیرالڈ" نے لکھا "بھارت کے گھسے پٹے کمانڈوز کے مقابلے میں آئی ایس آئی کے تربیت یافتہ کمانڈوز اور وادی کشمیر میں جنگ میں مصروف پاکستانی عام اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں ایسے ماحول میں تربیت دی جاتی ہے جہاں اختلاف رائے نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ان کی دنیا میں مذہب ہی بنیادی پہچان ہے اور باقی ہر چیز ثانوی اہمیت رکھتی ہے۔ انہیں سوتے وقت ان دلیر مسلمانوں کی داستانیں سنائی جاتی ہیں جنہوں نے اپنے اوطان سے دور عیسائیوں اور ہندوؤں سے جنگیں لڑیں۔ ہر روز وہ بھارتی فوج کے مظالم کی تفصیلات سنتے ہیں۔ جب وہ ہائی سکول کی سطح پر پہنچتے ہیں تو کشمیر ان کی سوچ کا جزو لاینفک بن چکا ہوتا ہے"۔ کشمیر کی بغاوت کی جڑیں پاکستانی اسلام پسندوں کے نظریات سے جا ملتی ہیں۔ جن کی پاکستانی فوج نے کئی عشرے آبیاری کی ہے۔

سویلین قیادت کو ملنے والی فوجی حمایت جہاد کشمیر پر اول الذکر کی رضامندی پر منحصر تھی۔ بے نظیر بھٹو اب نواز شریف کے ساتھ مقابلہ کر رہی تھیں کہ وہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت میں کس نہج تک جا سکتی تھیں۔ آئی ایس آئی نے جہاد کشمیر کے لئے رضا کاروں کی بھرتی اور جنگجوؤں کی وسیع پیمانے پر تربیت میں اسلام پسندوں کی معاونت کی۔ ان کا بنیادی کام بھارتیوں سے لڑنا اور کشمیر میں انہیں ناکوں چنے چبوانا تھا۔ جو فوجی افسران اسلام پسندوں کے نظریات سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بھارت پر دباؤ برقرار رکھنے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ جبکہ اسلام پسند فوجی افسران کے نزدیک "پان اسلامزم" پاکستان کے خارجہ تعلقات کا جزو لاینفک تھا۔

ایک امریکی مبصر نے لکھا کہ "اسلام پسند گروہوں کو کشمیر میں بھارتی فوج سے لڑنے کی اجازت دیکر پاکستان نے اپنے آپ کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ساتھ ساتھ اسے ان گروہوں کو باز رکھنا پڑ رہا ہے کہ وہ پاکستان کی سرزمین کو دوسرے ملکوں کے خلاف کاروائیوں کے لئے اڈے کے طور پر استعمال نہ کریں"۔ بھٹو منیلا گئیں تو فلپائنی حکومت نے احتجاج کیا کہ پاکستانی منڈاناؤ میں حصول خودمختاری کی جدوجہد میں مصروف انتہا پسند مسلمانوں کو حمایت اور مدد فراہم کر رہے تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ ملکر جنگ لڑ رہے تھے۔ روس کو اعتراض تھا کہ چیچنیا کے اسلام پسند جنگ جوؤں میں پاکستانی بھی شامل تھے۔ مصر الجیریا اور اردن کی حکومتوں نے بھی اپنے ان دشمنوں کی نشاندہی کی جنہوں نے روسیوں کے خلاف افغان جہاد میں حصہ لینے کے بعد پاکستان میں ہی بسیرا کر رکھا تھا۔

"پیولٹزر پرائز" جیتنے والے صحافی جان ایف برنس نے مارچ 1995ء میں نیویارک ٹائمز میں لکھا کہ "پشاور اور اس سے متصل علاقے جہاد میں مصروف عالمی دہشت گردوں کی ایک نئی نسل کے لئے فعال ترین تربیتی مراکز اور پناہ گاہوں میں بدل چکے ہیں۔ وہ ان حکومتوں اور اہداف کے خلاف مقدس جنگ لڑ رہے ہیں جو ان کے خیال میں دشمنان اسلام ہیں"۔ سفارتکاروں اور انٹیلی جنس کی رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے برنس لکھتا ہے کہ "پاکستان میں تربیت حاصل کرنے والے مسلمان فلپائن کے سب سے بڑے جزیرے منڈاناؤ جیسی جگہوں پر بھی جنگ لڑ چکے ہیں۔ رمزی یوسف جو 1993ء میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دہشت گردحملے کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ مبینہ طور پر اس کے بھی منڈاناؤ کے ایک مسلمان باغی گروہ کے ساتھ قریبی روابط ہیں۔ وہ تربیت یافتہ مسلمان بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں بھی باغی مسلمانوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں 5 لاکھ بھارتی فوجی اور پولیس افسران بغاوت کو فرو کرنے میں مصروف ہیں۔ مسلمان تاجکستان، بوسنیا، مصر، تیونس اور الجیریا سمیت شمالی افریقہ کے متعدد ملکوں میں بھی مصروف عمل ہیں۔ پاکستان کی گذشتہ حکومتوں کی طرح بے نظیر بھٹو بھی مغربی دباؤ کا محتاط رہ کر سامنا کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں پاکستان کے اندر موجود طاقتور مسلمان گروہوں کی طرف سے خطرات لاحق ہیں"۔

بے نظیر بھٹو اسلام پسند جنگ جوؤں کے خلاف کریک ڈاؤن سے اجتناب کر رہی تھیں۔ اس کی وجہ اسلام پسندوں کی طرف سے شدید ردعمل کا خوف ہی نہیں بلکہ امکان موجود تھا کہ ان کی انٹیلی جنس سروس ہی ان کے خلاف محاذ بنا لے گی۔ بے نظیر قائل ہو چکی تھیں کہ اگر وہ فوج اور آئی ایس آئی کی ملکی دفاع کی پالیسیوں میں مداخلت نہ کریں تو فوج اور آئی ایس آئی انہیں تنہا (آزاد) چھوڑ دیں گی۔ آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی اپنے اکثر اقدامات کی قابل قبول وضاحت پیش کر دیا کرتے تھے۔ وہ بے نظیر کو یہ باور کرانے میں دور تک نکل جاتے تھے کہ ان کا جھکاؤ آخر الذکر کی طرف تھا۔

1995ء میں کشمیر کے اندر ہونے والی دہشت گردی اس وقت عالمی توجہ کا مرکز بن گئی جب ایک جنگجو گروہ "حرکت الانصار" نے چھ مغربی سیاحوں کو یرغمال بنا کر ان کی بحفاظت واپسی کو بھارتی جیلوں سے 22 جنگ

جوؤں کی رہائی کے ساتھ مشروط کر دیا۔ ایک امریکی یرغمالی اغواء کنندگان کی حراست سے فرار ہو گیا جب کہ ایک دوسرے سیاح کی سر بریدہ لاش ایک ماہ بعد ملی۔ کافی عرصہ بعد "الفاران" نامی ایک غیر معروف تنظیم نے اغواء کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا کہ ایک فوجی ایکشن کے نتیجے میں بھارتی حکام نے 3 سیاحوں کو رہا کرالیا تھا جبکہ چوتھا ملا ہی نہیں رہا۔ اس واقعے نے بے نظیر بھٹو کو پریشان کر دیا اور انہوں نے قومی اسمبلی میں " کمیٹی برائے امور خارجہ " کے چیئرمین اور جمعیت العلمائے اسلام کے راہنما مولانا فضل الرحمٰن سے کہا کہ وہ بھارت جائیں اور اسلام پسند جنگجوؤں کے ساتھ بات چیت کی کوشش کریں۔ جب عالمی سطح پر مذمت کی جانے لگی تو پاکستانی حکومت نے موقف اختیار کیا کہ یہ واقعہ بھارت کے "غلیظ حیلوں حربوں" کا نتیجہ تھا۔

امریکہ نے "حرکت الانصار" کو دہشت گرد تنظیم قرار دیدیا۔ اس طرح امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے عالمی دہشت گرد تنظیموں کی جو فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ اس میں شامل ہونے والا یہ پہلا کشمیری گروہ تھا۔ بے نظیر بھٹو نے "حرکت لانصار" کے راہنماؤں کی گرفتاری کا حکم دیدیا۔ آئی ایس آئی نے بے نظیر کو مطلع کیا کہ اول الذکر کا اس نام کی تنظیم سے کوئی رابطہ یا تعلق نہیں تھا۔ لہذا کسی کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔ چند دنوں بعد حرکت الانصار کے معروف راہنماؤں نے "حرکت المجاہدین" کے نام سے ایک تنظیم تیار کر لی۔ جب امریکہ اور میڈیا کے توسط سے معلوم ہوا کہ کشمیری بغاوت میں عرب، افغان اور پاکستانی بھی فعال حصہ لے رہے ہیں تو بے نظیر بھٹو نے آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل قاضی کو بتایا کہ پاکستانی موقف اور ان رپورٹوں کے درمیان تضاد موجود تھا۔ بے نظیر بھٹو کو یہی بتایا گیا تھا کہ بغاوت کی نوعیت مقامی تھی۔ اس پر جنرل قاضی نے موقف اختیار کیا کہ ابتداء میں بغاوت میں واقعتاً مقامی کشمیری ہی شریک تھے لیکن بھارتیوں نے 16 سال سے زیادہ عمر کے تمام کشمیریوں کو مار ڈالا۔ لہذا وہ لوگ بھی بغاوت میں شامل ہو گئے جو کشمیری نہیں تھے۔ بے نظیر نے جنرل قاضی کی وضاحت سے اتفاق کیا اور یہی وضاحت اپنے غیر ملکی مذاکرات کاروں کے سامنے دوہرا دی۔ بے نظیر بھٹو کو آئی ایس آئی کے اقدامات کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی لیکن اس تنظیم پر انہیں مکمل کنٹرول حاصل نہ ہو سکا۔

بے نظیر بھٹو نے فوج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کشمیر اور کراچی پر سخت موقف اختیار کئے رکھا۔ لیکن ان کی حب الوطنی پر جن حملوں کا آغاز ان کی پہلی مدت اقتدار کے دوران ہوا تھا ان کا تسلسل جاری رہا۔ بی بی سی کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران انہوں نے کہا کہ بھارتی پنجاب اور بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں ہونے والی بغاوتوں میں بہت فرق تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اپنی پہلی مدت اقتدار کے دوران ان کی حکومت نے بھارتی پنجاب پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے بھارت کی مدد کی تھی۔ کیونکہ وہ بھارت کا اندرونی معاملہ تھا۔ جبکہ یہ ایک عالمی تنازعہ ہے اور پاکستان کشمیر پر اپنے دعوے سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ صرف اتنا کہنے پر کہ ممکن ہے حکومت پاکستان نے بھارت کے ساتھ تعاون کیا ہو نواز شریف

کی سربراہی میں حزب اختلاف نے بے نظیر بھٹو کو "بھارت کے لئے نرم گوشے کی حامل"۔ "اپنے ملک کے ساتھ غیر مخلص" اور "سیکیورٹی رسک" قرار دینا شروع کر دیا۔

1994ء کے اواخر میں اپنی شناخت ظاہر کئے بغیر آئی ایس آئی کے کچھ افسران نے متعدد نمایاں اور معروف غیر سیاسی پاکستانی شخصیتوں سے ملاقات کی اور انہیں پیش کش کی کہ بے نظیر بھٹو کی معزولی کے بعد جو قومی حکومت بنے وہ اس میں شامل ہو جائیں۔ جن لوگوں سے "بغاوت کے متوقع منصوبہ سازوں" نے ملاقات کی ان میں پاکستان کی معروف سماجی شخصیت عبدالستار ایدھی بھی شامل تھے۔ انہوں نے صرف اس بناء پر ملک چھوڑ دیا کہ مبادا انہیں کسی سیاسی سازش میں ملوث کر دیا جائے۔

اسلام پسندوں نے بھی اپنی کمین گاہوں میں بیٹھکر بے نظیر بھٹو پر حملے جاری رکھے۔ انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے کے ایک دور دراز مقام مالاکنڈ میں "پرتشدد بغاوت" کا اہتمام کیا۔ وہاں "تحریک نفاذ شریعت محمدی" نے شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔ اس تحریک نے دیوانی عدالتوں کے ججوں اور سرکاری ملازمین کو یرغمال بنا لیا اور ایک ائر پورٹ پر قبضہ کرنے کے بعد مختلف شاہراہیں ٹریفک کے لئے بند کر دیں۔ تحریک کو کچھ غیر ملکی مدد بھی میسر آ گئی۔ کرائے کے عرب اور افغان فوجیوں نے افغانستان میں جاری خانہ جنگی سے ناطہ توڑا اور اس نئی مہم میں شریک ہو گئے۔ فوج نے مداخلت سے انکار کر دیا اور سول حکام سے کہہ دیا کہ وہ اس بحران پر خود قابو پائیں۔ اکتوبر 1995ء میں اسلام پسندانہ رجحانات کے حامل ایک میجر جنرل سمیت متعدد فوجی افسروں کو بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر پاکستان کے معاملات سے بخوبی باخبر رابرٹ لاپورٹ جونیئر نام کے ایک مبصر نے لکھا۔

"سازشیوں کا تعلق ایک مسلمان بنیاد پرست گروہ سے تھا۔ مبینہ طور پر جس کی سرپرستی آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جاوید ناصر کر رہے تھے۔ پریس کی ابتدائی رپورٹوں میں بتایا گیا کہ (سازشی) افسران کو ان کے عہدوں سے جبری ریٹائر کر دیا جائے گا۔ لیکن نومبر 1995ء میں اعلان کیا گیا کہ ان کا کورٹ مارشل ہوگا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فوج کے 9 کور کمانڈروں کو ختم کرنا بھی ان کے منصوبے میں شامل تھا۔ فوج کے بنیاد پرست اسلام پسندوں سے منسوب یہ پہلا واقعہ تھا جس کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ پاکستانی فوج کے کردار میں تبدیلی کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اعلیٰ کمان کے ڈھانچے اور نظم وضبط پر ابھی تک اس تبدیلی کے اثرات مرتب نہیں ہو سکے"۔

بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں دور رس نتائج کی حامل جو پیش رفت ہوئی وہ افغانستان میں طالبان کا برسر اقتدار آنا تھا۔ 1993ء میں افغانستان کی خانہ جنگی عروج پر تھی اور پاکستان کی اس خواہش کی تکمیل کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس کے پسندیدہ اسلام پسند پشتون راہنما گلبدین حکمت یار افغانستان کے حکمران بن جائیں گے۔ اگرچہ

سعودی عرب اور پاکستان کے درمیان ہونے والے ایک معاہدے کی رو سے حکمت یار کو مجاہدین کی متوقع حکومت میں وزیراعظم نامزد کر دیا گیا تھا۔ تاہم کمانڈر مسعود کی فوجوں نے انہیں دارالحکومت کابل کے اندر داخل ہی نہ ہونے دیا۔ دارالحکومت کے مضافات میں ہی حکمت یار اور مسعود کی فوجوں کے درمیان راکٹوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ملک کے مختلف حصوں پر اور علاقائی "وارلارڈز" حکومت کر رہے تھے۔ پاکستانیوں نے مسعود کو امن اور پاک افغان دوستی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ لیا۔ ادھر مسعود آئی ایس آئی کی مخالفت سے اس حد تک تنگ آ چکا تھا کہ اس نے بھارت جیسے پاکستان کے ازلی حریف سے پیار کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ اندریں حالات پاکستان کی حکومت چاہتی بھی تو مسعود کے تفکرات دور نہیں کر سکتی تھی۔ طاقت کا توازن کچھ اسطرح متشکل ہو چکا تھا کہ متعدد کوششوں کے باوجود نہ تو آئی ایس آئی اور حکمت یار ملکر مسعود کو فوجی شکست سے دوچار کر سکے اور نہ ہی مسعود ان دونوں پر فتح حاصل کر سکا۔

افغانستان میں موجود تعطل نے عام افغان شہریوں کی زندگی دشوار بنا دی تھی۔ جو مجاہدین ماضی میں قابل احترام ہوا کرتے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو کر "وارلارڈز" کے دستوں میں شامل ہو گئے اور نہتے افغانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ان دگرگوں حالات میں جنوب مشرقی صوبہ قندھار کے مذہبی طلباء کے ایک گروہ نے وارلارڈز کو چیلنج کر دیا بقول سیٹوکول:-

"طالبان 1994ء میں ہی معرض وجود میں آئے اور اسی سال عروج حاصل کر لیا۔ ملا محمد عمران کے راہنما کے طور پر منظر عام پر آئے۔ امریکہ اور یورپ میں طالبان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ "وہ مذہب کی طرف مائل سادہ لوح، پرہیزگار اور پرعزم طلباء کا ایک ایسا منظم گروہ ہے جو قندھار کے جرائم پیشہ وارلارڈز کے لئے مبنی بر تنفر عوامی رویے کے نتیجے میں برسراقتدار آیا"۔ ان کے خیال میں طالبان کی بنیادی سوچ ملا عمر کے ان خوابوں سے ہم آہنگ تھی جو انہوں نے افغانستان میں اسلامی نظام کے بارے میں دیکھ رکھے تھے۔ وارلارڈز نے جن لڑکیوں کو جبری آبروریزی کے لئے اغواء کر لیا تھا ملا عمر نے انہیں نجات دلائی۔ عوامی انصاف کے بارے میں ملا عمر کی خواہشات کی تشہیر کی گئی اور لڑکیوں کے بدراہ اغواکنندگان کو جب انہوں نے پھانسی پر لٹکایا تو اس فعل کو بھی مغربی ممالک میں سراہا گیا۔ ایک پشتون نیوز کاسٹر جس کی طالبان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی کہتا ہے کہ "وہ پراسرار حکایتوں کی مانند تھے۔ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں بندوق پکڑے گاؤں گاؤں گئے اور درخواست کی کہ اس قرآن کے واسطے ہتھیار پھینک دو۔ جن وارلارڈز نے ان کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا وہ ان کے ہاتھوں قتل ہو گئے"۔ سپوژمہائی میوندی نامی مذکورہ نیوز کاسٹر نے مزید لکھا کہ "ہم ان کے رویے کو عجیب خیال نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم ان کے وجود سے آگاہ تھے۔ دیہی قندھار میں انہوں نے انصاف تقسیم کیا"۔

طالبان کے منظر پر ابھرنے کی جتنی تفصیلات دستیاب ہیں ان کے مطابق وہ سب مقامی تھے اور مجاہدین راہنماؤں اور وارلارڈز دونوں سے نالاں تھے۔ بعدازاں پاکستان کی آئی ایس آئی نے بھی انہیں حمایت مہیا کی۔ اپنی کتاب "طالبان" میں احمد راشد لکھتا ہے کہ طالبان تحریک کے زیادہ تر راہنما مدرسوں کے جزوقتی یا کل وقتی طلباء تھے۔ اسی نسبت

سے وہ طالبان کہلائے۔ احمد راشد نے لکھا" طالب ایک اسلامی طالب علم ہے۔ وہ ملا کے برعکس علم کے حصول کا خواہاں رہتا ہے۔ جبکہ اول الذکر علم بانٹتا ہے۔ اس کام کا انتخاب کرنے کے بعد (طالبان، طالب کی جمع ہے) وہ مجاہدین کی تقسیم وتفرقہ پرمبنی سیاست سے الگ تھلگ ہو گئے اور عندیہ دیا کہ وہ حصول اقتدار کے لئے فریق بننے کی بجائے معاشرے میں موجود غلاظت کا تدارک کریں گے"۔ طالبان نے اپنے ارادوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ امن بحال اور عوام کو غیر مسلح کریں گے۔ شرعی قوانین نافذ کریں گے اور افغانستان کی سالمیت اور اسلامی تشخص کا دفاع ان کی ذمہ داری ہوگا۔

بقول راشد، ممکن ہے پاکستان ابتداء سے ہی طالبان کے عروج میں ملوث رہا ہو۔ تاہم وہ طالبان کو ملنے والی حمایت کو پریشان حال پاکستانی ٹرانسپورٹروں، سمگلنگ مافیا۔ جمیعت العمائے اسلام (جے یو آئی) اور ان پشتون فوجی اور سیاسی افسران سے منسوب کرتا ہے جو پاکستان سے وسطی ایشیاء کی ریاستوں تک زمینی راستہ کھول دینا چاہتے تھے۔ جمعیت العلمائے اسلام وہ واحد اسلامی دھڑا تھا جو بے نظیر بھٹو کی مخلوط حکومت میں شامل ہوا۔ اس کے راہنما مولانا فضل الرحمٰن کو امور خارجہ پر قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ کا چیرمین نامزد کر دیا گیا۔ جے یو آئی کو زیادہ حمایت ان پاکستانی صوبوں سے ملی جو افغانستان کی سرحد کے ساتھ واقع تھے۔ حکومتی سرپرستی کے توسط سے فضل الرحمٰن نے پشتونوں کے کاروباری مفادات کے ساتھ گہرے تعلقات قائم کر لئے۔

اس بیان کے مطابق جو پاکستانی براستہ افغانستان وسطی ایشیاء تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے، انہیں قندھار میں "وارلارڈز" کی طرف سے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت تک بے یارومددگار عورتوں اور بچوں کے حامی ومدد گار کی حیثیت سے ملا عمر قندھار میں "رابن ہڈ" جیسی شہرت کے مالک بن چکے تھے۔ جبکہ پاکستان کے ٹرک مالکان طالبان کو لاکھوں روپے چندے کے طور پر دے چکے تھے۔ لاکھوں روپے ماہانہ وظائف بھی مقرر کر دیئے گئے۔ وہ طالبان سے توقع رکھتے تھے کہ "وارلارڈز" نے سڑکوں پر رکاوٹیں پیدا کر کے ٹیکسوں کی وصولی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا ایک تو وہ ختم ہونا چاہئے۔ دوسرے ٹرکوں کے قافلے ڈاکوؤں اور لٹیرے سے محفوظ رہیں۔

پاکستانی فوج کے لیفٹیننٹ جنرل کمال متین الدین اور صحافی امتیاز گل کے بیانات کے مطابق جس وقت پاکستانی حکام کا طالبان کے ساتھ رابطہ ہوا۔ اس وقت تک آخر الذکر قندھار میں اپنے وجود کا احساس دلا چکے تھے۔ آئی ایس آئی طالبان کی تخلیق میں مددگار ثابت ہوئی یا اس کی کتابوں میں طالبان کا بطور اتحادی اندراج ان کے موثر اور بارسوخ ہونے کے بعد ہوا۔ دونوں صورتوں میں پاکستان سے ملنے والی حمایت یا مالی مدد ان کے لئے فیصلہ کن اور اہم تھی۔

آئی ایس آئی طالبان کو جو مدد فراہم کر رہی تھی۔ بے نظیر بھٹو کو بھی آہستہ آہستہ اس میں ملوث کیا جا رہا تھا۔ جب طالبان برسر اقتدار آئے تو ابتداء میں "ایک پرامن افغانستان" امریکہ کی پریشانی کا باعث نہیں بنا۔ ایک امریکی آئل کمپنی

"یونوکیل" نے ترکمانستان سے پاکستان براستہ افغانستان گیس پائپ لائن بچھانے کے لئے مذاکرات کیئے۔ طالبان اور دیگر افغان دھڑوں کو مذاکرات کی میز تک لانے کے لئے پاکستان جو کاوشیں کر رہا تھا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ تاہم بعد میں جب طالبان نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں اور اس کے نیٹ ورک سمیت اسامہ بن لادن کے میزبان بن گئے تو امریکہ کے ساتھ ان کی شدید دشمنی کا آغاز ہو گیا۔ اگرچہ پاکستان کے وزیر داخلہ نصیراللہ بابر بدستور طالبان کی مدد کر رہے تھے۔ تاہم مارچ 1996ء میں بے نظیر کی حکومت نے غور شروع کر دیا کہ کیوں نہ ان کی حمایت کا سلسلہ ترک کر دیا جائے۔ سول حکام نے بھی فکر مندی کا اظہار کیا کہ اگر کابل میں طالبان کی حکومت قائم ہو گئی تو پاکستان کے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ ان کو خدشہ تھا کہ ایک تو اس طرح اسلامی بنیادی پرستی کو تقویت ملے گی اور دوسرے پاکستان کے جو قبائلی علاقے افغانستان کی سرحد کے ساتھ متصل ہیں وہاں علیحدگی کے رجحانات پیدا ہوں گے۔ عجب اتفاق ہے کہ انہی دنوں بے نظیر بھٹو کی حکومت اور پاکستانی عدلیہ کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے اور جماعت اسلامی نے مہم شروع کر دی کہ بے نظیر بھٹو مستعفی ہو جائیں اور عدلیہ کی سربراہی میں ایک عبوری حکومت تشکیل دے دی جائے۔

1996ء کے موسم گرما میں حکومت کے خلاف جماعت اسلامی کی مہم میں تشدد در آیا اور جون میں پولیس کے ساتھ تصادم کے نتیجے میں جماعت کے تین کارکن ہلاک ہو گئے۔ جولائی میں نواز شریف کی مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سمیت حزب اختلاف کی 9 جماعتوں نے ہڑتال کی کال دیدی۔ جس کے نتیجے میں کراچی کا صنعتی شعبہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ حزب اختلاف کے اتحاد میں شامل جماعتوں کی تعداد 14 ہو گئی جن میں "مہاجر قومی موومنٹ" (ایم کیو ایم) بھی شامل تھی اور بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف احتجاج کی مقدار میں اضافہ ہو گیا۔ بعد ازاں بم دھماکوں اور فرقہ وارانہ ہلاکتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک پولیس مقابلے کے نتیجے میں مرتضیٰ بھٹو کی موت کے بعد یہ تاثر عام ہو گیا کہ گھریلو صورت حال پوری طرح بے نظیر بھٹو کے کنٹرول میں نہیں تھی۔

5 نومبر 1996ء کو جب صدر فاروق لغاری نے وزیراعظم کو معزول اور اسمبلیاں تحلیل کر دیں تو بے نظیر حکومت ختم ہو گئی۔ فوج لغاری کی پشت پر موجود تھی۔ جس نے مبینہ طور پر لغاری کو مطلع کر دیا تھا کہ ایک تو بے نظیر حکومت کے خلاف فوج میں بے چینی پائی جاتی تھی اور دوسرے حکومت کی بدعنوانیوں کے شواہد بھی موجود تھے۔ لغاری کو بتایا گیا کہ بے نظیر کے شوہر آصف علی زرداری بدعنوانیوں میں ملوث تھے۔

بے نظیر بھٹو کو مختصر وقت کے لئے گرفتار کیا گیا اور آصف علی زرداری کو ملٹری انٹیلی جنس والے ہمراہ لے گئے۔ بعد میں زرداری کو بدعنوانیوں کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ ادھر صدر نے بے نظیر کو بتا رکھا تھا کہ فوج آخرالذکر کی معزولی کی خواہاں تھی اور ادھر آرمی چیف نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ لغاری ان کی حکومت کو معزول کرنے ہی والے تھے۔ تاہم بے نظیر کو توقع نہیں تھی کہ ان سے دوسری مرتبہ اقتدار چھن جائے گا۔

لغاری نے بے نظیر بھٹو پر الزام عائد کیا کہ وہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کا سلسلہ روکنے میں ناکام رہیں۔ دوسرے انہوں نے عدلیہ کی آزادی کو نقصان سے دوچار کیا۔ مزید براں ان کے دور حکومت میں بدعنوانی اور اقرباء پروری بھی عروج پر رہی اور حکومتی فرائض کی ادائیگی کے دوران بھی قواعد وضوابط کو نظر انداز کر دیا گیا۔ "فرائیڈے ٹائمز" نے، جس کے مدیر نجم سیٹھی کو فاروق لغاری نے صدارتی مشیر مقرر کر رکھا تھا، اپنے اداریے میں بے نظیر بھٹو کے متعدد ناقدین کے جذبات شائع کئے۔ "فرائیڈے ٹائمز" نے لکھا۔ "یہ سب بے نظیر بھٹو کا کیا دھرا تھا۔ وہ ایک متکبر، ناعاقبت اندیش، متلون مزاج اور بدعنوان حکمران تھیں۔ انہوں نے اپنے گرد خوشامدیوں، اندھے مقلدین اور چاپلوسوں کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ اس طرح انہوں نے پاکستان کے عوام کی خدمت کا دوسرا موقع بھی ضائع کر دیا"۔

بلاشبہ بے نظیر بھٹو نے اپوزیشن کے ساتھ دوران مقاومت بھی بعض غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ عدلیہ کے ساتھ بھی ان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور امور حکومت کی انجام دہی میں بھی ان سے کئی کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ لیکن انہوں نے نسبتاً بڑی غلطی یہ کی کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پر اعتماد کر لیا۔ وہ پر امید تھیں کہ مدت اقتدار کے اختتام تک ان کی منتخب حکومت کو اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل رہے گی۔ جب انہیں معزول کیا گیا۔ بے نظیر بھٹو "سول ملٹری امتزاج" کے لئے بے کار اور غیر مفید ہو چکی تھیں۔ نہ تو وہ اضافی امریکی امداد حاصل کر سکتی تھیں اور نہ ہی افغانستان اور کشمیر میں پاک فوج کی خفیہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کو تیار تھیں۔ ان کی معزولی کے بعد طالبان نے افغانستان کے زیادہ تر حصے پر اپنا کنٹرول مستحکم اور پاکستان نے سفارتی سطح پر ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ 2001ء میں مسعود نے جب امریکہ کی مدد سے طالبان سے اقتدار چھینا۔ اس وقت اول الذکر اور شمالی اتحاد میں شامل ان کے اتحادیوں کو افغانستان کے صرف 10 فیصد علاقے پر کنٹرول حاصل تھا۔

آئی ایس آئی نے کشمیری مجاہدین کے تربیتی مراکز افغانستان منتقل کر دیئے۔ جہاں انہیں امریکہ مخالف دہشت گردوں کے ہمراہ تربیت دی گئی۔ اسلام آباد میں حکومتوں کی تبدیلی نے اس امر کو یقینی بنا دیا کہ ان پالیسیوں پر عملدرآمد کی راہ میں کوئی سویلین رکاوٹ حائل نہیں ہوگی اور نہ ہی سویلین حکومت کا کوئی اقدام تاخیر کا باعث بنے گا۔

بے نظیر کی دوسری مدت اقتدار کا دورانیہ نسبتاً کچھ زیادہ تھا۔ اپنے گزشتہ تجربے کی بنیاد پر انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ فوج یا آئی ایس آئی کے ساتھ ان کا کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔ بھارت کے ساتھ انہوں نے اپنا رویہ سخت رکھا اور کشمیر میں باغیوں کی حمایت بھی کی۔ حتیٰ کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت سے بھی کوئی تعرض نہ کیا جو آئی ایس آئی کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے۔ تاہم نہ تو وہ اعلیٰ ترین حکومتی سطح پر بدعنوانی کی روک تھام کر سکیں اور نہ ہی نواز شریف کے ساتھ شدید اختلافات کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ ادھر اسلامی جماعتیں بے نظیر کے احتساب کا مطالبہ کر رہی تھیں اور ادھر پہلے کی طرح ان کی دوسری حکومت کو بھی معزول کر دیا گیا۔

نئے انتخابات کے انعقاد سے قبل لغاری نے فوج کا ایک دیرینہ مطالبہ منظور کرتے ہوئے "قومی دفاعی وسلامتی کونسل" کے قیام سے اتفاق کرلیا اور طے پایا کہ مذکورہ کونسل دفاع اور معیشت سمیت تمام معاملات پر برسر اقتدار حکومت کو ہدایات جاری کرے گی اور صدر کی سربراہی میں 10 ارکان پر مشتمل اس کونسل میں وزیر اعظم۔ چار وفاقی وزراء۔ چیئرمین آف دی جوائنٹ چیفس آف سٹاف اور تینوں مسلح افواج کے سربراہ شامل ہوں گے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے خیال میں یہ فوج کے سیاسی کردار کو اداراتی درجہ دینے کی ایک کوشش تھی۔ لہذا انہوں نے اس کی تخلیق کی مخالفت کی۔ یہ کونسل ضیاء الحق کی اس نیشنل سیکیورٹی کونسل سے مشابہہ تھی جسے قومی اسمبلی نے 1985ء میں آئین سے حذف کر دیا تھا۔ صرف نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ نے اس کی تخلیق کی حمایت کی اور کہا کہ یہ کونسل ملکی استحکام کے لئے سودمند ثابت ہوگی۔ ان کا مقصد صرف فوج کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

بدعنوانی کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے لغاری نے فوج کے ایماء پر ایک "احتساب کمیشن" کے قیام کی منظوری بھی دے دی۔ تاہم کمیشن کے قیام سے 6 ہفتے بعد حکومت نے تسلیم کرلیا کہ اسے بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری سمیت چوٹی کے سیاستدانوں کے خلاف کوئی شہادت میسر نہیں آئی جس کی بنیاد پر کوئی کاروائی کی جا سکے۔ بدعنوانی کے ثبوت نہ ملنے کے باعث اسٹیبلشمنٹ کا یہ منصوبہ ناکام ہوگیا کہ تازہ انتخابات سے قبل بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں کو نا اہل قرار دے دیا جائے۔ 3 فروری 1997ء کو انتخابات منعقد کرائے گئے جن میں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ نے بالترتیب بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی سربراہی میں دو بڑے حریفوں کے طور پر حصہ لیا۔ جماعت اسلامی کا موقف تھا کہ نگران حکومت بدعنوان سیاستدانوں کو نا اہل قرار دینے میں ناکام رہی۔ لہذا اس نے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ انتخابات کے دوران تیسری سیاسی قوت کا کردار پاکستان میں کرکٹ کے ہیرو عمران خان نے ادا کیا جو ایک نئی جماعت "پاکستان تحریک انصاف" کے سربراہ تھے۔ تحریک انصاف نے وعدہ کیا کہ وہ پاکستان کو بدعنوانی سے پاک کردے گی اور ایسی حکومت تشکیل دے گی جس میں حکمرانوں کے طور پر "تازہ چہرے" عوام کے سامنے لائے جائیں گے۔ آئی ایس آئی پر امید تھی کہ طاقت کا توازن ایم کیو ایم، تحریک انصاف اور ان آزاد امیدواروں کے ہاتھ میں رہے گا جو بڑے بڑے زمیندار ہونے کے ناطے لغاری کے قریبی ساتھی تھے۔ لیکن فوج اپنا پسندیدہ سیاسی منظر متشکل کرنے میں ایک بار پھر ناکام رہی۔

انتخابات میں بہت کم رائے دہندگان نے حصہ لیا اور ملکی سطح پر ٹرن آؤٹ 30 فیصد سے نہ بڑھ سکی۔ پنجاب سے 41 فیصد سے کم۔ سندھ سے 31 اعشاریہ 2 فیصد۔ شمال مغربی سرحدی صوبے سے 29 اعشاریہ 6 فیصد اور بلوچستان سے 22 اعشاریہ 84 فیصد رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ عوام ایسی حکومتوں کو بار بار منتخب کر کے تنگ آچکے تھے جنہیں دوسال گزرنے پر معزول کر دیا جاتا تھا۔ کم ٹرن آؤٹ پاکستان مسلم لیگ کے لئے مفید ثابت ہوئی

اوراس نے نئی قومی اسمبلی کی دوتہائی نشستیں جیت لیں۔لغاری اورفوج کے پاس دوہی راستے تھے۔یاتو کم ٹرن آؤٹ کی بنیاد پر انتخابات کوکالعدم قرار دے دیا جائے اوریا پھر نواز شریف کو بطور وزیراعظم قبول کرلیا جائے۔انہوں نے دوسرے متبادل کو چن لیا اور نواز شریف وزیراعظم منتخب ہو گئے۔اس مرتبہ قومی اسمبلی میں ان کے پاس اتنی اکثریت تھی کہ آئین میں ترمیم کرسکیں۔

بےنظیر بھٹواور نواز شریف نے اس ترمیم کو آئین سے حذف کرتے وقت مختصر تعاون کیا جس کے تحت صدر کواختیار حاصل تھا کہ وہ منتخب حکومت کومعزول کرسکے۔لغاری نے بےنظیر بھٹواوران کے شوہر کے خلاف جس عدالتی کاروائی کا آغاز کرایا۔نواز شریف نے اس کاتسلسل قائم رکھا۔"احتساب کمیشن" وزیراعظم سیکرٹیریٹ کے اندرہی ایک "احتساب سیل "میں بدل گیا اورنواز شریف کے مخالف سیاستدانوں، تاجروں اور صحافیوں کوگھیرنے کے لئے اس سیل نے اپنے دائرہ کار میں وسعت پیدا کرلی۔

صدر کے ہاتھ میں پکڑی معزولی کی جوتلوار ہروقت وزیراعظم کے سرپرلٹکتی رہتی تھی۔اس سے محفوظ ہونے کے بعد نواز شریف نے آئین میں ایک اور ترمیم منظور کرائی جس کے تحت ہر پارلیمانی پارٹی کے سربراہ کواختیار مل گیا کہ جورکن جماعتی نظم وضبط کی خلاف ورزی، اپنی جماعت کے خلاف تقریر یااس کے خلاف ووٹ استعمال کرنے کا مرتکب ہو۔وہ اس کی مقننہ کی رکنیت ہی ختم کردے۔بمطابق ترمیم، ایسے اخراج کوعدالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔مطلب یہ کہ نواز شریف کے پارلیمانی گروپ کے ارکان نہ توان کے خلاف ووٹ دے سکتے تھے اور نہ ہی ان کے خلاف بول سکتے تھے اور اگر وہ ایسا کرتے تو مقننہ میں اپنی نشست کھو بیٹھتے۔لغاری اور فوج کو "وزیراعظم کی آمریت" نے چوکنا کر دیا۔صدارتی اختیارات کے خاتمے کے بعد نواز شریف پر اگر کوئی واحد چیک تھا تو وہ عدلیہ تھی۔لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت نے پاکستان کے چیف جسٹس کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ نواز شریف سے اختلاف کریں۔

عدالت عظمیٰ کے لئے 5 نئے ججوں کی نامزدگی نواز شریف اور عدلیہ کے درمیان تصادم کا باعث بن گئی۔نواز شریف ان کی راہ روکنا چاہتے تھے تاہم وہ فوجی مداخلت کے بعد رضامند ہو گئے۔نومبر 1997ء میں "نیویارک ٹائمز" نے خدشہ ظاہر کیا کہ پاکستان میں ایک مرتبہ پھر فوج برسراقتدار آجائے گی۔اخبار نے لکھا:۔

"صرف نوماہ قبل نواز شریف نے شاندار فتح حاصل کی اور وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہو گئے۔اپنی حکمرانی کومحفوظ بنانے کے لئے انہوں نے حکومتی گاڑی کوغیرمحتاط انداز میں چلایا۔خدشہ ہے کہ پاکستان شورش کے ایک نئے سلسلے کی زد میں آجائے گا۔کیوں کہ 1993ء میں ان کی حکومت کوایک صدارتی حکم کے تحت معزول کیا گیا تھا۔لہٰذا 47 سالہ نواز شریف اس امرکویقینی بنانا چاہتے ہیں کہ ان سے 5 سالہ مدت اقتدار کی تکمیل سے پہلے ہی وزارت عظمیٰ نہ چھین لے جائے۔اس

مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے صدر، آرمی چیف، پارلیمنٹ اور عدلیہ کے اختیارات کو محدود کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ اخبارات انہیں متعدد مرتبہ متنبہ کر چکے ہیں کہ وہ مسلح افواج کو ایک مرتبہ پھر اقتدار سنبھالنے کی دعوت دے رہے رہیں۔ وہ فوج جو بالواسطہ یا براہ راست پاکستان کی 50 سالہ زندگی میں کم از کم 30 سال اس ملک پر حکومت کر چکی ہے۔ حصول اقتدار کی حالیہ جدوجہد میں نواز شریف نے آخری لمحے پر پسپائی اختیار کی۔ اس مرتبہ سپریم کورٹ کے 5 ججوں کی نامزدگی کا مسئلہ تھا۔ نواز شریف ایسا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ 12 ججوں پر مشتمل عدالت عظمیٰ کو مزید جج درکار نہیں ہیں۔ لیکن ان کے ناقدین کے خیال میں نواز شریف سمجھتے تھے کہ نامزد ججوں میں سے کئی ان کے طاقتور اور بااثر مخالف ثابت ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر انہیں بدعنوانی کے پرانے الزامات پر برطرف کیا جانے لگا تو وہ جج ان کے خلاف رائے دیں گے۔ اسلام آباد میں گشت کرنے والی افواہوں کے مطابق نواز شریف جنرل جہانگر کرامت کی مداخلت کے بعد ان ججوں کے تقرر پر رضامند ہو گئے۔ جنرل کرامت نے ان سے کہا تھا کہ وہ آئینی بحران کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ اگرچہ فوج کی طرف سے ایک بیان سامنے آیا کہ وہ کسی جانبداری کا مظاہرہ نہیں کر رہی، تاہم بہت سے لوگوں کے خیال میں جنرل کرامت نے نواز شریف کو باور کرادیا کہ حتمی ثالث فوج ہی ہوگی کہ اس ملک پر کون حکومت کر سکتا ہے۔ لیکن آج کے کئی اخبارات نے خبردار کیا ہے کہ اپنی گزشتہ مدت اقتدار میں نواز شریف غور و فکر سے عاری تھے لیکن اس بار وہ جارحیت کی سمت لوٹ آئیں گے"۔

نواز شریف نے مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا۔ سپریم کورٹ میں اس وقت ان کے خلاف توہین عدالت کے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ سے وابستہ کم و بیش 100 مرد و خواتین نے عدالت عظمیٰ پر ہلہ بول دیا تھا۔ اس حملے کے بعد چیف جسٹس شاہ کو ان کے ساتھی ججوں نے معزول کر دیا اور صدر لغاری 2 سمبر 1997ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

تاہم یہ تبدیلیاں استحکام پاکستان کے لئے اچھی ثابت نہ ہوئیں۔ اسلام پسندوں نے، جنہیں منتخب اسمبلیوں میں بہت کم نمائندگی حاصل تھی، دھمکی دیدی کہ وہ موجودہ پارلیمانی نظام کی جگہ صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے احتجاجی تحریک چلائیں گے۔ نواز شریف کے آمرانہ طور طریقوں نے ملک کے اندر ہر سیاسی قوت کو ناراض کر دیا تھا۔ پی پی پی نے 14 چھوٹی جماعتوں کو اپنے ساتھ ملا کر سیاسی ظلم و ستم کے خاتمے اور تازہ پارلیمانی انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ کر دیا۔ افغانستان میں طالبان نے اپنی حکومت کو مجتمع کر لیا تھا۔ یہ چیز پاکستان کے اسلام پسندوں کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث بنی۔ نواز شریف نے "نفاذ شریف کی آڑ میں اور پارلیمنٹ۔ عدلیہ اور صوبوں کی قیمت پر وزیر اعظم کے اختیارات میں اضافے کی کوشش کی"۔ کٹڑ اسلام پسند گروہ ان کے سیاسی مخالفین کے مقابلے میں توازن پیدا کرنے کے لئے متحرک ہوئے لیکن ساتھ ساتھ اپنا رسوخ بھی بڑھا لیا۔

جب نواز شریف نے بھارت کے ساتھ تعلقات خوشگوار بنانے کی بات کی تو اسلام پسندوں نے شدید مخالفت کی۔ اسلام پسندوں اور آئی ایس آئی نے افغانستان اور کشمیر میں وسیع پیمانے پر جہادی کاروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ نواز شریف بھارت کے ساتھ تجارت کا سوچ رہے تھے۔ ان کی یہ سوچ مذکورہ کاروائیوں کو سبوتاژ کر سکتی تھی۔ نواز شریف بھارت کے ساتھ تجارت کو اس لئے وسعت دینا چاہتے تھے کہ دور دراز واقع عالمی منڈیوں سے منگوانے کی بجائے پاکستان بھارت سے خام مال اور تیار مصنوعات نسبتاً کم قیمت پر خرید سکتا تھا۔ پاکستان نے بھارت کی ریاست پنجاب اور ہریانہ کے لئے بجلی فروخت کرنے کے ضمن میں سنجیدہ مذاکرات بھی کیے۔

بھارت کے ساتھ تجارت کو وسعت دینے کے لئے جو اقدامات نواز شریف نے کیئے ان کے ثمر بار ہونے سے پہلے ہی اول الذکر نے 11 اور 13 مئی کو ایٹمی دھماکے کر دیئے۔ جوابی ایٹمی دھماکہ نہ کرنے کی صورت میں صدر بل کلنٹن نے پاکستان کو اقتصادی، سیاسی اور دفاعی مدد کی فراہمی کا یقین دلایا لیکن پاکستانی رائے عامہ مصر رہی کہ پاکستان بھی بھارت کو ترکی بہ ترکی جواب دے۔ ایٹمی تجربے کے فوراً بعد امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ مغربی ممالک نے بھارت پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اگر وہی پابندیاں پاکستان پر عائد کی جاتیں تو پاکستانی معیشت کے لئے حد درجہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ بھارتی تجربات کے بعد سٹاک ایکسچینج کراچی کم از کم 33 فیصد نیچے آ گئی۔ بالخصوص تاجر طبقے کے لئے عالمی پابندیاں خوش آئند نہیں تھیں۔

نواز شریف نے معیشت دانوں۔ تاجروں اور امور خارجہ کے ماہرین سے مشورہ کیا کہ اگر پاکستان بھی بھارت کے جواب میں ایٹمی تجربہ کر ڈالے تو کس نوعیت کے سیاسی اور معاشی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ مشاورت کے چند ایام عوام کو سڑکوں پر لے آئے جو ایٹمی تجربے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس امر کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی کہ پاکستان بل کلنٹن کی ہدایت پر کان دھرے گا۔ فوج نے بھی اپنا وزن ایٹمی تجربے کے پلڑے میں ڈال دیا۔ بے نظیر بھٹو بھی نواز شریف کی ہچکچاہٹ پر طنز کرنے کے لئے حزب اختلاف کے دیگر راہ نماؤں کے ساتھ مل گئیں۔

28 مئی کو پاکستان نے 5 ایٹمی دھماکے کیئے اور علانیہ جوہری طاقت بن گیا۔ پاکستان کے پہلے فوجی حکمران کے صاحبزادے اور نواز شریف کے وزیر خارجہ گوہر ایوب خان نے پاکستان کے دھماکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ "ہمارے پاس ایٹمی اسلحہ ہے" انہوں نے مزید کہا "پاکستان اب بھارت کے خلاف تباہ کن جوابی کاروائی کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے"۔ نواز شریف نے امریکیوں کو ایٹمی تجربات کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کو خطرہ تھا اسرائیل بھارت کو ساتھ ملا کر ہماری ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کر دے۔ نیشنل سیکیورٹی کونسل میں مشرق قریب اور جنوبی ایشیاء کے معاملات پر صدر کلنٹن کے معاون خصوصی بروس ریڈل نے کہا کہ "جس دن پاکستان نے ایٹمی تجربات کیئے اس سے صرف ایک رات قبل واشنگٹن میں پاکستانی سفیر کو اسرائیلی چیف آف سٹاف نے واضح یقین دہانی کرائی کہ ایسا کوئی منصوبہ ان کے زیر غور نہیں۔ تاہم اسلام آباد میں اس وضاحت کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔

پاکستانیوں نے ایک نئی ایٹمی قوت کا درجہ حاصل کرنے پر جشن منایا۔ خوشحال افراد اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے جشن کی خوشیوں کو عالمی پابندیاں تو متاثر نہ کرسکیں۔ تاہم اگلی رات حکومت نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو ملک گیر خوف و ہراس کا باعث بن گیا۔ نواز حکومت نے پاکستانی بنکوں میں موجود 11 ارب 80 کروڑ ڈالرز کے نجی فارن کرنسی اکاؤنٹس جامد کردئے۔ عام پاکستانیوں نے یہ رقوم پاکستانی کرنسی کی قدر میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے اتار چڑھاؤ کے منفی اثرات سے بچنے کے لئے جمع کرار کھی تھیں اور حکومت کئی سال قبل اس امر کی ضمانت فراہم کر چکی تھی کہ کھاتہ دار وہ رقوم غیر ملکی کرنسی میں نکلوا سکیں گے۔ اس دوران برسر اقتدار آنے والی حکومتیں ان رقوم کو پاکستان کی غیر ملکی تجارت کا عدم توازن ختم کرنے کے لئے استعمال کرتی رہیں۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد توقع کی جارہی تھی کہ لوگ بنکوں سے رقوم بڑی مقدار میں نکلوا لیں گے لیکن پاکستان کی بنکنگ کا نظام اس قابل نہیں تھا کہ اتنا بوجھ برداشت کر سکے۔ جس دن پاکستان نے ایٹمی تجربات کئے پاکستان کے مرکزی بنک میں ریزرو کی شکل میں صرف ایک ارب 26 کروڑ ڈالرز موجود تھے۔

جن پاکستانی تارکین وطن اور مقامی سرمایہ کاروں نے پاکستان کی معیشت کو سہارا دے رکھا تھا۔ عالمی پابندیوں کے نفاذ کے بعد ان میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ پاکستانی بنکوں میں غیر ملکی کرنسی کے کھاتہ داروں اور متوسط طبقات میں نواز شریف کے حامیوں کی تعداد قابل ذکر حد تک کم ہوگئی۔ اسلام پسندوں اور سیاسی حزب اختلاف کے ساتھ ان کے تعلقات پہلے ہی کشیدگی کا شکار تھے۔ نتیجتاً فوجی مداخلت کی راہ ہموار ہوگئی۔

آئی ایم ایف۔ ورلڈ بنک اور ایشین ڈویلپمنٹ بنک پاکستان کو جو مالی معاونت فراہم کررہے تھے۔ جوہری دھماکوں کے بعد ابتداء میں اس کا سلسلہ رک گیا۔ اس وقت پاکستان پر قرضوں کا حجم 32 ارب ڈالرز تھا۔ غیر ملکی قرضہ جات کے حوالے سے پاکستان کو ڈیفالٹر قرار دیدیا گیا۔ تاہم نواز شریف حکومت تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک سے مالی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ چند ماہ بعد کلنٹن انتظامیہ نے پاکستان کو اس حد تک لچک دیدی کہ اگر آئی ایم ایف اسے قرضہ دینا چاہے تو امریکہ مخالفت نہیں کرے گا۔ اس لچک کے نتیجے میں پاکستان کے اقتصادی بحران کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوگئی۔ امریکہ نے یہ فیصلہ نواز شریف کے اس وعدے کے بعد کیا کہ بھارت کے ساتھ مذاکرات کے عمل کی تجدید کی جائے گی۔

نواز شریف کی حکومتی پالیسیوں میں تصادم کا عنصر نمایاں تھا۔ نتیجتاً ملک بحرانی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ فوج نے فیصلہ کیا کہ اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرے۔ ڈاکٹر حسن عسکری کے الفاظ میں "تنزل پذیر اقتصادی صورت حال فوج کی پیشہ ورانہ اور کاروباری ہیئت اجتماعیہ کو متاثر کررہی تھی"۔ اکتوبر 1998ء میں آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت نے ملکی صورت حال پر متعدد بیانات دیئے اور تجویز پیش کی کہ ایک "نیشنل سیکیورٹی کونسل" تشکیل دی جائے جس کی پشت پر قابل اعتماد مشیروں اور ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم موجود ہو۔ تاکہ فیصلہ سازی کے عمل کو اداراتی شکل دی جاسکے۔ یہ کوئی نئی تجویز نہیں تھی۔ ایک ادارے کے طور پر فوج کئی سالوں سے یہ تجویز پیش کررہی تھی۔ ضیاء الحق نے آئین میں تبدیلیوں کا جو پیکج مرتب

کیا تھا اس میں بھی نیشنل سیکیورٹی کونسل کی تخلیق شامل تھی۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو دوسری مرتبہ معزول کرنے کے بعد لغاری نے بھی ایسی ہی ایک کونسل بنائی تھی۔ فوج کے خیال میں سویلین سیاستدان صرف اس وقت تک اپنے عہدوں پر فائز رہ سکتے تھے جب تک وہ فوج کی حمایت یافتہ پالیسیوں کے تسلسل کو یقینی بنائے رکھیں اور اپنے کچھ آئینی اختیارات ٹیکنوکریٹس اور جرنیلوں کے حوالے کر دیں۔

جنرل جہانگیر کرامت چاہتے تھے کہ نواز شریف ایسی پالیسیاں تشکیل نہ دیں جوان کے احساس عدم تحفظ کا نتیجہ ہوں یا ان میں کشیدگی۔ کھنچاؤ اور پرانی دشمنیوں جیسے عناصر پائے جائیں۔ لیکن آخر الذکر آرمی چیف کی ہدایت کو درخور اعتنا سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ نواز شریف نے اپنی فوج کے سپہ سالار سے کہا کہ یا تو وہ استعفیٰ دیدیں اور یا پھر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ جنرل جہانگیر کرامت نے اپنے مزاج اور ذاتی عقائد کے باعث فوجی انقلاب جیسے انتہائی اقدام سے گریز کئے رکھا اور ریٹائرمنٹ کی تاریخ سے 3 ماہ پہلے ہی اپنا عہدہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

جنرل کرامت کی ریٹائرمنٹ کو ذہن میں رکھتے ہوئے نواز شریف نے ایک مشترکہ دوست کے توسط سے اپنے آرمی چیف کا انتخاب کر رکھا تھا۔ کراچی سے تعلق رکھنے اور اردو بولنے والے ایک مہاجر جرنیل پرویز مشرف نواز شریف کا چوائس تھے جو اس وقت سینیارٹی کے اعتبار سے تھری سٹار جرنیلوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ 28 اکتوبر کو مشرف نے بطور آرمی چیف چارج سنبھال لیا۔ جو مشترکہ دوست نواز شریف اور پرویز مشرف کو ایک دوسرے کے قریب لایا۔ وہ بینکار حمید اصغر قدوائی تھے۔ 1990ء کے انتخابات کے دوران جب نواز شریف آئی جے آئی کے سربراہ تھے۔ آئی ایس آئی کے ذریعے انہیں فنڈز کی فراہمی میں قدوائی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ وہ ان دنوں مہران بنک میں تھے۔ نواز شریف نے حمید اصغر قدوائی کو کینیا میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دیا۔ ایک سال بعد جب پرویز مشرف نے ایک فوجی انقلاب کے ذریعے نواز شریف کو معزول کر دیا تو اس کے بعد بھی قدوائی عہدہ سفارت پر فائز رہے۔ پرویز مشرف کو آرمی چیف مقرر کرتے وقت نواز شریف کا خیال تھا کہ فوج کی ہائی کمان میں پنجابی اور پشتون جرنیلوں کی اکثریت ہے۔ لہذا پرویز مشرف ایک کمزور آرمی چیف ہوں گے اور ان کی سویلین حکومت پر دباؤ ڈالنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوگا۔ اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کی طرح نواز شریف بھی ایک فاش غلطی کا ارتکاب کر گئے۔ اول الذکر نے بھی ضیاء الحق کو آرمی چیف مقرر کرتے وقت یہی غلطی کی تھی۔ ان کا خیال بھی یہی تھا کہ ایک فرماں بردار، خوشامدی اور مذہبی اعتبار سے پرہیز گار سا جرنیل ان کی سویلین حکومت کے لئے خطرہ ثابت نہیں ہوگا۔ یہ بھی ایک قابل ذکر اتفاق ہے کہ بھٹو اور نواز شریف دونوں کو بالترتیب ضیاء الحق اور پرویز مشرف کی طرف مائل اور ان کے انتخاب کی حوصلہ افزائی جن افراد نے کی ان کے ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ تعلقات قریبی اور گہرے تھے۔

اپنی مرضی کا آرمی چیف مقرر کرنے کے بعد نواز شریف نے امریکہ کی اشیر باد سے بھارت کے ساتھ قیام امن کے عمل کا آغاز کر دیا۔ پہلے تو سارک سربراہ کانفرنس کے موقع پر نواز شریف نے کولمبو میں بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی

سے ملاقات کی اور آخرالذکر کو تجویز پیش کر دی کہ دونوں ملکوں کے باہمی مراسم میں موجود کشیدگی اور کھنچاؤ کی مقدار میں کمی کی جائے۔ اس وقت تک دونوں ملکوں کو ایٹمی تجربات کئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ اگرچہ دونوں ہمسائے کبھی کبھار ایک دوسرے کو جنگ کی دھمکیاں بھی دیتے رہتے تھے۔ تاہم دونوں راہنماؤں نے مذاکرات کی بحالی پر بھی اتفاق کیا اور یہ بھی طے گیا کہ مسافروں کے لئے دونوں ملکوں کے درمیان بس سروس بحال کر دی جائے گی۔ 1999ء میں جب بس سروس کا آغاز ہوا تو واجپائی نے اعلان کر دیا کہ وہ پہلی بس پر سوار ہو کر بھارت سے پاکستان جائیں گے۔

واجپائی کی بس ڈپلومیسی دو دشمن ایٹم بردار ہمسایوں کے درمیان سربراہ کانفرنس پر منتج ہوئی جس میں سے امید اور تعلقات میں مزید گرمجوشی کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں وزرائے اعظم "جامع مذاکرات" پر متفق ہو گئے۔ طے پایا کہ "جامع مذاکرات" کے دوران کشمیر سمیت تمام متنازعہ امور پر بات کی جائے گی۔ بانی پاکستان محمد علی جناح نے تقسیم ہند سے قبل ایک عوامی اجتماع سے خطاب کے دوران کہا تھا "پاکستان اور بھارت امریکہ اور کینیڈا کی طرح (اچھے ہمسائے بنکر) رہیں گے"۔ نواز شریف نے بھی اسی امید کا اظہار کیا۔ واجپائی نے لاہور میں واقع اس تاریخی اور یادگار جگہ کا علامتی دورہ بھی کیا جہاں ہندوستانی مسلمانوں نے ایک قرارداد کے ذریعے علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا تھا۔ واجپائی پاکستانیوں کو ایک بار پھر یقین دلانا چاہتے تھے کہ بھارت کے وطن پرست ہندو بھی پاکستان کے حق وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ پاکستان اور بھارت کے عوام حصول امن کے عمل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن پاکستان کے اسلام پسندوں اور فوج نے مذکورہ عمل کو پسند نہ کیا۔ جماعت اسلامی نے واجپائی کی بس کا راستہ روکنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان کے "قومی دشمن" ہیں اور مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے کے لئے عوام کو سڑکوں پر لے آئی۔ جس دن سربراہ کانفرنس کا انعقاد ہونا تھا۔ اسلام پسندوں نے لاہور میں عام ہڑتال کی کال دے دی۔ متعدد ملکوں کے سفیروں کو بھی واجپائی کے اعزاز میں دیئے گئے سٹیٹ ڈنر میں مدعو کیا گیا تھا۔ جب مظاہرین نے سڑکیں بلاک کر دیں اور ان کی گاڑیوں پر پتھراؤ کیا تو انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ نواز شریف کا ارادہ تھا کہ جماعت اسلامی کے راہنما قاضی حسین احمد کو اجتماعی مظاہروں سے پہلے گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن قاضی حسین احمد گرفتاری سے بچنے کے لئے ملٹری انٹیلی جنس کے افسران میں سے کسی کے گھر چھپے ہوئے تھے۔ لہٰذا انہیں تلاش نہ کیا جا سکا۔

مظاہرے حصول امن کے عمل کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکے لیکن جنگ کے خطرات نے مذکورہ عمل کو سبوتاژ کر دیا۔ پاک بھارت مذاکرات میں اس وقت فوراً تعطل پیدا ہو گیا جب پاکستانی فوج بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں لائن آف کنٹرول میں متصل علاقے میں گھس گئی۔ 1999 کے موسم گرما میں دونوں ملک "کارگل کے بحران" میں پھنس گئے۔ کارگل ہمالیہ کے اس پہاڑی سلسلے کا نام ہے جہاں تصادم شروع ہوا۔ امریکی حکام کے مطابق "کارگل کا بحران" ایٹمی

جنگ میں بدل سکتا تھا۔ امریکیوں نے کہا کہ پاکستان نے اپنے ایٹمی اسلحے کو مختلف مقامات پر نصب کرنے کی تیاری شروع کردی تھیں۔

کارگل کے بحران کے بارے میں ایک پاکستانی بریگیڈئر شوکت قادر کی بیان کردہ تفصیلات بلاشبہ جامع ہیں جو انہوں نے اپنے قابل بھروسہ ذاتی علم کی بنیاد پر مرتب کیں۔ مئی 1999 میں بھارتی فوج کو علم ہوا کہ کشمیر میں دراس کے علاقے کے پاس واقع پہاڑیوں پر دراندازقابض تھے۔ ان دنوں کارگل کا علاقہ صرف موسم گرما میں بھارتیوں کے کنٹرول میں ہوتا تھا۔ کیونکہ شدید سردی کے دوران بھارتی وہاں سے رخصت ہو جاتے تھے۔ نومبر 1998 کے وسط میں جنرل مشرف کی سربراہی میں 4 پاکستانی جرنیلوں نے فیصلہ کیا کہ سردیوں میں بھارتی فوج کی عدم موجودگی میں دراس کارگل کے علاقے پر قبضہ کرلیا جائے۔ یہ منصوبہ اور اس پر عملدرآمد کی تیاریاں پاک فوج کے دوسرے کمانڈروں سے خفیہ رکھی گئیں۔ دسمبر 1998ء میں کسی دن جنرل مشرف نے نواز شریف سے اس منصوبے کا سرسری سا تذکرہ کیا لیکن فوج نے مذکورہ آپریشن کا نہ تو تفصیلی تجزیہ پیش کیا اور نہ ہی اس کے ممکنہ نتائج کے متعلق کچھ بتایا۔ مشرف اور ان کے 3 ساتھی جرنیلوں کا خیال تھا کہ بھارت کے زیر انتظام علاقے پر قبضہ آزادی کشمیر کی تحریک کے لئے مہمیز کا کام دے گا۔

بریگیڈیئر قادر کے خیال میں مشرف کا "کارگل آپریشن" آخرالذکر کے ارادوں سے زیادہ وسعت اختیار کر گیا۔ پاکستانی فوج مزید غیر مقبوضہ پہاڑیوں کی تلاش میں آگے بڑھتی چلی گئی اور بالآخر وادی کشمیر ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ 100 کلومیٹر چوڑائی میں وہ 7 سے 15 کلومیٹر تک آگے بڑھ گئے اور مختلف حجم کی حامل 132 بھارتی چوکیوں پر قبضہ کرلیا۔ قابض فوجیوں کا تعلق پاکستان کی "شمالی لائٹ انفنٹری" سے تھا۔ ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور انہیں "لاجسٹک سپورٹ" فراہم کرنے پر چار گنا فوجی مامور تھے۔ کچھ مقامی مجاہدین مختلف اشیاء کی نقل و حمل میں ان کی مدد کررہے تھے۔

پاکستان کی فوجی قیادت کے منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بریگیڈیئر قادر لکھتے ہیں:-

"کارگل آپریشن کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق مستقل بنیادوں پر حل ہو جائے۔ تاہم سیاسی مقصد سے پہلے ایک فوجی مقصد بھی تھا۔ پاکستانی فوج چاہتی تھی بھارت کے لئے ایک ایسا خطرہ تخلیق کردیا جائے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ جان لے کہ کشمیر کا فوجی حل بھی ممکن ہے۔ اس طرح وہ مذاکرات کی میز پر آنے میں حیل وحجت سے کام نہیں لے گا اور اس کی پوزیشن بھی کمزور ہوگی۔ بھارت مجبور ہو جائے گا کہ وہ اپنی فوج کارگل کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے لائن آف کنٹرول کے ساتھ اکٹھی کرلے اور جہاں اس کی فوج پہلے تعینات تھی

وہاں خلاء پیدا ہو جائے۔ پھر جولائی میں اس جگہ مجاہدین دباؤ ڈال دیں اور ان علاقوں یا راستوں پر قبضہ کر لیں جہاں سے بھارتی فوج کو کمک پہنچائی جاتی تھی۔ اس طرح بعض اہم مقامات بھارت کے زیر قبضہ علاقے سے کٹ جائیں گے۔ جب بھارتی فوج مجاہدین کی کاروائیوں کے خلاف ردعمل کا اظہار کرے تو دوسری طرف سے پاکستانی فوج اس پر چڑھائی کر دے۔ اس طرح بھارتی فوج کے لئے دوہرے خطرات سے نمٹنا دشوار ہو جائے گا اور بھارت مجبور ہو کر مذاکرات کی میز کی طرف رجوع کرے گا۔

اس سارے منصوبے میں نہ تو عالمی ردعمل کے لئے کوئی جگہ رکھی گئی اور نہ ہی یہ سوچا گیا کہ اگر بھارت میدان جنگ میں کوئی مختلف حربہ اختیار کرے تو صورت حال کیا ہوگی۔

بھارت کے خیال میں کارگل میں پاکستانی فوج کی کاروائی کوئی چھوٹا اور غیر اہم مسئلہ نہیں تھا۔ پاکستانی فوج ان پہاڑی چوٹیوں پر قابض ہو چکی تھی جہاں سے کارگل ہائی وے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس طرح ایک قابل ذکر (اگرچہ بنجر) علاقے پر بھارتی کنٹرول کمزور پڑ رہا تھا۔ مزید برآں حصول امن کا وہ عمل شدید متاثر ہو رہا تھا جس پر نواز شریف اور واجپائی صرف چند ماہ قبل متفق ہوئے تھے۔ کارگل آپریشن پاکستان کی طرف سے "دھوکے" کے مترادف تھا۔ بھارت نے وادیء کارگل میں گھس آنے والوں کے خلاف بھارتی توپ خانے سمیت بڑی قوت سے جنگ کی۔ پاکستان کے جو فوجی سطح سمندر سے 17,000 فٹ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھے تھے ان پر بمباری کے لئے بھارت نے اپنی فضائیہ کو جنگ میں جھونک دیا۔ ابتداء میں قابضین نے قبضہ برقرار رکھا۔ لیکن سویڈن کی بنی ہوئی بوفورس توپوں اور لیزر گائیڈڈ فضائی بمباری نے جون کے وسط تک صورت حال بدل ڈالی۔

بھارت نے ساتھ ساتھ ایک بڑی سفارتی مہم کا آغاز بھی کر دیا۔ امریکہ اور چین سمیت اسے متعدد ملکوں کی حمایت میسر آ گئی۔ عالمی برادری نے بھی متفقہ مطالبہ کر دیا کہ پاکستانی فوج مقبوضہ علاقے سے دست بردار ہو جائے۔ اس طرح کشمیر کی آزادی کی جدوجہد پر توجہ مرکوز کرانے کی بجائے مشرف اور ان کے تین ساتھی جرنیلوں نے عالمی برادری کو پاکستان کے خلاف متحد کر دیا۔ پاکستان نے پہلے تو یہ الزام تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا کہ کارگل آپریشن میں اس کی باقاعدہ فوج ملوث تھی اور کشمیری جنگجوؤں کے کندھوں پر ذمہ داری منتقل کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ سب مجاہدین کا کیا دھرا ہے۔ بھارت نے جنرل مشرف اور جنرل عزیز کے درمیان گفتگو کی ایک آڈیو ٹیپ ریلیز کر دی۔ جس نے کارگل میں پاکستانی فوج کی موجودگی میں کوئی شک باقی نہ رہنے دیا۔ ٹیپ شدہ گفتگو کے وقت مشرف بیجنگ اور جنرل عزیز جی ایچ کیو راولپنڈی میں موجود تھے۔ اس راز سے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا جا سکا کہ بھارت کو اس گفتگو تک کس طرح رسائی حاصل ہوئی۔ پاکستانی انٹیلی جنس کو شک تھا کہ وہ کام امریکہ نے دکھایا اور پاکستان کو پریشان کرنے کے لئے ٹیپ بھارت کے حوالے کر دی تا کہ پاکستان کو کارگل کی پہاڑیوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جا سکے۔

نواز شریف کارگل میں پاکستان کے کردار سے زیادہ دیر انکاری نہ رہ سکے۔ ادھر کسی سویلین حکومت کے دور میں بھارت کے ہاتھوں پسپائی کے امکانات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ لہذا انہوں نے چاہا کہ بھارت کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ طے پا جائے جس کے نتیجے میں پاکستان کا بھرم رہ جائے۔ بھارت نے یہ کہہ کر نواز شریف کو کارگل آپریشن سے لا تعلق رہنے کا موقع فراہم کر دیا کہ "پاکستانی فوج نے یہ کاروائی سیاسی قیادت سے منظوری حاصل کئے بغیر کی"۔ نواز شریف فوجی قیادت پر یہ الزام برملا عائد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مزید براں ان کی کوشش تھی دنیا یہ نہ سمجھے کہ انہیں بطور وزیر اعظم پاکستان کے معاملات پر کنٹرول حاصل نہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بے نظیر بھٹو کو بھی اپنے اقتدار کے دونوں ادوار میں یہی مشکل درپیش رہی۔ وہ بھی جرنیلوں کے ساتھ اپنے اختلافات کا برملا تذکرہ نہیں کر سکتی تھیں۔ نواز شریف بھی یہی ظاہر کرتے رہے کہ وہ "بے قابو جرنیلوں" کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ لیکن نواز شریف کو اس "جعلی تاثر" کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ جرنیلوں پر کنٹرول کے حوالے سے وہ بے اختیار تھے۔ کارگل کے بحران کے دوران جب ساری دنیا پاکستان کے خلاف اکٹھی ہو گئی تو وہ مشرف کے سٹریٹیجک اعتبار سے غلط اندازوں پر سے نقاب اٹھا کر اپنا اعتبار اور اعتماد بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔

نواز شریف نے 2 جولائی کو صدر کلنٹن سے بات کی اور ان سے کہا کہ امریکہ مداخلت کر کے فوری طور پر جنگ رکوائے۔ مزید براں کشمیر کا مسئلہ بھی حل کرائے۔ اس سے اگلے دن نواز شریف نے کلنٹن کو جو کال کی وہ نسبتاً زیادہ ہنگامی نوعیت کی تھی۔ پاکستانی وزیر اعظم 4 جولائی کو کلنٹن کے ساتھ سربراہ ملاقات کے لئے واشنگٹن پہنچ گئے۔ اسلام آباد ائر پورٹ پر انہیں جنرل مشرف نے الوداع کیا اور پاکستان ٹیلی ویژن پر دونوں کو دیکھ کر یہی اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ نواز شریف جس مشن پر امریکہ جا رہے تھے اسے فوج کی حمایت حاصل تھی۔ نواز شریف کلنٹن سے امریکہ کے یوم آزادی کے موقع پر بلیئر ہاؤس میں ملے۔ بروس ریڈل دونوں کی ملاقات کے وقت پاس موجود تھا۔ وہ ملاقات کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"وزیر اعظم پاکستان نے صدر کلنٹن کو بتایا کہ اول الذکر مسئلے کا ایسا حل چاہتے ہیں جو پاکستان کی فوج کو اپنی موجودہ پوزیشن سے دست بردار ہونے کے لئے کوئی آڑ مہیا کر دے۔ انہوں نے اپنی طرف سے کسی حل کی جانب اشارہ کئے بغیر خوفزدہ کر دینے والے انداز میں کہا کہ پاکستان کے بنیاد پرست ان کے سخت خلاف ہو جائیں گے اور کلنٹن کے ساتھ ان کی وہ آخری ملاقات ہوگی۔ کلنٹن نے نواز شریف سے پوچھا کیا وہ جانتے تھے کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ کس حد تک بڑھ چکا تھا؟ کیا انہیں معلوم تھا کہ ان کی فوج ایٹمی میزائلوں کو مختلف جگہوں پر نصب کر رہی تھی؟ نواز شریف ششدر رہ گئے اور صرف اتنا کہا کہ امکانی طور پر بھارت بھی یہی کر رہا تھا۔ کلنٹن نے نواز شریف کو یاد دلایا کہ 1962ء میں کیوبا کے مسئلے پر امریکہ اور سوویت یونین ایٹمی جنگ کے کتنے قریب پہنچ گئے تھے۔ اس کے باوجود ایک

بم بھی نہیں گرایا گیا تھا نواز شریف نے کہا کہ اگر پاکستان اور بھارت کی جوہری جنگ شروع ہوگئی تو یہ بہت بڑا المیہ ہو گا۔ اس پر صدر کلنٹن ناراض ہو گئے اور بولے کہ وہ پاکستان سے بار بار کہہ چکے ہیں کہ اسامہ بن لادن کو افغانستان سے نکال کر انصاف کے کٹہرے تک لانے میں امریکہ کی مدد کرے۔ نواز شریف نے متعدد وعدے وعید کئے لیکن عملاً کچھ بھی نہ کیا۔ بلکہ آئی ایس آئی نے دہشت گردی کو ہوا دینے کے لئے اسامہ بن لادن اور طالبان کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا۔ کلنٹن کے بیان کا جو مسودہ تیار کیا گیا اس میں بھی لکھا گیا کہ پاکستان نے افغانستان اور بھارت میں دہشت گردی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کلنٹن نے نواز شریف سے پوچھا کہ آیا وہ یہی کچھ چاہتے تھے؟ کیا پاکستان کے جوہری میزائلوں کو ان کے کہنے پر ایکشن کے لئے تیار کیا گیا؟ کیا انہیں احساس ہوا کہ وہ کتنا خطرناک اور حساس معاملہ تھا۔ آپ نے مجھے آج عین درمیان میں لٹکا دیا ہے تاکہ امریکہ ناکام ہو جائے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ پاکستان جوہری جنگ سے کھیل رہا ہے"۔

نواز شریف نے جب دیکھا کہ کلنٹن پاک بھارت مذاکرات کی بحالی میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں تو اس ملاقات کے اختتام پر کارگل سے پاکستانی فوج کی دست برداری اور لائن آف کنٹرول کے تقدس کی بحالی کا اعلان کرنے سے اتفاق کر لیا۔

وطن واپس پہنچ کر نواز شریف نے فوج کو ہدایت کی کہ "کارگل ڈرامے" کے کرداروں کا سراغ لگا کر ان کے خلاف کاروائی کی جائے اور ان سے نجات حاصل کر لی جائے۔ مشرف جانتے تھے کہ اگر وزیراعظم کی ہدایت پر عمل ہو گیا تو وہ پہلا ہدف ہوں گے۔ آرمی چیف نے پاکستان کی تمام چھاؤنیوں کا دورہ کیا تاکہ فوجیوں کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت پیش کر سکیں اور بطور کمانڈر اپنے لئے ان کی حمایت کی تجدید کرا لیں۔ اسلام پسند ایک بار پھر سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کے احتجاج کا انداز انتقامی تھا۔ اس مرتبہ انہوں نے احتجاج کے دوران کچھ بینرز بھی اپنے ہمراہ رکھے جن پر مندرجہ ذیل مختلف نعرے درج تھے۔

"نواز شریف ہٹاؤ اور ملک بچاؤ"۔ "کارگل سے پسپائی غداری ہے"۔ وغیرہ وغیرہ

10 اکتوبر 1999ء کو "واشنگٹن پوسٹ" نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں لکھا گیا کہ "اقتدار پر نواز شریف کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ جولائی میں کارگل آپریشن کے دوران بھارت کے ساتھ مقابلے سے دست برداری کا فیصلہ کرنے کے بعد فوجی قیادت توہین محسوس کر رہی ہے۔ نواز شریف کی حکومت اور معزولی کے درمیان بہت کم فاصلہ باقی ہے۔ "واشنگٹن پوسٹ" میں شائع ہونے والے مضمون میں مزید لکھا گیا "نواز شریف نے فوج کو سرحد پر سے واپس بلانے کا جو فیصلہ کیا اس پر فوج میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ تاہم انہوں نے ساتھ یہ بھی کہا کہ پاکستان کو کسی بھی ممکنہ تباہی سے

بچانے کے لئے فوج سول حکام کے ساتھ ملکر کام کرنے کو تیار ہے"۔ صحافیوں کے ساتھ گفتگو کے دوران راشد قریشی یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ "اگر فوج براہ راست اقتدار سنبھال لے تو امریکی زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں؟"

مشرف فوجی بغاوت کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور اس منصوبہ بندی کے حصے کے طور پر اپنے قریبی دوستوں کو ایسی جگہوں پر تعینات کر رہے تھے جو انقلاب کے دوران اہم اور فیصلہ کن ہوا کرتی ہیں۔ 12 اکتوبر کو جونہی نواز شریف نے پرویز مشرف کو ہٹا کر ان کی جگہ آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کو آرمی چیف بنانے کی کوشش کی۔ انقلاب بپا کر دیا گیا۔ مشرف اس وقت ملک سے باہر تھے۔ تاہم سرکاری بیانات نے انقلاب کو مشرف کی برخاستگی پر فوج کا فوری ردعمل قرار دیا۔ انقلاب کے بعد اگلے دن علی الصبح 3 بجے مشرف نے پاکستانی عوام کو بتایا کہ "میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ فوج نے ملک کو عدم استحکام سے بچانے کے لئے آخری اقدام کے طور پر اقتدار سنبھالا"۔ انہوں نے مزید کہا "عوام کی طرف سے مسلح افواج سے مسلسل مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ تیزی سے انحطاط پذیر صورت حال کا کوئی حل نکالا جائے"۔

سرکاری سطح پر یہ وضاحت پیش کی گئی کہ نواز شریف کے ہاتھوں مشرف کی برخاستگی کے نتیجے میں فوج نے ایک اداراتی فیصلہ کیا اور انہیں معزول کر دیا۔ بعد ازاں نواز شریف کے خلاف اس طیارے کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کے الزام پر مقدمے کی سماعت کا آغاز ہو گیا۔ جس پر مشرف سری لنکا سے واپس آ رہے تھے۔ ایک رپورٹر نے سرکاری موقف کو بالاختصار اس طرح بیان کیا:-

"اپنی برخاستگی سے بے خبر مشرف سری لنکا سے ایک کمرشل پرواز کے ذریعے واپس آ رہے تھے۔ ائر ٹریفک کنٹرولرز نے مبینہ طور پر نواز شریف کے احکامات کے تحت اس طیارے کو کراچی ائیر پورٹ پر لینڈ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ شیڈول کے مطابق اسے وہیں اترنا تھا۔ رن وے کی جس پٹی پر طیارے کو لینڈ کرنا تھا وہاں گاڑیاں کھڑی کر کے راستہ روک دیا گیا۔ رن وے کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ تیل کی کمی کا شکار طیارہ بالآخر اس وقت لینڈ کرنے میں کامیاب ہوا جب مشرف کے وفادار افسران نے ائر پورٹ کا کنٹرول سنبھال لیا"۔

دوسرے لفظوں میں نواز شریف نے مشرف کو ہٹانے کا جو فیصلہ کیا اس نے فوج کو اقتدار سنبھالنے پر اکسایا۔

پاکستانی فوج ہمیشہ یہی کہتی آئی کہ کوئی نہ کوئی فوری اکساہٹ فوجی بغاوت کا باعث بنتی رہی۔ پاکستان کے ہر فوجی حکمران کے بارے میں یہی کہا گیا کہ وہ بغاوت پر بمشکل آمادہ ہوا۔ ایوب خان نے مشرقی پاکستان کی مقننہ میں شدید ہنگامہ آرائی کے بعد اقتدار سنبھالا۔ یحییٰ خان ایوب خان کے خلاف کئی مہینوں پر محیط ہنگاموں اور سیاستدانوں کے ساتھ آخر الذکر کی گول میز کانفرنسوں کی ناکامی کے بعد اقتدار میں آئے۔ ضیاء الحق نے فوجی بغاوت کا یہ عذر پیش کیا کہ

سیاستدانوں نے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیئے اور ذوالفقار علی بھٹو ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ کر سکے۔ نتیجتاً خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اب فوج نے نواز شریف کو اس لئے معزول کیا کہ وہ اس کے کمانڈر کو برخاست کرنے کی کوشش اور امکانی طور پر ان کی زندگی کو خطرات سے دوچار کر رہے تھے۔ کسی بھی متوقع اکساہٹ پر فوج نے اقتدار سنبھالنے میں ہمیشہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس پھرتی کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ فوج نے ایسے مواقع پر پیشگی منصوبہ بندی کی ہوتی ہے۔ تاہم گہری چھان بین اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ مذکورہ پھرتی کا باعث فوج کی پیشگی اور محتاط منصوبہ بندی ہے۔ سڑکوں پر پائی جانے والی افراتفری بھی فوج کے منصوبے کا حصہ ہوتی ہے جو اسلام پسند جماعتوں کی قابل "اعتماد سٹریٹ پاور" کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔

ابتداء میں عالمی برادری نے مشرف کی فوجی بغاوت کی مذمت کی لیکن انہیں ایک ایسے اعتدال پسند راہنما کے طور پر قبول کر لیا گیا جس کی خارجہ پالیسیاں کلنٹن انتظامیہ کے لئے قابل قبول ہی نہیں بلکہ خوشگوار حیرت کا باعث بھی بن گئیں۔ مشرف کو اقتدار سنبھالے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ امریکی عہدہ صدارت کے اہم ترین ری پبلکن امیدوار نے اول الذکر کی صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ وہ جنوبی ایشیاء میں استحکام کا باعث بنیں گے۔ اگرچہ جارج ڈبلیو بش مشرف کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے کہا "نیا پاکستانی جرنیل۔ اسے حال ہی میں منتخب کیا گیا ہے۔ وہ منتخب نہیں ہیں انہوں نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ لگتا ہے وہ اپنے ملک کے استحکام کا باعث بنیں گے۔ میرے خیال میں برصغیر کے لئے یہ ایک اچھی خبر ہے"۔

بش کے رابطہ ڈائریکٹر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بش صرف سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسران کے ساتھ اتفاق کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ بھی اس لئے کہ مشرف نے جمہوریت کی طرف لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ اپنے ایک مضمون بعنوان "پاکستان۔ جمہوریت ہی سب کچھ نہیں" (Pakistan-Democracy is Not Everything) میں رچرڈ این ہاس نے لکھا۔

"جس فوجی بغاوت کے ذریعے آرمی چیف پرویز مشرف برسر اقتدار آئے۔ اس کی بلا سوچے سمجھے مذمت کر دینا غلط ہوگا۔ یہ تبدیلی ایک ایسے علاقے اور ملک میں استحکام کا باعث بن سکتی ہے جہاں استحکام کی قلت ہے۔ سب سے بڑا خطرہ ناکام پاکستان ہوگا۔ وہ پاکستان جس کی مرکزی حکومت کا ملک کے اکثر علاقے پر موثر کنٹرول نہ رہ جائے۔ وہ عدم استحکام جو پاکستان کو دہشت گردوں، منشیات فروشوں اور مذہبی جنونیوں کی پناہ گاہ اور جنت بنا سکتا ہے"۔

اس امر کا ادراک نہیں کیا گیا کہ مشرف کے ادارے یعنی فوج ہی نے پاکستان میں دہشت گردوں اور مذہبی جنونیوں کے عروج میں موثر کردار ادا کیا۔

پاکستانی جرنیل اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اکثر لوگ بالخصوص امریکی پالیسی ساز پاکستانی سیاست کے مکمل تناظر کی بجائے پاکستانی سیاستدانوں کی ناکامیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ پاکستانی فوج خصوصی کوشش کرتی ہے کہ امریکی فوج کے ساتھ اس کا قریبی اداراتی تعلق برقرار رہے۔ پینٹا گان پاکستان کے فوجی قائدین کو سپاہی سمجھتا ہے۔ اپنے اسی تاثر کے باعث وہ اپنی چھوٹی موٹی سیاسی ریشہ روانیوں پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ کی بناء پر جنرل مشرف نے بغاوت کے فوراً بعد امریکہ کی مرکزی کمان کے کمانڈر جنرل انتھونی زینی کو ٹیلی فون کیا۔ بمطابق زینی مشرف نے انہیں بتایا کہ " کیا چیز بغاوت کا باعث بنی اور ان کے اور دیگر فوجی قائدین کے پاس اس چوائس کے علاوہ کوئی چوائس کیوں نہیں تھا۔ جس پر وہ عمل کر سکتے "۔ دو ماہ بعد امریکہ کو مطلوب کچھ دہشت گردوں کی گرفتاری میں جنرل مشرف نے جو مدد کی زینی نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اسی چیز نے زینی کو واشنگٹن سے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ "اب مشرف کے لئے بھی کچھ کریں"۔

2001ء میں افغان جنگ کے دوران امریکہ کی مرکزی کمان کے کمانڈر جنرل ٹموتھی فرینکس نے اپنی یادداشتوں میں ان کاوشوں کا تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے جنرل مشرف کے ساتھ سٹریٹیجک تعلق قائم کرنے کے لئے کیں۔ جنرل فرینکس نے 2000ء میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ سے کہا۔ "مشرف ایک سپاہی ہیں۔ آپ کو انہیں فوجی تناظر میں دیکھنا ہوگا"۔ امریکی جرنیل نے پیش کش کی کہ امریکہ پاکستان کی روایتی فوج کو جدید بنانے میں مدد دینے کو تیار ہے۔ تاکہ ایٹمی اسلحے پر اس کا انحصار کم ہو جائے۔ یہ پیش کش انہوں نے نائن الیون سے پہلے کی۔ نتیجتاً امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کی تجدید ہوگئی۔ بقول جنرل فرینکس جنوری 2001ء میں ایک ملاقات کے دوران جنرل مشرف نے اول الذکر کو اپنے بارے میں بعض مربوط معلومات بہم پہنچائیں۔ مثلاً 1999ء میں پاکستان کی بدعنوان سویلین حکومت کے خلاف فوجی بغاوت سے قبل وہ کس قسم کے جرنیل ہوا کرتے تھے۔

اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ مشرف نے جنرل فرینکس کو "سول ملٹری تعلقات" کی ناپسندیدہ تفصیلات بتائی ہوں یا انہیں پاکستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اندرونی اور بیرونی تبدیلیوں کی تاریخی ترتیب یاد ہو۔ بقول فرینکس "مشرف نے انہیں یہ بھی بتایا کہ پاکستان نے بیلسٹک میزائلوں کی تیاری پر اس قدر دولت اور توانائی صرف اس لئے خرچ کی کہ امریکہ کی طرف سے اسلحے پر عائد کی جانے والی پابندیوں نے پاکستانی فوج کو اپاہج کر کے رکھ دیا تھا۔ درحقیقت پاکستان نے اپنے میزائل پروگرام کا برملا اعلان 1989ء میں کیا اور بتایا کہ وہ پروگرام آخری مرحلوں میں ہے۔ یہ اس سے بھی بہت پہلے کی بات ہے۔

جنرل فرینکس کے لئے مشرف کے ساتھ معاملات طے کرنا ایک سپاہی کے ساتھ سپاہی کا معاملہ تھا۔ جنرل فرینکس لکھتے ہیں "اچھا ہی ہوا کہ اس وقت ہم دونوں وردی میں تھے۔ گزشتہ کئی سالوں سے بزنس سوٹوں میں ملبوس امریکی حکام

اورسفارتی نمائندے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور نمائندہ حکومتوں کے فقدان پر پرویز مشرف جیسے فوجی سیاستدانوں کو ڈراتے دھمکاتے رہے۔ بے شک میں بھی ان اقدار پر یکساں یقین رکھتا تھا لیکن تاریخ کے اس موڑ پر ہمیں ترجیحات کا تعین کرنا تھا۔ القاعدہ کا سد باب ایسی ہی ایک ترجیح تھی اور مشرف مدد پر تیار تھے"۔ زینی اور فرینکس جیسے امریکی جرنیل امریکی فوج کے لئے پاکستان کی آپریشنل معاونت کے عوض عسکری ساز وسامان کی فروخت کو اپنی بڑی مذاکراتی فتوحات خیال کرتے ہیں۔ وہ اکثر اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے کہ اس قسم کے سودوں کے امکانات پاکستانی فوج کے طور طریقوں کا جزو لاینفک ہوتے ہیں۔

1988ء اور 1999ء کے درمیانی سالوں میں پاکستان کے ناکام جمہوری تجربات کی وجوہ کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یکے بعد دیگرے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتیں پر از نقائص تھیں۔ دونوں سویلین راہنماؤں نے متعدد غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ان کی سب سے بڑی غلطی ایک دوسرے کے ساتھ عدم تعاون، مل کر کام کرنے سے انکار اور سمجھوتوں کا فقدان تھا۔ فوج نے بدعنوانی کے الزامات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ان الزامات کو متشکل کرنے کے لئے اپنے مطلب کے واقعات چنے اور کہا کہ سویلین سیاست دان بدعنوانیوں پر قابو نہ پا سکے۔ چوٹی کے سیاستدانوں پر یہ الزام کہ انہوں نے عوام کی قیمت پر اپنی تجوریاں بھریں۔ یہ امر نہ صرف پریشان کن بلکہ ہماری بدقسمتی کا مظہر بھی تھا۔ بہت سے شعبوں میں سویلین عوام کو اپنے اس تفاخر کی قیمت ادا کرنا پڑی جس نے انہیں یہ تسلیم کرنے سے روکے رکھا کہ وہ "فری ایجنٹس" نہیں تھے۔ اگر ملا اور فوج ملکر سویلین راہنماؤں کے متبادلات کو محدود نہ کرتے تو ممکن تھا بعض بڑے فیصلے کرتے وقت ان سے فاش غلطیاں سرزد نہ ہوتیں۔ "سول ملٹری تعلقات" کے تناظر میں ایک پاکستانی مبصر اور دانشور نے ضیاء الحق کی موت کے بعد پاکستان کے سیاسی نظام کی درج ذیل وضاحت کی۔

"پاکستان میں 1988ء کے بعد جو پاور سٹرکچر متشکل ہوا اس میں آرمی چیف کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ صدر اور وزیراعظم کے ساتھ ملکر وہ ٹرائیکا کا ایک تہائی حصہ بن جاتا ہے۔ داخلی و خارجہ پالیسی اور دفاع کے معاملات پر سویلین راہنماؤں اور فوج کے درمیان اتفاق رائے کے قیام کے لئے یہ ایک ماورائے آئین بندوبست ہے۔ وقتاً فوقتاً ٹرائیکا کے اجلاس منعقد ہوتے رہے ہیں۔ زیر بحث معاملات پر بریفنگز دینے کے لئے آرمی چیف صدر اور وزیراعظم کے ساتھ علیحدہ ملاقاتیں بھی کرتا ہے۔ کور کمانڈروں کے اجلاس ایک اور اہم اور ممتاز ادارہ بن چکے ہیں۔ آرمی چیف کی زیر صدارت اس کانفرنس میں سنیئر ترین کمانڈرز، جی ایچ کیو کے پرنسپل سٹاف افسران اور سٹریٹیجک اعتبار سے اہم عہدوں کے حامل افسران شریک ہوتے ہیں۔ اس کانفرنس کے ارکان صرف دفاعی، تنظیمی اور پیشہ ورانہ معاملات پر ہی بحث نہیں کرتے بلکہ امن و امان اور عمومی سیاسی صورت حال پر بھی غور کرتے ہیں۔ بالخصوص جب حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کشیدگی اور کھنچاؤ ایک حد سے آگے چلا جائے۔ ان مباحث کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ سیاسی معاملات کے بارے میں سنیئر افسران کی فکرمندی

سامنے آجائے اور دوسرے فوج کے اندر وسیع البنیاد اتفاق رائے قائم ہو جائے اور اتفاق رائے کے نتیجے میں جو فیصلے سامنے آتے ہیں ان پر عملدرآمد کا کام آرمی چیف پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب آخرالذکر صدر اور وزیراعظم سے رابطے کرتا ہے تو اس کی پوزیشن مضبوط تر ہو جاتی ہے"۔

اگر "ٹرائیکا" کے ارکان کے درمیان رابطہ اور تعلق ہموار رہے تو وزیراعظم کو فوج کی حمایت میسر رہتی ہے۔ نتیجتاً ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اگر ان بڑے، اہم اور کلیدی کھلاڑیوں کے درمیان سنگین اختلافات پیدا ہو جائیں تو سیاسی بے یقینی اور عدم استحکام کو تقویت ملتی ہے۔ اس "سیاسی مساوات" کی سویلین سمت یعنی وزیراعظم محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک دشوار صورت حال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ فوج اس پر دباؤ ڈالنے کے لئے بہتر پوزیشن میں ہوتی ہے۔ مزید براں 1973ء کے آئین میں 1985 میں جنرل ضیاء الحق نے جو ترامیم کیں ان کی روشنی میں صدر کے مقابلے میں وزیراعظم کا ایک خودمختار طاقت کے طور پر ابھرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ البتہ اپریل 1997ء میں وزیراعظم کی پوزیشن کچھ بہتر ہو گئی۔ جب ایک ترمیم کے ذریعے صدر کے اختیارات کم کر دیئے گئے۔ اب وہ وزیراعظم کو برخاست نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم جب تک وزیراعظم منقسم اور باہمی طور پر حریف سیاسی قوتوں کی صدارت کرتا رہے۔ اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ صدر اور فوج کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام کرے۔

2002ء میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کے تصور کو دوبارہ متعارف کرانے کے لئے مشرف نے پاکستان کے آئین میں ترمیم کر دی۔ ان کا مقصد تھا کہ پارلیمانی انتخابات کے انعقاد سے قبل صدر کے اختیارات میں اضافہ کر دیا جائے۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو ان انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ ایک لیفٹیننٹ جنرل کی سربراہی میں کام کرنے والے "قومی احتساب بیورو" نے کئی دیگر سیاستدانوں کو بھی نااہل قرار دیدیا۔ انتخابات سے قبل پانچ سال صدر پاکستان کے عہدے پر فائز رہنے کا مینڈیٹ حاصل کرنے کے لئے مشرف نے ایک ریفرنڈم کا اہتمام کیا۔ ایک برطانوی دانشور نے مذکورہ ریفرنڈم کو پر از نقائص قرار دیتے ہوئے لکھا۔

["الیکشن کمیشن نے ریفرنڈم کے جن نتائج کا اعلان کیا۔ ان کے مطابق "ریفرنڈم میں ٹرن اوور 70 فیصد رہی۔ جن رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا ان میں سے 98 فیصد نے صدر مشرف کو پانچ سال کے لئے بطور صدر پاکستان پر حکمرانی کا مینڈیٹ دیدیا۔ ووٹنگ کے دوران بے قاعدگیوں کا مشاہدہ کیا گیا۔ رائے دہندگان کی شناخت کا کوئی رسمی طریق کار وضع نہ کیا گیا۔ نتائج میں تحریف کی گئی۔ اس ریفرنڈم نے جنرل ضیاء الحق کے پر از دھاندلی ریفرنڈم کی یاد تازہ کر دی جس کے ذریعے آخرالذکر نے بطور صدر پاکستان جواز حکمرانی حاصل کیا تھا۔ جس طرح ایوب خان کے دور حکومت میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح ناظمین یا ضلعی منتظمین کے تقرر کے ذریعے اقتدار اور اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں بے جا طرفداریوں اور جانبداریوں نے اہم کردار ادا کیا۔ "گڈ گورننس" کے

حکومتی غبارے میں سے ہوا نکل چکی تھی۔ مشرف نے ٹیلی ویژن پر برملا تسلیم کیا کہ ریفرنڈم میں دھاندلیوں کی اطلاعات ان تک بھی پہنچیں جن پر انہوں نے تاسف کا اظہار کیا]۔

2000ء میں منعقد ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ٹرن آؤٹ 40 فیصد رہی لیکن سیاسی جماعتوں کی اکثریت کے خیال میں ٹرن آؤٹ 25 فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔ صرف 39 دنوں کے لئے انتخابی مہم کی اجازت دی گئی۔ مہم کے طریق کار پر اضافی پابندیاں بھی عائد کی گئیں۔ انتخابات سے کافی عرصہ قبل آئی ایس آئی نے نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ سے متعدد لوگوں کو توڑا اور پاکستان مسلم لیگ (ق) تخلیق کر ڈالی۔ اس جماعت نے دیگر حکومت نواز جماعتوں اور آزاد ارکان کو ساتھ ملا کر ایک اتحاد قائم کر لیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ میں نواز شریف کے وفاداروں نے ملکر حزب اختلاف کے فرائض سنبھال لئے۔ جماعت اسلامی اور جمیعت العلمائے اسلام کی سربراہی میں اسلام پسند جماعتوں نے متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) تشکیل دے لی۔ یہ اتحاد بھی حزب اختلاف کے ساتھ مل گیا۔ اگرچہ حکومت نواز جماعتوں کا اتحاد قومی اسمبلی میں دوسرا بڑا دھڑا بن کر ابھرا۔ تاہم اصل فوائد ایم ایم اے نے حاصل کئے۔ اسلام پسندوں نے امریکہ مخالف مہم چلائی تھی اور اس حقیقت نے کامیابی کے حصول میں ان کی مدد کی کہ وہ واحد بڑی جماعت تھی جس نے انتخابی مہم اور امیدواروں کے چناؤ کے دوران حکومتی پابندیوں کا خیال رکھا

فوج نے 40 دنوں کے اندر اپنے حامیوں اور پاکستان پیپلز پارتی کے ان ارکان پر مشتمل ایک مخلوط اتحاد قائم کر دیا جنہیں یا تو وزارتوں کا لالچ دیا گیا اور یا پھر انہیں دھمکایا گیا کہ ان پر بدعنوانی کے الزامات کے تحت مقدمے چلائے جائیں گے۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) نے ایک بے جوش سے قبائلی سیاست دان ظفر اللہ جمالی کو وزارت عظمیٰ کے امیدوار کے طور پر پیش کیا جو 342 نشستوں کی حامل قومی اسمبلی میں سے 170 ووٹ حاصل کر کے وزیراعظم منتخب ہو گئے۔ اس طرح مشرف بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی سیاسی طاقت کو کم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آئین میں تبدیلیوں کے پیکج کے لئے مشرف کو قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت درکار تھی۔ اسمبلی کے اجزائے ترکیبی بتا رہے تھے کہ مشرف کے لئے دو تہائی اکثریت کا حصول بہت مشکل ہو گا۔ پارلیمنٹ میں مشرف کے مخالف اسلام پسندوں نے آئینی تبدیلیوں کے حق میں ووٹ دینے سے قبل مشرف سے وعدہ لیا کہ وہ 2004ء کے اواخر میں آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیں گے۔ بعد میں مشرف اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے اور صدر پاکستان اور آرمی چیف کے عہدے بدستور اپنے پاس رکھے۔

جمالی صرف اٹھارہ ماہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ اگرچہ بطور سیاستدان وہ بہت کمزور تھے۔ تاہم پاکستانی جرنیلوں کے نزدیک قابل بھروسہ نہیں تھے۔ اگست 2004ء میں شوکت عزیز نے وزیراعظم پاکستان کے طور پر چارج

سنبھال لیا۔ جنرل مشرف نے اکتوبر 1999ء میں جب اقتدار پر قبضہ کیا۔ شوکت عزیز سٹی بنک کے ایگزیکٹو تھے۔ بغاوت کے فوراً بعد مشرف نے انہیں پاکستان کا وزیرخزانہ مقرر کر دیا۔ فوج ایک ایسی سویلین حکومت کی خواہاں تھی جو ہر طرح اس کے قابو میں رہے۔ اس کی خواہش پوری ہوگئی۔ عوامی یا قابل انتخاب سیاستدانوں کے ادارے کے لئے بہت محدود کردار باقی بچا۔ ایم ایم اے کے قد میں اضافے نے ایک اہم مسئلہ حل کر دیا۔ مشرف کے امریکی پشت پناہوں کو قائل ہونا پڑا کہ اگر پاکستانی سیاست اور حکومت کی طنابیں فوج کے ہاتھ میں نہ رہیں تو خطرہ ہے کہ اسلام پسند اقتدار حاصل کر لیں گے۔ فوج اور پاکستان کے اسلام پسندوں کے اتحاد نے ملک کے اندر جمہوریت کے امکانات کو ایک مرتبہ پھر گہنا دیا۔ پاکستان میں سویلین حاکمیت کو کمزور کرنے کے لئے پاکستانی جرنیل پورا ایک عشرہ اسلام پسندوں کو استعمال کرتے رہے۔ اب انہوں نے اسلام پسندوں کو عالمی برادری خصوصاً امریکہ کے سامنے خطرہ بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا تاکہ ان پر کنٹرول برقرار رکھنے کے لئے پاکستانی فوج ان ممالک سے امداد حاصل کر سکے۔

سرحدوں کے بغیر جہاد

4 فروری 2004ء کو پاکستان کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے اسلام آباد میں پاکستانی اخبارات کے مدیروں کو بتایا کہ "پاکستان کے دو بڑے قومی مفادات ہیں۔ ایک جوہری طاقت اور دوسرے کشمیر کاز"۔ 11 ستمبر 2001ء کو نیویارک اور واشنگٹن پر جو دہشت گرد حملے ہوئے تھے ان سے 29 ماہ بعد مشرف کے مذکورہ بالا بیان نے اس امر کی نشاندہی کی کہ پاکستان کی سٹریٹیجک سوچ کا تسلسل برقرار تھا۔ تاہم جنرل مشرف امریکیوں کو یہی باور کراتے رہے کہ وہ ایک ایسے وقت میں راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں جب پاکستان میلانات میں سٹریٹیجک تبدیلیوں کے دور سے گزر رہا ہے۔ امریکی حکام نے ان کے اس دعوے کو من وعن تسلیم کرلیا۔

ستمبر 2001ء میں پاکستان کو امریکی امداد کا اہل ثابت کرنے کے لئے مشرف کو جو فوری قیمت ادا کرنا پڑی وہ یہ تھی کہ ایک تو افغانستان میں طالبان کی حمایت ترک کردی اور دوسرے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی سربراہی میں جو عالمی اتحاد وجود میں آیا اس کے رکن کے طور پر پاکستان نے بھی دستخط کردیئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنرل مشرف کو امریکیوں نے قائل کرنا شروع کردیا کہ پاکستان القاعدہ سے تعلق رکھنے والے جہادی گروہوں کے خلاف حاصل شدہ انٹیلی جنس میں امریکہ کو بھی شریک کرے۔ دوسرے لائن آف کنٹرول کے اس پار بھارتی مقبوضہ کشمیر میں جنگجوؤں کی دراندازی کا سلسلہ ختم کرے اور تیسرے حصول امن کے عمل میں بھارت کے ساتھ شریک ہوجائے۔ 2003ء کے اواخر میں جب پاکستان کی طرف سے ایران، شمالی کوریا اور لیبیا کو جوہری ٹیکنالوجی کی خفیہ فروخت کا راز طشت ازبام ہوگیا تو صدر مشرف کو پاکستان کے سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی سربراہی میں مصروف عمل جوہری سامان کی فروخت کا نیٹ ورک ختم اور نیٹ ورک سے متعلقہ انٹیلی جنس میں امریکہ کو شریک کرنا پڑا۔

دراصل مشرف امریکہ کے ساتھ دوبارہ تعلق قائم کرنا اور اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ پاکستان کی ترجیحات کا ازسرنو تعین ضروری ہے۔ پاکستان کے "اہم قومی مفادات" کے متعلق انہوں نے جو بیان دیا اس کا مقصد ہی

فوج اور پاکستان کے مذہبی قدامت پسندوں کو ایک مرتبہ پھر یقین دلانا تھا کہ امریکہ کے ساتھ اتحاد کو "پالیسی یوٹرن" نہ سمجھا جائے۔ مشرف کہنا چاہ رہے تھے کہ انہوں نے پاکستان کی اس بنیادی پالیسی کو تبدیل یا ترک نہیں کیا جس کے تحت ایک آزاد ریاست کے طور پر پاکستان کی سمت کا تعین کیا گیا تھا اور جس پر اس کے معرض وجود میں آجانے کے وقت سے عمل کیا جا رہا تھا۔ وہ تو امریکہ کی حمایت اور اعتماد کے دوبارہ حصول کے لئے اس پالیسی کو تھوڑا بہت سنوار رہے تھے کیونکہ امریکی حمایت اور اعتماد بھی پاکستان کی روایتی سٹریٹیجک سوچ کا اسی طرح حصہ تھا جس طرح اسلامی وطنیت کا تصور اہم تھا یا جس طرح علاقائی رسوخ کے حصول کی بھارتی کاوشوں کی راہ میں مزاحم ہونا ضروری تھا۔

مشرف کی بار بار یقین دہانیوں کے نتیجے میں امریکہ نے پاکستان پر سے وہ پابندیاں اٹھالیں جو آخرالذکر کے خفیہ جوہری پروگرام اور 1999 میں مشرف کی فوجی بغاوت کے ردعمل کے طور پر عائد کی گئی تھیں۔ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں پاکستان کو فرنٹ لائن سٹیٹ قرار دیدیا گیا۔ صدر جارج ڈبلیو بش نے پاکستان کی اقتصادی اور عسکری امداد بحال کر دی اور پاکستان کے لئے 3 ارب ڈالرز کے دوطرفہ امدادی پیکج کا اعلان کر دیا۔ طے پایا کہ پاکستان کو یہ امداد 5 سال کے دورانیے میں دی جائے گی۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کا جو قرض پاکستان کے ذمہ تھا وہ یا تو معاف کر دیا گیا یا اس کی ری شیڈولنگ کر دی گئی۔ نئے پاک امریکہ تعلقات اور امریکی امداد کے وعدوں کی تجدید نے پاکستان کے ساتھ امریکہ کے اس خوشگوار سلوک کی یاد تازہ کر دی جو آخرالذکر نے ان دنوں روا رکھا تھا۔ جب ضیاء برسراقتدار تھے اور افغان جہاد زوروں پر تھا۔ دہشت گردی کے خلاف اقدامات، سرکاری امور کی انجام دہی کے دوران اسلام سے صرف نظر اور بھارت کے ساتھ قیام امن کے عمل کو بحال کر کے دراصل جنرل مشرف نے امریکہ کے فوری تفکرات دور کرنے کی کوشش کی۔ مشرف کے پیش رو فوجی حکمرانوں ایوب خان، یحیٰی خان اور ضیاءالحق نے بھی امریکہ کو خوش کرنے کے لئے پاکستان کی بنیادی پالیسی کے بعض اہم پہلوؤں کو اسی طرح بدلا تھا۔ مقصد ان ایجنڈوں کو (وقتی طور پر) پس پشت ڈالنا تھا جو امریکی مفادات سے متصادم تھے۔ اس دوران جنرل مشرف نے پاکستان کے انتہاپسندوں کو بھی باور کرانا چاہا کہ فوج ہی ملک کو چلائے گی اور جن چیزوں کو فوج نے پاکستان کے بنیادی اور اہم مفادات قرار دیا تھا ان کی بطریق احسن حفاظت کی جائے گی۔

1988ء اور 2001ء کے درمیانی برسوں میں پاکستانی فوج اور قومی دفاع کے شعبے نے تین امور کو پاکستان کے اہم ترین اور بنیادی مفادات قرار دیئے رکھا۔ (i) ایٹمی صلاحیت کا استقرار اور وسعت (ii) بھارت کو کشمیر سے رخصت ہو جانے پر مجبور کرنا اور (iii) افغانستان میں گہرے سٹریٹیجک رسوخ کا حصول۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے اس ضابطہ کار کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا۔ بعد میں جب امریکی دباؤ پر افغانستان کے طالبان کی مدد سے ہاتھ اٹھانا پڑا تو مشرف نے قومی مفاد کے دیگر دو عناصر کو بدستور اپنائے رکھا۔ 4 فروری 2004ء کو انہوں نے اخبارات کے مدیروں کو جو بریفنگ

دی۔ اس میں بھی اپنے اس عزم کا اظہار کیا۔ پاکستان نے افغانستان میں اپنے رسوخ کا جو خواب دیکھ رکھا تھا مشرف نے جب اس سے منہ موڑا تو یہ اقدام اسلام پسندوں اور پاکستانی فوج کے متعدد افسران پر ناگوار گزرا۔ وہ تو افغانستان سے آگے وسط ایشیاء تک پاکستان کے رسوخ کے قیام کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ مشرف نے جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اہم تر مفادات کے لئے افغانستان میں پاکستان کے مفادات کو قربان کرنا ضروری تھا۔ وہ اہم مفادات تھے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کی صلاحیت اور کشمیر پر پاکستان کا استحقاق۔ 19 ستمبر 2001ء کو مشرف نے پاکستانیوں کو بتایا کہ اگر پاکستان نائن الیون کے بعد امریکہ کے مطالبات تسلیم نہ کرتا تو ہمارے اہم ترین فیصلہ کن مفادات خطرات کی زد میں آجاتے۔ انہوں نے کہا" جب میں فیصلہ کن مفادات کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد سٹریٹیجک اثاثے ہوتے ہیں یا پھر کشمیر کاز۔ اگر یہ دونوں خطرات لاحق ہو جائیں تو ہمارے لئے صورت حال بدتر ہو جائے گی"۔

جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد جزوی سویلین حکومت کے دور میں فوج نے ہمیشہ "قومی مفاد" کو ہی اپنی کھلی مداخلت اور پس منظر میں رہ کر سیاسی کردار کی ادائیگی کا جواز قرار دیا۔ پاکستانی فوج کے کچھ افسران سے انٹرویوز اور ان کے تجزیات سے وہ 6 وجوہ اخذ کی گئیں جن کی بناء پر فوج کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ ملکی مفادات پر اپنا تسلط برقرار رکھے۔ حسن عسکری رضوی نے "قومی مفاد" کو پہلی وجہ قرار دیتے ہوئے لکھا:۔

"ضیاء دور میں جوہری پالیسی اور افغان جنگ براہ راست فوج کے کنٹرول میں رہیں۔ سویلین ادوار حکومت میں بھی جوہری پالیسی پر فوج ہی کا کنٹرول رہا۔ بے نظیر بھٹو نے ستمبر 1991ء میں شکایت کی کہ ان کی پہلی مدت اقتدار کے دوران ملک کے حساس ترین جوہری پروگرام کے بارے میں انہیں معلومات بہم پہنچانے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ 1989ء میں روسی فوج کی دست برداری کے بعد افغان پالیسی کی تشکیل اور اس پر عملدرآمد میں دفتر خارجہ اور سویلین قیادت کے کردار میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن سنیئر فوجی جرنیل اور آئی ایس آئی کی طرف سے قابل ذکر مداخلت بدستور کی جاتی رہی۔ اسی طرح کشمیر سمیت پاکستان کی بھارت پالیسی میں بھی فوج گہری دل چسپی لیتی رہی۔ فوجی اشرافیہ کو پاکستان اور بھارت کے درمیان مصالحت سے کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ اسے اس بات کی فکر لاحق رہتی ہے کہ سویلین حکومت کہیں نئی دہلی کے منی پر تسلط ایجنڈے کو نظر انداز نہ کر دے۔ بھارتی دباؤ کا مقابلہ کرنے اور آزادانہ خارجہ و داخلی پالیسیوں کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کا روایتی دفاعی نظام بھی مضبوط اور قابل اعتماد ہو اور اس کے پاس جوہری ہتھیار تیار کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ جب تک فوج کو بھارت کی مداخلت کی کوشش کے خلاف کوئی قابل اعتماد ضمانت نہ مل جائے وہ ایٹمی ہتھیاروں کے متبادل سے دست برداری کی راہ میں مزاحم رہے گی اور یہی مشورہ دے گی کہ بھارت کے ساتھ معمول کے تعلقات کی بحالی کے عمل میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ مزید براں فوج متعدد سویلین پالیسی سازوں کی طرح مسئلہ کشمیر کے حل سے پہلے بھارت کے ساتھ دوطرفہ تعلقات میں بہتری کی خواہاں نہیں ہے"۔

کشمیر کو بھارت کی گرفت سے نجات دلانے کی خواہش نے فیلڈ مارشل ایوب خان کو 1965ء میں آخر الذکر کے خلاف جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا۔ 1965ء میں ایوب خان نے چاہا کہ تربیت یافتہ باغیوں کی مدد سے بھارتی حکمرانی کے خلاف کشمیری مسلمانوں کی بغاوت کے شعلوں کو ہوا دی جائے۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد سے امید کی جا رہی تھی کہ بھارت پر کافی عالمی دباؤ پڑے گا اور وہ مذاکرات کی میز پر دوڑا چلا آئے گا اور نتیجتاً جموں و کشمیر کو علاقائی جمود سے نجات مل جائے گی۔ بجائے اس کے کہ وہ پاکستان کے حق میں جانے والے نتائج کو درخور اعتناء سمجھتا۔ 1971ء میں ہونے والی جنگ کے بعد بھارت نے اپنی عسکری پوزیشن مجتمع اور مستحکم کر لی اور مسئلہ کشمیر پر مذاکرات میں دل چسپی لینا ترک کر دی۔ اگرچہ بھارت نے تقسیم ہند کو کالعدم قرار دینے کے مطالبے کی تکرار چھوڑ دی۔ تاہم زیادہ تر پاکستانیوں کے خیال میں بھارت کا پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنا آخر الذکر کے فدویانہ پن سے مشروط تھا۔ بالخصوص پاکستان کی فوج اس منطق کو تسلیم کرنے سے انکاری رہی کہ دونوں ملکوں کے رقبے اور آبادی کے فرق کے باعث انہیں یکساں اور برابر نہیں سمجھا جا سکتا۔

1965ء میں کشمیر کو آزاد کرانے کی فوجی کاوش میں ناکامی کا منہ دیکھنے اور 1971ء میں بنگلہ دیشی جنگ میں شکست اٹھانے کے باوجود پاکستان کے پالیسی سازوں نے کشمیر کو بھارتی چنگل سے آزاد کرنے کی منصوبہ بندی ترک نہ کی۔ اگرچہ 1972ء میں طے پانے والے شملہ سمجھوتے کے بعد پاک بھارت سفارتی تعلقات بحال ہو چکے تھے۔ تاہم دونوں ملکوں کے مراسم سے سرد مہری صاف جھلکتی تھی۔ دونوں کے درمیان سفر اور باہمی تجارت بھی محدود تھی۔ نسبتاً ایک "مختصر پاکستان" کے راہنما کے طور پر چارج سنبھالنے کے فوراً بعد ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستانی فوج کی توسیع اور تنظیم نو کے احکامات جاری کر دیئے۔ پاکستان کا ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام بھی جاری تھا۔ جس کا واضح مقصد بھارتی تسلط کے مقابلے میں پاکستان کا دفاع کرنا تھا۔ اگرچہ اقوام متحدہ سمیت عالمی برادری نے اس کے حل میں کوئی دل چسپی نہ لی۔ تاہم جب اور جہاں ممکن ہوا پاکستان سفارتی سطح پر مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرتا رہا۔ 1973ء سے لیکر آج تک ہر سال کشمیریوں کے ساتھ قومی سطح پر یک جہتی کا دن منایا جا رہا ہے جو پاکستان کی عوام کو یاد دلاتا ہے کہ تقسیم ہند کی تکمیل ابھی بقایا ہے۔

محض پاکستان کی تضحیک کی خاطر تقسیم ہند کے جواز کو متنازعہ بنانے کے لئے بھارتی راہنما اور دانشور ہر دستیاب موقع پر یہ مسئلہ اٹھاتے رہے۔ ان کے اس رجحان نے پاکستانیوں کی نظر میں بھارت کو ایک مستقل خطرہ بنا دیا۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان کے اسلام پسند اور فوجی افسران مسلسل اس ضرورت پر زور دیتے رہے کہ بھارت نے پاکستان کو دولخت کر دینے کی صورت میں آخر الذکر کی توہین کی ہے لہذا اس سے انتقام لیا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ بھارت پاکستان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ تاہم امریکہ کی طرف سے عسکری ساز و سامان کی فراہمی بند ہو جانے کے باعث پاکستان کی خواہشات محدود ہو کر رہ گئیں۔ امریکہ نے پاکستان کو اسلحے کی فراہمی پر جو پابندی 1965ء میں عائد کی تھی وہ 1975ء تک برقرار رہی۔ بعد ازاں 1979ء میں پاکستان کے خفیہ ایٹمی پروگرام

کے ردعمل کے طور پر یہ پابندی دوبارہ نافذ کر دی گئی۔ 1979ء میں افغانستان پر روسی حملے کے بعد جب امریکہ کے ساتھ پاکستان کے دفاعی تعلقات دوبارہ بحال ہوئے تو آخر الذکر نے جموں وکشمیر کے حصول کے لئے عسکری متبادل کے استعمال پر سنجیدگی سے غور شروع کر دیا۔

جنرل ضیاء الحق اپنے دو پیش رو فوجی حکمرانوں کو بھارت کے ساتھ جنگ کی غلطی کرتے دیکھ چکے تھے۔ دونوں ملکی سرحدوں پر فوجی فتح کے حصول میں ناکام رہنے کے بعد ملکی سطح پر بھی حمایت کھو بیٹھے۔ ضیاء الحق نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے دور حکمرانی میں بھارت کے ساتھ تعلقات اس حد تک کشیدہ نہیں ہونے دیں گے کہ جنگ کی نوبت آجائے۔ ضیاء الحق دیکھ چکے تھے کہ بیک وقت امریکہ کے ساتھ قریبی دفاعی تعلقات اور بھارت کے ساتھ دشمنی میں اضافہ پاکستان کے لئے ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوئے۔ بھارت کے ساتھ پاکستان کے اچھے تعلقات پاک امریکہ دفاعی تعلقات کی پیشگی شرط بن کر رہ گئے اور بھارت کے ساتھ عسکری مقابلے کی سوچ بھی پاک امریکہ دفاعی تعلقات کی راہ میں مزاحم رہی۔

ضیاء الحق نے جولائی 1977ء میں جب فوجی بغاوت کے نتیجے میں اقتدار سنبھالا تو ایک بھارتی سفارت کار نے کہا کہ پاک بھارت تعلقات ایک "مافوق الفطرت پگھلاؤ" کی زد میں ہیں۔ اس سے چند ماہ قبل پارلیمانی انتخابات کے نتائج نے بھارت کو آزادی دلانے والی جماعت کانگریس کو 1947ء کے بعد پہلی مرتبہ اقتدار سے الگ کر دیا تھا۔ جنتا پارٹی کے نام سے نیا حکمران اتحاد خود کو طویل عرصہ سے حکمران کانگریس کے مقابلے میں مختلف ثابت کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ بھارت کے وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی (جو 1977ء میں قائم ہونے والی ہندو وطن پرست جنتا پارٹی کے سربراہ ہونے کے ناطے بعد ازاں وزیراعظم بھارت بن گئے)، فروری 1978ء میں پاکستان کے دورے پر آئے اور دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کو معمول پر لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ضیاء الحق اس وقت اندرون ملک اور بیرون ملک جواز حکمرانی کے فقدان سے نبرد آزما تھے۔ انہوں نے پاک بھارت تعلقات میں پائی جانے والی کشیدگی اور کھنچاؤ میں کمی کو سیاسی طور پر مفید خیال کیا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان مختلف کھیل بحال ہو گئے اور تجارت، ریلوے ٹرانسپورٹ اور زرعی شعبے میں تعاون پر سرکاری سطح پر مباحث کا آغاز ہو گیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی نمائندگی کے حجم میں توسیع کے طور پر بھارت کو کراچی میں اپنا قونصل خانہ کھولنے کی اجازت بھی دیدی گئی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ بھارتی مبصرین نے نکتہ اٹھایا اور کہا کہ دونوں حکومتوں نے محض لحاتی طور پر ایک دوسری کے لئے نیک ارادوں کا اظہار تو کیا اور عوامی سطح پر کچھ آگے بڑھے لیکن عملی سیاست میں پاکستان اور بھارت کے تفکرات۔ تحفظات اور رویوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

کانگریس بھارت میں 1979ء میں ایک دفعہ پھر برسراقتدار آ گئی۔ اس کے بعد جلد ہی افغانستان پر روسی حملے کے نتیجے میں پاکستان اور امریکہ کے دفاعی تعلقات بحال ہو گئے۔ 1971ء میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے پاکستان کو

دولخت کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ لہذا ان کی حکومت نے پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو ضروری خیال نہ کیا۔ دوسری طرف ضیاء الحق اور دیگر فوجی قائدین پاکستان اور امریکہ کے باہمی اتحاد اور امریکی یقین دہانیوں کے باعث پر اعتماد ہو چکے تھے۔ اندرا گاندھی بھارت کی طاقت کے بل بوتے پر اسے جنوبی ایشیاء میں ایک برتر حیثیت کی حامل ریاست خیال کرتی تھیں۔ انہوں نے پاکستان اور امریکہ کے اتحاد کو اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ سوویت یونین کی نصب کردہ کمیونسٹ افغان حکومت کو با جواز تسلیم کر لیا اور شملہ سمجھوتے کو مسئلہ کشمیر کا حل قرار دیدیا۔ پاکستان نے محسوس کیا کہ بھارت چاہتا ہے اول الذکر اپنے اقتدار اعلیٰ کو بھارتی خواہشات کے مطابق استعمال کرے۔ پاکستان کے لئے یہ خیال ہی قابل قبول نہیں تھا۔ پاکستان کو اسلام پسندوں اور فوجی نظریہ پرستوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ بھارت "دوقومی نظریے" کو ترک کرنے کے لئے مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے کیونکہ دوقومی نظریہ ہی 1947ء میں تقسیم ہند پر منتج ہوا تھا۔ ضیاء الحق بھارت اور پاکستان کے درمیان طاقت کے عدم توازن کا کوئی طویل المیعاد حل چاہتے تھے۔

افغانستان میں سوویت روس سے نمٹتے وقت ضیاء الحق چاہتے تھے کہ آخر الذکر کے ساتھ ان کا براہ راست تصادم بھی نہ ہو اور وہ روسیوں کو خون میں نہلا دیں۔ ضیاء کی سوچ کی وضاحت کرتے ہوئے انٹیلی جنس کے افسران نے کہا تھا۔ "پانی شدید گرم نہ ہونے دیا جائے" جب امریکہ کی جانب سے اقتصادی اور عسکری امداد کے بہاؤ کا آغاز ہو گیا تو ضیاء الحق نے کہا کہ بھارت کے ساتھ نمٹنے کے لئے نسبتاً سخت پالیسی اپنائی جائے۔ ضیاء الحق کے معتمد اور آئی ایس آئی کے چیف جنرل اختر عبدالرحمان کی فیملی نے دونوں جرنیلوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی اشاعت کی اجازت دی ہے۔ یہ گفتگو 1981ء یا 1982ء کے دوران کسی وقت ہوئی۔

فکر مند ضیاء الحق نے جنرل اختر سے پوچھا "بھارتی دباؤ کا ہمارے پاس کیا حل ہے؟" جنرل اختر قائل ہو چکے تھے کہ بھارت شرافت کی زبان نہیں سمجھتا۔ اس نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا اور ابھی تک "اکھنڈ بھارت" کے قیام کا خواہاں ہے۔ جنرل اختر نے صدر کو ایک منصوبہ پیش کیا۔ صدر کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ یہ (منصوبہ) بہت زیادہ غور وفکر اور سوچ بچار کا متقاضی ہے"۔ لیکن جنرل اختر تمام پہلوؤں کا پہلے ہی جائزہ لے چکے تھے۔ منصوبے پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی نے پورے بھارت میں نیچے تک اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے دفتر سے فائلیں پاکستان پہنچ گئیں۔ بھارتی فوج کی نقل وحرکت کا مستقلاً مشاہدہ کیا جانے لگا۔ کشمیر کی صورت حال کا باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا اور ایسے کشمیریوں کی تلاش شروع ہوگئی جو بھارت کے خلاف آزادی کی مہم میں راہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کیلئے تیار ہوں اور بیک وقت صدر ضیاء نے حصول امن کی مہم کا آغاز بھی کر دیا۔

یہ پاکستان کی دوغلی پالیسی تھی کہ ایک طرف تو بھارت کو کمزور کرنے کے لئے خفیہ کاوشیں کی جارہی تھیں اور دوسری طرف پائیدار امن کے قیام کی خواہش کا اظہار کیا جارہا تھا۔ یہ پالیسی نہ صرف ضیاء الحق کی مدت اقتدار کے دوران جاری

رہی بلکہ ان کے بعد بھی اسی پالیسی پر عمل کیا جاتا رہا۔ یہ حکمت عملی پاکستانی فوج نے بھارت کی طاقت اور کمزوریوں کا تعین کرنے کے بعد وضع کی تھی۔ ایک پاکستانی جرنیل جوان دنوں فوج کے " کمانڈ اینڈ سٹاف کالج" کے سربراہ تھے لکھتے ہیں:-

["اس معاملے میں بھارت کی بعض سنجیدہ نوعیت کی حدود و قیود ہیں۔ 1971ء کے بعد بھارت کو ایک "حاوی علاقائی طاقت" سمجھنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ یہ تاثر قائم کرنے میں ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے اپنا مشکوک سا کردار ادا کیا۔ لیکن ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے دفاع کو مضبوط اور مزاج کو ٹھنڈا رکھیں۔ عسکری تجزیہ نگاروں کی آراء کا بغور جائزہ لینے کے بعد اگر ہم بھارت کو ایک علاقائی طاقت سمجھیں تو چند معروضی حقائق ہمارے ذہن میں ہونے چاہئیں۔ ان معروضی حقائق کا محتاط تجزیہ بھارت کے بارے میں کوئی متوازن رائے قائم کرنے میں ہماری مدد کرے گا اور بھارت کی کمزوریاں اور حقیقی طاقت ہمارے سامنے آجائے گی۔ اگر ہم بھارت کی صرف مضبوطیوں کا شمار کریں تو جلد ہی ان لوگوں کے تقریباً ہم خیال ہو جائیں گے جو بھارت کو ایک منی سپر پاور سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی حدود و قیود کو بھی سامنے رکھیں تو ہمیں بھارت کا درست حجم معلوم ہو جائے گا اور ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ فی الحقیقت اتنا مضبوط نہیں جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں۔ مزید براں اس کی فوجی طاقت کا مقابلہ کرنا بھی ناممکن نظر نہیں آئیگا"]۔

بھارت کے درست حجم یا اس کی اصل اوقات کا تعین کرنا محض لفاظی نہیں تھی۔ بلکہ پاکستانی فوج نے بھارتی معاشرے اور سیاست کا جو جانبدارانہ اور نظریاتی تجزیہ کر رکھا تھا اسے ایک فعال پالیسی کی بنیاد بننا تھا۔ اگرچہ اس نوعیت کے تجزیے قیام پاکستان کے بعد جلد ہی کئے جانے لگے تھے۔ تاہم ضیاء الحق کے دور اقتدار اور اس کے بعد چند سالوں کے دوران مذکورہ تجزیوں کے حق میں جو دلائل پیش کئے گئے۔ وہ نسبتاً زیادہ درست اور گہری سوچ بچار کا نتیجہ تھے۔ اسلام پسندوں کے رسائل و جرائد نے یہ تاثر عام کر دیا کہ اگر مذہبی جوش و خروش اور فوجی اقدامات باہم مل جائیں تو بھارت کو زیر کرنا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ امریکہ کے ایماء پر کئے جانے والے افغان جہاد کے ناقدین کو بتایا گیا کہ افغان جہاد کے دوران جہادی روح کی تجدید بھارتی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پاکستان کے عظیم منصوبے کی تمہید ثابت ہوگی۔

لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) جاوید حسن نے "انڈیا" اے سٹڈی ان پروفائل (India-A Study in Profile) کے عنوان سے جو کتاب لکھی، اس کے لئے انہوں نے ہندوؤں اور ہندوستان کی دو ہزار سالہ تاریخ پر تحقیق کی۔ "ملٹری بک کلب" نے یہ کتاب تقسیم کی۔ اس کتاب میں فوجی افسران کی ارتقاء پذیر سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ اپنی سرحدوں سے باہر اظہار قوت کے اعتبار سے ہندوستان کا ٹریک ریکارڈ ہرگز قابل ستائش نہیں۔ اس نے اپنی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے تحفظ میں بھی ہمیشہ بدتر اور مایوس کن کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن اس کی تاریخ میں ہندوؤں کی ناقابل اصلاح جنگ پسندی کے (ناقابل تردید) شواہد موجود ہیں۔

قومیں اپنے قومی کردار کے کلیدی عناصر سے پہچانی جاتی ہیں۔روسیوں کی "بنیادی قوت اور مستقل مزاجی" امریکیوں کی "انفرادی سطح پر پہل کرنے کی صلاحیت اور اختراعی وایجاداتی سوچ" برطانویوں کی "عمومی سوجھ بوجھ" اور جرمنوں کا "نظم وضبط اور صاف گوئی" یہ سب قومی کردار کے اجزائے ترکیبی ہیں۔تو پھر ہندو کی پہچان کیا ہوگی؟ ہندو نسبتاً ایک پیچیدہ شخصیت ہے۔ وہ طاقت اور قوت کی مساواتوں پر مبنی کلیدی خصائل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کمزور کے ساتھ مستقلاً استحصالی اور متکبرانہ رویہ روا رکھتا ہے۔ اگر کمزور سرتابی کی جرات کرے تو ہندو اس کے لئے مسلسل ناقابل برداشت اور متشدد ہو جاتا ہے۔ جو ہندو کا ہم پلہ ہوا سے وہ اکثر دھوکہ دیتا ہے اور اگر کسی ہم پلہ کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ لگ جائے تو اسے اپنا اثاثہ بنانے سے نہیں چوکتا۔ اگر اس کا کسی ایسے دشمن سے واسطہ پڑ جائے جو اس سے طاقتور ہو تو اس میں تحمل پیدا ہو جاتا ہے۔اس کے انداز واطوار سے نیازمندی جھلکتی ہے۔ دشمن کو دھوکہ دیتا ہے اور اسے اپنی طرح آلودہ کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے۔ اگر ان کلیدی خصائل کو بالاختصار بیان کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندو ایک "نخوت زدہ۔ مستقل مزاج اور سازشی مخلوق" ہے۔

ہندو ذہن کی کجروی جواز فراہم کر دیتی ہے کہ اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔ مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستان کے فوجی افسران کو بتایا گیا تھا بھارت نے خود کو "مرکز جو" کی بجائے "مرکز گریز" روایات کا یرغمال بنا رکھا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو ہندوستان کسی دور میں بھی ایک واحد اور متحد ریاست کے طور پر اپنا وجود تسلیم نہیں کرا سکا۔ جب جدید بھارتی ریاست اور قدیم برہمنی تہذیب کا تقابلی جائزہ لیا گیا تو بھارتی ریاستوں کے 3 حلقے سامنے آئے۔ بھارت کی شمالی اور مغربی ریاستیں ہندو کی اصلیت کی نمائندہ تھیں۔ دوسرا حلقہ ان ریاستوں پر مشتمل تھا جن میں علاقائیت کا عنصر نمایاں تھا۔ لیکن ان میں علیحدگی کی قوت محرکہ کی رفتار کم تھی۔ بھارت کے مرکز سے بعید ترین حلقے میں بھارتی پنجاب، جموں وکشمیر، تامل ناڈو کی جنوبی ریاست اور 6 شمال مغربی قبائلی ریاستیں شامل تھیں۔ یہ حلقہ مرکزی دھارے سے بالکل ہی الگ تھلگ سمجھا جاتا تھا۔ مذکورہ حلقے کے باشندوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تو ان علاقوں کو بغاوت کے مراکز میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ جس کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا کہ بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ یا پھر اتنا کمزور پڑ جاتا کہ کئی سالوں کے لیے علاقائی تسلط کے حصول کی خواہش سے گریز کرتا۔

پاکستانیوں کا یہ ادراک درست تھا کہ بھارت کے کچھ حصوں اور مرکزی حکومت کے درمیان کھنچاؤ موجود تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا کہ بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔ نہ ہی ہندوؤں کی عادات کے متعلق ان کا تصور درست تھا۔ ان کا یہ مفروضہ بھی خالی از مبالغہ نہیں تھا کہ بھارت کے حکومتی نظام میں سے ہندو ذہن جھلکتا ہے۔ دریائے سندھ کے اس پار بسنے والے پاکستانیوں کی تاریخ اور نسلی نقطہ آغاز بھارتیوں کی تاریخ اور نسلی نقطہ آغاز سے مختلف نہیں تھے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تاریخی اور نسلی اعتبار سے ہندو ایک مخصوص رویے کے حامل ہیں تو پھر ان کے جن آباء نے مذہب اسلام کو اپنا لیا تھا وہ ان

سے مختلف کس طرح ہو گئے؟ مذہب اور نظریے کو فرق کی وجہ قرار دیا گیا۔ یہ مفروضہ کہ ہندو اور مسلمان کے کردار میں فرق ہے۔ اس تصور کے لئے تقویت کا باعث بنا کہ پاکستان کی غائت وجود اسلام تھا اور پاکستان کے فوجی افسران کی تربیت اس طرح کی گئی کہ وہ خود کو اسلام پسندوں کے نظریے کے عدسے سے دیکھیں۔ اسلام پسندوں کے دلائل اس قوت محرکہ کی وضاحت کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں جو پاکستان اور بھارت کے اندر اور دونوں کے درمیان کارفرما ہے۔ ہندو بھارت ہندوؤں کے کردار کی کمزوریوں کے باعث لخت لخت ہو جائے گا۔ جبکہ پاکستان کی حفاظت اسلام کرے گا۔ کیونکہ پاکستانیوں کے کردار کو گروہی یا نسلی نقطہ ہائے آغاز نے نہیں بلکہ ان کے مذہب نے متشکل کیا۔

1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں بھارت ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتوں سے نبرد آزما رہا اور حسب معمول اپنے ہمسایوں بالخصوص پاکستان کو مورد الزام ٹھہراتا رہا کہ اس نے باغیوں کو اسلحہ اور تربیت فراہم کی۔ شمال مشرقی بھارت کے قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کچھ باغی ایسے بھی تھے جنہوں نے جنرل ضیاء کے برسراقتدار آنے سے بہت پہلے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ پاکستان نہ تو پاک بھارت سرحد سے طویل فاصلوں پر واقع بھارتی علاقوں میں باغیوں کو اکسا سکتا تھا اور امکان غالب ہے کہ نہ ہی اس نے ایسا کیا۔ مزید براں زیادہ تر غیر مسلموں نے بھارت کی مرکزی حاکمیت کو چیلنج کیا اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ انہوں نے پاکستان کی "جہادی کال" کے ردعمل کے طور پر بغاوت کر دی ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بھارت کے اندرونی تنازعات میں کوئی بیرونی قوت ملوث نہیں تھی۔ بھارت کے بعض علاقوں کے ساتھ وزیراعظم اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے وزیراعظم راجیو گاندھی کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ انہی علاقوں سے ان کے خلاف بغاوتیں متشکل ہوئیں جو بالآخر متشدد مخالف گروہوں کے قیام پر منتج ہوئیں۔ بھارت کے چھوٹے ہمسایوں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ اول الذکر کا سلوک متکبرانہ ہے اور وہ دوسروں کے جذبات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔

جنوبی ایشیاء کی جن ریاستوں کو بھارت کے ساتھ گلے شکوے تھے۔ جنرل ضیاء نے ان کے ساتھ قریبی اور گہرے تعلقات پیدا کئے۔ بھارت کو گھیرے میں لینے کے لئے آئی ایس آئی نے نیپال، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اس طرح پاکستان بھارت میں علیحدگی کی تحریکوں کی نگرانی بلکہ امکانی طور پر ان کی معاونت کے قابل ہو گیا۔ ان ممالک میں پاکستان کے خفیہ کارکن اس وقت زیادہ سودمند رہے جب جموں وکشمیر میں نسبتاً بڑی بغاوت کا آغاز ہوا۔ اس بغاوت کو پاکستان کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ضیاء الحق نے 1985ء میں برما کا دورہ بھی کیا اور برما کی اس فوجی حکومت کے ساتھ خصوصی تعلقات استوار کئے جو عالمی سطح پر تنہائی کا شکار تھی۔ وہ تعلقات آج تک مضبوط شکل میں موجود ہیں۔ 2000ء میں جنرل مشرف نے بھی برما کا دورہ کیا۔ یہ کسی پاکستانی سربراہ مملکت کا دوسرا دورہ برما تھا۔ ان تعلقات کی بنیاد باہمی تجارت نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس حکمت عملی کا حصہ تھے جس کے تحت بھارت کے ساتھ متصل ممالک میں خفیہ کاروائیوں کے لئے اڈے تلاش کئے جا رہے تھے۔

1980ء میں جب افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف بڑی خفیہ کاروائیوں میں آئی ایس آئی اور سی آئی اے حصہ دار بن گئے تو اس کے بعد جلد ہی پاکستان کی سرحد کے ساتھ واقع بھارتی صوبہ پنجاب میں تشدد کا آغاز ہو گیا۔ متعدد پیچیدہ مقامی وجوہ بھارتی پنجاب میں بغاوت کا باعث بنیں۔ مرکزی حکومت نے ریاستی سیاست میں اپنا رسوخ بڑھانا چاہا مگر بات ہاتھ سے نکل گئی۔ بھارتی حکام طویل سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ 1976ء اور 1980ء کے درمیانی عرصے میں پاکستان میں واقع اپنے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے جانے والے سکھ زائرین کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ رہی۔ 1947ء میں گروہی فسادات کے دوران سکھوں نے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اس وقت سے دونوں عقائد کے پیروکاروں کے درمیان تعلقات کی نوعیت تلخ چلی آ رہی تھی۔ ضیاء حکومت کے دوران سکھوں کے مذہبی مقامات کی بحالی اور تزئین کا کام زوروں پر رہا اور سکھوں کو ان کے مذہبی مقامات کی زیارت کی عام اجازت دیدی گئی۔ انگلستان اور شمالی امریکہ میں مقیم سکھ راہنماؤں نے سکھوں کے لئے ایک علیحدہ وطن "خالصتان" کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ ان میں سے اکثر زائرین کے طور پر پاکستان آئے۔ ان میں سے چند ایسے راہنما بھی تھے جن کا جنرل ضیاء الحق نے ذاتی طور پر استقبال کیا۔

پنجاب میں جب تشدد کی آگ بھڑکی تو بھارتی حکومت نے پاکستان پر الزام دھرا کہ وہ سکھ باغیوں کو تربیت اور اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔ آئی ایس آئی کے چیف جنرل اختر عبدالرحمان نے ایک بریگیڈئر کی سربراہی میں مشرقی پنجاب کی صورت حال کا تجزیہ کرنے کے لئے ایک ڈیسک تشکیل دیدیا۔ وہاں سکھ اپنی آزادی کی جدوجہد کا آغاز کر چکے تھے۔ عبدالرحمان کے ساتھی اس بات پر فخر کا اظہار کرتے تھے کہ بھارت نے مشرقی پنجاب میں فوج کی بھاری نفری بھی تعینات کر دی پھر بھی سکھ سارے صوبے میں بغاوت کی آگ بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ "کسے ہلاک کرنا ہے؟" "بم کہاں نصب کرنا ہے؟" اور "کس دفتر کو ہدف بنانا ہے؟"۔

ضیاء الحق نے صاف انکار کر دیا کہ سکھوں کی بغاوت میں پاکستان نے ان کی حمایت کی یا اس میں کوئی کردار ادا کیا۔ انہوں نے بھارت کے ایک نیوز میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا "یہ الزامات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں"۔ وہ مصر تھے کہ "پاکستان ایک ایسی ریاست ہے جو میکیاولی کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتی"۔ لیکن اپنے اسی انٹرویو کے دوران پاکستان کے حکمران نے یہ ناقابل یقین بات کہہ دی کہ "آپ کا یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ پاکستان میں مجاہدین کو سی آئی اے مسلح کر رہا ہے اگر ایسا ہے تو مجھے اس کا کوئی علم نہیں اور اگر یہ بات میرے علم میں نہیں تو سمجھیں کہ پاکستان کے راستے کوئی ہتھیار مجاہدین تک نہیں پہنچایا جا سکتا"۔ جنرل ضیاء نے یہ بات اس وقت کہی جب لاکھوں کروڑوں ڈالرز "سی آئی اے اور آئی ایس آئی" کی ان مشترکہ کاروائیوں پر خرچ کئے جا چکے تھے جو انہوں نے افغان مجاہدین کی مدد کے لئے کیں۔ اس وقت مجاہدین کو طیارہ شکن سٹنگر میزائلوں کے ساتھ مسلح کیا ہی جانے والا تھا۔ پاکستان نے بعد میں دہشت گردی کی حمایت سے مکمل انکار کی جو پالیسی اختیار کی۔ جنرل ضیاء کا مذکورہ بیان اس کی تمہید تھا۔

بھارت نے پنجاب میں بغاوت کوفرو کرنے کے لئے بے رحمانہ طریقے استعمال کیئے۔ انگلستان، امریکہ اور کینیڈا میں مقیم سکھوں نے ایک مضبوط لابی قائم کر لی جس نے انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر بھارت کے خلاف شدید تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن اس لابی نے سکھوں کے دہشت گرد حملوں کو کاملاً نظر انداز کر دیا۔ امریکہ اپنے سرد جنگ کے اتحادی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہذا بھارت نے سکھ بغاوت میں پاکستان کے ملوث ہونے کے جو ثبوت پیش کیئے امریکہ نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب روس افغانستان سے دست بردار ہو گیا اور امریکہ نے افغان مجاہدین کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا تو اس وقت امریکہ کو احساس ہوا کہ پاکستان سکھ باغیوں کا ممد و معاون تھا۔ 1991ء کے دوران مستقلاً ایسی قابل یقین رپورٹیں موصول ہوتی رہیں کہ پاکستان کشمیر کے ان جنگ جو گروہوں کو حمایت اور مدد فراہم کرتا رہا جو بھارت کے زیر انتظام کشمیر کے اندر دہشت گرد کاروائیوں میں مصروف تھے۔ علاوہ ازیں اس نے بھارتی پنجاب کے سکھ باغیوں کی مدد بھی کی۔ اس مدد میں اسلحے اور تربیت دونوں کی فراہمی شامل تھی"۔ اس رپورٹ کے بعد بھی سالانہ رپورٹوں میں سکھ باغیوں کے لئے پاکستانی حمایت اور مدد کا ذکر ہوتا رہا تاہم جب سکھوں کی بغاوت عروج پر تھی امریکہ نے بھارتی پنجاب میں ہونے والی دہشت گردی میں پاکستان کے کردار کو نظر انداز کیئے رکھا۔ اس سے پاکستانی حکام نے نتیجہ اخذ کیا کہ "امریکہ کی طرف سے اظہار تفکر نہیں بلکہ پاک امریکہ تعلقات میں گرمجوشی کی مقدار سے اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ بھارت میں جنگ جوؤں کو ملنے والی پاکستانی حمایت پر امریکہ کا ردعمل کیا ہے"۔

1984ء میں جب ایک سکھ محافظ نے بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو قتل کر دیا۔ تب پتہ چلا کہ پنجاب کی بغاوت میں کتنے خطرات مضمر تھے۔ تقریباً انہی دنوں پاکستان کا جنوبی صوبہ سندھ گروہی اور فرقہ وارانہ تشدد کی لپیٹ میں آ گیا۔ کراچی شہر کئی سالوں کے لئے اضطراب کا مرکز بن گیا۔ پاکستان نے کراچی میں ہونے والے پر تشدد واقعات کا ذمہ دار بھارت کی سمندر پار انٹیلی جنس سروس "را" کو ٹھہرایا۔ دونوں طرف سے اپنے ہی اقدامات کے ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کو ایک دوسرے کے سر تھوپا جانے لگا۔

1989ء تک پنجاب کی بغاوت میں کوئی ٹھہراؤ پیدا نہ ہوا۔ ادھر بھارت نے مشرقی پنجاب سے متصل پاک بھارت سرحد کے کچھ حصے پر باڑ لگا دی اور ادھر پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے پاک بھارت سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستانی اور بھارتی فوجیوں کی مشترکہ پٹرولنگ کی تجویز منظور کر لی۔ تب جا کر مشرقی پنجاب کی بغاوت کی شدت میں کمی واقع ہوئی۔ بعد ازاں تشدد کے اکا دکا واقعات ہوتے رہے۔ 1990ء کی دہائی کے وسط تک بغاوت تو ختم ہو گئی، تاہم مشرقی پنجاب میں امن کا مطلب یہ نہیں تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بھی امن قائم ہو گیا۔

مشرقی پنجاب اور دیگر علاقوں میں ابھرنے والی بغاوتوں نے بلاشبہ بھارت کی سلامتی کے لئے خطرات پیدا کر دیئے اور بھارت کی فوجی قوت کو اطاعت پذیر بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ پاکستانیوں کا خیال تھا کہ وہ جموں و کشمیر میں "دوقومی

نظریے" کے استقرار کو ثابت کردیں گے۔ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور یہ علاقہ تقسیم ہند کے وقت سے متنازعہ چلا آرہا تھا۔ کشمیری بھارتی یونین کا حصہ بنکر خوش نہیں تھے۔ وہ 1947ء کے بعد پاکستان کی طرف سے معمولی سی اکساہٹ پر بھی 1947ء میں ہونے والے اپنی ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کو وقفے وقفے سے چیلنج کرتے رہے۔ کشمیر کے سیاسی عمل کو نئی دہلی میں بڑی احتیاط سے مرتب کیا جاتا تھا۔ اس بھارتی احتیاط نے کشمیریوں کے لئے جمہوریت کے ثمرات کو محدود کردیا۔ پاکستانی جرنیلوں اور ان کے اسلام پسند اتحادیوں کے خیال میں امریکیوں کی مدد سے افغانستان میں جہاد کا جو تجربہ حاصل ہوا تھا۔ اس کی منتقلی کے لئے کشمیر موزوں ترین جگہ تھی۔

1984ء میں جنرل ضیاء الحق کے احکامات پر آئی ایس آئی نے کشمیر کے لئے ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جس کی پختگی 1991ء میں متوقع تھی۔ افغانستان کے برعکس جہاں آئی ایس آئی نے ہر مجاہد کو تربیت دی تھی۔ کشمیر کے باغیوں کے لئے طے کیا گیا کہ ابتداء میں صرف باغی گروپوں کے سربراہوں اور تربیت کاروں کو تربیت دی جائے گی۔ بااثر راہنماؤں سے امید کی گئی کہ وہ بددل نوجوان کشمیریوں کو بھرتی کر کے گوریلوں کے گروہ تشکیل دیں گے۔ جنرل ضیاء الحق کے ذہن میں وہی طریق کار تھا جو افغانستان میں روسی مداخلت سے قبل ان سالوں کے دوران اپنایا گیا جب برہان الدین ربانی اور گلبدین حکمت یار کو پاکستان میں بیس فراہم کی گئی اور نظریاتی تربیت اور مادی امداد کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ افغانستان میں "جمعیت اسلامی" اور "حزب اسلامی" کو منظم کرلیں۔

1980ء کی دہائی کے وسط میں جموں و کشمیر کی جماعت اسلامی اور سیکولر و وطن پرست "جموں اینڈ کشمیر لبریشن فرنٹ" (JKLF) کے نمائندوں کے ساتھ آئی ایس آئی کے افسران کی باقاعدہ اور تسلسل کے ساتھ ملاقاتیں ہوتیں رہیں۔ 1987ء میں جماعت اسلامی اور جے کے ایل ایف کے راہنماؤں کے ساتھ ایک خفیہ اجلاس کے دوران ضیاء الحق نے بذات خود اپنا وہ منصوبہ پیش کیا جس پر عملدرآمد کے نتیجے میں کشمیر پر بھارتی کنٹرول رفتہ رفتہ کمزور پڑ سکتا تھا۔ لیکن کشمیر میں بھارتی حکام کے انتظامی اعتبار سے بعض غلط اقدامات شدید بدامنی کا باعث بنے اور وہ دن جس کا آئی ایس آئی کو انتظار تھا۔ وقت سے پہلے آگیا اور پاکستان کو بھارتی مقبوضہ کشمیر کی بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق اقدام کرنا پڑا۔ کیونکہ جنرل ضیاء کے تجویز کردہ مرحلہ وار پروگرام پر عملدرآمد کے لئے وقت ہی نہیں رہ گیا تھا۔

1987ء میں کشمیر میں منعقد ہونے والے انتخابات کے دوران نئی دہلی اور اس کے کشمیری اتحادیوں نے ملکر دھاندلی کا ارتکاب کیا۔ تاکہ کشمیر میں بھارت کی اتحادی حکومت منتخب ہوجائے۔ دھاندلی سے جو فریق سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ جماعت اسلامی کی جموں و کشمیر ونگ کی سربراہی میں تشکیل دیا جانے والا ایک اسلامی اتحاد "مسلم یونائیٹڈ فرنٹ" (MUF) تھا۔ سری نگر اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے دیگر شہروں میں احتجاجی مظاہرے شروع ہوگئے۔ ابتداء میں مذکورہ مظاہروں میں کوئی غیر ملکی ہاتھ ملوث نہیں تھا۔ کشمیریوں کی اکثریت نے آزادی کو نعرے (حتیٰ کہ تکیہ کلام) کے طور پر اپنا

لیا۔ بھارت صورت حال کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نمٹا۔ باعث پاکستان کو ٹھہرایا اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر عالمی تنقید کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیا۔

1947ء میں بھارت نے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر کو دیگر بھارتی ریاستوں کے مقابلے میں خصوصی مقام دیا جائے گا لیکن عہد شکنی کے باعث کشمیریوں کے دلوں میں گلے شکوے پیدا ہوئے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پنپتے رہے۔ کشمیریوں کو کشمیری راہ نماؤں نے بھی نظر انداز کئے رکھا۔ مذکورہ وعدے کا ایفاء بھارت کی ذمہ داری تھی۔تلوین سنگھ کے خیال میں "نئی دہلی کی مذکورہ پالیسیوں نے وادی کشمیر کو شعلہ جوالا بنا دیا۔ ورنہ کشمیر کبھی مسئلہ کشمیر میں نہ بدلتا۔ ایک دن ایسا آتا کہ ہم تمام تنازعے فراموش کر دیتے لیکن اس کی بجائے ہوا کیا؟ 1980ء کی دہائی کے خاتمے تک وادی کشمیر بارود کا ڈھیر بن چکی تھی جس سے کشمیری راہنما شیخ عبداللہ اکثر و بیشتر خبردار کرتے رہتے تھے"۔

کشمیر میں بغاوت ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ جنرل ضیاء الحق اپنے نابغہ روزگار جرنیل اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن سمیت کئی کلیدی جرنیلوں کے ہمراہ ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے حوالے سے طے پانے والے جنیوا سمجھوتے کے بعد جنرل ضیاء جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ "کمیونسٹ توسیع پسندی" کے خلاف امریکی جدوجہد کے نتیجے میں افغانستان سے روسی فوج کی دست برداری کے ساتھ ہی پاکستان کا وہ کردار اختتام کو پہنچا جو وہ "فرنٹ لائن سٹیٹ" کے طور پر ادا کر رہا تھا۔ نتیجتاً پاکستان میں امریکہ کی دل چسپی کم ہو گئی۔ ان دنوں بعض ایسے محرکات یکجا ہو گئے جن کے نتیجے میں پاکستان جہاد کشمیر میں پہلے سے بھی زیادہ اور کھلم کھلا ملوث ہو گیا۔ اس طرح امریکی پابندیوں کو دعوت دیدی گئی اور فوجی حکومت میں اسلام پسندوں کے رسوخ میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ اپنی زندگی میں ضیاء الحق نے آرمی چیف اور صدر کے عہدوں کو یکجا کئے رکھا۔ اس عمل کے دوران انہیں چند ساتھیوں کی خفیہ مدد حاصل رہی۔ ضیاء الحق نے آہنی ہاتھوں سے پاکستان پر حکمرانی کی۔ ان کی مضبوط اور طاقتور حکومت نے آئی ایس آئی کو اس قابل بنا دیا کہ اس نے ملکی سیاست اور بیرونی کارروائیوں کو کنٹرول کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں کارکن۔ مخبر اور ٹھیکیدار بھرتی کر لئے۔ ضیاء الحق نے پاکستان کے متعدد اسلام پسند گروہوں اور شخصیات کے ساتھ ذاتی تعلق استوار کر لیا۔ انہوں نے ضیاء الحق کی اس اپیل پر لبیک کہا کہ ریاستی معاملات کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا۔ اس "لبیک" کے نتیجے میں جنرل ضیاء نے اپنی بعض خفیہ کارروائیوں کو چھپائے رکھا اور امریکہ اور بھارت کے ساتھ تعلقات بھی برقرار رکھے۔ کیونکہ ان کارروائیوں کا افشاء آخر الذکر دونوں کی ناراضگی کا سبب بن سکتا تھا۔

افغان جہاد میں پاکستان کے فیصلہ کن کردار نے امریکہ کو نہ صرف اقتصادی اور عسکری امداد دینے پر مجبور کئے رکھا بلکہ اس نے پاکستانی پالیسیوں کے کئی پہلوؤں سے بھی صرف نظر کیا۔ امریکہ نے صدر ضیاء کی "پین اسلامک" خواہشات کو اس وقت بھی نظر انداز کیا جب وہ واضح طور پر "مغرب مخالف سمت" اختیار کر گئیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ جنرل ضیاء سوویت یونین

کے خلاف امریکہ کے پرزور اور پرجوش اتحادی تھے۔ امریکی حکام نے اسلام پسندوں کے مغرب مخالف جذبات پر جو تبصرے کیئے وہ محض لفاظی تھی۔ ضیاء الحق کی بھارت پالیسی پر بھی واشنگٹن نے بہت کم توجہ دی۔ کیونکہ وہاں ایسے بھارت کے لئے ہمدردی کا فقدان تھا جو وسیع تر تناظر میں "روس نواز" تھا۔

ضیاء الحق کی موت کے بعد پاکستان بطور اتحادی امریکہ کے لئے کم اہم ہوگیا۔ پاکستانی فوج نے ایسی صورت حال کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کر رکھی تھی۔ ضیاء الحق کی موت کے بعد بھی جرنیل بیک وقت امریکی امداد کے خواہاں بھی رہے۔ بھارت دشمنی کو بھی انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور ساتھ ساتھ ان کی یہ خواہش بھی رہی کہ پاکستان کے اندر فیصلہ سازی پر فوجی تسلط اور برتری برقرار رہے۔ بھارت دشمنی اور علاقائی افضلیت و برتری کے حصول کی خواہشوں اور کوششوں میں اسلام پسند نظریہ پرست فوج کے قابل اعتماد اتحادی بنے رہے۔ پاکستان کی پالیسی کے جن عناصر کو امریکہ نے گزشتہ چند عشروں کے دوران برداشت یا ان سے صرف نظر کیئے رکھا وہی پاک امریکہ تعلقات میں جھلاہٹ کا باعث بن گئے۔ پاکستانی حکام نے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے امریکہ کو ناقابل اعتماد گردانناشروع کردیا۔ امریکہ نے ضیاء الحق کے دور میں پاکستان پر پابندیاں عائد کر کے بھی دیکھ لیا تھا جو ناکافی اور غیر موثر رہیں۔ ضیاء الحق کے بعد گیارہ سالوں کے دوران پاکستان کی سویلین یا فوجی قیادت میں جب بھی تبدیلی آئی۔ امریکہ نے امید باندھ لی کہ اس مرتبہ پاکستان کا موقف بھی تبدیل ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ جو اسلام پسندانہ حکمت عملیاں کئی عشروں تک ارتقاء کے مراحل سے گزرتی رہیں اور ضیاء کے دور حکومت میں خالص شکل میں سامنے آئیں۔ پاکستان نے ان سے ذرہ برابر انحراف نہ کیا۔

ضیاء الحق کی موت کے ساتھ ہی ان کی شخصی حکومت اپنے اختتام کو پہنچی۔ ان کے بعد پاکستان کی دفاعی پالیسیوں کے سیاق وسباق تو بدلے۔ متن میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ صدر اور آرمی چیف کے عہدوں پر دو الگ الگ شخصیتیں براجمان تھیں۔ صدر غلام اسحٰق خان تھے اور آرمی چیف کا عہدہ جنرل اسلم بیگ کے پاس تھا۔ دونوں یکساں خیالات کے حامل تھے۔ پھر بھی بعض حکمت عملی پر مبنی معاملات میں اختلاف رائے ناگزیر ہو جاتا تھا۔ 1988ء کے عام انتخابات کے بعد منتخب وزیراعظم کے طور پر بے نظیر بھٹو بھی اس منظر میں داخل ہو گئیں۔ اب اس منظر کو ملکی اقتدار اور اختیارات کی کشمکش کے بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور نسبتاً آزاد میڈیا نے ضیاء دور کے بعض ایسے معاملات کو دشوار تر بنا دیا جن میں یا تو انتہائی رازداری برتی گئی تھی اور یا پھر بعض حقائق سے صاف انکار کر دیا گیا تھا۔ ملکی سلامتی کے شعبے نے ردعمل کا اظہار کیا اور مخالف "پاور سنٹرز" کو اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دے لیا۔ پاکستان کی مبینہ اور حقیقی پالیسیوں میں خلاء بڑھتا چلا گیا۔ مثلاً صدر یا وزیراعظم عالمی سفارت کاروں سے کوئی اور وعدہ کر لیتے تھے جبکہ فوج اور دفاعی شعبہ کسی اور طرف چل پڑتے تھے۔ فوج کے لئے اپنے کچھ فیصلوں کو سویلین راہنماؤں کے سر تھوپنا اور آئی ایس آئی کے لئے اپنی خفیہ کاروائیوں پر سے عوامی توجہ ہٹانا ممکن ہوگیا۔

بے نظیر بھٹو افغانستان اور بھارت کے بارے میں جن پالیسیوں کو ترجیح دیتی تھیں۔ وہ فوج کی پسندیدہ پالیسیوں سے مختلف تھیں۔

"بے نظیر بھٹو افغانستان کے معاملات کو مذاکرات کے ذریعے نمٹانا چاہتی تھیں جبکہ فوج اور آئی ایس آئی کی خواہش تھی کہ مجاہدین کابل کی کمیونسٹ حکومت کو میدان جنگ میں شکست دینے کے قابل ہو جائیں۔ وہ کشمیری بغاوت کے لئے بھی اپنی حکومت کی حمایت کو اعتدال پر لانا چاہتی تھیں۔ لیکن اس زعم میں کہ اب بھارت کے مقابلے میں اس کی صلاحیت میں اضافہ ہو چکا ہے۔ فوج کی خواہش تھی کہ کشمیر میں بغاوت کے شعلے مزید بھڑکیں۔ فوج بے نظیر کی وکالتوں کو حب الوطنی کی نفی خیال کرتی تھی"۔

فوج نے آئی ایس آئی کی مدد سے اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) تشکیل دیا تھا تاکہ بے نظیر بھٹو کی راہ روکی جا سکے اور وہ اس سٹریٹیجک سمت کے خلاف وکالت نہ کر سکیں جو فوج نے اپنا رکھی تھی۔ آئی جے آئی کی سیاسی قیادت قدامت پسند سیاستدانوں پر مشتمل تھی جن میں اکثر (روایتی) اسلام پسند نہیں تھے۔ اس کا نظریہ آئی ایس آئی اور جماعت اسلامی نے تشکیل دیا۔ اسلام پسند بھٹو کی پی پی پی پر طنز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ "تم نے ڈھاکہ کھو دیا۔ ہم نے کابل حاصل کر لیا"۔ حالانکہ یہ جنگ جویانہ نعرہ تاریخی اعتبار سے غلط تھا۔

پاکستان کو ایٹمی اسلحے کی حامل ریاست ڈیکلئر کرنے، بھارت اور امریکہ کی کھلم کھلا مخالفت اور کشمیری مجاہدین کی کھلم کھلا حمایت کے مطالبات آئی جے آئی کی پرشور انتخابی مہم کا حصہ تھے۔ بالآخر بے نظیر بھٹو نے 2 دسمبر 1988ء کو اقتدار سنبھالا تو انہیں افغان جنگ کے جلد خاتمے کی کوشش، بھارت کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر امریکی حدود و قیود کو قبول کرنے کے اختیارات حاصل نہیں تھے۔ آئی جے آئی میں شامل اسلام پسند اور فوج ملکر مصروف عمل تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ اور ان کے انٹیلی جنس چیف لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کی تجویز کردہ پالیسیوں کو میڈیا اور گلی کوچوں میں ہونے والے مظاہروں کے توسط سے آئی جے آئی کی حمایت حاصل تھی۔ اسلام پسند فوجی حکمت عملی کو قوت محرکہ بہم پہنچا رہے تھے اور یہ تاثر پیدا کرنے میں مصروف تھے کہ رائے عامہ افغانستان اور کشمیر میں جہاد کے حق میں ہے۔

1989ء کے اواخر تک بے نظیر بھٹو اسلام پسندوں کے حملوں کی زد میں آ چکی تھیں۔ دیگر الزامات کے علاوہ ان پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ بھارت کے لئے نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ اس الزام نے انہیں بھارت کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششیں عملاً ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ مذاکرات کے جس عمل کا آغاز بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے مختصر دورہ اسلام آباد کے دوران ہوا تھا وہ کشمیر میں بگڑتی ہوئی صورت حال کے باعث جزوی طور پر پہلے ہی تعطل کا شکار ہو چکا تھا۔ اس وقت تک سڑکوں پر ہونے والے متشدد مظاہرے اور بھارتی حاکمیت کی علامتوں پر مسلح جنگ جوؤں کے حملے کشمیر کی

روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ پاکستان کے زیرانتظام کشمیر جسے آزاد کشمیر کہا جاتا ہے، کے حکام نے رپورٹ دی کہ بھارتی فوج اور نیم فوجی فورسز کی منتقمانہ کاروائیوں سے بچ بچا کر مقبوضہ کشمیر سے پناہ گزین آزاد کشمیر پہنچ چکے ہیں۔

بے نظیر بھٹو کو آئی ایس آئی نے مطلع کیا کہ وہ جموں وکشمیر کی متنازعہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے رائے شماری کا مطالبہ کرنے والے مقامی کشمیری گروہوں کو کچھ امداد فراہم کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے پناہ گزینوں کی بحالی اور کشمیریوں کے ایماء پر عالمی میڈیا میں اور حکومتوں کی سطح پر مہم چلانے کے لئے فنڈز کی منظوری دیدی۔ ایک تو پاکستان کے اندر کشمیر کے متعلق شدید جذبات موجود تھے دوسرے ان پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ وہ بھارت کے لئے نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ اندریں حالات اپوزیشن کی تنقید پر قابو پانا ان کی سیاسی ضرورت بن گیا اور ممکن ہے اس سیاسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وہ کشمیری جنگ جو گروہوں کو مادی امداد فراہم کرنے پر بھی رضامند ہو گئی ہوں۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے 4 فروری 1990ء کو تمام سیاسی جماعتوں کا اجلاس طلب کر لیا تا کہ کشمیر پر قومی اتفاق رائے حاصل کیا جا سکے۔ یہ قدم اٹھانے کے بعد انہوں نے امید باندھ لی کہ اگر ان کے سیاسی حریفوں نے کشمیر پالیسی کے حوالے سے ان کی حکومت کے لئے کوئی دشواری پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ اس پر قابو پالیں گی۔

لیکن آئی ایس آئی اور اس کا سیاسی محاذ آئی جے آئی کشمیریوں کے احتجاج اور وزیراعظم کی طرف سے انہیں ملنے والی حمایت سے بہت آگے نکل گئے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت کے عدم استحکام کو واضح مقصد کے طور پر اپنا لیا۔ آئی ایس آئی نے ان گوریلوں کے لئے تربیتی کیمپوں کے قیام کے عمل کو تیز کر دیا جنہیں حصول تربیت کے بعد بھارتی مقبوضہ کشمیر کے اندر مسلح بغاوت کا بیڑہ اٹھانا تھا۔ آئی جے آئی کے راہنما نواز شریف نے کشمیریوں کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کے لئے ملک گیر عام ہڑتال کی کال دیدی۔ اقبال اخوند جو امور خارجہ پر بے نظیر بھٹو کے مشیر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کاوشوں کو مندرجہ ذیل پیرائے میں بیان کیا ہے جو آئی جے آئی نے کشمیر کاز کا چیمپئن بننے کے لئے کیں۔

"اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے ایک اور رکن اسمبلی شیخ رشید نے ایک نام نہاد تربیتی کیمپ کے قیام اور ایسے رضا کاروں کی بھرتی کا اعلان کر دیا جنہیں رہائش" خوراک اور تربیت فراہم کی جائے گی۔ حکومت کے لئے وہ اعلان ایک چیلنج بن گیا۔ اگر شیخ رشید کو روکنے کی کوشش کی جاتی تو بے نظیر پر الزام آتا کہ انہوں نے بھارتی تسلط اور اجارہ داری کو قبول کر لیا اور اگر کچھ بھی نہ کیا جاتا تو دنیا پاکستان کو دہشت گردوں کی پناہ گاہ سمجھنا شروع کر دیتی۔ مختلف اور متنوع گروہوں نے احمقانہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لائن آف کنٹرول (جنگ بندی لائن) کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ جس دن نواز شریف نے ہڑتال کی کال دی۔ اسی دن 4000 طلباء کارکنوں اور کسانوں وغیرہ پر مشتمل گروہ نے جسے جماعت اسلامی کے مقررین نے اشتعال دلایا۔ سیالکوٹ کے قریب لائن آف کنٹرول پار کرنے کے لئے سفر کا آغاز کر دیا۔ ان میں سے کچھ نے پاکستانی پرچم تھام رکھے تھے اور چاہتے تھے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی جھنڈے اتار کر وہ انہیں لہرا دیں گے۔

پہلی کوشش پر ہی اس ہجوم اور بھارت کے سرحدی گارڈز کا آمنا سامنا ہو گیا۔ پاکستانی پرچم چھین لئے گئے اور لڑکوں کو لائن آف کنٹرول سے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ ہجوم دوبارہ اکٹھا ہوا اور لائن آف کنٹرول پار کرنے کی ایک کوشش کی۔ بھارتیوں نے ردعمل کے طور پر ہوائی فائرنگ کی۔ تیسری کوشش کے دوران ہجوم پر براہ راست فائرنگ کی گئی۔ ایک لڑکا جاں بحق جبکہ ایک درجن کے قریب زخمی ہو گئے۔ جن میں سے کچھ شدید زخمی ہوئے۔ 6 دن بعد اری کے نزدیک پھر لائن آف کنٹرول کو عبور کرنے کی کوشش کے دوران بھارتی فائرنگ کے نتیجے میں 6 اموات وقع ہو گئیں۔

پاکستان کے اندر ہونے والے احتجاجی مظاہروں نے ثابت کر دیا کہ آئی جے آئی نے خود کو کشمیر کی آزادی کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ بے نظیر بھٹو کو بھی رویہ سخت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ کئی مہینوں تک کشمیر کی آزادی اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت پر بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان بیانات کا مقابلہ ہوتا رہا۔ بے نظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے انداز کو جنگ جویانہ خیال کیا جائے۔ اگرچہ پالیسی سازی اور پالیسی پر عملدرآمد ان کے دائرہ اختیار میں نہیں تھے۔ تاہم ان کے بیانات کو سرکاری موقف یا سرکاری پالیسی کا درجہ حاصل تھا۔ راجیو گاندھی کے جانشین وزیر اعظم بھارت وی پی سنگھ نے بے نظیر بھٹو کو تنبیہاً کہا کہ "اگر جنگ شروع ہو گئی تو وہ کشمیر تک محدود نہیں رہے گی"۔ پاکستان کے اندر کشمیر کے متعلق جو شدید جذبات متشکل ہو رہے تھے ان پر کسی ردعمل کا اظہار کرنا بے نظیر بھٹو کی (سیاسی) ضرورت تھی۔ لیکن انہیں اس امر کا بھی ادراک تھا کہ پاک بھارت تعلقات میں کھنچاؤ کی شدت کو کم کرنا بھی انہی کی ذمہ داری تھی۔ دوسری طرف نواز شریف کی راہ میں ایسی کوئی سوچ حائل نہیں تھی۔ اپنے اسلام پسند اتحادیوں کی شہ پر وہ بھارت کے ساتھ حساب چکانے کی باتیں جنگ جویانہ انداز میں کرتے تھے۔ اس دوران جماعت اسلامی نے فنڈز اکٹھے کئے اور رضا کاروں کو کشمیر میں جہاد کی تربیت دینا شروع کر دی۔ رضا کاروں میں کشمیری اور پاکستانی دونوں شامل تھے۔

اگست 1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کی معزولی اور تین ماہ بعد بطور وزیر اعظم نواز شریف کے انتخاب نے کشمیر میں جنگ جوئی کی مزید اور کھلم کھلا حمایت کی راہ ہموار کر دی۔ اگرچہ پارلیمنٹ میں نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ کے مقابلے میں جماعت اسلامی کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ تاہم آئی جے آئی کا حصہ ہونے کے ناطے وہ حکمران اتحاد میں شامل تھی۔ 1990ء میں ہونے والے انتخابات کی مہم کے دوران نواز شریف نے کشمیر کو آزاد کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ لہذا نہوں نے وزیر اعظم بننے کے بعد اپنے اتحادیوں کو عام اجازت دیدی کہ وہ بھارت کی تباہی کی باتیں سر عام کریں۔ آئی جے آئی کی انتخابی ریلیوں کے دوران نواز شریف اس بناء پر بے نظیر بھٹو کو "سیکیورٹی رسک" قرار دیتے رہے کہ انہوں نے کشمیر میں بھارت کے خلاف خفیہ کارروائیوں کی تسلی بخش اور کافی حمایت نہیں کی تھی۔ نواز شریف نے بے نظیر بھٹو پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ آخر الذکر نے بھارتی پنجاب میں مصروف عمل پاکستان کے ایجنٹوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دی تھیں۔ انتخابی مہم کے دوران نواز شریف نے یہ بھی کہا کہ بے نظیر نے پاکستان کا ایٹمی پروگرام امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

لیکن اپنی نجی محفلوں میں نواز شریف اپنے مشیروں سے کہا کرتے تھے کہ بھارت کے ساتھ حصول امن کا عمل شروع ہونا چاہئے تا کہ پاکستان کی معاشی ترقی ممکن ہو جائے۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران بھارت کے لئے سخت لہجہ رکھنے کے باوجود نواز شریف خواہش رکھتے تھے کہ بھارتی صحافی ان سے انٹرویو کریں۔ وہ ان صحافیوں کے ساتھ "آف دی ریکارڈ" گفتگو بھی کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی گفتگو بھارتی راہنماؤں تک پہنچے اور انہیں بتایا جائے کہ نواز شریف نے اقتدار میں آنے کے بعد "خاموش سفارت کاری" پر رضا مندی کا اظہار کیا ہے۔

پاکستانی فوج نے 1988ء اور 1990ء میں ہونے والے انتخابات کے دوران نواز شریف کی مکمل حمایت کی۔ فوج چاہتی تھی کہ اس کے سیکیورٹی ایجنڈے کو عوامی حمایت یافتہ خیال کیا جائے۔ 1990ء کے انتخابات میں آئی ایس آئی نے آئی جے آئی کو فنڈز اور مشاورت فراہم کئے رکھی۔ انتخابات کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے دیگر ناقدین نے الزام عائد کیا کہ آئی ایس آئی نے انتخابات کو "چرانے" میں نواز شریف اور آئی جے آئی کی مدد کی۔ بعد میں جنرل بیگ اور آئی ایس آئی کے اس دور کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل اسد درانی نے عدالت عظمیٰ کے روبرو تسلیم کیا کہ آئی ایس آئی نے آئی جے آئی کی انتخابی مہم کے دوران آخر الذکر کو سرمایہ فراہم کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے فوج کے ذریعے پارلیمانی انتخابات پر اثر انداز ہو کر قانون کی صریحاً خلاف ورزی کی تاہم پاکستانی جرنیلوں نے دعویٰ کیا کہ ان کا وہ فعل قومی مفاد میں تھا۔

بطور وزیر اعظم نواز شریف کے دور اقتدار میں سے تقسیم واضح طور پر جھلکتی رہی۔ ایک طرف نواز شریف کی خواہش تھی کہ ان کی پالیسیاں معاشی ترقی پر مرتکز رہیں اور دوسری جانب انہوں نے فوج سے سمجھوتہ کر لیا کہ آخر الذکر کو قومی دفاع کے معاملات میں فری ہینڈ حاصل رہے گا۔ نواز شریف نے آئی ایس آئی کو اجازت دیدی کہ وہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں باغیوں کی حمایت اور مدد میں اضافہ کر دے۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوامی سطح پر انہیں امریکہ مخالف راہنما سمجھا جائے۔ جنرل بیگ ان کے "امریکہ مخالف" تاثر کو مفید سمجھتے تھے۔ نواز شریف نے مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے درمیان پیدا ہونے والے تعطل کو ختم کرنے کے لئے "بیک چینل ڈپلومیسی" کا توسط بھی استعمال کیا۔ مثلاً 1991ء میں دورہ تہران کے دوران انہوں نے ایک ایرانی صحافی کو بتایا کہ اگر بھارت یہ موقف ترک کر دے کہ مسئلہ کشمیر پر مذاکرات ہو ہی نہیں سکتے تو پاکستان "ایک آزاد کشمیر" کے متبادل پر غور کرنے پر بھی رضا مند ہے۔ اگرچہ نواز شریف اس "پیش کش" پر اپنی وزارت خارجہ کے ساتھ مشاورت کر چکے تھے۔ تاہم آئی ایس آئی نے تفکر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس پیش کش سے پاکستانی موقف کی کمزوری جھلکتی ہے۔ اس پر نواز شریف 24 گھنٹوں کے اندر اپنی پیش کش سے منحرف ہو گئے۔

ان ایام میں جماعت اسلامی اس لائن کی سختی سے پیروی کرتی رہی جو جنرل بیگ نے عوامی سطح پر اور آئی ایس آئی نے بین الحکومتی مباحث میں اپنا رکھی تھی۔ جماعت اسلامی کے خیال میں پارلیمنٹ میں اس کی نمائندگی کے کم حجم کے باوجود اسے نواز شریف حکومت کی پالیسیاں متشکل کرنے کا استحقاق حاصل تھا کیونکہ آئی جے آئی کی انتخابی فتح کی شکل میں عوام نے

اسلام پسندوں کے فلسفہ زندگی کو مینڈیٹ فراہم کر دیا تھا۔ لہذا جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے متعدد معاملات پر نواز شریف سے برملا اختلاف کیا۔ کویت کو عراقی قبضے سے نجات دلانے کے لئے جنگ کا موضوع خصوصی وجہ اختلاف بنا۔ جماعت اسلامی اور دیگر اسلام پسندوں نے عراق کے حق میں مظاہرے شروع کر دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس خطے میں امریکی فوج آ گئی تو مسلمانوں کی مرکزی سرزمین امریکی استعمار کی زد میں آ جائے گی۔

اتفاق ملاحظہ ہو کہ امریکہ کے خلاف عراق کو ملنے والی اسلام پسندوں کی حمایت آرمی چیف مرزا اسلم بیگ کے اس موقف سے ہم آہنگ تھی جو انہوں نے عوامی سطح پر اپنا رکھا تھا۔ پاکستانی رائے عامہ کا رجحان بھی عراق کے حق میں تھا۔ عوام صدام حسین کے لئے پر جوش حمایت کا اظہار کر رہے تھے۔ 28 جنوری 1991ء کو مرزا اسلم بیگ نے پاکستانی افسران سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خلیجی جنگ دراصل "صیہونی حکمت عملی" کا حصہ تھی۔ جنرل بیگ چاہتے تھے کہ ایران۔ عراق اور پاکستان جیسی اوسط درجے کی قوتیں چین کی مدد سے امریکہ کے احکامات یا ہدایات کے خلاف "سٹریٹیجک عدم تعمیل" کی راہ اپنائیں۔ ان کے خیال میں ایسی "سرتابی" چھوٹے ممالک کی اقتدار اعلیٰ کی محافظ ثابت ہوگی۔ بعد ازاں پروفیسر خورشید احمد کا جماعت اسلامی کے جریدے۔ "ترجمان القرآن" میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں سٹریٹیجک عدم تعمیل" کی وضاحت پیش کی گئی۔ پروفیسر خورشید احمد نے اس مضمون میں لکھا کہ جس "نیو ورلڈ آرڈر" کی امریکہ خواہش رکھتا ہے وہ "پاکستان۔ اسلامی احیاء اور امت مسلمہ" کے لئے نقصان دہ تھا۔ امریکہ کے یک محوری تسلط کے چیلنج سے نمٹنے کے لئے اسلام پسندوں نے جو نسخہ تجویز کیا وہ مسلمان ممالک کا اتحاد تھا۔ مزید براں وہ چاہتے تھے کہ امریکہ کے خلاف موثر ایکشن کے لئے دیگر امریکہ مخالف ملکوں کو بھی ساتھ ملا لیا جائے۔

اسلام پسندوں اور آرمی چیف کے نظریات کے باہمی انطباق کے باوجود نواز شریف کی امریکہ کی حمایت پر مبنی پالیسی غالب رہی۔ اگر چہ جوہری معاملات کے ضمن میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان اختلافات جنم لے چکے تھے اور اس حوالے سے آخر الذکر کو دشواریاں بھی درپیش تھیں۔ تاہم پاکستانی جرنیل امریکہ سے تعلق منطقع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ صدر غلام اسحٰق خان اور دیگر جرنیلوں کی شہ پر نواز شریف نے جنرل بیگ کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ سے دو ماہ پہلے ہی ان کے جانشین کے نام کا اعلان کر دیا۔

افغانستان میں روسیوں کے خلاف جنگ کے دوران پاکستان اور امریکہ کی فوجوں کے درمیان جو خصوصی تعلق پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو رہا تھا۔ امریکہ کے اندر یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ اداراتی طور پر پاکستانی فوج امریکہ کی اتحادی بننا اور رہنا چاہتی ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی اسلام پسندانہ جھکاؤ کا حامل جرنیل انفرادی کوشش کے ذریعے اسے مخالف سمت کا مسافر بنا دیتا ہے۔ 1991ء میں جب پاکستانی فوج کی کمان میں تبدیلی آئی تو پاک فوج اور امریکی فوج کے باہمی تعلقات بہتر ہو گئے۔ جنرل اسلم بیگ کے بعد آنے والے جنرل آصف نوز۔ جنرل عبدالوحید۔ جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل

مشرف بھی سرد جنگ کے دور کے جرنیلوں ایوب خان اور یحیٰی خان کی طرح مغرب نواز ہی رہے۔ تاہم ان میں سے کسی نے بھی جہادی پالیسیوں کی مخالفت نہ کی البتہ کبھی کبھار وہ اپنا دائرہ کار جنوبی ایشیاء سے آگے تک بڑھا لیتے تھے۔ جنرل بیگ کے بعد آنے والے جرنیل اول الذکر سے اس اعتبار سے مختلف تھے کہ وہ امریکہ کے خلاف گفتگو نہیں کرتے تھے۔ مزید براں وہ انٹیلی جنس کے حصول کے امریکی منصوبوں میں امریکہ کی مدد پر آمادہ رہتے تھے۔ پاکستان نہ تو اپنا جوہری پروگرام ترک کرسکتا تھا اور نہ ہی بھارت کو اس کی اوقات بتانے اور دکھانے کی کوششوں سے باز رہ سکتا تھا۔ تاہم پاکستانی جرنیل امریکہ کو ایسی سپر پاور خیال کرتے تھے جس کا پاکستان نے اپنی مرضی سے بطور سرپرست انتخاب کر رکھا تھا۔

پاکستان کا جوہری پروگرام 1989ء کے بعد پاک امریکہ تعلقات میں وجہ نزاع بن گیا۔ 1989ء تک پاکستان کا جوہری پروگرام امریکی کانگریس کی منظور کردہ پابندیوں سے محفوظ رہا۔ کیونکہ ریگن انتظامیہ پریسلر ترمیم کے تحت مطلوبہ سرٹیفکیٹ ہر سال جاری کر دیتی تھی کہ پاکستان کے پاس ابھی تک کوئی ایٹمی ہتھیار نہیں ہیں۔ (پریسلر ترمیم "غیر ملکی معاونت کے قانون مجریہ 1961" میں کی گئی تھی)۔ یا تو صدر امریکہ جانتے بوجھتے ہوئے ایک غلط سرٹیفکیٹ جاری کر دیتے اور یا پھر پاکستان پر پابندیاں عائد کر دیتے۔ امریکہ نے پاکستان کو تنبیہہ جاری کر دی کہ جب تک آخر الذکر اپنے جوہری پروگرام کو رول بیک کر کے ابتدائی مرحلے پر نہ لے جائے۔ امریکی صدر کے لئے کانگریس کو مطلوبہ سرٹیفکیٹ جاری کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ ڈینس ککس کے الفاظ میں "1990ء تک امریکہ پاکستان کو مسلسل خبردار کرتا رہا کہ مستقبل میں اس کے لئے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن بالآخر پاکستان کو سزا دینے سے اجتناب کے لئے خود ہی کوئی راستہ نکال لیتا رہا"۔ جب صدر امریکہ جارج ایچ ڈبلیو بش نے سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا اور پابندیاں عائد کر دیں تو پاکستان کو یکم اکتوبر 1990ء کو ملنے والی امداد روک لی گئی۔ اس پر اسلام آباد نے ردعمل کے طور پر "بے یقینی۔ حیرانی اور غصے" کا اظہار کیا۔

جوہری ہتھیاروں کی تیاری کی صلاحیت کے حصول کے بعد پاکستان دہلیز عبور کر چکا تھا۔ اب امریکی پابندیوں کو دعوت دیئے بغیر اپنا جوہری پروگرام جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ پاکستان نے یہ نہ سوچا کہ پاک امریکہ تعلقات میں کشیدگی کا باعث پاکستان کی عہد شکنی تھی۔ بلکہ پابندیوں کے نفاذ کو امریکہ کی طوطا چشمی کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ پاکستانی حکام کا خیال تھا کہ جب تک امریکہ کو روس کے خلاف جنگ کے دوران افغانستان میں پاکستان کی ضرورت رہی۔ اس نے آخر الذکر کی طرف سے اپنے ملکی قانون کی خلاف ورزی کو برداشت کیئے رکھا۔ اب چونکہ افغان جنگ میں روسیوں کی دست برداری کے بعد امریکہ کی دل چسپی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ لہذا پاکستان کا جوہری پروگرام اس کی آنکھ میں کھٹکنے لگا۔ ایک اردو ہفت روزہ "آواز" سے انٹرویو کے دوران 1993ء میں جنرل بیگ نے کہا تھا "امریکہ ہر سال ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتا رہا کہ پاکستان اپنے جوہری پروگرام میں ایک مخصوص لائن سے آگے نہیں بڑھا۔ لیکن جونہی افغانستان میں روس کو شکست ہوئی۔ صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی"۔

اس مخصوص حوالے سے پاکستان اور امریکہ کے جو بیانات منظر عام پر آئے۔ ڈینس لکس نے ان کی ممکنہ وضاحت پیش کرتے ہوئے لکھا۔

"امکان غالب یہی ہے کہ پاکستانی بناوٹ کر رہے تھے اور جیسا کہ امریکی الزام عائد کرتے ہیں انہوں نے بم پر دوبارہ کام 1990ء میں ہی شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایٹمی صلاحیت اس سے پہلے ہی حاصل کر لی گئی ہو۔ (پاکستان یہی دعویٰ کرتا ہے) لیکن اس بارے امریکی تجزیہ نگار 1990ء تک کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ کیونکہ انٹیلی جنس کے اندازاے خفیہ ذرائع سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی تھے۔ لہذا وقت کے تعین میں فرق نا قابل وضاحت نہیں"۔

جو چیز پاکستان کے بیان کو قابل اعتبار بناتی ہے وہ پاکستان کے جوہری سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا انٹرویو ہے جو بھارتی صحافی کلدیپ نیّر نے ان سے 1987ء میں کیا۔ انٹرویو کے دوران ڈاکٹر خان نے کہا کہ پاکستان ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر خان نے کہا "امریکہ کو معلوم ہے سی آئی اے نے ہمارے بم کے متعلق جو کچھ کہا۔ یا غیر ملکی اخبارات نے جن شبہات کا اظہار کیا وہ سب درست تھے۔ انہوں نے کہا تھا پاکستان کبھی ایٹم بم نہیں بنا سکے گا۔ انہیں میری صلاحیتوں پر شک تھا۔ اب ہم نے کر دکھایا ہے"۔ اسی انٹرویو کے دوران ڈاکٹر قدیر خان نے کہا کہ ان کی لیبارٹریوں میں اعلیٰ وافزودہ یورینیم کو 90 فیصد تک افزودہ کر لیا ہے اور جوہری اسلحے کی تیاری کے پروگرام میں درکار ساز و سامان کی خریداری کے لئے ضروری تھا کہ پاکستان امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی عائد کردہ پابندیوں سے بچا رہے۔

ڈاکٹر خان سے یہ انٹرویو 1987ء میں کیا گیا۔ انہی دنوں بھارت نے بہت بڑی اور جسیم جنگی مشقوں کا آغاز کر دیا جن کا نام "آپریشن براس ٹیک" رکھا گیا۔ پاکستان نے بھارت کو دھمکی آمیز انداز میں متنبہ کیا کہ اگر وہ مشقیں پاکستان کی سرحد کے ساتھ (کسی جگہ) حقیقی فوجی کاروائی میں بدلیں تو شدید رد عمل کا اظہار کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خان کے انٹرویو کی اشاعت سے چند دن بعد ہی پاکستان کی وزارت خارجہ نے ایسے کسی انٹرویو کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔ اس انکار کا واضح مقصد امریکی پابندیوں کے بے تحاشا اور ناروا بوجھ سے بچنا تھا۔ حالانکہ کلدیپ نیر پاکستانی مدیر مشاہد حسین کی موجودگی میں ڈاکٹر خان سے ملے تھے اور فوج نے انٹرویو کی باقاعدہ اجازت دی تھی۔ لیکن امریکہ نے اس انٹرویو کو جان بوجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور ریگن انتظامیہ نے بھی اس سے بے خبری کا تاثر دیا۔ ظاہر ہے افغانستان میں روسیوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ان دنوں نسبتاً کہیں زیادہ اہم تھی اور پاکستانی ایٹم بم کے خالق کے بیانات یا دعووں کو بآسانی ان کی "اکڑفوں" پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر خان نے اپنے جس انٹرویو میں پاکستان کے پاس ایٹمی اسلحے کی موجودگی کی برملا تصدیق کی، صدر ریگن اس کے بعد مسلسل دو سال سرٹیفکیٹ جاری کرتے رہے کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صدر ریگن نے اسی نوعیت کا ایک سرٹیفکیٹ 1989ء میں بھی جاری کیا تاہم پاکستان میں امریکی سفیر رابرٹ اوکلے کے توسط سے واضح کر دیا کہ اگر پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام ایک خاص سطح پر جامد نہ کیا تو آئندہ ایسے کسی سرٹیفکیٹ کا اجراء ممکن نہیں ہوگا۔

1990ء میں ایٹمی پھیلاؤ کے حوالے سے پابندیوں کے نفاذ کے بعد جلد ہی آئی ایس آئی نے ایک "اندازہ رپورٹ" تیار کی کہ امریکہ پاکستان کو کس حد تک سزا دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ رپورٹ سنیئر فوجی کمانڈروں اور جی ایچ کیو میں خدمات سرانجام دینے والے جرنیلوں کے ساتھ زیر بحث لائی گئی۔ مذکورہ اندازہ رپورٹ سے نتیجہ اخذ کیا گیا کہ امریکہ جوہری مسئلے پر پاکستان پر دباؤ تو ڈالنا چاہتا تھا اور اس دباؤ کے نتیجے میں پاک امریکہ تعلقات بھی متاثر ہو سکتے تھے لیکن مستقلاً نہیں۔ عارضی طور پر اور مختصر عرصے کے لئے۔ پاکستانی حکام نے ایک اور نتیجہ بھی اخذ کیا۔ کہ امریکی دباؤ اور اس دباؤ کے نتیجے میں پاک امریکہ تعلقات میں متوقع عارضی کشیدگی بھارتی اور صیہونی لابیوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ آئی ایس آئی کے قائم کردہ اندازے کے مطابق اگر پاکستان امریکی مطالبات کے سامنے سرِتسلیم خم کیے بغیر بھی امریکہ سے وابستہ رہتا تو تھوڑے ہی عرصے بعد آخرالذکر پاکستان کے ایٹم بم کو "نوشتہءتقدیر" سمجھ کر قبول کر لیتا۔ تاہم امید کی جارہی تھی کہ پابندیوں کا دورانیہ مختصر ہوگا۔ آئی ایس آئی کے خیال میں امریکی فوج اور انٹیلی جنس میں پاکستان کے لیے نیک خواہشات رکھنے والے حلقے بھی موجود تھے اور جہاں امریکہ کو پاکستان کا تعاون درکار ہو۔ وہاں تعاون پیش کر کے ان حلقوں کو برقرار رکھا جاسکتا تھا۔ اس دوران یہ تاثر دینا بھی ضروری تھا کہ پاکستانی معاشرے میں وسیع البنیاد امریکہ مخالف جذبات موجود ہیں۔ جنہیں وقتاً فوقتاً اسلام پسندوں کے مظاہروں کے ذریعے نمایاں کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح پاکستان کے فوجی اور انٹیلی جنس حکام کے لیے ان کے امریکی ہم منصبوں کے ذہنوں میں ہمدردی کے جذبات ابھر آتے کہ اول الذکر دشواریوں سے دوچار ہیں اور ملک کے اندر امریکہ کے لیے مخالفانہ جذبات کے باوجود وہ اس کی دوستی کو یقینی بنانے کی تگ ودو کر رہے ہیں۔

اندرونی سطح پر پاکستانی جرنیلوں اور سویلین حکام کے درمیان مباحث جاری تھے کہ کوئی ایسی حکمت عملی وضع کی جائے جس کے نتیجے میں پابندیوں سے بھی جان چھوٹ جائے اور افغانستان، ایٹمی اسلحہ اور کشمیر جیسے بنیادی قومی مفادات پر سمجھوتہ بھی نہ کرنا پڑے۔ جس طرح امریکی مقننہ نے پاکستان پر پابندیاں عائد کیں اور انتظامیہ نے کہہ دیا کہ اسے پاکستان کی دوستی درکار ہے۔ اسی طرح پاکستان نے بھی فیصلہ کیا کہ یہی کھیل کھیلے اور پاکستان کی حکومت کی مختلف شاخیں امریکہ کے بارے میں مختلف رویے تجویز کریں۔

امریکہ کے ساتھ نمٹنے کے لیے مجوزہ حکمت عملی کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے فوجی کمانڈر، انٹیلی جنس چیف اور وزیراعظم اپنی علیحدہ علیحدہ حیثیتوں میں امریکی حکام کے ساتھ رابطے رکھیں۔ تینوں کے موقف اور ترجیحات میں تھوڑا بہت فرق ہو۔ ہر ایک یہ تاثر دے کہ وہ دوسروں کی نسبت پاک امریکہ اختلافات کے خاتمے کی زیادہ خواہش رکھتا ہے۔ پالیسی میں معمولی ردوبدل کو بھی بڑے "بریک تھروز" کے طور پر اجاگر کیا جائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خلیجی جنگ کے دوران جنرل بیگ نے جو سخت زبان استعمال کی تھی۔ اس کی وضاحت پیش کرتے وقت کہا جائے کہ وہ ان کے ذاتی خیالات تھے۔ جو اقدامات امریکہ کی نظر میں قابل اعتراض ہوں انہیں اعلیٰ افسران کی ذاتی غلطیاں قرار دے دیا جائے۔ 1990 کی

دہائی میں پاکستان امریکہ کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت اسی حکمت عملی پر عمل کرتا رہا ہے اس طرح پابندیوں کو سنگین تر کرنے سے گریز کیا گیا اور پاکستانی پالیسی میں کسی قابل ذکر تبدیلی کے بغیر ہی امریکہ پر امید رہا کہ پاک امریکہ تعلقات میں بہتری آجائے گی۔

پاکستان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ پابندیوں کا دورانیہ مختصر ہوگا۔ تاہم اس کی یہ پیشین گوئی درست رہی کہ امریکہ پاکستان کو کسی قسم کی سزا دینے سے گریز کرے گا۔ امریکی صدر جارج ایچ ڈبلیو بش واقعتاً متاسف ہوئے کہ اب وہ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری نہیں کرسکیں گے۔ امریکی انتظامیہ نے پھر بھی پابندیوں کو اس امید پر موخر کئے رکھا کہ شاید اکتوبر 1990 میں منتخب ہونے والی حکومت جوہری مسئلے کا کوئی حل نکال لے۔ کانگریس کی طرف سے مخالفت بدستور غالب رہی۔ کانگریس کی دلیل یہ تھی اگر پاکستان کے لیے پابندیوں کا معیار نرم کردیا گیا تو جوہری پھیلاؤ کے حوالے سے دیگر ممالک بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ پاکستان کی شکل میں انہیں ایک نظیر میسر آجائے گی جس وقت پاکستان پر پابندیاں نافذ کی گئیں اس وقت وہ امریکی امداد سے استفادہ کرنے والا تیسرا بڑا ملک تھا۔ پاکستان کے اس احتجاج اور واویلے کے جواب میں کہ امریکی پابندیاں پاکستان کو ختم کرنے کے مترادف ہیں، امریکہ نے جاری منصوبوں کے لیے ایک ارب ڈالرز کی امداد بحال کردی۔ 3 سال امریکی پابندیوں پر عملدرآمد ہوتا رہا۔ اس دوران پاکستان کو اقتصادی امداد تو ملتی رہی لیکن وہ 3 کروڑ ڈالرز کے سالانہ اسلحے اور فوجی ساز وسامان سے محروم ہوگیا۔ پاکستان کو 1992 تک تجارتی بنیادوں پر عسکری ساز وسامان خریدنے کی اجازت بھی ملی رہی۔

امریکہ نے ابتداء میں پاکستان کو جھٹکہ دیکر باور کرانا چاہا کہ امریکہ کے ساتھ اس نے ایٹمی عدم پھیلاؤ کے جو وعدے کررکھے تھے۔ کسی صورت توڑنے نہیں دیئے جائیں گے اور نہ ہی وہ سزا سے مبرّا ہوگا۔ لیکن امریکہ پھر بھی اسے سزا دینے کی بجائے چاہتا تھا کہ کوئی اور حل نکل آئے۔ 6 فروری 1991 کو اسلام آباد میں امریکہ کے دفاعی نمائندے بریگیڈیر جان ہاور نے پاکستانی وزیر اعظم کے دفتر مین ایک اطلاعی دستاویز بھجوائی جس کے مطابق امریکہ پاکستان کے ساتھ فوجی تعاون میں تسلسل کا خواہاں تھا۔ اس اطلاعی دستاویز میں لکھا تھا:-

"اگرچہ پاکستان کے ساتھ دفاعی تعاون کا پروگرام شکوک وشبہات کی زد میں ہے تاہم ایک قلیل المیعاد پروگرام قابل عمل ہے اور اگر پاکستان کے ساتھ اختلافات ختم ہوگئے تو یہ پروگرام بہت اہم ہوجائے گا۔ حتیٰ کہ 10 کروڑ ڈالرز سالانہ کی کم سطح بھی فائدہ مند رہے گی۔ اہم اقدامات زیرغور ہیں۔ اگر امریکی حکومت نے کسی وجہ سے امداد کے تمام راستے بند کردیئے تو پاکستان کی مسلح افواج پر مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ امریکی حکومت اب تک ہر ممکن کوشش کرچکی ہے کہ پابندیوں کے نفاذ میں سختی سے کام نہ لے۔ نہ ہی اس نے پاکستانی سیاستدانوں اور اعلیٰ حکام کے امریکہ مخالف بیانات پر کسی ردعمل کا اظہار کیا ہے"۔

امریکہ نے ایٹمی پھیلاؤ کے ردعمل کے طور پر پاکستان پر پابندیاں تو عائد کر دیں لیکن عالمی مالیاتی ادارے یا عالمی بنک میں اس کے خلاف اپنا رسوخ استعمال کرنے سے گریز کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کو امریکی امداد کی بندش سے جو نقصان پہنچا عالمی مالیاتی اداروں سے قرض لیکر اسے کسی حد تک پورا کیا جا سکتا تھا۔ پریسلر ترمیم کے نتیجے میں پاکستان پر عائد کی جانے والی پابندیوں نے اسے نقصان تو پہنچایا لیکن اس نقصان کا حجم اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اسے اپنی پالیسی بدلنا پڑتی۔ البتہ بھارتی پنجاب اور کشمیر میں پاکستانی کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے امریکہ اگر پاکستان کو دہشت گردی کی سرپرست ریاست قرار دے دیتا تو پاکستان کو جامع تر پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ ابتداء میں جنگ جوؤں کو ملنے والی پاکستانی حمایت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بالآخر یہ معاملہ جب امریکہ کے سامنے آیا تو اس نے اپنی دھمکیوں کو امداد کی بندش سے منسلک نہ کیا۔

کیونکہ امریکی محکمہ دفاع کے ساتھ پاکستانی فوج کے تعلقات پریسلر ترمیم کے نتیجے میں عائد کی جانے والی پابندیوں پر عملدرآمد کر کے دوران بھی قائم رہے۔ پاکستانی جرنیلوں نے توقع باندھ لی کہ انہیں اپنی سیکیورٹی پالیسی کو بھی تبدیل نہیں کرنا پڑے گا اور امریکہ کے ساتھ دوستی بھی برقرار رہے گی۔ امریکی افواج کو سرد جنگ کے دور میں پاکستان سے ملنے والی مدد بخوبی یاد تھی اور اس نے پاکستانی فوج کو جدیدیت سے ہمکنار کرنے پر 1960ء کی دہائی میں بھاری سرمایہ کاری بھی کی تھی۔ امریکی انٹیلی جنس نے بھی پاکستان کے تعاون سے استفادہ کیا تھا۔ یہ تعاون اسے افغانستان کے اندر روس کے خلاف جنگ سے قبل بھی حاصل رہا۔ اگرچہ پاکستان امریکہ سے پہلے ہی امداد حاصل کر چکا تھا اور اس کی پالیسیوں میں بھی امریکہ کو رسوخ حاصل نہیں تھا۔ پھر بھی امریکہ کے پالیسی سازوں نے سوچا کہ پاکستان کو فوجی امداد دیکر وہ پاکستان پر اپنے اثرات بڑھانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سرد جنگ کے دور کی یادوں۔ پاکستان کے سٹریٹیجک محل وقوع اور امریکی جرنیلوں کے ساتھ پاکستانی جرنیلوں کے حسن سلوک جیسے عناصر نے ملکر پینٹاگون کو اس ضرورت کا احساس دلایا کہ پاکستان کو امریکہ کا اتحادی رہنا چاہیے۔ سفارت کار مورخ ڈمنس ککس نے لکھا:-

"خصوصاً پینٹاگون مبنی بر تعاون تعلق کے ٹوٹنے پر متاسف تھا۔ امریکی فوج اپنے پاکستانی ہم منصبوں کو پسند کرتی تھی اور مراسم سے کھنچاؤ پر مضطرب تھی۔ ان کے خیال میں خلیج فارس میں امریکی مفادات کے تحفظ میں اسلام آباد مثبت کردار ادا کر سکتا تھا۔ مزید براں پاکستان کو اسلامی دنیا میں اعتدال کی قوت سمجھا جاتا تھا"۔ پاکستانی فوج نے پینٹاگان اور امریکہ کی مرکزی کمان کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھا۔ جس کے دائرہ کار میں پاکستان شامل تھا۔ مرزا اسلم بیگ کے امریکہ مخالف بیانات کے باوجود خلیجی جنگ کے دوران امریکہ نے جو فوجی اتحاد تشکیل دیا۔ اس میں پاکستان کے فوجی بھی شامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان نے وہ جنگ امریکی ایماء پر امریکہ ہی کی طرف سے لڑی۔ بعد میں امریکی درخواست پر پاکستان نے صومالیہ اور بوسنیا میں بھی اپنے امن دستے بھجوائے۔ امریکی فوج کے خیال میں پاکستانی تعاون اسلامی انتہا

پسندی کے مقابلے میں پاکستانی فوج کی اعتدال پسندی کی علامت تھا۔ تاہم پاکستان کے اندر اور قریبی ہمسائیگی میں پاکستان کی فوج کا کردار اعتدال پسندانہ رسوخ کی حدود سے کوسوں دور تھا۔

1989-1988ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بدامنی کے آغاز کے بعد جلد ہی آئی ایس آئی نے بھارتی حکمرانی کے خلاف برسرپیکار کشمیری گروہوں کے لئے اپنی حمایت میں اضافہ کر دیا۔ آئی ایس آئی کئی سال سے جموں وکشمیر کی جماعت اسلامی اور سیکولر وطن پرست "جموں اینڈ کشمیر لبریشن فرنٹ" کے ساتھ رابطے میں تھی۔ یہ دونوں قابل ذکر مقامی کشمیری گروہ تھے۔ کشمیر میں بدامنی نے آئی ایس آئی کو موقع فراہم کر دیا کہ اس نے افغانستان میں روس کے خلاف مزاحمت کا جو تجربہ حاصل کیا تھا اسے کشمیر میں ہونے والی بغاوت کی سمت منتقل کر سکے۔ کشمیری جنگ جوؤں کی بھرتی انہیں مسلح کرنے اور تربیت دینے کے لئے آئی ایس آئی کے اندر ایک کشمیر سیل تشکیل دیدیا گیا۔ پاکستان نے اپنی حمایت کا رخ جے کے ایل ایف سے جماعت اسلامی اور اس کی جنگ جو تنظیم "حزب المجاہدین" کی طرف موڑ دیا۔ جب بھارت نے کشمیر کے اندر کریک ڈاؤن اور باغیوں کو ان کے اہل خانہ سمیت سزا دینے کا آغاز کیا تو آئی ایس آئی اس نتیجے پر پہنچی کہ بغاوت کو صرف کشمیریوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ 1991ء کے اواخر تک آئی ایس آئی ملکی و بین الاقوامی رضا کاروں اور افغان جہاد کا تجربہ رکھنے والے مجاہدین کی مدد کا آغاز کر چکی تھی تا کہ وہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے اندر گھس جائیں اور بھارتی فوج کے خلاف گوریلا کاروائیاں کریں۔ اس طرح حق خودارادیت کے حصول کے لئے کشمیریوں کی مقامی جدوجہد اور اسلام پسندوں کے عالمگیر جہاد میں ایک تعلق پیدا ہو گیا۔

"جموں اینڈ کشمیر لبریشن فرنٹ"(JKLF) 1977ء میں برطانیہ میں مقیم کشمیریوں نے تشکیل دیا تھا۔ یہ "جموں اینڈ کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ"(JKNLF) کی ایک شاخ تھی جو 1960ء کی دہائی میں فعال رہا۔ اگرچہ جے کے ایل ایف نے پاکستان کی معاونت قبول کر لی تاہم اس نے کشمیریوں کے حق خودارادیت کے مطالبے کو ان علاقوں تک وسعت دے رکھی تھی جو 1947ء کے بعد پاکستان کے زیر انتظام آ گئے۔ "جے کے ایل ایف" کا مطالبہ تھا کہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان دونوں سے آزاد رہنے کی آپشن بھی دی جائے۔ یہ موقف پاکستان کے فیصلہ سازوں کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ ایک بھارتی لکھاری کے خیال میں " کشمیریوں کے حق خودارادیت کے مطالبے کی نمائندگی کرنے والی جماعتوں، تنظیموں یا گروہوں کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو تمام علیحدگی پسند اور زیر زمین تنظیموں میں سے مقامی ترین، اہم ترین اور کشمیر میں قابل قبول ترین جے کے ایل ایف کو ہی ٹھہرایا جا سکتا ہے"۔ جے کے ایل ایف نے 1989ء میں ایک جیل میں سے اپنے 6 ساتھیوں کو بھی رہا کرا لیا تاہم آزادی کے حق میں جے کے ایل ایف کا موقف اور عملی آزادی کا مطالبہ پاکستانی حکام کو ناگوار محسوس ہوا۔ آئی ایس آئی کو پہلے ہی افغانستان سے روسیوں کی دست برداری کے بعد مجاہدین کے مختلف گروہوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش کے نتیجے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے آئی ایس آئی

کے ایک افسر نے کہا" ہم نہیں چاہتے کہ کشمیر میں کوئی پی ایل او(PLO) جنم لے"۔ آئی ایس آئی کی خواہش تھی کہ کشمیر میں جاری مزاحمتی تحریک پر اسے ابتدائی مراحل کی نسبت زیادہ کنٹرول حاصل ہو جائے۔

جو مقامی کشمیری کمانڈر بنیادی طور پر کشمیری گروہوں سے وابستہ تھے ان کی نسبت ایسے کمانڈروں کو زیادہ قابل اعتماد سمجھا جاتا تھا جن کا تعلق پاکستانی گروپوں سے تھا۔ پاکستانی افسران دلیل پیش کرتے تھے کہ بھارتی انٹیلی جنس کشمیریوں کو ورغلا کر ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ آئی ایس آئی کے خیال میں وہ پاکستانی لڑاکوں اور غیر ملکی جہادیوں کو آسانی سے کنٹرول کر سکتی تھی۔ پاکستانی لڑاکوں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ ان کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ غیر ملکی جہادی ایسے ملکوں کے اسلام پسند تھے جہاں وہ واپس نہیں جا سکتے تھے۔ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی موت تک میدان جنگ میں ڈٹے رہیں گے اور مذہبی جوش و خروش کے باعث جہاد کا حصہ بنے رہیں گے۔

ایک اور وجہ بھی تھی جس کی بناء پر فوج نے کشمیر کو محض مقامی بغاوت کا میدان بنانے کی بجائے عالمی جہاد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ کشمیر کی آزادی کا پاکستانی منصوبہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا تو یہ تھا کہ کشمیر کو بھارتیوں کے لئے "ناقابل حکمرانی" بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے گوریلا جدوجہد اور دہشت گردی کی مہم کو توسط بنایا گیا۔ پاکستانی منصوبے کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر کو ایک مرتبہ پھر بین الاقوامی سطح پر اجاگر کیا جائے تا کہ کشمیریوں کے مستقبل کے فیصلے میں عالمی برادری دل چسپی لینا شروع کر دے۔ ایک طرف سے جنگجو بھارتیوں کو مجبور کر کے مذاکرات کی میز کی طرف دھکیل دیں گے اور دوسری طرف سے پاکستان کو عالمی برادری کی حمایت میسر آجائے گی اور مذاکرات کے نتیجے میں کوئی ایسا سمجھوتہ طے پا جائے گا جو پاکستان کے حق میں ہوگا اور کیونکہ جہاد کشمیر میں معروف غیر ملکی مجاہدین کا تعلق اسلامی ممالک سے ہے لہذا" کشمیر کاز" کے لئے ان ممالک کی حمایت بھی میسر آجائے گی۔ افغانستان میں روسیوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی حمایت کے بعد اتنی جلدی کشمیر میں بھارت کے خلاف جہاد کو امریکہ اور مغربی ممالک نظر انداز نہ کر سکے۔ پاکستانیوں کا موقف تھا کہ اگر افغانستان میں روس کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کو حریت پسند تسلیم کیا گیا تھا تو آزادی کی جنگ لڑنے والے کشمیری مجاہدین بھی وہی مقام و مرتبہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ وہ بھی تو حصول آزادی کی جدوجہد میں ہی مصروف تھے۔

اگست 1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کی معزولی کے بعد جلد ہی آئی ایس آئی نے بڑی پھرتی سے کشمیر میں بغاوت کو منظم کیا اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نواز شریف کی سربراہی میں آئی جے آئی اپنی انتخابی مہم کے دوران عوام کو آزادی کشمیر کی حمایت کے لئے متحرک کر چکا تھا۔ آئی جے آئی میں جماعت اسلامی کی شمولیت نے پاکستانی حکومت کی سویلین اور فوجی شاخوں کے لئے باہم مربوط اور ہم آہنگ ہو کر کام کرنا سہل کر دیا۔ نواز شریف کی مدت اقتدار کے پہلے سال کے دوران ہی جماعت اسلامی کا تخلیق کردہ گروہ حزب المجاہدین کشمیری جنگجو گروہوں پر تسلط اور برتری کے حصول میں کامیاب ہو گیا۔

" کشمیریوں کی تحریک آزادی جونہی مذہبی جہاد میں تبدیل ہوئی اس کا سب سے پہلا ہدف جے کے ایل ایف بنا جس نے کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی جدوجہد کی تھی۔ جماعت اسلامی کی حزب المجاہدین نے بھارتی فوج کے ساتھ لڑائی کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیا۔ اس حقیقت کو اب حزب المجاہدین کو کچھ راہنما بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ جے کے ایل ایف کے راہنما امان اللہ خان نے 1991ء میں اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا " حزب المجاہدین جے کے ایل ایف کے لڑاکوں کا خود ہی کام تمام نہیں کرتی بلکہ بھارتی فوج کو ہمارے ٹھکانے سے بھی مطلع کر دیتی ہے۔ نتیجتاً جے کے ایل ایف کے 500 کے قریب کمانڈرز پہلے ہی شہید ہو چکے ہیں"۔ مظفر آباد میں جے کے ایل ایف کے ایک راہنما نے سرکاری ملازم ہونے کے باعث اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا" آئی ایس آئی نے واقعتاً حزب المجاہدین کے ذمہ لگا رکھا تھا کہ وہ بھارتی مقبوضہ کشمیر سے جے کے ایل ایف کا مکمل صفایا کر دے۔ کیونکہ جے کے ایل ایف نے ایک خودمختار کشمیر کا مطالبہ کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جے کے ایل ایف کشمیر کی سب سے بڑی تنظیم تھی جس کا انحصار آئی ایس آئی پر نہیں تھا۔ جے کے ایل ایف کے متعدد راہنماؤں کو خرید لیا گیا۔ نتیجتاً یہ تنظیم 20 مختلف دھڑوں میں بٹ گئی"۔

اس کے بعد آنے والے سالوں کے دوران آئی ایس آئی نے اپنا کنٹرول موثر کرنے کی خواہش کے تحت اپنی حمایت کا رخ حزب المجاہدین سے ان مذہبی دھڑوں کی طرف موڑ دیا جن کے کشمیری ارکان کی تعداد بہت کم تھی۔ اگرچہ حزب المجاہدین جماعت اسلامی سے وابستہ تھی اور اس ناطے سے اس پر آئی ایس آئی کا اثر زیادہ تھا۔ لیکن اس کی قیادت کشمیری تھی۔ حزب المجاہدین آئی ایس آئی کے بعض انتہا پسندانہ منصوبوں سے نہ تو متفق تھی اور نہ ہی انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار تھی۔ مثلاً آئی ایس آئی چاہتی تھی کہ غیر مسلم مقامی کشمیریوں پر حملے کئے جائیں اور ان کا صفایا کر دیا جائے۔ مزید براں نواز شریف حکومت اور فوج کے کچھ عناصر نہیں چاہتے تھے کہ کشمیر میں بھارت کے خلاف جدوجہد کا سارا کریڈٹ جماعت اسلامی لے جائے۔ آئی ایس آئی پر امید تھی کہ اگر وہ ایسے جہادی گروہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائے جن کے ارکان کشمیری نہ ہوں اور پاکستانی سیاست کے حوالے سے بھی ان کا کوئی ایجنڈا نہ ہو تو وہ جنگجویانہ کاروائیوں کی منصوبہ بندی اور عملدرآمد پر مکمل کنٹرول رکھ سکتی تھی۔

جونہی پاکستان کے حمایت یافتہ باغیوں نے بھارت کے زیر انتظام علاقوں کے اندر اپنے حملے تیز کئے تو ردعمل کے طور پر بھارتی فوج بھی منظر میں داخل ہوگئی اور اختلاف رائے کے حامل کشمیریوں کے بے رحمانہ استیصال میں اضافہ کر دیا۔ بھارتی استیصال کے نتیجے میں کشمیری بھارت سے مزید دور ہو گئے اور عالمی سطح پر بھارت کی شہرت متاثر ہوئی۔ اندریں حالات پاکستان نے سمجھا کہ اس کی حکمت عملی کامیاب رہی۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویدار بھارت انسانی حقوق کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزی کا مرتکب ٹھہرایا جانے لگا۔ 1992ء میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں ایک تنقیدی نوٹ لکھا۔

"جنوری 1990ء کے بعد سے ریاست جموں وکشمیر میں انسانی حقوق کی شدید اور بڑے پیمانے پر خلاف ورزیوں کو بھارتی فوج، نیم فوجی بارڈر سیکیورٹی فورس (BSF) اور سنٹرل ریزرو پولیس فورس سے منسوب کیا جارہا ہے۔ جہاں حکومت مخالف مسلح سرگرمیوں کی اطلاع ملتی ہے۔ اس علاقے کا گھیراؤ کر کے گھر گھر تلاشی لی جاتی ہے۔ ایسی کاروائیوں کے دوران اور فوجی کیمپوں، تفتیشی مراکز، تھانوں اور جیلوں میں تشدد ایک معمول ہے۔ بلا امتیاز لوگوں کو مارا پیٹا جاتا ہے اور جبری آبروریزیاں بھی عام ہیں۔ جموں وکشمیر میں بغاوت اور باغیوں کے خلاف کاروائیوں کے دوران مقامی کشمیری خواتین کی جبری آبروریزی کی جاتی ہے تاکہ وہ توہین محسوس کریں اور خوفزدہ رہیں"۔

لیکن انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بھارت پر جو عالمی سطح پر تنقید کی گئی وہ اس اعتبار سے ناکافی رہی کہ بھارت نے کشمیر میں رائے شماری کا پاکستانی مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار جاری رکھا۔ جیسا کہ پاکستان کی خواہش تھی، عالمی برادری نے کشمیر کو حق خودارادیت کا مسئلہ سمجھا ہی نہیں اور ابتدائی چند سالوں کے بعد جنگ جوؤں کی مسلسل حمایت اور مدد کے نتیجے میں اسلام آباد پر عالمی دباؤ اس دباؤ سے بڑھ گیا جو کشمیریوں پر ظلم وستم کے حوالے سے بھارت پر ڈالا جارہا تھا۔

کشمیر میں جاری جنگجوئی نے بڑی تعداد میں ان بھارتی فوجیوں کو مصروف رکھا جو بغاوت کی سرکوبی کے لئے وہاں بھیجے گئے تھے۔ پاکستان کے فوجی منصوبہ سازوں نے بھارتی فوج کی اس مصروفیت کو بھی اپنی کامیابی خیال کی۔ کشمیر میں ہونے والی بغاوت بھارت کو اس مسئلے کے حل پر آمادہ نہ کرسکی جسے پاکستانی حکام کشیدگی اور کھنچاؤ کا اصل باعث اور جڑ قرار دیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان بھارت کے زیرانتظام کشمیر میں جنگجوئی کی رفتار اور شدت میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ جب بغاوت کے خلاف بھارت کی کاروائیوں میں شدت پیدا ہوگئی تو جنگ جوؤں کے حملوں کے منصوبے بھی وسیع تر ہوتے چلے گئے اور کشمیر میں بھارتی فوجیوں اور مقامی ہندوؤں پر حملوں کے ساتھ ساتھ منصوبہ بندی کے تحت کشمیر سے آگے بھی حملے کئے جانے لگے۔ چند سالوں کے دوران خودکش حملوں کی منصوبہ بندی بھی کرلی گئی۔ بھارت کے خلاف بغاوت کو شدید تر بنانے کے لئے زیادہ تعداد میں باغی درکار تھے اور جہادی گروہ فنڈز اکٹھے کرنے اور رنگروٹوں کی بھرتی کے لئے جلد ہی سارے پاکستان میں کود پڑے اور پاکستان "جہادی کلچر" کی گرفت میں آگیا۔

ادھر پاکستان میں "جہادی کلچر" نے وسعت اختیار کی اور ادھر 1992ء میں لیفٹیننٹ جنرل جاوید ناصر کو آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کردیا گیا۔ جنرل ناصر خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تبلیغی جماعت کے پرجوش رکن تھے۔ وہ پاکستانی فوج کے پہلے جنرل تھے جنہوں نے پوری داڑھی رکھی جو اسلامی پاکبازی کی علامت تھی۔ تبلیغی جماعت ایک غیر سیاسی مذہبی تحریک ہے جو اسلام کے کٹر دیوبندی سنی مسلک کے ساتھ وابستہ ہے اور عالمی ترتیب پر غیر مسلموں کے تسلط کو سیاسی اسلام پسندوں کی طرح تفکر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

جنرل ناصر نے جہادی گروہ منظم کرنے کے لئے متعدد دیوبندی مذہبی علماء کو دعوت دی اوران گروہوں کو آئی ایس آئی نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ جب 1992ء میں افغانستان میں روس کی نصب کردہ حکومت بالآخر منہدم ہوئی اور مجاہدین کے مختلف دھڑوں کے درمیان خانہ جنگی کے امکانات دکھائی دینے لگے تو "حرکت جہاد اسلامی" جیسے کچھ دیو بندی گروہوں نے افغانستان اور کشمیر میں جنگ لڑنے کے لئے کچھ رضا کار بھرتی کیے اور اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بوسنیا ہرگوزونیا میں مصروف جنگ فریقین کو اسلحہ فراہم کیا اور بوسنیائی مسلمانوں کے لئے فضائی راستے سے "جدید ترین اینٹی ٹینک گائیڈڈ میزائل" بھجوائے۔ جب ایودھیا میں جنونی ہندوؤں نے تاریخی بابری مسجد کو مسمار کیا اور وہاں مذہبی فسادات پھوٹ پڑے تو جاوید ناصر نے آئی ایس آئی کو وہاں بمبئی کی انڈر ورلڈ کے مسلمان راہنما داؤد ابراہیم کے ساتھ ساز باز کرنے کی اجازت دیدی۔ جس نے 12 مارچ 1993ء کو بمبئی سٹاک ایکسچینج پر حملے کا اہتمام کیا اور نتیجتاً کم از کم 250 افراد ہلاک اور ایک ہزار سے زائد زخمی ہو گئے۔ اگرچہ جنرل جاوید ناصر کے بعض اقدامات اور طریقہ ہائے کار کو نہ تو سویلین قیادت نے پسند کیا اور نہ ہی انہیں پاکستانی فوج کی ہائی کمان کی حمایت ملی۔ تاہم انہوں نے جہادی نیٹ ورک کو افغانستان، پاکستان اور کشمیر سے آگے جو وسعت دی اسے واضح اور وسیع تر حمایت حاصل ہوئی۔ 13 مئی 1993ء کو امریکی دباؤ پر جنرل جاوید ناصر کو آئی ایس آئی کے عہدے سے وقت سے پہلے ہی ریٹائر کر دیا گیا لیکن وہ پاکستان میں سکھوں کے مقدس مقامات کی حفاظت اور بحالی کی ذمہ دار ایک تنظیم کے سربراہ کے طور پر پھر منظر عام پر آ گئے۔ ناصر نے 2002ء تک یعنی جنرل مشرف کی فوجی بغاوت سے 3 سال اور نائن الیون سے کافی دیر بعد تک اسی عہدے پر رہ کر خدمات سرانجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہوں نے اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کے خلاف کئی سخت مضامین لکھے جو پاکستانی اخبارات میں شائع ہوئے اور وہ جنرل حمید گل کی طرح آئی ایس آئی اور فوج میں بدستور مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔

دیوبندی اور وہابی گروہوں کے لئے آئی ایس آئی کی حمایت جنرل ناصر کی سبکدوشی کے بعد بھی جاری رہی اور سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر گئی۔ جب جنرل ناصر نے سرکاری طور پر آئی ایس آئی کو چھوڑا تو پاکستان کا لبرل ہفت روزہ جریدہ "فرائیڈے ٹائمز" "اسلام کے نادیدہ سپاہی" (The Invisible Soldiers of Islam) کے عنوان سے آئی ایس آئی کی "پیروڈی" کا آغاز کر چکا تھا اور ایجنسی نے پوری کوشش کی اپنی اس شہرت پر پوری اترے۔

افغانستان سے سوویت فوج کی دست برداری سے کچھ دیر بعد تک جہادی تحریک، بالخصوص کشمیر میں ہونے والی بغاوت میں پاکستان کے ملوث ہونے پر کسی قسم کی فکر مندی کا اظہار نہ کیا گیا۔ روس کا آخری فوجی دستہ 15 فروری 1989ء کو افغانستان سے رخصت ہوا اور امریکہ نے اس سے ایک سال بعد تک کابل میں غیر کمیونسٹ اور مستحکم حکومت کے قیام کے لئے افغان مجاہدین اور پاکستان کی امداد جاری رکھی۔ روسیوں کی واپسی کے بعد بھی امریکہ نے پاکستان کی اس

افغان پالیسی سے تعرض نہ کیا جو آخر الذکر نے آئی ایس آئی کے توسط سے اپنا رکھی تھی۔ نتیجتاً آئی ایس آئی کو موقع میسر آ گیا کہ وہ امریکہ کی طرف سے کسی سنجیدہ اعتراض کے بغیر جہاد کو کشمیر تک وسعت دے سکے۔ ان دنوں پاکستان اور افغانستان کے معاملات جن امریکی حکام کے ذمہ تھے انہوں نے کئی سال بعد تسلیم کیا کہ امریکہ نے روسیوں کی رخصتی کے بعد اپنے طرز عمل کو تبدیل نہ کرنے کی صورت میں غلطی کا ارتکاب کیا۔ ستمبر 1991ء کے بعد افغان جہاد سے امریکہ کا براہ راست تعلق اس وقت ختم ہو گیا جب اس نے روس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا کہ افغانستان میں مصروف جنگ فریقین میں سے کسی کی مدد نہیں کی جائے گی۔ اس وقت تک جوہری عدم پھیلاؤ کے حوالے سے پاکستان کی عہد شکنی کے باعث امریکہ اس پر پابندیاں نافذ کر چکا تھا۔ جب افغانستان میں پاک امریکہ گٹھ جوڑ اختتام کو پہنچا تو امریکہ نے اسلام پسندوں کی دہشت گردی کے لئے پاکستان کی حمایت کا بھی نوٹس لینا شروع کر دیا۔

نئے امریکی سفیر نکوس پلاٹ اسلام آباد میں 1991ء کے اواخر میں پہنچے اور دہشت گردی پر ابتدائی امریکی تنبیہات ہمراہ لائے پاکستانی حکام نے پلاٹ اور امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں "شعبہ انسداد دہشت گردی" کے رابطہ افسر پیٹر برلے کے ساتھ ملاقات کی۔ دوران گفتگو پاکستانی حکام نے یہ الزام تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ پاکستان سرکاری سطح پر دہشت گرد سرگرمیوں کی حمایت میں ملوث تھا۔ آئی ایس آئی نے امریکی حکام کے ساتھ معاملات طے کرنے والے سویلین پاکستانی حکام کو مشورہ دیا کہ وہ امریکیوں سے دہشت گردی کی حمایت پر مبنی پاکستانی سرگرمیوں کا ثبوت طلب کریں۔ امریکیوں کے جواب سے آئی ایس آئی کو اندازہ ہو جاتا کہ اول الذکر کے پاس پاکستان میں انٹیلی جنس کے حصول کیلئے کس نوعیت کے ذرائع موجود تھے۔ نتیجتاً آئی ایس آئی اپنی کاوش کو اس طرح متشکل کر لیتی کہ امریکیوں کے لئے اس کا سراغ لگانا ممکن نہ رہتا۔ پاکستانی سفارت کاروں اور سویلین حکام نے بعض غیر سرکاری افراد اور جماعت اسلامی جیسی اسلام پسند جماعتوں پر الزام عائد کیا کہ وہ کشمیری جنگجوؤں کے لئے حمایت کو منظم کر رہی تھیں اور سرکاری سطح پر امریکہ سے وعدہ کیا کہ بعض افراد اور سیاسی جماعتوں نے کشمیری جنگ جوؤں کے لیے جو تربیتی کیمپ قائم کر رکھے تھے۔ وہ ختم کر دیئے جائیں گے اور کشمیریوں سمیت جو غیر ملکی پاکستان میں افغان مجاہدین کے ہمراہ تربیت حاصل کر رہے تھے۔ انہیں آئندہ تربیت نہیں دی جائے گی۔

ان وعدوں کے باوجود زمینی صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی اور مئی 1992 میں بش انتظامیہ نے دھمکی دیدی کہ پاکستان کو "دہشت گردی کی سرپرست ریاست" قرار دیدیا جائے گا۔ امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز بیکر نے 10 مئی 1992ء کو وزیراعظم نواز شریف کے نام ایک خط لکھا کہ امریکی حکومت ان پاکستانی دعووں کو تسلیم کرتی ہے کہ پرائیویٹ گروہ اور اسلام پسند جماعتیں کشمیری جنگ جوؤں کی حمایت کر رہی ہیں۔ خط میں نواز شریف کے اس وعدے کو بھی قابل تحسین قرار دیا گیا کہ پاکستان اپنے آپ کو بھارت کے خلاف دہشت گرد سرگرمیوں سے دور رکھنے کے لیے اقدامات

کرے گا۔ خط میں مزید درج تھا کہ "ہماری اطلاع کے مطابق آئی ایس آئی اور دیگر (افراد یا گروہ) دہشت گرد کارروائیوں میں ملوث اور مصروف گروہوں کی مادی امداد جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے ان معلومات کا سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہئے۔ امریکی قانون کے مطابق جو ممالک عالمی دہشت گردی کی حمایت کرتے پائے جائیں۔ ان پر سخت پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں اور اس قانون پر عملدرآمد میری ذمہ داری ہے"۔

وہ خط نواز شریف کے حوالے کرتے وقت نکولس پلاٹ نے واضح کر دیا کہ امریکہ ان پاکستانی دعووں کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ کارروائیاں اسلام پسند اپنے طور پر کر رہے تھے۔ پلاٹ نے نواز شریف کو اپنے طور پر لکھا کہ:۔

"ہم پر اعتماد ہیں کہ ہماری معلومات غلط نہیں ہیں۔ آئی ایس آئی کی نظامت اور پاکستانی فوج کے کچھ عناصر ان کشمیری اور سکھ جنگ جوؤں کی حمایت کر رہے ہیں جو دہشت گردی میں مصروف ہیں۔ اس حمایت میں اسلحے اور تربیت کی فراہمی اور دراندازی میں معاونت شامل ہیں۔ ہم پاکستانی حکومت کی براہ راست اور خفیہ مدد کی بات کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے ذہن میں کوئی شک موجود نہیں۔ یہ کام جماعت اسلامی جیسی اسلام پسند جماعتیں اپنے طور پر نہیں کر رہیں بلکہ صدر، وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کے توسط سے حکومت پاکستان دہشت گردوں کو کنٹرول کر رہی ہے۔ ہماری اطلاع یقینی ہے اور یہ ہمیں بھارتی حکومت نے بہم نہیں پہنچائی۔ اگر صورت حال برقرار رہی تو امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ قانونی طور پر پابند ہوں گے کہ وہ پاکستان کو ان ممالک کی فہرست میں شامل کر لیں جو دہشت گردی کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ہم یہ انتہائی قدم اٹھانا نہیں چاہتے لیکن قانون کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو جنگ جوؤں کی معاونت ختم کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے اور آپ پاکستان یا آزاد کشمیر میں تربیتی کیمپوں کے قیام کی اجازت نہیں دیں گے"۔

پاکستان کے جوہری پروگرام کے ردعمل کے طور پر اس پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ ان کے مقابلے میں دہشت گردی کی سرپرست ریاست کے طور پر اسے کہیں زیادہ سخت پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ امریکی قانون کے تحت دہشت گرد ریاستوں کو معمولی اور بالواسطہ معاونت بھی فراہم نہیں کی جا سکتی۔ نئی پابندیوں کے تحت پاکستان کے لئے عالمی بنک، عالمی مالیاتی فنڈ یا دیگر عالمی مالیاتی اداروں سے تعاون حاصل کرنا بھی ممکن نہ رہتا۔ دوطرفہ تجارت پر بھی پابندی عائد کر دی جاتی۔ دہشت گردی کی سرپرست ریاست قرار دیئے جانے کا مطلب یہ بھی تھا کہ پاکستان میں جاری منصوبوں کے لئے ایکسپورٹ امپورٹ بنک فنانسنگ کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا۔

امریکی سفیر سے وہ خط وصول کرنے کے چند روز بعد نواز شریف نے ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں ان کے سیکرٹریٹ، وزارت خارجہ اور مسلح افواج کے سنیئر حکام شریک ہوئے اور تازہ ترین امریکی دھمکی پر غور کیا گیا۔ آرمی چیف

جنرل آصف نواز اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل جاوید ناصر بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ ناصر نے واشنگٹن میں موجود "بھارتی صہیونی لابی" پر الزام عائد کیا کہ وہی پاکستان کے ساتھ امریکی رویے میں تبدیلی کا باعث تھی۔ وہ مصر تھے کہ امریکہ سے ان الزامات کے ثبوت طلب کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر میں جہاد فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور اس کا تسلسل نہیں توڑا جا سکتا۔ ان کے الفاظ تھے "ہم اپنے قدموں کے نشان پہلے بھی مٹاتے رہے ہیں آئندہ مزید احتیاط سے کام لیا جائے گا۔ امریکہ پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار نہیں دے گا۔ ہمیں چاہئے اپنی سفارتی کوششوں کو زیادہ وقت دیں اور انہیں بہتر بنائیں۔ ہم جو حمایت کشمیری مزاحمت کو فراہم کر رہے ہیں اس کی بجائے وہ کشمیر میں بھارتی مظالم پر اپنی توجہ مرکوز کریں"۔

نواز شریف جنرل ناصر سے متفق تھے۔ ان کی رائے شرکائے اجلاس کے اتفاق رائے کی عکاس تھی۔ دو عدد شرکائے اجلاس کے علاوہ کشمیری جنگ جوؤں کو حمایت فراہم کرنے کی پاکستانی حکمت عملی پر کوئی معترض نہ ہوا۔ تاکہ جلاس میں موجود پاکستان کی اعلیٰ ترین قیادت کے نزدیک اصل مسئلہ پاک امریکہ تعلقات تھے۔ ایک غلط پالیسی اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ نواز شریف نے کہا کہ جب تک پاکستان امریکہ کے لئے فائدہ بخش تھا امریکہ کا جھکاؤ واضح طور پر پاکستان کی طرف رہا اور افغان جہاد کے دوران متشکل ہونے والے پاک امریکہ تعلقات میں کوئی دراڑ نہ آئی۔ ان کے الفاظ تھے "صرف امریکی میڈیا اور کانگریس ہمارے لئے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ مضبوط تر لابنگ پر مشتمل کاوشوں کی مدد سے حل کیا جا سکتا ہے"۔ نواز شریف نے پہلے قدم کے طور پر امریکی میڈیا کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے اور امریکی کانگریس میں لابنگ کے لئے 20 لاکھ ڈالرز مختص کر دیئے۔ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ نے عدم اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری جنگجوؤں کے لئے پاکستانی حمایت میں کمی آنی چاہئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر پاکستان کشمیریوں کے لئے سفارتی اور سیاسی حمایت پر اپنی توجہ مرکوز کرے تو وہ زیادہ کامیاب رہے گا۔ بموں سے ممکنہ حد تک گریز کیا جائے۔ جنرل ناصر نے کہا کہ ہندو طاقت کے علاوہ کوئی زبان نہیں سمجھتا۔ جنرل آصف نواز کا موقف تھا کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ تعلقات میں کشیدگی کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا اور "ہم بھارت کے خلاف فوجی کاروائیاں بھی ختم نہیں کر سکتے"۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ خفیہ حمایت کو یکسر ختم کرنے کی بجائے پاکستان امریکہ کو مطمئن کرنے کے لئے اپنا طریق کار تبدیل کر لے۔ اس سے اگلے برس پاکستان نے اسی پالیسی پر عمل کیا۔

نواز شریف نے امریکی تنبیہات کے جواب میں امریکہ کو یقین دلایا کہ بھارت کے خلاف نبرد آزما جنگ جوؤں کی خفیہ حمایت کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے گا۔ انہوں نے بھارت کے ساتھ پاکستان کے اختلافات کی فہرست بھی امریکہ کو فراہم کی اور درخواست کی کہ آخر الذکر پاک بھارت تنازعے کے حل میں فعال کردار ادا کرے۔ اگرچہ امریکہ نے 1998ء میں پاکستان کے ایٹمی تجربے اور 1999ء میں جنرل مشرف کی فوجی بغاوت کے ردعمل کے طور پر اس پر متعدد پابندیاں نافذ

کیں۔تاہم دہشت گردی کی سرپرست ریاست ہونے کے حوالے سے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے سے گریز کئے رکھا۔ پابندیوں کے نفاذ کے بعد پاکستان واشنگٹن کو رویہ بہتر بنانے پر قائل کرتا رہا اور اس پر عائد شدہ پابندیوں میں گاہے بگاہے نرمی آتی رہی۔ بعدازاں اس دور لیے کا آغاز ہوگیا جب امریکہ نے پاکستان کے گلاس کو "نصف بھرا ہوا" رکھا۔ روایتاً امریکہ کو جب بھی پاکستان سے دوبارہ بغلگیر ہونا مقصود ہوتا۔ امریکی پالیسی اسی مخصوص رویے پر مبنی ہوتی تھی۔

جب امریکہ نے پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دینے کی دھمکی دی۔ اس سے ایک عشرہ بعد تک آخرالذکر بار بار وعدے کرتا رہا کہ جو اسلام پسند جنگ جو پاکستانی سرزمین پر بیٹھ کر کاروائیوں میں مصروف تھے ان کے خلاف کریک ڈاؤن کیا جائے گا۔ ہر مرتبہ یہ تاثر قائم کرنے کے لئے اقدامات کئے جاتے رہے کہ جہادیوں کا مکمل قلع قمع کرنا ایک دشوار کام تھا اور پاکستانی حکومت اس مسئلے کے ساتھ نمٹنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ ابھی امریکی دھمکی برقرار تھی کہ اپریل 1998ء میں پاکستان نے 9 عرب باشندوں کو گرفتار کرلیا جن کا تعلق جنگ جو اسلام پسند گروہوں کے ساتھ تھا اور اعلان کردیا کہ اسلامی انتہا پسندوں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع ہو چکا ہے۔

پاکستان نے اس مسئلے کو افغانستان میں روس مخالف جہاد کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ وہ جہادی عالمی رضامندی سے پاکستان آئے تھے۔ پاکستان کی طرف سے سرکاری سطح پر پیش کی جانے والی وضاحت میں یہ بھی کہا گیا کہ پاک افغان سرحد کے ساتھ پہاڑوں کے دشوار گزار سلسلے غیر ملکی جنگ جوؤں (جو بعد میں "القاعدہ" میں بدل گئے) کے خلاف کاروائیوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ غیر ملکی جنگ جو مبینہ طور پر انہی پہاڑی سلسلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ "واشنگٹن پوسٹ" نے لکھا "پاک افغان سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے میں خوفناک حد تک آزاد اور نسل پرست پشتون آباد ہیں۔ افغانستان کا ان پر کنٹرول نہ ہونے کے برابر ہے اور پاکستان کی حکومت بڑے شہروں اور قصبوں سے باہر کمزور ہے"۔ ایک اور وجہ کی بناء پر بھی امریکہ کو تلقین کی جاتی رہی کہ وہ پاکستانی حکومت پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہ ڈالے مبادا وہ ملاؤں کے کنٹرول میں چلا جائے۔ یہ دلیل سب سے پہلے 1993ء میں پیش کی گئی اور آج کے دن تک پیش کی جارہی ہے۔

جب نواز شریف کو وزارت عظمٰی اور جنرل جاوید ناصر کو آئی ایس آئی کی سربراہی سے ہٹادیا گیا تو امریکہ بھی پاکستان کو دہشت گردی کی سرپرست ریاست قرار دینے کی دھمکی سے دست بردار ہوگیا۔ نئی حکومت نے وعدہ کیا کہ آئی ایس آئی کی تطہیر کی جائے گی۔ گکس لکھتا ہے کہ "اگرچہ وہ تبدیلی کسی حد تک ظاہری تھی لیکن اس نے امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو اپنے اس ارادے سے باز رکھا کہ پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دیدیا جائے"۔ کشمیری جنگجوؤں کے لئے پاکستانی حمایت کا تسلسل جاری رہا بلکہ ہر نئی حکومت اس حمایت میں اضافہ کرتی رہی۔ نواز شریف کی پہلی مدت اقتدار کے آخری چند ماہ کے دوران امریکی دباؤ جس سطح پر پہنچا اس پر اس کے بعد کبھی نہ آیا۔

بطور وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی دوسری مدت اقتدار کے دوران (96-1993) جب آئی ایس آئی نے مطالبہ کیا کہ کشمیر کی جدوجہد آزادی کے حوالے سے حکومت معذرت خواہانہ رویہ نہ اپنائے تو کشمیر پر پاکستانی موقف میں بھی سختی آ گئی۔ پاکستان کے اسلام پسند گروہوں نے جہاد کشمیر کے لئے خود کو کھلم کھلا منظم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے عوام سے فنڈز بھی اکٹھے کرنا شروع کر دیے۔ آئی ایس آئی نے مطالبہ کیا کہ ملکی ٹیلی ویژن پر کشمیر میں بھارتی مظالم اور مجاہدین کے جرائتمندانہ اقدام کو نمایاں کیا جائے۔

1995ء کے موسم گرما میں جماعت اسلامی کے جنگ جوؤں پر مشتمل ایک گروہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں چرار شریف کی ایک خانقاہ میں محصور ہو گیا۔ کئی دن لڑائی ہوتی رہی۔ خانقاہ کو آگ لگا دی گئی۔ بھارتی فوج نے ان مجاہدین کو پاکستان کی طرف محفوظ راستہ فراہم کر دیا۔ جنگ جوؤں کا کمانڈر مست گل ایک پاکستانی شہری تھا۔ اگرچہ اس میں شامل جماعت اسلامی کے راہنما بے نظیر بھٹو کی حکومت کی مذمت کرتے رہے۔ تاہم استقبالیہ ریلی کو پاکستان کے ٹی وی نیٹ ورک پر کوریج دی گئی۔

بے نظیر بھٹو آئی ایس آئی اور اسلام پسندوں کو تو نہ روک سکیں تاہم انہوں نے جہادیوں سے نمٹنے کے لئے امریکہ سے اپیل کر دی اور امریکی رپورٹروں سے کہا کہ وہ اپنی حکومت کو یہ پیغام پہنچا دیں۔ "آپ ایک انصاف پسند قوم ہیں۔ ہمارے اتحادی بھی رہے ہیں۔ جنگجوئی اور دہشت گردی پر قابو پانے میں ہماری مدد کریں"۔ امریکی صحافیوں کے لئے بے نظیر بھٹو کی بریفنگ کے دوران موجود ایک امریکی رپورٹر نے لکھا "بے نظیر بھٹو نے اشارتاً بتایا کہ پاکستان دہشت گردوں کے خلاف اپنی مرضی سے اقدام نہیں کر سکتا۔ اس پر بعض مضبوط قوتیں ان کی حکومت کے خلاف صف آراء ہو گئیں اور اسلام پسندوں نے ردعمل کے طور پر سرعام وزیراعظم کی مذمت شروع کر دی"۔

مست گل کی رہائی کے بعد راولپنڈی میں ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے سربراہ قاضی حسین احمد نے مطالبہ کیا کہ حکومت سرکاری سطح پر بھارت کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ مست گل کے اعزاز میں منعقد کی جانے والی ریلیوں پر دفتر خارجہ کی تنقید کا حوالہ دیتے ہوئے قاضی حسین نے کہا کہ دفتر خارجہ میں "امریکی وائرس" سرایت کر چکا ہے۔ اسلام پسندوں نے مزید دعویٰ کیا کہ عوامی سرمائے کو آصف زرداری کی تجوریاں بھرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دفاع، اسلحے کی خریداری اور ترقیاتی کاموں پر خرچ نہیں ہو رہا اور حکومت جہاد کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

نواز شریف 1997ء سے 1999ء تک وزیراعظم رہے لیکن بھارت کے ساتھ حصول امن کے جس عمل کا آغاز لاہور سے کیا گیا اس سے پہلے انہوں نے جہادی جنگجوؤں کو دبانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ جہادی گروہ مزید دیدہ دلیر ہو

گئے۔ انہوں نے مسجدوں اور بازاروں میں سرعام فنڈز اکٹھے کرنا شروع کر دیئے۔ ان کے اخبارات اور رسائل میں غیر ملکی اور پاکستانی شہیدوں کی فہرستیں بھی شائع ہونے لگیں۔ گورنر پنجاب اور پاکستان کے مرکزی وزیر اطلاعات نے اپریل 1998ء میں "لشکر طیبہ" کے صدر دفتر کا دورہ بھی کیا۔ مطلب یہ کہ ایک جنگجو اسلام پسند گروہ کو سرکاری سطح پر احترام دیا گیا۔ زیادہ تر لوگ لشکر طیبہ کے صدر دفتر "مرکز الدعوۃ والارشاد" کو جنگجوؤں کے تربیتی مرکز کے طور پر جانتے تھے۔ بعد ازاں لشکر طیبہ نے تنازعہ کارگل کے دوران فیصلہ کن کردار ادا کیا اور اس کے ارکان بھارتی چھاؤنیوں کے خلاف خودکش کاروائیوں میں ملوث رہے۔ یہ گروہ ان تنظیموں میں سے ایک تھا جن کا امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے نائن الیون کے بعد مرتب کی جانے والی عالمی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں سب سے پہلے اندراج کیا۔

ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کی رپورٹ کے مطابق 1998ء میں گورنر پنجاب نے مرکز کے طلباء کے جذبہ جہاد و ایثار کو سراہا۔ انہوں نے کشمیری حریت پسندوں کی حمایت کی شکل میں مرکز کے طلباء کی قربانیوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے وزیر اطلاعات نے مبینہ طور پر کہا کہ حکومت نے جوہری صلاحیت کے حامل غوری میزائل بنا کر ملکی دفاع کو مضبوط تر کر دیا ہے اور اب بڑی طاقتیں ہمارے ملک کے مقدر کا فیصلہ نہیں کریں گی۔

آئی ایس آئی اور پاکستان کے اسلام پسندوں کی سرگرمیوں کو طالبان دور کی افغان اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے بے پناہ حمایت حاصل ہوئی۔ پاک افغان سرحد کو جنگ جوؤں کیلئے کھول دیا گیا اور پاکستانی جہادیوں کے لئے تربیتی انفراسٹرکچر کا ایک قابل ذکر حصہ افغانستان منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح پاکستانی حکام کو موقع میسر آ گیا کہ وہ جہادی سرگرمیوں کے وجود سے زیادہ شدومد کے ساتھ انکار کر سکیں۔ مزید براں پاکستانی شہروں میں سیکیورٹی کی صورت حال بگڑنے لگی۔ امریکی حکام (1995) اور آئل کمپنیوں کے ملازمین (1997) پر جان لیوا حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجتاً پاکستان کے اندر امریکی موجودگی محدود ہو گئی۔ امریکہ نہ تو احسن طریق پر پاکستان کے اندر جنگجویانہ سرگرمیوں کا مانیٹر کر سکتا تھا اور نہ ہی افغانستان میں واقع پاکستانی کیمپوں کے متعلق ایک حد سے زیادہ انٹیلی جنس حاصل کی جا سکتی تھی۔ انہی وجوہ کی بناء پر امریکہ کے لئے ممکن نہ رہا کہ وہ کشمیری جنگجوؤں کو ملنے والی پاکستانی حمایت اور مدد کی واضح نشاندہی کر سکے۔ جن دنوں پاکستان کو خطرہ لاحق تھا کہ اسے دہشت گردی کی سرپرست ریاست قرار دے دیا جائے گا۔ ان دنوں کے مقابلے میں امریکی احتجاج کی نوعیت عمومی ہو کر رہ گئی۔

اگست 1998ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں پر دہشت گرد حملے ہوئے۔ اس کے بعد پاکستان اور افغانستان پر امریکی توجہ میں اضافے کا مشاہدہ کیا گیا۔ ردعمل کے طور پر امریکہ نے افغانستان میں واقع اسامہ بن لادن کی کمانڈ اینڈ کنٹرول کی تنصیبات پر کروز میزائلوں سے حملہ کر دیا۔ کیونکہ مشرقی افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر حملوں کا ذمہ دار القاعدہ کو ٹھہرایا گیا تھا۔ کروز میزائل پاکستان کے اوپر سے ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے۔ ان دنوں ایک امریکی

جرنیل پاکستان کا دورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے پاکستانی آرمی چیف کو بتایا کہ کروز میزائلوں کا اصل ہدف افغانستان تھا۔ لیکن جن کیمپوں کو نشانہ بنایا گیا اسامہ بن لادن مبینہ طور پر وہاں سے کچھ دیر پہلے رخصت ہو چکا تھا۔ لہذا اسے ہلاک نہ کیا جاسکا۔ اسامہ تو بچ گیا لیکن "حرکت الانصار" کے کم از کم گیارہ پاکستانی ارکان کروز میزائلوں کی زد میں آ کر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان گیارہ افراد کی وہاں موجودگی نے بن لادن کے ساتھ پاکستانی روابطہ کی نشاندہی کر دی۔ یہ افواہ عام ہو گئی کہ جب امریکی بحریہ کے جنگی جہاز سے کروز میزائل فائر کیے گئے اس کے چند لمحوں بعد اسامہ بن لادن نے اپنا ٹھکانہ چھوڑ دیا۔ کیوں کہ آئی ایس آئی نے اسے مطلع اور بروقت تنبیہ کر دی تھی کہ " کروز داغے جا چکے ہیں۔ اپنا دفاع کرلو"۔

اس وقت تک نواز شریف فوج کے ہاتھوں معزول ہو چکے تھے اور پاکستانی معاشرہ فوج کے زیر تسلط آ چکا تھا۔ سٹیفن کوہن اپنی کتاب "دی پاکستان آرمی"(The Pakistan Army) میں رقمطراز ہیں:۔

"عسکریت کی 4 اقسام ہیں۔ فوج کی پرستش۔ فوج کی مدد سے حکمرانی۔ زمانہ امن میں بھی معاشرے کو عسکریت پسند بنائے رکھنا۔ (سویلین قیادت کے دور میں بھی) اور معاشرے کو جنگ کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا اور رکھنا۔

پاکستان نے صرف پہلی دو اقسام کا مشاہدہ کیا وہ بھی متفرق بنیادوں پر۔ 1990ء کی دہائی میں پاکستانی معاشرے کو جنگ کے لئے کمربستہ پایا گیا۔ سویلین حکومت کے دور میں بھی قوم میں عسکریت پسندی پیدا ہو گئی۔ جنرل مشرف کا فوجی دور پاکستان کی سابقہ فوجی حکومتوں کے مقابلے میں کم معذرت خواہانہ تھا۔ ابتداء میں معاشرے کو عسکریت پسند بنانے کے عمل کو کھلم کھلا جاری رکھا گیا۔

اکتوبر 1999ء کی فوجی بغاوت کو پاکستان کے جہادیوں نے جنرل مشرف کے اس کردار کے پس منظر میں خوش آمدید کہا جو انہوں نے کارگل کے بحران میں ادا کیا تھا۔ اسلام پسندوں نے ایک بھارت مخالف ویب سائٹ دکھائی جس میں حرکت المجاہدین کے راہنما مولانا مسعود اظہر کا ایک مضمون شامل تھا۔ مولانا ان دنوں بھارت کی قید میں تھے مضمون میں لکھا تھا کہ نواز شریف کا مستبد دور اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کو مبارک ہو کہ پاکستان کی معزز افواج نے انتہائی فیصلہ کن مرحلے پر ایک ناگزیر قدم اٹھا کر اور ملک کو بڑی تباہی اور خوفناک انجام سے بچا کر اپنا فرض ادا کر دیا۔ ہم انہیں زبردست خراج تحسین پیدا کرتے ہیں"۔

مسعود اظہر نے مزید لکھا کہ پاکستانی فوج اور علما جو پاکستان اور عقیدہ اسلام کے محافظ ہیں انہیں ملک کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانا ہے۔ انہوں نے ان سیاستدانوں کی نشاندہی کی جو پاکستان کو امریکہ یا روس کی نوآبادی بنانا چاہتے تھے اور گروہی اور نسلی عصبیت کو ہوا دینے والی ان سیاسی جماعتوں کے نام بھی گنوائے جو بھارتی انٹیلی جنس سروس "را" کے ایماء پر کام کر رہی تھیں اور ان جماعتوں کا ذکر بھی کیا جن کا تعلق یہودی لابی سے تھا۔

بغاوت سے دو ماہ بعد مسعود اظہر کو قید سے اس وقت رہائی ملی جب دسمبر 1999ء میں بھارتی ائر لائن کے ایک طیارے کو کھٹمنڈو (نیپال) سے اغواء کرنے کے بعد قندھار (افغانستان) لے جایا گیا۔ 5 مسلح ہائی جیکروں نے مسافروں اور عملے سمیت 155 افراد کو آٹھ روز تک یرغمال بنائے رکھا۔ ہائی جیکروں نے اسکائی ماسک پہن رکھتے تھے۔ بھارت نے ہائی جیکروں کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے مسعود اظہر سمیت 3 قیدیوں کو رہا کر دیا اور اس واقعے کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا لیکن پاکستان نے کوئی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تاہم چند دنوں بعد ہائی کے مطالبے پر بھارت کے رہا کردہ قیدی پاکستان میں نظر آئے۔ مسعود اظہر نے "جیش محمد" کو منظم کرنا شروع کر دیا جو جلد ہی کشمیر کا موثر ترین جنگجو گروہ بن گیا۔ دوسرے رہا شدہ قیدی پر 2002ء میں وال سٹریٹ جرنل کے رپورٹر ڈینیل پرل کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔

اگرچہ مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد پاکستان سے مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ تاہم جلد ہی یہ امر واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک کشمیری حریت پسند اور ملکی اسلام پسند دو مختلف "قبیلے" تھے۔ 2002ء میں تقریباً 18 جنگجو تنظیمیں پاکستان میں بیٹھکر کشمیر میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ مشرف حکومت نے ابتدائی دو سالوں کے دوران ان کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا۔ تاہم بدعنوانی میں ملوث سیاستدانوں اور کاروباری لوگوں کی پکڑ دھکڑ جاری رہی۔ 2001ء میں نئے سال کی آمد کے موقع پر کشمیری جنگ جوؤں کے ایک گروہ نے کچھ بھارتی فوجیوں کے سر قلم کر دیئے۔ جس پر مجاہدین بھارتی مقبوضہ کشمیر کے اندر گھس گئے اور 3 بھارتی فوجیوں کے سر کاٹ کر اپنے ہمراہ لے آئے اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں ایک چوک میں لٹکا دیے۔ پاکستانی فوج کے ترجمان میجر جنرل راشد قریشی نے کہا کہ اس واقعے نے انہیں تو پریشان نہیں کیا تاہم اسے کسی انگریزی اخبار میں شائع نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جب مغربی سفارت کار وہ واقعہ پڑھیں گے تو پاکستان کے بارے میں غلط تاثر قائم کریں گے۔

نائن الیون کے دہشت گرد حملوں کے بعد امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں تبدیلی آئی لیکن وہ تبدیلی کشمیر پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے موقف کو فوری طور پر متاثر نہ کر سکی۔ جس طرح 1992ء میں نواز شریف نے کیا تھا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ کا اتحادی بن جانے کے باوجود جنرل مشرف کشمیر کے اندر جنگ جوئی اور تشدد کے خاتمے کو مسئلہ کشمیر کے حل سے مشروط کرتے رہے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو امریکی جرنیل فیصلہ کن لاجسٹک سپورٹ اور انٹیلی جنس کے حصول کے لئے پاکستان پہنچے۔ جنرل مشرف نے اقتصادی اور عسکری امداد کی بحالی کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد امریکہ کو مطلوبہ تعاون فراہم کر دیا۔

ابتداء میں مشرف پر امید تھے کہ کابل کی نئی حکومت میں پاکستان کے چند موکلین کو بھی کوئی کردار سونپا جائے گا۔ اُدھر آئی ایس آئی نے مستقبل کی کابل حکومت میں "اعتدال پسند" طالبان کی شمولیت کا خیال پیش کر دیا۔ امریکہ نے اپنے طور پر امید باندھ لی کہ شمالی اتحاد کابل کا محاصرہ تو کرلے گا لیکن جب تک اقوام متحدہ افغان حکومت کے اجزائے ترکیبی پر اتفاق

نہ کرے۔ وہ کابل شہر میں داخل نہیں ہوگا۔ اس مرحلے پر صدر جارج ڈبلیو بش نے کشمیر کے حوالے سے مشرف پر کوئی دباؤ نہ ڈالا۔ اسلام پسند امریکہ کے ساتھ اتحاد کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کے احتجاج کا صرف یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ امریکہ کے ساتھ سودے بازی میں مشرف کی پوزیشن مضبوط ہوگئی۔ مشرف نے پاکستانی قوم کو بتایا کہ انہوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ممکنہ امریکی حملے سے محفوظ کرنے کے لئے طالبان کی مدد سے ہاتھ کھینچا۔ انہیں توقع تھی کہ کشمیریوں کی مزاحمتی تحریک امریکہ کی طرف سے کسی قابل ذکر دباؤ کے بغیر جاری رہے گی۔

امریکہ کی مرکزی کمان مشرف کی احسانمند تھی کہ افغانستان کے ساتھ جنگ کے دوران امریکہ کو اڈے دیئے جہاں بیٹھ کر امریکی کاروائیاں کرتے رہے۔ مزید براں پاکستان نے اپنی فضائی حدود بھی امریکہ کے جنگی طیاروں کے لئے کھول دیں۔ امریکہ کی مرکزی کمان کے کمانڈر جنرل ٹومی فرینکس کے مطابق جنرل مشرف نے ایندھن، مواصلاتی رابطوں کے لئے جگہ کی فراہمی اور پاک افغان سرحد کے نزدیک طبی سہولیات سمیت 74 مطالبات پر مشتمل فہرست سے اتفاق کرلیا اور ان "مہربانیوں" کے عوض صرف ایک درخواست کی کہ افغانستان کے خلاف کی جانے والی فوجی کاروائی سے بھارت کو دور رکھا جائے۔ حالانکہ 9/11 کے بعد امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جو مہم منتشکل کی بھارت بھی اس کا حصہ تھا۔ امریکی فوج کو اسقدر مراعات دینے کے بعد مشرف کو امید تھی کہ پاک امریکہ تعلقات ایک مرتبہ پھر اس مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں وہ ایوب خان اور ضیاء الحق کے ادوار میں تھے۔

پاکستان نے "القاعدہ" کے خلاف امریکہ کو جو تعاون پیش کیا اس کے عوض آخر الذکر نے طویل عرصے کے لئے کشمیری جنگجوئی کو نظر انداز کردیا۔ اسلام پسند گروہوں نے پاکستان کے اندر سے بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں حملوں کا سلسلہ یوں جاری رکھا جیسے پاک امریکہ تعلقات سے انہیں کوئی غرض نہ ہو۔ یکم اکتوبر کو جنگجوؤں نے سری نگر میں ریاستی مقننہ کی عمارت پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں 38 افراد ہلاک ہوگئے۔ ان میں سے زیادہ تر سویلین تھے۔ حملے کے فوراً بعد جن لوگوں نے جموں میں اخبارات کے دفاتر میں فون کیے، انہوں نے حملوں کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا تعلق "جیش محمد" سے تھا۔

سری نگر کی مقننہ پر حملے سے اگلے روز پاکستان کے سب سے بڑے اُردو اخبار "جنگ" میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کے مطابق اخبار نے حملہ آور گروہ کے راہنما مسعود اظہر سے رابطہ کیا تو انہوں نے تصدیق کی وہ حملہ واقعتاً "جیش محمد" نے کیا تھا۔ اخبار کے پہلے ایڈیشن میں مسعود اظہر کے ایک بیان کا حوالہ موجود تھا جس میں انہوں نے کہا تھا "ہم بھارتی دہشت گردی کا جواب دہشت گردی سے ہی دیں گے۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخی کامیابی ہے"۔ لیکن اخبار کے دوسرے ایڈیشن میں سے وہ کہانی غائب تھی۔ اگلے روز "جیش محمد" نے مذکورہ بالا حملے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا۔ آئی ایس آئی کے جو وابستگان "جیش محمد" کو کنٹرول کررہے تھے انہوں نے مسعود اظہر سے کہا ہوگا کہ مشرف امریکہ کے ساتھ معاشی اور عسکری امداد کے لئے مذاکرات کررہے ہیں۔ لہذا وہ اپنا لہجہ دھیما رکھیں۔

دوسرا حملہ 13 دسمبر کو ہوا۔ اس مرتبہ نئی دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ کی عمارت کو ہدف بنایا گیا تھا۔ دوسرے حملے کے نتائج سنگین تر تھے۔ بھارت کے خیال میں دارالحکومت کے قلب پر ہونے والا حملہ آغاز جنگ پر اکسانے کے لئے کافی تھا۔ بھارت نے پاکستان کے ساتھ اپنی 1800 میل طویل سرحد پر کئی ڈویژن فوج اور میزائل بیٹریاں تعینات کر دیں۔ کئی سکواڈرن جنگی طیارے مستعد اور چوکس ہو گئے۔ غرضیکہ جنگ سر پر آن پہنچی۔ ردعمل کے طور پر مشرف نے ابتداء میں لشکر طیبہ کے 50 ارکان کی گرفتاری کا اعلان کیا۔ بھارت نے اسی گروہ کو پارلیمنٹ پر حملے کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ لیکن بھارت نے کہا کہ اقدامات وہ بناوٹی تھے۔ پھر لشکر طیبہ کے راہنما حافظ محمد سعید اور "جیش محمد" کے راہنما مسعود اظہر کی گرفتاری کا اعلان کیا گیا۔ لیکن بھارتی وزیراعظم واجپائی نے کہا کہ جب تک پاکستان اسلامی جنگجو گروہوں کی سرکوبی نہ کرے وہ اس کے ساتھ کسی قسم کے مذاکرات پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

مشرف نے 12 جنوی 2002ء کو "پالیسی تقریر" کی اور چند جنگجو گروہوں پر پابندی عائد کر دی اور اعلان کیا کہ وہ کشمیر کے نام پر بھی دہشت گردی کی اجازت نہیں دیں گے۔

مذکورہ خطاب کے ساتھ جب امریکی سفارت کاری شامل ہوئی تو امید پیدا ہوگئی کہ پاک بھارت مراسم میں در آنے والے کھنچاؤ میں کمی آ جائے گی۔ پاکستانی حکام نے کئی سو جنگجوؤں کو گرفتار کر لیا اور چند دن بعد رہا بھی کر دیا۔ حافظ سعید اور مسعود اظہر بھی چند روز حراست کے بعد ایک مرتبہ پھر اپنے اپنے حلقوں میں واپس آ گئے۔ یہ امر واضح ہو گیا کہ آئی ایس آئی اپنے جہادی ساتھیوں کو طویل عرصہ جیل میں رکھ کر انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس صورت حال پر ایک امریکی رپورٹر نے لکھا "اگر صدر مشرف ان گروہوں کے خلاف کریک ڈاؤن میں مخلص بھی ہوں تو یہ بات یقینی نہیں کہ وہ ان پر کنٹرول حاصل کر لیں گے یا پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کے ان حصوں کی طرف سے انہیں بدستور حمایت ملتی رہے گی جنہیں کشمیر کا زیپاری ہے"۔

اگرچہ مشرف دہشت گردی کے خلاف امریکہ کا قابل اعتماد اتحادی ہونے کا تاثر پیدا کر رہے تھے تاہم وہ بھارت کے خلاف جہاد کو ملنے والی پاکستانی فوج کی مستقل حمایت سے یکسر دست برداری پر رضامند نہیں تھے۔ انہوں نے "واشنگٹن پوسٹ" کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران اپنے خیالات کی وضاحت کی اور پاکستان کو درپیش جنگ ہوئی کے مسئلے کے مختلف عناصر کے درمیان پائے جانے والے فرق اور امتیاز کو واضح کیا اور اپنے اس موقف پر زور دیتے رہے کہ کشمیری جنگ جو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے کہا:-

"دہشت گردی کے 3 عناصر نے دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ پہلا عنصر تو القاعدہ ہے۔ دوسرا عنصر وہ جسے بھارت سرحد پار سے ہونے والی دہشت گردی قرار دیتا ہے جبکہ ہمارے نزدیک وہ کشمیر کو آزاد کرانے کی جدوجہد ہے۔ تیسرا عنصر شیعہ سنی

انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی ہے۔ تیسرا عنصر ہمارے لیے نسبتاً زیادہ فکر مندی کا باعث ہے اور بدقسمتی سے دنیا کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن ہمارے لیے یہ بہت بڑی پریشانی ہے کیونکہ یہ ہمیں اندرونی عدم استحکام سے دوچار کر رہا ہے"۔

مشرف نے وعدہ کیا کہ پاکستان کے اندر جو غیر ملکی داخل ہوگا اسے نکال باہر کیا جائے گا۔ انہوں نے اس امر پر بھی فخر کا اظہار کیا کہ امریکہ کی نسبت پاکستان نے "القاعدہ" کے زیادہ ارکان کو گرفتار کیا۔ مارچ 2002 میں پاکستان نے اسامہ بن لادن کے ایک اہم کمانڈر ابوزبیدہ کو گرفتار کرنے کے بعد امریکہ کے حوالے کر دیا۔ اس گرفتاری نے امریکہ کو متاثر کیا اور مشرف کے خیال میں لائن آف کنٹرول کے گردوپیش میں جاری سرگرمیوں سے امریکی توجہ ہٹانے کے لیے وہ کارنامہ کافی تھا۔ انہوں نے کہا۔ "لائن آف کنٹرول کے اُس پار کچھ نہیں ہو رہا"۔ انہوں نے اس الزام کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ پاکستان بھارت کے خلاف دہشت گردی میں کوئی کردار ادا کر رہا تھا۔ مشرف نے واضح طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ ملک کے اندر فرقہ وارانہ دہشت گردی کو ختم کرنا ان کی اولین ترجیح رہے گی۔

مشرف نے اس بات کا بھی واضح اظہار کر دیا کہ وہ بھارت کو پسند یا اس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار اور کشمیر کو علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔ اسکے بعد کشمیر میں جو کچھ ہوگا۔ وہ اسے اپنی قوت سے کچل دے گا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا بھارت اپنی ہمسائیگی میں ایک مستحکم اور جدّت پذیر پاکستان کو پسند یا برداشت کرے گا تو ان کا جواب تھا۔ "بالکل نہیں۔ وہ ایک فدوی قسم کا پاکستان چاہتا ہے جو فرماں برداری کا مظاہرہ کرتا رہے"۔ مشرف کے جو خیالات جنگ کارگل کے وقت تھے۔ ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک روایتی جنگ کے نسبتاً سستے متبادل کے ذریعے پاکستان کو عسکری تناظر میں بھارت کا ہم پلہ بنانے کا عزم رکھتے تھے۔ وہ عالمی برادری، بالخصوص امریکہ کی نظر میں اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے بدستور مصر تھے کہ پاکستان مجاہدین کو کوئی مادی مدد فراہم نہیں کر رہا۔

پاک بھارت تعلقات مئی 2002ء میں اس وقت مزید کشیدگی کا شکار ہو گئے جب بھارت نے ایک دہشت گرد حملے کے خلاف احتجاج کے طور پر پاکستانی سفیر کو نکال دیا۔ پھر دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان توپوں کے گولوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ کیونکہ موسم گرما میں کشمیر کے پہاڑی محاذ کو عبور کرنا نسبتاً آسان ہو گیا۔ لہذا جنگ جوؤں نے حملوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ اس پر بھارت نے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ پاکستان کو "دہشت گرد ریاست" قرار دیدے۔

امریکہ نے جنوبی ایشاء میں بحالی امن کے لئے مداخلت کی۔ پاکستان کو اس وقت 5 سالوں پر محیط 3 ارب ڈالرز کی امریکی امداد کا پیکج دیا جا چکا تھا۔ امریکہ نے ضروری سمجھا کہ پاکستان اور بھارت کو جنگ کے دہانے سے واپس لانے کے لئے مذکورہ بالا امداد کی آڑ میں مشرف پر اپنا رسوخ استعمال کرے۔ امریکہ کے ڈپٹی سیکرٹری آف سٹیٹ رچرڈ آرمیٹج جون

میں برصغیر پہنچے اور مشرف سے وعدہ لیا کہ وہ سرحد کے اس پار مداخلت سے ہمیشہ اجتناب برتیں گے۔ اس دوران بھارت سے کہا گیا کہ وہ ایفائے عہد کا انتظار کرے اور کشیدگی میں اضافے سے گریز کرے۔ اڑھائی ماہ بعد آرمیٹج کو ایک مرتبہ پھر اسلام آباد اور نئی دہلی جانا پڑا کیونکہ بھارت کے زیر انتظام کشمیر کے اندر جنگجوؤں کے حملے مکمل طور پر ختم نہیں رکے تھے۔

جہادیوں کو کنٹرول کرنے کے پاکستانی دعووں کے باوجود انہوں نے اپنی مصروفیات ترک نہ کیں۔ مشرف کے ناقدین کے خیال میں چند ایک مذہبی انتہا پسندوں کو جیل بھیجنے کے بعد باقیماندہ کو اول الذکر نے چھوا تک نہیں۔ کیونکہ انہیں خوف لاحق تھا کہ اس طرح دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مذہبی راہنما بوقت ضرورت ان کا ساتھ نہیں دینگے۔ حکومت نے دکھاوے کے لئے جنگ جو گروہوں پر پابندی عائد کی۔ کچھ مذہبی راہنماؤں کو پس دیوار زنداں بھی بھیجا گئیں۔ چند دنوں بعد وہی گروہ مختلف ناموں کے ساتھ ملکی سیاست کے افق پر ایک مرتبہ پھر نمودار ہو گئے۔ ان دنوں "واشنگٹن پوسٹ" نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا:-

"متعدد جہادی تنظیموں نے اپنے آپ کو از سر نو منظم کر لیا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر فنڈز اکٹھے کرنے اور لوگوں کو بھارت اور مغرب کے خلاف جہاد کے لئے تیار کرنے میں مصروف ہیں"۔

یہ وعدے بھی کریک ڈاؤن کے وعدوں کے مماثل تھے۔ کبھی کبھار چھوٹا موٹا ایکشن لے لیا جاتا اور 10 سال قبل نمودار ہونے والے جہادی ایک مرتبہ پھر تقویت حاصل کر لیتے تھے۔

نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے نامکمل ادوار حکومت کے مقابلے میں مشرف دور میں امریکہ اور پاکستان کے تعلقات نسبتاً زیادہ قریبی اور خوشگوار رہے۔ پاکستان ہر چند ماہ بعد کسی اہم موقع پر "القاعدہ" کی کسی نہ کسی اہم شخصیت کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ستمبر 2002ء میں رمزی بن الشب کو کراچی سے گرفتار کیا گیا۔ وہ نائن الیون کے حوالے سے امریکہ کو مطلوب تھا۔ یکم مارچ 2003ء کو پاکستان نے اعلان کیا کہ خالد شیخ محمد کو راولپنڈی سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون سمیت "القاعدہ" کے متعدد دہشت گرد حملوں کی منصوبہ بندی کی تھی۔ یہ دونوں بڑی گرفتاریاں اس وقت عمل میں آئیں جب امریکی پالیسی ساز کشمیری بغاوت کی حمایت کرنے اور افغان سرحد کے ساتھ طالبان کی باقیات کو پناہ دینے پر پاکستان سے ناراض نظر آ رہے تھے۔ خارجہ تعلقات پر امریکی سینیٹ کی کمیٹی کے دو سنیئر ترین ارکان نے جب طالبان جنگ جوؤں کی پاکستان میں موجودگی پر پریشانی کا اظہار کیا تو انہوں نے واضح لفظوں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ مشرف عدم استحکام کی سرگرمیوں سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔

مشرف نے آرمیٹج کے ساتھ جو وعدہ کیا۔ بظاہر اسے ایفا کیا اور 2003ء کے موسم گرما کے بعد بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں گھسنے والے جنگ جوؤں کی تعداد میں قابل ذکر کمی واقع ہوئی۔ اب یہ بھارت کا کام تھا کہ اپنے حصے کا وعدہ

ایفا کرتا اور دوطرفہ مذاکرات کا دوبارہ آغاز ہو جاتا۔ گیارہ دن بعد دسمبر میں مشرف پر ہونے والے دو عدد قاتلانہ حملوں نے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا۔ جن چند جنگ جوؤں کو جہاد کشمیر میں خدمات سرانجام دینے کے عوض آئی ایس آئی کی طرف سے تحفظ حاصل تھا۔ ان کا القاعدہ کے ساتھ اس سے زیادہ تعلق تھا جتنا پاکستانی حکام نے تسلیم کیا تھا۔ بے لچک نظریات کے حامل یہ جہادی ستمبر 2001ء کے بعد پاکستان کے اندر متعدد دہشت گرد حملوں کے ذمہ دار تھے۔ اب چونکہ ان بے قابو جنگ جوؤں نے پاکستان کے آرمی چیف کو ہلاک کرنے کی کوشش بھی کر ڈالی۔ لہذا انہیں۔ ہدف بنانا ناگزیر ہو گیا۔ اس کے بعد پاکستانی حکام نے فرقہ واریت کے حامی بے قابو جنگ جوؤں کو بڑی تعداد میں ہلاک یا گرفتار کیا۔

پھر بھی کئی جنگ جو آزاد پھرتے رہے۔ آئی ایس آئی نے "لشکر طیبہ کے حافظ محمد سعید "جیش محمد" کے مولانا مسعود اظہر اور "حرکت المجاہدین" کے مولانا فضل الرحمان خلیل جیسے جہادی راہنماؤں کو غیر معینہ عرصے کے لئے غیر فعال ہونے کے عوض بھاری رقوم ادا کرنا پڑیں۔

مولانا فضل الرحمٰن خلیل کا معاملہ خصوصی دل چسپی کا حامل ہے۔ اسامہ بن لادن نے 1998ء میں امریکہ کے خلاف جو فتویٰ جاری کیا تھا۔ اس پر مولانا خلیل کے دستخط بھی موجود تھے اور وہ مبینہ طور پر اس کیمپ میں بھی موجود تھے جس پر امریکہ نے 1998ء میں کروز میزائلوں سے حملہ کیا تھا۔ یکم جنوری 2004ء کو "لاس اینجلس ٹائمز" نے اپنے اداریے میں لکھا کہ حکومت کی طرف سے ان پر اور ان کی تنظیموں پر پابندی عائد کئے جانے کے باوجود وہ کھلم کھلا فعال رہے۔ اخبار لکھتا ہے:-

" کئی سال قبل امریکی کروز میزائلوں کا معاملہ بھی مقدس جنگ کے ساتھ فضل الرحمٰن کی وابستگی کو متاثر نہ کر سکا۔ پاکستانی حکومت نے ان پر دو مرتبہ پابندی عائد کی لیکن وہ یہودیوں اور امریکہ کے خلاف پروپیگنڈے سے باز نہ آئے۔ خلیل جنہوں نے 1998ء میں اسامہ بن لادن کے اس فتوے پر دستخط کئے تھے جس کے تحت امریکیوں اور یہودیوں کو ہلاک کرنا مسلمانوں کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ کسی خفیہ غار میں بیٹھ کر مقدس جنگجوؤں کی راہنمائی نہیں کر رہے بلکہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دارالحکومت اسلام آباد کے نواحی شہر میں اپنے لڑکیوں کو قرآن کی تعلیم دینے والے ادارے اور دکان سے متصل عمارت میں ایک پولیس چوکی سے مختصر فاصلے پر پرآسائش زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ابھی تک اپنے مقلدین کو امریکہ کے خلاف لڑنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ خلیل اور ان کی تنظیم کی تازہ ترین تجسیم "جماعت الانصار" (مددگاروں کا گروہ) نومبر 2003ء میں حکومت کی طرف سے عائد کردہ تازہ ترین پابندی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہی ہے۔ وہ اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے ایک امریکہ مخالف ماہانہ رسالے 'الہلال' کے صفحات کو استعمال کرتے ہیں۔ جس کے سرورق پر مولانا خلیل کا نام سرپرست اعلیٰ کے طور پر چھپتا ہے۔ وہ اس رسالے کے ذریعے فنڈز اکٹھے کرتے ہیں۔ اپنے حامیوں کو اجلاس اور دیگر سرگرمیوں کی اطلاع دیتے ہیں اور افغانستان اور عراق میں امریکی فوجوں کے خلاف لڑنے کے لئے رضا کار بھی اسی رسالے کے ذریعے بھرتی کرتے ہیں"۔

خلیل کی "حرکت الانصار" پر 1995ء میں پابندی عائد کر دی گئی تو انہوں نے "حرکت المجاہدین تشکیل دے لی "حرکت المجاہدین" پر پابندی عائد ہوئی تو "جماعت الانصار" میدان عمل میں نکل آئی۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد خلیل یا اُن کے پیروکاروں کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی بجائے آئی ایس آئی نے "لاس اینجلس ٹائمنر" کے پاکستانی رپورٹر کو دھمکانا شروع کر دیا۔ بالآخر مولانا خلیل کو اگست 2004ء میں گرفتار کر لیا گیا اور اس گرفتاری کی خوب تشہیر کی گئی۔ لیکن صرف 7 ماہ بعد انہیں بڑی خاموشی سے رہا کر دیا گیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کچھ ارکان کے لئے اسلام پسندوں کے ساتھ دو عشروں تک قومی ہیروز جیسا سلوک کرنے کے بعد انہیں ملک دشمن سمجھنا بہت مشکل کام تھا۔ رپورٹر ڈینیل پرل کے اغواء اور قتل کا ایک ملزم کراچی پولیس کی سپیشل برانچ میں ملازم تھا۔ نیم فوجی رینجرز کے ایک رکن پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے اس گروہ کے ساتھ ملکر مشرف کو قتل کرنے کی سازش کی جو کراچی میں امریکی قونصلیٹ میں بم دھما کے کا ذمہ دار تھا۔ کچھ جونیئر فوجی افسران مشرف کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث پائے گئے جو آخری وقت پر طشت از بام ہو گئی۔ جہادی گروہوں کے وجود کو برداشت کرنے کے باعث ملک کے اندر نفاذ قانون کی راہ مین عمومی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بلکہ نفاذ قانون عملاً غیر موثر ہو کر رہ گیا۔ مشرف خود تسلیم کر چکے ہیں کہ:۔

"پاکستان ایک ایسی نرم ریاست میں بدل چکا ہے جہاں قانون کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی"۔ فرقہ وارانہ اور گروہی و نسلی عصبیت کے تحت قتل اور بلا مقصد بم دھماکے گذشتہ کئی سالوں سے اس ملک میں معمول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کم از کم 50 لاکھ کی تعداد میں چھوٹے ہتھیار پاکستان میں نجی ہاتھوں میں ہیں۔ ان میں قابل ذکر ترین کلاشنکوف رائفل ہے۔ روس مخالف افغان مزاحمت کے دوران اس ہتھیار کے عام استعمال کا مشاہدہ کیا گیا۔

جنرل مشرف اگر کسی مرحلے پر اسلامی جنگ جوئی کے خاتمے کی ٹھان بھی لیں تو بھی دہشت گردوں کے نیٹ ورک کے مکمل خاتمے پر کئی سال صرف ہو جائیں گے۔ پولیس اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذرائع ان پر ڈالے جانے والے بوجھ کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں۔ انہیں فوجی حکومت اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ ان کا کام صرف جرائم اور دہشت گردی کے واقعات پر نظر رکھنا ہی نہیں ہوتا۔ دہشت گردوں کو اس ریاستی کمزوری کا علم ہوتا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

پاکستان کے اسلام پسندوں اور آئی ایس آئی میں ان کی پشت پناہی کرنے والوں کے خیال میں جہاد کو صرف معطل کیا گیا ہے۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ افغانستان اور کشمیر میں پاکستان کا ایجنڈا ابھی تشنہ تکمیل ہے اور چونکہ اقتصادی اور عسکری اعتبار سے پاکستان زیادہ مضبوط ملک نہیں۔ لہذا اس کے پاس اسلام پسندوں کو ساتھ ملا کر روائتی طریق جنگ کے سوا کوئی متبادل نہیں۔ جس طرح بھارت مخالف بڑے جہادی گروہوں نے اپنا ڈھانچہ برقرار رکھا ہوا ہے کہ مستقبل میں جب چاہیں فعال ہو جائیں۔ اسی طرح طالبان نے بھی 2005ء میں موسم بہار کے دوران پاکستان کے اندر محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش

کا سلسلہ جاری رکھا۔ افغان اور امریکی حکام اکثر و بیشتر شکایت کرتے رہے کہ پاکستان کے سرحدی علاقوں میں طالبان ابھی تک تربیت حاصل کر رہے ہیں اور از سر نو منظم ہو رہے ہیں۔

جنوری 2004ء میں جب اسلام آباد سارک سربراہ کانفرنس کے موقع پر مشرف اور واجپائی کی ملاقات کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان حصول امن کا عمل بحال ہو گیا تو پاکستانی و کشمیری جنگجو اور طالبان دونوں نسبتاً خاموش ہو گئے۔ امریکہ کی طرف سے حوصلہ افزائی کے بعد بھارت اور پاکستان کے درمیان وہ جامع مذاکرات بحال ہو گئے جنکا 1999ء میں نواز شریف اور واجپائی نے آغاز کیا اور بعد میں کارگل بحران کے باعث ان میں تعطل پیدا ہو گیا۔ اپریل 2002ء میں بھارت اور پاکستان کے زیر انتظام "کشمیروں" کے درمیان بس سروس کا آغاز ہوا جسے ایک بڑے "بریک تھرو" کا نام دیا گیا۔ تاہم کسی نہ کسی مرحلے پر بھارت اور پاکستان کو کشمیر کی حیثیت کے حتمی تعین کے لئے آپس میں گفت و شنید کرنا پڑے گی۔

مشرف کا بھارت کے ساتھ رویہ جس قدر صلح جویانہ آج ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ پاکستان کشمیر کے کسی علاقائی تقسیم پر مبنی سمجھوتے کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ ادھر بھارت نے بھی صاف بتا دیا ہے کہ کشمیر کے حوالے سے سرحدوں کا دوبارہ تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ حصول امن کا تازہ ترین عمل اور جہادیوں کی عدم فعالیت جنوبی ایشیاء میں پائیدار امن پر منتج ہوں گے۔

مشرف حکومت نے امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات کے قیام کے لئے تمام اقدام بڑی احتیاط سے اٹھائے ہیں اور اس کے "روشن خیال اعتدال پسندی" کے نعرے کو بھی امریکی حمایت میسر آئی ہے۔ پاکستان نے پاک افغان سرحد کے ساتھ متصل قبائلی علاقوں میں "القاعدہ" کی باقیات کا صفایا کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے اُن باقیات میں بن لادن اور اس کا نائب اعلیٰ ایمن الظواہری بھی شامل ہیں۔ کئی ماہ پاکستانی فوج وقفے وقفے سے پاکستانی قبائلیوں اور غیر ملکی جنگ جوؤں کے خلاف لڑتی رہی۔ فی الوقت یہ آپریشن ختم ہو چکا ہے۔ پاکستانی فوجی کچھ چیچنوں اور ازبکوں کو ہلاک کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن "القاعدہ" کی اعلیٰ قیادت ابھی تک ان کی دسترس سے باہر ہے۔

صدر بش نے مشرف کو ایک "جراتمند راہنما" کا نام دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے "القاعدہ" کے دہشت گرد نیٹ ورک کے خلاف کریک ڈاؤن کے دوران اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی۔ امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ کونڈولیزا رائس مارچ 2005ء میں پاکستان آئیں اور کہا:-

"پاکستان نے طویل فاصلے طے کر لئے ہیں۔ نہ تو یہ نائن الیون والا پاکستان ہے اور نہ ہی 2002ء والا پاکستان رہ گیا ہے"۔ امریکی حکام نے اکثر و بیشتر اس یقین کا اظہار کیا کہ پاکستان نے ایک معرکہ سر کر لیا ہے اور اب اس پر امریکی

اتحادی کے طور پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے جوہری سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جوہری اسلحے کی تیاری کی تکنیک لیبیا، ایران اور شمالی کوریا کو منتقل کی تو امریکہ نے اسے نظر انداز کر دیا اور مشرف کا کسی حد تک نا قابل یقین موقف تسلیم کر لیا کہ جوہری تکنیک کی فروخت کچھ لوگوں کا انفرادی فعل تھا اور پاکستان کا بطور ریاست اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ امریکہ ایک مرتبہ پھر پاکستان کے گلاس " کو آدھا خالی " سمجھنے کی بجائے " آدھا بھرا ہوا " سمجھنا چاہتا تھا۔

پاکستانی فوج کے لئے یہ ایک خوش آئند چیز تھی۔ امریکہ کے ساتھ دوستانہ اور گہرے تعلقات کے نتیجے میں پاکستان جدید عسکری ساز و سامان بھی حاصل کر سکتا تھا اور پاکستان کی جانب امریکی امداد کے بہاؤ میں بھی تیزی آسکتی تھی۔ جس طرح ماضی میں متعدد مرتبہ کیا گیا۔ بھارت دشمنی سے بھی وقتی طور پر صرف نظر کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان چاہتا تھا کہ اسلامی روایت پسندی کا چیمپئن بننے کی بجائے "اعتدال پسند اسلام" کا نعرہ بلند کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اس طرح پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کا یہ روایتی نظریہ بھی عملی شکل میں سامنے آجاتا کہ پاکستان کو ایک ایسی ریاست یا ملک بنا دیا جائے جہاں فوج کو برتری حاصل رہے۔

نتیجہ

نظریاتی ریاست سے فعال ریاست تک

ایک ایسی ریاست بننے کی کوشش میں جسے بااختیار فوج کی راہنمائی دستیاب رہے، پاکستان نے خصوصاً گذشتہ دوعشروں کے دوران، خود کو اعتدال سے متجاوز ثابت کیا۔ پاکستان کے ارتقاء میں اس امر کو کبھی بڑا ایشو نہیں سمجھا گیا کہ ایک عام شہری اسلام کے ساتھ وابستہ ہے یا نہیں۔ عام معمولات کے عادی مسلمان گاہے بگاہے بیلٹ بکس کے ذریعے اپنی خواہش کا اظہار کرتے رہے کہ وہ نتائجیت کے حامل معاشی اور سیاسی نظریات اپنانا چاہتے ہیں۔ امکان غالب ہے کہ زیادہ تر پاکستانی ایک ایسی ریاست پر قناعت کرلیں گے جو ان کی سماجی ضروریات پوری کر سکے اور ان کے مذہبی شعائر کی ادائیگی کے حق کو احترام اور تحفظ فراہم کرے اور صرف اسلام ہی کو اس کا جواز وجود خیال نہیں کریں گے۔ پاکستان کو اسلامی نظریے یا عقیدے کا مثالی نمونہ بنانے کی کاوشوں میں سب سے بڑے محرک کے طور پر پاکستانی فوج کی یہ خواہش کارفرما رہی کہ ملک کے سیاسی نظام پر بھی اس کا تسلط قائم رہے اور ملکی سلامتی کی حدود اور ان کی ترجیحات کا تعین بھی اسی کی ذمہ داری ہو۔

ایک بڑے ملک سے الگ ہو کر نئی ریاست کے طور پر معرض وجود میں آنے کے بعد پاکستان کو اپنی زندگی کے ابتدائی چند سالوں کے دوران متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی سلامتی کے بارے میں پاکستان کے کچھ خدشات یا تفکرات کی نوعیت حقیقی تھی۔ مثلاً بھارت کے مقابلے میں اس کے پاس ایک "قابل اعتماد ڈیٹرنٹ" کا ہونا ناگزیر تھا لیکن ملک کے اندر پاکستانی فوج کی برتری کے حصول کی خواہش نے پاکستانی قوم کے احساس عدم تحفظ پر نفسیاتی اور سیاسی تہیں چڑھا دیں اور پاکستان میں ملاؤں اور فوج کے درمیان اتحاد نے نہ صرف عدم تحفظ کے اس احساس کو برقرار رکھا بلکہ ان نفسیاتی اور سیاسی خدشات کو سنگین تر بنانے میں بعض اوقات مبالغے سے بھی کام لیا۔ اس طرح سیاسی اختیارات پر تسلط کے لیے اس

اتحاد نے اسلام پسندوں اور جرنیلوں کی بیک وقت مدد کی۔ پاکستانی فوج کو ملنے والی امریکی امداد نے پاکستان کے کمزور اور سیکولر سول معاشرے کے لیے اپنے وجود کا احساس دلانا دشوار بنا دیا اور پاکستان کے شہریوں کے لیے اسلامی نظریے کے نعروں کے طلسم سے نکل کر اپنے اصل اور حقیقی مسائل پر توجہ مرکوز کرنا ممکن نہ رہا۔

امریکہ کے خیال میں پاکستان کے پاس سیاسی متبادلات کا فقدان تھا۔ اگرچہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کا اتحادی ہے۔ تاہم اسے دوست یا دشمن قرار دینا آسان نہیں۔ پاکستان اسلام پسندوں کے انتہا پسندانہ نظریات اور انتہا پسند گروہوں کا ایک بڑا مرکز بن چکا ہے۔ جس کی بڑی وجہ جموں و کشمیر میں بھارتی حاکمیت کے ساتھ نبرد آزما اسلام پسند جنگجوؤں کی حمایت پر مبنی وہ پالیسیاں ہیں جو اس نے ماضی میں اپنائے رکھیں۔ دوسرے وہ افغانستان میں اپنی موکل حکومت کی تشکیل کے لئے طالبان کو مدد فراہم کرتا رہا۔ تاہم نائن الیون کے بعد پاکستان کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے بعض مخصوص معاملات میں امریکہ کو تعاون پیش کیا۔ اس کے ساتھ انٹیلی جنس شیئر کی اور القاعدہ کے متعدد ارکان کو گرفتار کیا۔ پاکستانی جرنیل کے اقدامات یہ مفروضہ قائم کرنے میں ممد ثابت ہو رہے ہیں کہ ممکن ہے پاکستان انتہا پسند اسلام کے ساتھ اپنے دیرینہ مراسم منقطع کرے۔ دوسری طرف امریکہ بھی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ پاکستان ایک ایسی اسلامی نظریاتی ریاست ہے جس کی جڑیں تاریخ سے جا ملتی ہیں اور ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے پاکستانی فوج کی خواہش اقتدار اور پاکستانی اشرافیہ کے فلسفہ زندگی کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔

قابل قیاس مستقبل تک پاکستان کی سیاست میں اسلام ایک قابل ذکر محرک کے طور پر موجود رہے گا۔ مشرف اور فوج میں ان کے متوقع جانشین اصلاحات کے وعدے وعید بھی کرتے رہیں گے اور انہیں امریکی اقتصادی و عسکری امداد بھی بدستور درکار رہے گی۔ تاہم انتہا پسند اسلام پسندوں اور پاکستان کی ملٹری انٹیلی جنس کے درمیان قریبی تعلقات ان وعدوں کی مضبوطی کو متاثر کرتے رہیں گے۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی سربراہی میں لڑی جانے والی جنگ کے تناظر میں امریکہ کے لئے یہ امر حد درجہ اہمیت کا حامل ہے کہ پاکستان مستقبل میں کون سی سمت اختیار کرے گا۔ جس کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ پاکستان جوہری صلاحیت کا حامل ملک ہے۔ اسلام پسندوں اور پاکستانی فوج کے درمیان اتحاد دہشت گردی کے خلاف قلیل المیعاد اقدامات کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ عالمگیر سطح پر اسلامی انتہا پسندی کا پھیلاؤ اور پاک بھارت کشیدگی میں اضافے کی کوششیں اس جنگ کو غیر موثر کر کے رکھ دیں گی۔ جب تک پاکستان کی ہمہ مقتدر فوج کو قائل نہ کیا جائے کہ وہ اختیارات سیکولر سویلین قیادت کو مرحلہ وار منتقل کر دے اور اقتصادی مقابلوں اور علاقائی مفادات پر مبنی سیکولر سیاست کو پنپنے اور اسے مذہبی جذبات پر غالب آنے کی اجازت دے۔ ملک پر انتہا پسندانہ اسلامی سیاست کا چھا جانا یقینی ہو گا۔ حکومت پاکستان امریکی حکومت کی طرف سے ملنے والی مدد کے بل بوتے پر آئندہ کئی سال تک استحکام کا ایک جعلی تاثر دینے میں کامیاب ہوتی رہے گی۔ لیکن امریکی

معاونت کے نتیجے میں قوی تر ہونے والی فوج چاہے گی کہ ملک کے اندراسے برتری حاصل رہے۔اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسے جواز حکمرانی درکار ہوگا اور چونکہ جواز حکمرانی اسے صرف اسلام پسندوں سے حاصل ہوسکتا ہے لہذا فوج انہیں مراعات دیتی رہے گی۔امریکہ پاکستان کی مدد اس لئے کر رہا ہے کہ آخرالذکر اسلامی انتہاپسندی سے مرحلہ وار نجات حاصل کرلے۔تاہم اس عمل کے دوران فوج کی سیاسی خواہشات کی حوصلہ افزائی ہورہی ہے۔ہر قسم کی تبدیلی پر سمجھوتے ہورہے ہیں اور انقلابی اور انتہاپسندوں کا رسوخ برقرار رہنے کے واضح امکانات موجود ہیں۔ان کے رسوخ کو کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایسی جمہوری اصلاحات نافذ کی جائیں جن کے تحت سیکولر سیاستدان حصول اقتدار کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرنے میں آزاد ہوں۔

1947ء میں پاکستان کی آزادی کے بعد عسکری صلاحیت اور غیر ملکی اتحادوں پر توجہ مرکوز کرنے کے باعث پاکستان اندرونی طور پر کمزور ہوا۔سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے لیکر عدلیہ تک تمام ملکی ادارے عمومی انحطاط کا شکار ہیں۔معیشت کی حیران کن ترقی کا زیادہ تر انحصار غیر ملکی ذرائع کے بلا رکاوٹ بہاؤ پر ہے۔پاکستان کی جی ڈی پی کا حجم 75 ارب اور قوت خرید 295 ارب ڈالرز ہے۔جن ممالک نے کامیاب جوہری تجربے کئے ہیں ان سب کے مقابلے میں پاکستانی معیشت کا حجم کم ہے۔پاکستان کے شہری علاقوں میں بے روزگاری عروج پر ہے۔دیہی علاقوں میں اجیروں کو مناسب اجرت نہیں دی جاتی۔ناخواندگی کا دوردورہ ہے اور فی کس آمدنی بھی بہت کم ہے۔پاکستان کی ایک تہائی آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کررہی ہے۔جب کہ 21 فیصد آبادی مذکورہ لکیر سے ذرا سا اوپر ہے۔

آزادی کے فوراً بعد پاکستان میں خواندگی کی شرح 16 اعشاریہ 4 فیصد جبکہ بھارت میں یہی شرح 18 اعشاریہ 3 فیصد تھی۔ بھارت کی آبادی بھی قابل ذکر حد تک زیادہ تھی۔2003ء تک بھارت میں شرح خواندگی 65 اعشاریہ 3 فیصد ہوگئی جبکہ پاکستان اس وقت تک 35 فیصد سے اوپر نہ جاسکا۔پاکستان اپنی جی ڈی پی کا 2 فیصد سے بھی کم تعلیم کے لئے مختص کرتا ہے۔ترتیب نزولی کے اعتبار سے پاکستان ان آخری چند ملکوں میں سے ایک ہے جو پرائمری تعلیم کے لئے کم رقم مختص کرتے ہیں۔کم شرح خواندگی کے باعث تکنیکی اعتبار سے پاکستان کمزور پڑ چکا ہے۔یہ کمزوری ملک کی اقتصادی ترقی اور حصول جدیدیت کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔پاکستان کی آبادی 2 اعشاریہ 7 فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔صحت عامہ کی سہولتوں اور دیگر سماجی خدمات کی حالت تسلی بخش نہیں۔مزید براں پاکستان اپنی جی ڈی پی کا 5 فیصد دفاع پر خرچ کررہا ہے۔اس کے باوجود اس کی روایتی عسکری قوت بھارت کے مقابلے میں قابل ذکر حد تک کم ہے۔بھارت اپنی جی ڈی پی کا صرف 2 اعشاریہ 5 فیصد فوجی ضروریات پر خرچ کرتا ہے۔

پاکستان کے اندرونی معاملات پر فوج کے تسلط کا باعث وہ حالات ہیں جن کا آزادی کے بعد چند سالوں کے دوران اسے سامنا کرنا پڑا۔تاہم اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔اگر پاکستان کو ایک نارمل

ریاست بنانا مقصود ہے تو سیاسی زندگی سے منصوبہ بندی کے تحت فوج کو مرحلہ وار دست بردار ہونا پڑے گا۔ تقسیم کے وقت پاکستان کو برطانوی ہندوستان کے عسکری اثاثوں کا ایک تہائی حاصل ہوا جبکہ محصولات میں صرف 17 فیصد اس کے حصے میں آیا۔ اس طرح فوج نے ایک نئی ریاست میں برتر حیثیت حاصل کر لی اور یہ برتری برقرار رہی۔ 1958ء میں جب جنرل ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کرنے کے بعد اقتدار حاصل کیا۔ اس وقت سے لیکر آج کے دن تک پاکستانی سیاست پر فوج بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر حاوی چلی آ رہی ہے۔ پاکستان کے نظریاتی اور سیاسی ایجنڈے کے علاوہ ملکی سیاست کا رخ بھی فوج ہی متعین کرتی ہے۔ ملکی آئین بار بار تحریر کیا جاتا رہا اور اس کے باوجود 4 مرتبہ بظاہر پائیدار اور دیرپا جمہوریت کے قیام کی خاطر جرنیلوں نے اقتدار براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سویلین سیاستدان ملکی امور کی انجام دہی کے اہل نہیں۔ حتیٰ کہ سویلین ادوار حکومت میں بھی جرنیلوں نے انٹیلی جنس کے توسط سے ملکی امور میں اپنا رسوخ قائم رکھا۔ آئی ایس آئی پس منظر میں رہ کر سیاستدانوں میں تقسیم اور اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی رہی۔ مقصد صرف فوجی مداخلت کو جواز فراہم کرنا تھا۔

پاکستان کے سیاسی دھڑوں نے نہ تو کبھی آپس میں تعاون کیا اور نہ ہی قانون کی حکمرانی کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اس کی جزوی وجہ تو فوج کا کردار تھا اور دوسرے پاکستان کے سیاستدانوں کی اپنی کمزوریاں کہ انہوں نے اختلاف برائے اختلاف پر مبنی سیاسی روش اپنائے رکھی۔ نتیجتاً پاکستان میں کوئی دیرپا نظام حکومت قائم نہ کیا جا سکا اور مختلف فریقین کے درمیان سیاسی کھنچاؤ جاری رہا۔ ایک طرف سویلین سیاستدان اور فوج باہم برسر پیکار رہے۔ دوسری طرف مختلف نسلی اور صوبائی یا علاقائی گروہوں کے درمیان چپقلش رہی اور تیسرے اسلام پسند اور سیکولر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔

پاکستانی سیاست میں ایک ایسی دراڑ نمودار ہوئی جس کا تسلسل آج کے دن تک قائم ہے۔ وہ یہ کہ سیاسی اختیارات کس کے پاس ہونے چاہئیں؟ فوج بااختیار رہے یا سویلین سیاستدانوں کی حاکمیت قائم ہو؟ لاتعداد اندرونی و بیرونی دشواریوں کے پیش نظر مشرف نے کہا تھا کہ "پاکستان پر حکومت کرنا ایک کار محال ہے"۔ مشرف کا خیال پاکستانی فوج کے موقف کا عکاس ہے۔ جنرل مشرف نے بھی یہ کہتے وقت فوج ہی کے مفاد کو مقدم رکھا۔ فوج نے سیاست کو اپنی راہ خود متعین نہیں کرنے دی۔ وقفے وقفے سے منتخب سیاستدانوں پر قومی سلامتی پر سمجھوتے اور بدعنوانی کے الزامات عائد کئے جاتے رہے۔ بار بار ہونے والی فوجی مداخلت نے پاکستان کو ایسے سیاسی راہنماؤں سے محروم کر دیا جنہیں گورننس کا تجربہ حاصل تھا۔ نتیجتاً سویلین حکومتوں کے ادوار میں سنگین خلاء سامنے آتے رہے۔ فوج نے کبھی سیاستدانوں کو اقتدار میں شریک کر لیا اور کبھی نکال باہر کیا۔ اس طرح سیاسی امور کی انجام دہی کے لئے قابل قبول اور آزمودہ اصول ارتقاء کے مدارج طے نہ کر سکے۔ ملکی سیاست میں مذہب کا کردار حکومت کی مختلف شاخوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور صوبوں کے اختیارات ایسے مسائل تھے جنہیں آئین یا انتخابات کے ذریعے حل نہ کیا گیا۔ فوج نے سویلین حکمرانوں کی حکومت کو پسند نہ کیا اور فوجی

حکمرانی عامۃ الناس کی نظر میں بے جواز ٹھہری۔ نتیجتاً کشیدگی کی فضا مستقلاً قائم رہی اور مشرف سمیت پاکستان کے حکمران حکومت کرنے کی بجائے نسلی وگروہی۔ مذہبی اور صوبائی کھنچاؤ کو دور کرنے میں ہی مصروف رہے۔

دوسری "فالٹ لائن" کی ابتداء نسلی عصبیت اور صوبائی اختلافات سے ہوئی۔ اگرچہ نسلی اور گروہی عصبیت کی بنیادوں پر منقسم پاکستانی آبادی کی اکثریت کی نمائندگی سیکولر سیاستدان کرتے ہیں۔ اس اکثریت نے پاکستان کی پالیسیوں کی سمت کے تعین میں کبھی فعال کردار ادا نہیں کیا۔ آزادانہ اور شفاف انتخابات ہوں تو بھی صورت حال مختلف نہیں ہوتی۔ اختیارات کی مرکزیت اور غیر نمائندہ حکومتوں نے مختلف نسلی گروہوں میں اضطراب پیدا کئے رکھا لیکن ریاستی سطح پر اس بے چینی کو ختم کرنے کے لئے آج تک کوئی اداراتی میکنزم تخلیق نہیں کیا گیا۔ آئین کی جو دفعات اور شقیں صوبائی خودمختاری کی حدود و قیود کا تعین کرتی ہیں ان سے عملاً ہمیشہ تجاوز کیا جاتا رہا۔ بلوچستان میں بلوچوں اور پشتونوں، پنجاب میں پنجابیوں اور سرائیکی بولنے والوں، صوبہ سرحد میں پشتونوں اور ہندکو بولنے والوں اور سندھ میں سندھیوں اور مہاجروں (جو تقسیم ہند کے وقت بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے) کے درمیان اختلافات کا بھی کوئی سیاسی حل تلاش نہ کیا جاسکا۔

تیسری فالٹ لائن کا تعلق پاکستان کی قومی زندگی میں مذہب کے کردار پر پائی جانے والی نظریاتی تقسیم سے ہے۔ پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے پارلیمنٹ سے باہر "پریشر گروپوں" کی شکل میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ اب وہ اچھی طرح مسلح بھی ہیں اور ان کے پاس فنڈز کی بھی کوئی کمی نہیں۔ مختلف حکومتی شعبوں اور شاخوں میں بھی انہیں اچھا خاصا رسوخ حاصل ہے۔ مذہبی گروہوں نے فوج اور سول بیوروکریسی کی سرپرستی سے استفادہ کیا اور فوج ملکی اور خارجہ پالیسیوں پر اپنے کنٹرول کو تسلسل دینے کے لئے انہیں ایک مفید اور موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ کیونکہ اسلام پسندوں کا فلسفہ زندگی ایک جدید پاکستان کے تصور سے ہم آہنگ نہیں۔ لہذا کچھ اسلام پسندوں کی متشدد چوکسی پاکستان کے سول معاشرے کے لئے سنگین خطرہ بن چکی ہے۔ اسی متشدد چوکسی نے فرقہ وارانہ دہشت گردی کو فروغ دیا۔ قانون کی حکمرانی کے دائرہ کار سے باہر رہ کر اسلام پسندوں نے جو کاروائیاں کیں وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوئیں۔ خصوصاً کشمیر میں جنگجوؤں اور افغانستان میں طالبان کو ان کی طرف سے جو حمایت ملی اس نے خارجہ پالیسی کو زیادہ متاثر کیا۔

انتہا پسند اسلامی گروہوں نے خود کو نظریہ پاکستان کے محافظ بنا کر پیش کئے رکھا اور اس کے بدلے میں پاکستان کی سول اور فوجی بیوروکریسی نے انہیں خصوصی مقام و مرتبہ دیا۔ فوجی سول بیوروکریسی ہی عام طور پر پاکستان پر حکومت کرتی ہیں۔ اسلام پسندوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک تو پاکستان کے "جوہری ڈیٹرنٹ" کے محافظ ہیں۔ دوسرے وہ حصول کشمیر کی قومی کاز کے چیمپئن ہیں۔ سیکولر سیاستدان جو پاکستان کے مختلف حصوں کے لئے نسبتاً زیادہ خودمختاری طلب کرتے ہیں مذہب کو ریاستی امور سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان پر اسلام پسندوں نے اکثر اوقات نظریہ پاکستان سے انحراف کا الزام عائد کیا۔

ملک کے تشکیلی سالوں کے دوران اسلام کو ریاستی نظریے کے طور پر اپنایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کا تشخص قائم ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے فوراً بعد سیاستدانوں نے قومی تشخص کو تقویت دینے کے لئے مذہبی جذبات کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان 1947ء میں ایک نسبتاً مختصر دورانیے پر محیط تحریک آزادی کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا۔ ابتداء میں اس کی بقاء کو کئی چیلنج درپیش رہے۔ تخلیق پاکستان کو قبول کرنے سے بھارت کا اجتناب پہلا چیلنج تھا۔ پاکستان کی سیکولر اشرافیہ نے نسبتاً طاقتور ہندو بھارت سے لاحق فرضی اور حقیقی خطرات کے مقابلے میں قوم کو متحد کرنے کے لئے اسلام کو استعمال کیا۔ انہوں نے فرض کر رکھا تھا کہ ملکی علماء اور اسلام پسند اس قدر کمزور اور ریاست کے اس قدر رہین منت تھے کہ وہ پاور سٹرکچر کی مخالفت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنے نوزائیدہ ملک کے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کا شکار سیاستدان، سول ملازمین اور وہ فوجی افسران جنہوں نے پاکستان کے تشکیلی سالوں کے دوران راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا تھا، سب نے فیصلہ کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی جو باہمی عداوت تقسیم ہند پر منتج ہوئی۔ اسے بھڑکایا جائے تاکہ پاکستان کو "ہندو بھارت" کی راہ میں مزاحم "اسلامی پاکستان" کا ممتاز قومی تشخص حاصل ہو جائے۔ اگرچہ حصول امن کا ایک نحیف سا عمل جاری ہے تاہم پاک بھارت دشمنی بھی برقرار ہے۔ پاکستان میں پاک بھارت دشمنی کو قومی شناخت کا ایک اہم عنصر خیال کیا جاتا ہے۔

ایک نظریاتی ریاست کے تصور کے ساتھ پاکستان کی وابستگی نے ایسی سٹریٹیجک وابستگی کی شکل اختیار کر لی جس کے تحت علاقائی رسوخ کے حصول کی خاطر جہادی آئیڈیالوجی برآمد کرنا پڑی۔ 1971ء میں بنگلہ دیشی بحران کے دوران پاکستانی فوج نے اسلام پسندوں کے فن خطابت سے استفادہ کیا اور اسلام پسند گروہوں کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے قبل ان منتخب سیکولر راہنماؤں کو اقتدار سے دور رکھنے کے لئے استعمال کیا جنہیں بنگالی بولنے والوں کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ 1970ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے نتائج نے بنگالی سیاستدانوں کو متحدہ پاکستان میں اقتدار کا اہل بنا دیا۔ لیکن جب انہیں اقتدار کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا گیا تو بنگالیوں نے بھارت کی معاونت سے بغاوت کی راہ اپنائی۔ جسے پاکستانی فوج نے بے رحمانہ انداز میں دبایا۔ 1971ء کی جنگ کے بعد ایک آزاد بنگلہ دیش کے معرض وجود میں آجانے کے باعث پاکستان دولخت ہو گیا اور پاکستان کے عدم تحفظ میں اضافہ ہو گیا۔

بھارت اور بنگلہ دیش دونوں ایسی سیکولر جمہوریتوں کی شکل میں ابھرے جن کی توجہ اقتصادی ترقی پر مرکوز ہے۔ جبکہ پاکستان پر بدستور سول ملٹی امراء شاہی حکمران ہے۔ جو اپنے آپ کو ریاستی تشخص کی خالق اور محافظ خیال کرتی ہے۔ وہ ریاستی تشخص جو مذہبی اور جنگ پسند وطن پرستی پر مبنی ہے۔ مغربی پاکستان میں غیر متجانس نسلی اور لسانی گروہوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے میں مذہب کی اہمیت بڑھ گئی اور اس کے مظاہر نسبتاً زیادہ متشدد اور جنگجویانہ ہو گئے۔ ملاؤں اور فوج کے درمیان اتحاد کے نتیجے میں مسلح اور غیر مسلح دونوں مذہبی گروہ رفتہ رفتہ اقتدار میں آ گئے۔ اسلامی نظریے کے متشدد اور انتہا

پسندانہ مظاہر جو آج بھی بعض اوقات ملکی استحکام کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔ ان کی توجیہہ ایک ایسے ریاستی پروجیکٹ کے طور پر کی جاسکتی ہے جو بے قابو ہوکر بے ترتیبی کا شکار ہوگیا۔

پاکستانی حکمرانوں کی روایتاً یہی کوشش رہی کہ وہ جنگ پسند اسلام پسندی کو اپنے قابو میں رکھیں۔ وہ اس کی استعداد کو اس طرح متعین کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اس سے ملکی تعمیر کا کام بھی لیتے رہیں اور ملکی سیاست اور مغربی ممالک کے ساتھ مراسم بھی عدم استحکام کا شکار نہ ہوں۔ 1970ء کی دہائی کے اوائل اور وسط میں جب ذوالفقار علی بھٹو کی نیم مطلق العنان سویلین حکومت نے ملک کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی اسلامی خواہشات کو شامل کرنا شروع کر دیا تو پاکستان نے اپنی اسلامی شناخت پر توجہ بڑھا دی۔ پاکستان نے او آئی سی کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا اور اسلامی گروہوں اور ممالک کے ساتھ خصوصی مراسم استوار کیے۔

1970ء کی دہائی کے اواخر سے 1980ء کی دہائی کے اواخر تک ضیاء الحق کی فوجی حکومت معاملات کو ایک قدم اور آگے لے گئی۔ پاکستان کا قانونی و تعلیمی نظام اسلامی قانون پر ایستادہ کر دیا اور پہلے سے موجود ریاستی نظریے کو اسلامائزیشن کی سرکاری پالیسی میں بدل ڈالا۔ ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کی کاوشوں نے پاکستان کو بین الاقوامی اسلام پسند تحریکوں کے ایک اہم نظریاتی اور تنظیمی مرکز میں تبدیل کر دیا۔ پاکستان نے 1980ء کی دہائی میں روس مخالف مہم کے دوران اہم کردار ادا کیا اور افغان مجاہدین کو اجازت دیدی کہ وہ پاکستان کی سرزمین پر بیٹھ کر اپنی کاروائیاں جاری رکھیں اور روسی فوج کو بھاری جانی نقصان پہنچاتے رہیں۔

روس کے خلاف جہادی نظریے کی کامیابی نے پاکستان کے سٹریٹیجک منصوبہ سازوں کی حوصلہ افزائی کی اور بھارت کے علاوہ ان وسط ایشیائی ریاستوں تک جہاد کو وسعت دیدی گئی۔ جنہوں نے سوویت روس کے بطن سے جنم لیا تھا۔ افغانستان میں طالبان کو حاصل پاکستانی سرپرستی اور پاکستان میں ساری دنیا سے آنے والے اسلام پسند جنگجوؤں کی موجودگی اسلام آباد کی اس خواہش کا نتیجہ تھی کہ پاکستان عالمی سطح پر اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے مرکز کے طور پر نمایاں ہو جائے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اسلامی جوش اور ولولہ اس حکمت عملی کے حامی پاکستانی راہنماؤں میں کوئی تحرک پیدا نہ کرسکا اور اکثر سیاستدانوں نے اسے ایک ایسی سیاسی و فوجی حکمت عملی سمجھ کر قبول کر لیا جو اقوام عالم میں پاکستان کی شہرت اور مقام و مرتبے پر مثبت اثرات مرتب کرے گی۔ تاہم بعد میں جب اسے ایک نظریاتی ریاست بنانے پر توجہ مرکوز کی گئی تو پاکستان تقریباً ان تمام لوازم کے حصول کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا جو ایک فعال جدید ریاست کے اجزائے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں۔

گذشتہ چند برسوں کے دوران صورت حال مزید انحطاط کا شکار ہوگئی۔ اسلام پسند قومی معاملات میں ثانوی کردار پر قناعت نہیں کرتے۔ وہ اپنی ذاتی قوت محرکہ حاصل کر چکے ہیں۔ کئی سالوں پر محیط مذہبی لفاظی نے نوجوان فوجی افسران کو

متاثر کیا۔ بالخصوص آئی ایس آئی کے نوجوان فوجی افسران زیادہ متاثر ہوئے۔ ان نوجوان افسران کی بڑی تعداد نے اسلام پسندانہ عقائد کو اپنے اندر جذب کر لیا جو انہیں کشمیر اور افغانستان میں جہاد کی حمایت پر آمادہ کرتے رہے۔ کیونکہ مشرف اور ملکی فوج ابھی تک اسلام پسندوں کو نہیں سیاستدانوں کو سیاسی اقتدار کے حصول میں اپنا حریف سمجھتی ہے۔ لہذا اسلام پسندوں کو سیاسی مقاصد کے لئے بدستور استعمال کیا جاتا رہا۔ 2003ء میں مشرف انتظامیہ کو چند ایسی آئینی ترامیم کے لئے اسلام پسندوں کی مدد درکار تھی جن کے ذریعے صدارتی اختیارات میں اضافہ مقصود تھا۔ اسلام پسندوں سے حاصل ہونے والی حمایت کے بدلے میں حکومت نے پارلیمانی حزب اختلاف کے سربراہ کے طور پر ایک اسلام پسند راہنما کو قبول کر لیا۔ سیکولر حزب اختلاف کی بڑی شخصیات کو یا تو پس دیوار زنداں بھیج دیا گیا اور یا پھر انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس طرح اسلام پسند پاکستان کی حزب اختلاف کے بڑے گروہ بن گئے اور ان کے رسوخ میں اضافہ ہو گیا۔ اگر ایک کھلا اور جمہوری سیاسی نظام رائج ہوتا تو وہ اس قدر بارسوخ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ پاکستان میں گاہے بگاہے منعقد ہونے والے انتخابات میں انہوں نے ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پاکستان کی سول وفوجی اشرافیہ کو اس خوف نے قومی نظریے پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کئے رکھا کہ پاکستان کے چند نسلی اور گروہی عصبیت کے حامل گروہ پاکستان کے تصور سے ہی مخلص اور وفادار نہیں۔ ممکن ہے پاکستان کے تشکیلی سالوں کے دوران یہ مفروضہ جزوی طور پر درست رہا ہو لیکن جو قبائل اور نسلی اعتبار سے عصبیت زدہ لوگ ماضی میں باغیانہ خیالات کے حامل رہے ان میں سے اکثر سیاسی اور معاشی اقتدار میں سے مناسب اور جائز حصہ مل جانے کے بعد مطمئن ہو گئے۔ علاقائی خودمختاری اور ایک ایسا جمہوری سیاسی نظام جس میں ملک کے تمام طبقات کو نمائندگی حاصل ہو، ریاستی نظریے کے مقابلے میں پاکستان کو متحد رکھنے کے لئے زیادہ موثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک مسلط کردہ نظریے کی عدم موجودگی میں اس نظریے کی حدود وقیود کے تعین پر اختلافی مباحث کا امکان کم ہوگا اور فرقہ وارانہ تنازعات سے بچنا ممکن ہو جائے گا۔ اہم تر بات یہ ہے کہ اگر کسی ریاستی نظریے کو قومی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو تو جنگ پسند اسلام پسندوں کے رسوخ میں معتدبہ کمی واقع ہو جائے گی۔

گذشتہ 75 برس سے بھارت کے ساتھ مقابلہ اور اس کا خوف پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی سوچ پر حاوی چلا آ رہا ہے۔ نتیجتاً پاکستان کی ترقی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ یہ درست ہے کہ بھارت نے تقسیم ہند کو تسلیم کرنے میں سرد مہری دکھائی اور بھارتی راہنما چند سال تقسیم کو کالعدم قرار دینے کی باتیں بھی کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں آزادی کے فوراً بعد بھارتی ارادوں کا ادراک کرتے ہوئے پاکستان کے راہنماؤں کا احساس عدم تحفظ ایک فطری سی بات تھی۔ لیکن عدم تحفظ کے اس مسئلے کو عقلی بنیادوں پر حل کرنے کی بجائے پاکستانی راہنماؤں نے بھارت کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا۔ بھارت کے ساتھ پاکستان کو جو جنگیں لڑنا پڑیں ان کی یہ وجہ ہرگز نہیں تھی کہ بھارت طاقت کے بل بوتے پر

پاکستان پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان نے جب بھی جنگ کو دعوت دی حقیقی عدم تحفظ نہیں بلکہ عدم تحفظ کا سیاسی اور نفسیاتی احساس اس کی وجہ بنا۔ جوہری صلاحیت کے حصول اور اس کا کامیاب تجربہ کر لینے کے بعد بھی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ بدستور یہی کہتی رہی کہ ملک کو بھارت سے خطرات لاحق ہیں۔ اپنی سلامتی کے بارے میں پاکستان کے تفکرات کی نوعیت نفسیاتی ہے۔

حصول کشمیر کی خواہش، اندرونی مسائل کے حل کے لئے غلط پالیسیاں اور بھارت کے ساتھ تصادم کی پالیسی، یہ تینوں امور 1971ء میں ملک کے دولخت ہونے کا سبب بنے۔ حالیہ چند برسوں سے پاکستانی راہنما دلیل پیش کر رہے ہیں کہ پاکستان کا عسکری اعتبار سے مضبوط ہونا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں بھارت علاقائی اجارہ داری کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ بھارت کے بڑے حجم اور عسکری و اقتصادی برتری کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اس کے برابر ہونے یا آگے نکلنے کی کوشش میں تھک کر نڈھال ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جموں و کشمیر کے بارے میں پاکستانی عوام کے جذبات گہرے اور پر جوش ہیں۔ جسے تقسیم ہند کی منطق کی روشنی میں پاکستان کا حصہ بننا تھا۔ لیکن مذکورہ جذبات کو مہمیز اس پروپیگنڈے نے لگائی کہ پاکستان کی بقاء میں کشمیر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستانیوں کے اذہان میں یہ احساس مستقل بنیادوں پر ڈالا جاتا رہا۔ تقسیم سے 75 برس بعد کوئی مجبوری یا ترغیب بھارت کو اس تعطل پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ اندریں حالات پاکستانیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل پر جنوبی ایشیاء میں حالات کو معمول پر لانے اور اس خطے میں قیام استحکام کو ترجیح دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ پاکستانی ریاست ان نعروں کو ترک کر دے جو عوام کے ذہنوں میں رچ بس چکے ہیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی فوجی قیادت ملک کے نظریاتی جھکاؤ میں تبدیلی پر رضامند نہیں۔ پاکستان کو ایک نظریاتی ریاست کا مقام و مرتبہ دلانے اور بھارت کو مستقل خطرہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش میں اسلام پسند فوج کے بدستور اہم اتحادی ہیں۔

پاکستان کے اسلام پسندوں نے 2002ء میں منعقد ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے 11 اعشاریہ ایک فیصد ووٹ اور پارلیمنٹ کے ایوان زیریں کی 20 نشستیں جیت لیں۔ مشرف حکومت نے سابق وزرائے اعظم نواز شریف اور بے نظیر اور ان کے متعدد مقلدین کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دیکر اسلام پسندوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ بہتر نتائج حاصل کر سکیں۔ دونوں بڑی سیکولر سیاسی جماعتوں یعنی نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ اور بے نظیر بھٹو کی پاکستانی پیپلز پارٹی کو اس الزام پر مقدمات کا سامنا کرنا پڑا کہ دونوں نے اپنے اپنے دور حکومت میں بے تحاشا بدعنوانیوں کا ارتکاب کیا تھا۔ ان الزامات کی حمایت میں مشرف حکومت نے بھی شدید پروپیگنڈہ کیا۔ اسلامی جماعتوں کے اتحاد "متحدہ مجلس عمل" کے امیدواروں کو نا اہلی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اسلامی جماعتوں کے راہنما کھلم کھلا

انتخابی مہم چلاتے رہے۔ پاک افغان سرحد سے متصل علاقوں میں امریکہ مخالف جذبات سے متحدہ مجلس عمل نے خصوصی استفادہ کیا۔ اس طرح اسلامی جماعتوں نے اپنے روایتی ووٹ بنک میں کسی ڈرامائی اضافے کے بغیر ہی انتخابی فوائد حاصل کر لئے۔ سیکولر جماعتوں کو نئی ضلع بندیوں اور ان کے کچھ امیدواروں کی نااہلیوں نے نقصان سے دوچار کر دیا۔ پی پی پی اور پی ایم ایل کے راہنماؤں کو بدستور جلاوطن رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایم ایم اے کے راہنماؤں نے آزادانہ انتخابی مہم چلائی اور اس امر کو یقینی بنا لیا کہ اسلام پسند رائے دہندگان اپنے ووٹ ہر صورت استعمال کریں۔ اگرچہ ایم ایم اے کی 63 کے مقابلے میں اکیلی پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس 81 نشستیں تھیں۔ تاہم مشرف حکومت نے اپوزیشن کے طور پر ایم ایم اے کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔

مشرف نے ایم ایم اے کو اپنی بنیادی اپوزیشن کے طور پر جان بوجھ کر اجاگر کیا۔ مقصد یہ تاثر پیدا کرنا تھا کہ جمہوری ذرائع کو بروئے کار لا کر انتہا پسند اسلامی گروہ اقتدار میں آ رہے ہیں۔ تاکہ عالمی برادری بالخصوص امریکہ القاعدہ کے خلاف جنگ میں پاکستان کے تعاون کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہوری اصلاحات کے نفاذ پر زور نہ دے۔

نائن الیون کے بعد اپنے متعدد بیانات کے توسط سے مشرف دنیا کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرنے کی بار بار کوشش کر چکے ہیں کہ وہ پاکستانی پالیسی کی سمت میں انقلابی تبدیلیاں لائیں گے اور اسلام پسند اور جہادی ماضی سے اس کا ناطہ توڑ دیا جائے گا۔ مشرف انتظامیہ آج بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ایسی امریکی جنگ قرار دیتی ہے جو پاکستان کے تعاون سے لڑی جا رہی ہے۔ حالانکہ مشرف اور ان کے من پسند وزیراعظم شوکت عزیز پر 2003 اور 2004ء میں بالترتیب قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں۔ اسلام آباد کے خیال میں دہشت گردوں کی دو اقسام ہیں۔ ایک تو وہ غیر ملکی دہشت گرو جن کا تعلق القاعدہ سے ہے اور جن کا پاکستانی فوج تعاقب کر رہی ہے۔ دوسری قسم ان پروردہ دہشت گردوں پر مشتمل ہے جنہیں ابتداء میں کشمیر میں بھارتی فوج کے ساتھ لڑنے کی تربیت دی گئی تھی۔ مشرف نے ضیاء الحق کے اسلامائزیشن کے عمل کی سمت تبدیل کر دی ہے لیکن معمولی فرق کے ساتھ۔ اب حکومت خواتین کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ کہ قومی زندگی اور ایسے ثقافتی مواقع اور تہواروں میں شریک ہوں جن میں کھلم کھلا ناچ گانے کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ رقص و سرور کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ حکومتی میڈیا ثقافتی اعتبار سے زیادہ آزاد خیال ہو چکا ہے اور نجی ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز پر دکھائے جانے والے تفریحی پروگراموں پر پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ تاہم توہین رسالت اور حدود جیسے متنازعہ اسلامی قوانین بدستور نافذ ہیں۔

مشرف اور پاکستانی فوج سیکولر سیاستدانوں کی نسبت اسلام پسندوں کے ساتھ سمجھوتوں پر نسبتاً کہیں زیادہ رضامند رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ کے ایک دھڑے کے مقابلے میں متحدہ مجلس عمل کو ریلیاں منظم کرنے اور اپنی سٹریٹ پاور کے اظہار کی زیادہ اجازت حاصل ہے۔

تاہم صدر مشرف کی روشن خیال اعتدال پسندی پر مبنی اعلان شدہ پالیسی کے باوجود ان کی ملکی، علاقائی اور عالمی پالیسیوں میں تضادات بہت واضح ہیں۔ انہوں نے یہ پختہ سوچ اپنا رکھی ہے کہ وہ پاکستان کے لئے ناگزیر ہیں اور سویلین جمہوری حکمرانوں کے مقابلے میں فوج کے تحت پاکستان محفوظ تر ہے۔ صدر مشرف ایک طرف "روشن خیال اعتدال پسندی" کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ انہیں اسلام پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان سے نمٹنے کے لئے فوجی مداخلت اور فوجی حکومت ناگزیر ہیں۔ یہی پاکستانی سیاست کا اصل مسئلہ ہے۔ سویلین ادارے کمزور پڑ چکے ہیں اور فیصلہ سازی پر مسلح افواج کا تسلط قائم ہے۔

شعوری اور مستقل ریاستی پالیسی کے باعث اسلام پاکستانی سیاست کا مرکزی ایشو بن چکا ہے۔ اکثر لوگ غلط سمجھتے ہیں کہ یہ افغانستان میں سوویت مداخلت کے بعد کئے گئے فیصلوں کا نادانستہ اور غیر ارادی نتیجہ ہے۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو مرکزیت کے حامل نظام پر مبنی ریاست بنا کر فوجی اور سول بیوروکریسی کے حوالے اور سیکولر سیاستدانوں کو اقتدار سے الگ کر دیا جائے۔ پاکستان نے خود کو ایک نظریاتی ریاست کے تصور کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے اور مستقبل قریب میں اس سوچ میں تبدیلی واقع ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ملکی آبادی کو گروہی اور لسانی اختلافات نے نڈھال کر رکھا ہے اور اسے متحد کرنے کے لئے اسلام کو ایک مشترکہ تعلق کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

بطور ریاست، پاکستان متعدد مرتبہ ناکامی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ وقتی طور پر اسے امریکہ کی اقتصادی اور عسکری امداد کے ذریعے اس کنارے سے واپس لایا گیا لیکن اس نے ہر بار دوبارہ وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ روایتاً پاکستان کے ریاستی ادارے کمزور ہیں۔ ایک طرف اسے شناخت کے گہرے بحران اور دوسری طرف آزاد اور انتہا پسند اسلام پسندوں سے خطرات کا سامنا رہا۔ انہی خطرات نے اسلام آباد کو امریکہ کے ساتھ اتحاد پر مجبور کئے رکھا۔ اس دوران وہ بیک وقت جوہری ڈیٹرنٹ بھی تیار کرتا رہا اور اپنی روایتی جنگی استطاعت بھی بڑھاتا رہا۔ یعنی بھارت کے خلاف اسلام پسندوں کی دہشت گردی کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ نائن الیون کے امریکی ردعمل نے پاکستان کے پاس کوئی چوائس نہ رہنے دیا اور اس نے اپنا رُخ امریکہ کی طرف کر لیا۔ جب اسے "امریکہ کے ساتھ" یا "امریکہ کے خلاف" میں سے ایک کے چناؤ پر مجبور کیا گیا تو پاکستانی جرنیلوں نے امریکہ کے ساتھ اپنے اتحاد کی تجدید کا فیصلہ کر لیا۔ بعد ازاں ہر مرحلے پر پاکستان نے اپنے آپ کو کسی ایقان کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنی سہولت اور فائدے کے مطابق امریکی اتحادی ثابت کیا کیونکہ اسے مخصوص خدمات کے عوض مخصوص معاوضے دیئے گئے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستانی فوج ہمیشہ امریکہ کی فوری عالمی ضروریات کے مطابق اپنی ترجیحات کا تعین کرنے پر رضامند رہی تاکہ امریکہ کی طرف سے اقتصادی اور عسکری امداد کا بہاؤ جاری رہے۔ جسے پاکستان اپنی بقاء کی جدوجہد اور بھارت کے ساتھ مقابلے کی فضا قائم رکھنے کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے

مراسم پاکستانی فوج کی اس سہ جہتی پالیسی کا حصہ بنے رہے۔ جس کے تحت اسلام کو ملک گیر سطح پر اتحاد کے حصول کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بھارت دشمنی کو ملکی و خارجہ پالیسی کا اہم جز و سمجھا گیا اور پاکستانی فوج پر اٹھنے والے بھاری اخراجات کی ادائیگی کے لئے امریکہ سے اتحاد کو ضروری خیال کیا گیا۔ ملکی پالیسی کے یہی قواعد وضوابط انتہا پسندانہ اسلام پسندی کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث بنے۔ جو گذشتہ چند سالوں سے امریکی مفادات اور عالمی سلامتی کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہے۔ اگر امریکہ چاہے تو پاکستان پر طویل المیعاد بنیادوں پر اپنا رسوخ اس طرح استعمال کرے کہ قومی مفاد کے بارے میں فوج کا تصور ہی بدل جائے۔

پاک امریکہ تعلقات کے ابتدائی چند سالوں کے دوران اسلام پسندوں کی سیاست نے امریکہ کو پریشان کیے رکھا۔ یکم جولائی 1951ء کو امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ایک پالیسی بیان جاری کیا تھا جس کے مطابق " کمیونزم کے علاوہ امریکی مفادات کو دوسرا بڑا خطرہ رجعت پسند جاگیرداروں اور ان پڑھ مذہبی راہنماؤں سے لاحق ہے جو پاکستان کی موجودہ مغرب نواز حکومت کے خلاف اور قرون وسطی کے اسلامی اصولوں کی طرف مراجعت کے حق میں ہیں"۔

تاہم گذشتہ 4 عشروں کے دوران اور نائن الیون تک امریکہ نے ریاستی نظریے کے طور پر گمراہ کن اور مبنی بر جہل اسلام کی طرف پاکستان کے جھکاؤ کی کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی۔ نتیجتاً پاکستان کے مذہبی راہنماؤں نے عوام کی طرف سے ملنے والی حمایت سے زیادہ تقویت حاصل کر لی اور اسلام پسندوں نے سول و فوجی بیوروکریسی اور انٹیلی جنس سروسز کے ساتھ اپنے تعلقات مستحکم کر لئے۔

پاکستان بلکہ پاکستانی فوج کے ساتھ امریکی اتحاد نے پاکستان کو 3 اہم اور قابل ذکر نتائج دیئے۔ پہلا نتیجہ کیونکہ امریکی فوج پاکستان کو مشرق وسطی میں اپنی حکمت عملی کے سیاق و سباق میں دیکھتی ہے۔ لہذا اگرچہ پاکستان جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے جنوبی ایشیاء کا حصہ ہے تاہم اس کا زیادہ جھکاؤ مشرق وسطی کی طرف ہے۔ دوسرے وقفے وقفے سے پاکستان کو امریکہ کی طرف سے جو اقتصادی اور عسکری امداد ملتی رہی اس کے بل بوتے پر پاکستانی فوج نے اپنی طاقت کا غلط تخمینہ لگایا۔ جس کی بناء پر پاکستان نے بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات کو معمول پر لانے کی اہمیت کا کبھی ادراک نہ کیا اور بار بار غلط مہم جوئی کے دوران نقصان سے دوچار ہونے کے باوجود اس کے ذہن میں یہی خیال پنپتا رہا کہ وہ بھارت کو جنگ میں شکست تو نہیں دے سکتا لیکن کسی بھی تصادم کے نتیجے میں اس کے ساتھ برابر ضرور رہ سکتا ہے۔ تیسرے امریکہ کی طرف سے اقتصادی اور عسکری مدد کے حصول کے بعد اس کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ امریکی پالیسیوں کے موجودہ ضابطہ کار کے ساتھ منسلک رہے۔ اسی چیز نے پاکستان کو ایک " کرائے کی ریاست " میں تبدیل کر دیا۔ جس کی ایک وجہ اس کا سٹریٹیجک محل وقوع بھی ہے۔ اگر امریکہ پاکستان کو امریکی فوج کی مرکزی کمان کے دائرہ اختیار سے نکال کر پیسفک کمان کے دائرہ کار میں لے آتا تو پاکستان کا یہ بناوٹی دعویٰ بھی ختم ہو جاتا کہ وہ بھی مشرق وسطی ہی کی ایک ریاست ہے۔ واضح

رہے کہ بھارت امریکی فوج کی پیسفک کمان کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ اس طرح سنیئر بھارتی اور پاکستانی فوجی افسران کے باہمی رابطے بڑھ جاتے اور امریکی فوج اس قابل ہو جاتی کہ پاکستان اور بھارت کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھ سکے کیونکہ یہ ترتیب 1950ء کی دہائی سے ایسے ہی چلی آ رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور وسطی ایشیاء کے بارے میں امریکی منصوبہ سازوں نے اپنے منصوبوں میں پاکستان کا اندراج امریکی حکمت عملی کے مشرقی معاون کے طور پر کر رکھا ہے۔ پاکستانی جرنیل امریکہ کو آپریشنل مدد فراہم کرتے ہیں جو علاقائی تناظر میں ان کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وسیع تر امریکی پالیسی میں بھی یہ معاونت اتنی ہی اہمیت کی حامل رہے۔ پاکستانی فوج نے اپنا تاثر مثبت بنانے کے لئے امریکی فوج کی مرکزی کمان کے افسران سے اپنے مراسم کو کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اگر باقی ماندہ جنوبی ایشیا بھی اسی کمان کے دائرہ کار میں ہوتا تو ممکن ہے صورت حال مختلف ہوتی اور پاکستانی فوج اپنے تاثر کو اس قدر مثبت نہ کر پاتی۔

صورت حال میں دو مزید بگاڑ پاکستان کو متاثر کر رہے ہیں۔ ایک تو ہے پاکستان کی قوت کا مبالغہ آمیز اندازہ اور دوسرے پاکستان کے کرایہ خور دہونے کے باعث پیدا ہونے والی پیچیدگیاں۔ یہ دونوں بگاڑ غیر ملکی امداد کے متعلق امریکی پالیسی کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے امریکی معاونت نے پاکستان کی اندرونی حرکیات پر منفی اثرات مرتب کئے اور فوج کی با اختیار رہنے کی خواہش میں زیادہ شدت در آئی۔ یو ایس ایڈ کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق 1954ء اور 2002ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ نے پاکستان کو 12 ارب 60 کروڑ ڈلرز کی اقتصادی اور عسکری امداد مہیا کی۔ ان میں سے 9 ارب 19 کروڑ ڈالرز 24 سالہ فوجی حکمرانی کے دور میں دیئے گئے جبکہ 19 سالوں پر محیط سویلین ادوار حکومت میں امریکہ نے پاکستان کو صرف 3 ارب 40 کروڑ ڈالرز دیئے۔ اوسطاً فوجی حکمرانی کے دوران پاکستان کو سالانہ 38 کروڑ 29 لاکھ ڈالرز ملتے رہے جبکہ سول ادوار حکومت میں یہ رقم صرف 17 کروڑ 89 لاکھ ڈالرز سالانہ رہی۔

اس امریکی مفروضے کے برعکس کہ امداد لینے والے ملک کے اندر امداد دینے والے ملک کا رسوخ بڑھ جاتا ہے اور وہ اول الذکر کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ پاکستانی فوج کسی نہ کسی طرح امریکہ سے امداد تو حاصل کرتی رہی تاہم امریکہ جو چاہتا تھا واضح طور پر اسے کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں ایوب خان نے روس کی توسیع پسندی کے سامنے بند باندھنے پر پاکستان کی رضامندی امریکہ کے ہاتھ (مہنگے داموں) فروخت کی لیکن بعد میں اس سودے کے جملہ تقاضے پورے نہ کر سکے۔ پاکستان نے کچھ عرصے کے لئے امریکہ کو اہم انٹیلی جنس کے حصول کی سہولتیں مہیا کیں لیکن ایسا کوئی مرکزی اڈہ فراہم نہ کیا جہاں بیٹھ کر امریکہ اپنی کاروائیاں کر سکے۔ ضیاء الحق نے افغانستان پر حملہ آور روسیوں کو خون میں نہلا دیا تاہم ان کی "خدمات" کے پس پردہ یہ خواہش کارفرما تھی کہ جب روس افغانستان سے دست بردار ہو جائے تو وہاں پاکستان کی موکل حکومت قائم کر دی جائے۔ اگرچہ امریکہ "افغان آپریشن" پر اٹھنے والے تمام اخراجات برداشت کر رہا تھا لیکن نہ تو وہ کبھی آئی ایس آئی کو اپنے ماتحت رکھ سکا اور نہ ہی مجاہدین پر اسے کبھی کنٹرول حاصل

ہوا۔ سوویت یونین کے خلاف جہاد نے پاکستانی جہادیوں کو انسپائر کیا کہ وہ جہاد کو کشمیر تک توسیع دیں۔ "القاعدہ" کے شکار کے دوران بھی جنرل مشرف نے مخصوص مواقع پر امریکہ کی معاونت کی۔ امریکی توقعات پر ہر لحاظ سے پورا اترنے پر پاکستان کی عدم رضامندی اور امریکہ کی تلون مزاجی کے باعث پاکستان کے لئے امریکی امداد کے بہاؤ میں بعض اوقات رکاوٹوں کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔ جب بھی امدادی پائپ لائن میں کوئی چھوٹا موٹا رخنہ پیدا ہوا تو وہ پاکستانی فوج کی ناراضگی کا باعث بنا اور پاکستانی عوام کو بھی ناخوش کر گیا۔ تاہم جب امداد کے بہاؤ میں تسلسل پیدا ہوتا ہے تو امریکہ پاکستان میں نہیں بلکہ پاکستانی فوج امریکہ کے اندر اپنا رسوخ پیدا کر لیتی ہے۔

امریکی پالیسی سازوں کو چاہئے کہ پاکستان کے اندر امریکی رسوخ کی مناسبت سے امداد کی مقدار کا تعین کریں۔ پاکستان کے فوجی سیاستدانوں پر تعریف وتوصیف کے ڈونگرے برسانے کی بجائے ان کی خود پسندی کے غباروں میں سے ہوا خارج کریں۔ پاکستان کے لئے امریکی امداد کا پیکج اعتدال پسندی پر مبنی ہو اور کلیدی اقتصادی شعبوں کے لئے وہ امداد اسے بلاتوقف ملتی رہے۔ اس طرح پاکستان کی توقعات میں بھی (غیر ضروری اور غیر حقیقت پسندانہ) اضافہ نہیں ہوگا اور ملکی اشرافیہ پر امریکہ کا قابل اعتماد حد تک رسوخ بھی قائم رہے گا۔ امداد کی بڑی بڑی خوراکیں، کسی مخصوص شعبے میں پاکستان کی پیش کردہ معاونت کا معاوضہ یا سٹریٹیجک محل وقوع کی بناء پر اسے "کرایے" کی ادائیگی، تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو ان عوامل نے پاکستان کے اندر امریکی رسوخ کو ہمیشہ محدود رکھا۔ امریکی امداد پاکستانی اشرافیہ کے تعیشات پر خرچ ہو جاتی ہے۔ امریکہ اپنا محدود رسوخ بھی کھو بیٹھتا ہے اور اشرافیہ پھر بھی ناراض رہتی ہے۔

امریکہ کبھی ایسی پالیسی مرتب نہیں کر سکا جس میں اسلام آباد اور اس کے اعتدال سے متجاوز اقدامات پر توجہ مرکوز کی گئی ہو۔ پاکستان کو عام طور پر امریکہ کے وسیع تر پالیسی مقاصد میں جگہ دی جاتی رہی۔ مثلاً 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں کمیونزم کی راہ روکنے، 1980ء کی دہائی میں افغانستان کے اندر روسی توسیع پسندی کی راہ میں حائل ہونے، 1990ء میں جوہری عدم پھیلاؤ اور نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لئے امریکہ کو پاکستان سے تعاون طلب کرنا پڑا۔ پاکستان کے بارے میں "ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو" پر مبنی امریکی پالیسی پر عملدرآمد کے دوران جب کسی مخصوص مسئلے سے نمٹا جا رہا ہوتا ہے تو ساتھ ہی ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ 1950ء کی دہائی میں جب جنرل ایوب خان نے محسوس کیا کہ امریکہ کمیونزم کو محدود کرنے کے لئے بے چین ہے تو اول الذکر نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کمیونسٹ مخالف معاہدات مین پاکستان کی شمولیت کی اچھی خاصی قیمت وصول کی۔ سرد جنگ کے دوران امریکہ نے پاکستان کو جو امداد دی، آخر الذکر نے اسے 1971ء میں بنگلہ دیشی بحران کے دوران استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہو گیا۔

1979ء میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر فوجی یلغار کی اور افغانستان پر روسی قبضے اور روس کی توسیع پسندی کے خلاف مزاحمت کے لئے پاکستان فرنٹ لائن سٹیٹ بنا تو تاریخ نے اپنے آپ کو دوہرایا۔ روس کے خلاف

کاروائیوں کے لئے جب جنرل ضیاء الحق نے پاکستانی سرزمین پیش کی تو اپنے ایک پیش رو فوجی حکمران جنرل ایوب خان کی طرح انہوں نے بھی اپنی خدمات کے عوض اضافی امداد کے لئے امریکہ کے ساتھ سودے بازی کی۔ جنرل ضیاء نے ایٹمی عدم پھیلاؤ کے حوالے سے امریکی قانون سازی سے بچ بچا کر جوہری ہتھیاروں کی تیاری کی صلاحیت کے حصول کے لئے افغان جہاد کو آڑ کے طور پر استعمال کیا۔ امریکہ کی مدد سے ضیاء الحق نے پاکستانی فوج کو جدید اسلحے سے لیس کیا اور پاکستان کے علاقائی رسوخ میں اضافے کے لئے دستے تیار کیے گئے۔ افغانستان میں پاکستان کی موکل حکومت کے قیام کی خواہش کو عروج پر پہنچا دیا گیا۔ نتیجتاً طالبان منظر پر ابھر آئے اور افغانستان اس قابل ہو گیا کہ القاعدہ کو پناہ گاہ مہیا کر سکے۔

واشنگٹن کے ذہن پر افغانستان میں روس مخالف جدوجہد کی کامیابی کی شدید خواہش نے تسلط جما لیا۔ ایک طرف افغانستان میں روس کو اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا گیا اور دوسری طرف پاکستان نے 2 بڑے امریکی مقاصد کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔ وہ مقاصد تھے جوہری عدم پھیلاؤ اور مشرقِ وسطیٰ و جنوبی ایشیاء میں سیکیورٹی۔ اس دور کی انتہا پسندانہ دہشت گردی کی صورت میں ایک بالکل ہی نیا خطرہ اپنی پوری قوت کے ساتھ سامنے آ گیا۔ پاک امریکہ تعلقات بھی کسی حد تک پاکستانی بحران کا باعث بنے کیونکہ ان تعلقات نے پاکستانی راہنماؤں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنی خطرناک ملکی علاقائی اور "پان اسلامک" پالیسیوں کو فروغ دے سکتے تھے۔ امریکہ نے اپنی "بڑی حکمت عملی" کے لئے پاکستانی حمایت کے عوض (وقتاً فوقتاً) پاکستان کو جو امداد پیش کی وہ پاکستانی پالیسیوں میں عدم اعتدال اور ان کی ساخت میں نقائص کا سبب بنی۔

آج کل امریکہ نے پاکستان سے جو امید باندھ رکھی ہے وہ صدر مشرف کی امریکی مفادات کے ساتھ وابستگی ہے۔ جن قاتلانہ حملوں سے مشرف بار بار بچے، انہوں نے ایک اہم سوال کو جنم دیا ہے کہ آیا مشرف کی غیر یقینی مدت اقتدار کے بعد بھی امریکہ کے پالیسی مفادات کو پاکستان کی طرف سے تعاون یا تحفظ ملتا رہے گا؟ اگرچہ امریکی اور پاکستانی پالیسی ہے کہ پاکستان کے ایک نظریاتی ریاست ہونے کے تصور کو ہی ختم کر ڈالیں۔ پاکستانی ریاست کی نوعیت میں واقع ہونے والی تبدیلیاں رفتہ رفتہ اسلامی انتہا پسندی سے اس ملک کی جان چھڑا لیں گی لیکن اکیلے مشرف کے لئے یہ ممکن نہیں۔ پاکستان میں کئی سال سے فوجی حکومتیں مذہبی جنگ جوئی کی آگ کو ہوا دے رہی ہیں۔ فوجی قیادت کے تحت پاکستان نے بھارت سے کشمیر بزور حاصل کرنے کو اپنا قومی نصب العین بنائے رکھا۔ حالیہ چند سالوں کے دوران افغانستان میں پاکستان کی موکل حکومت کا قیام بھی اس قومی نصب العین کا حصہ بن گیا۔ جب تک اسلام آباد اپنے مقاصد کا از سرِ نو تعین اور اقتصادی خوشحالی اور گورننس میں عوام کو شریک نہ کرے۔ اس ملک میں اسلام ہی کو قومی سطح پر اتحاد کے حصول کا ذریعہ مانا جاتا رہے گا۔ اگر پاکستان اقتصادی اور سیاسی ترقی کی مخصوص روایتی راہ پر چلتا رہے تو سیاسی اور سٹریٹیجک معاملات میں اسے مبالغہ آمیز حد تک اسلام کے کردار کی ضرورت پیش نہیں آئے گی جو ملکی تاریخ میں اس کی شناخت بنا رہا۔ اپنے ذاتی مفادات کے تحت

امریکہ ایک ایسے بڑے مسلمان ملک کے اندر اسلامی جنگجوئی میں اضافے کا متحمل نہیں ہوسکتا جو ایٹمی اسلحہ تیار کرنے کی صلاحیت کا حامل بھی ہو، ایک بڑی فوج بھی رکھتا ہو اور اس کے پاس ایک جسیم انٹیلی جنس سروس بھی ہو۔ ایسی انٹیلی جنس سروس جو خلیج فارس۔ جنوبی ایشیاء اور وسطی ایشاء میں ہمسایہ حکومتوں کو غیر مستحکم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

پاکستان میں اسلام پسندوں کے رسوخ کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ جمہوریت ہے۔ انتخابات کے دوران پاکستان کے رائے دہندگان کی اکثریت بتا چکی ہے کہ عوام ملک کے بارے میں اسلام پسندوں کی سوچ سے متفق نہیں ہیں۔ اگرچہ ایم ایم اے نے 2002ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں بے مثل کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ تاہم اتحاد کو استعمال کردہ ووٹوں میں سے صرف 11 فیصد حاصل ہوئے۔ اندراج شدہ ووٹوں میں اسلام پسندوں کے حامیوں کا تناسب 1970ء کی دہائی سے یہی چلا آرہا ہے۔ اسلام پسندوں کی قوت ان کی اس قابلیت میں مضمر ہے کہ وہ مالی اور افرادی قوت سے کس حد تک استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسلام پسندوں نے سکول کھول رکھے ہیں۔ خیراتی ادارے چلا رہے ہیں اور اخبارات بھی شائع کرتے ہیں۔ مزید براں وہ اپنے منظم گروہوں کو سڑکوں پر لانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا جمہوری فیصلہ سازی کی عدم موجودگی میں سیاسی منظر پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کا سیکولر شہری معاشرہ یا تو غیر سیاسی ہے اور یا پھر تسلی بخش حد تک منظم نہیں۔ سیکولر سیاسی جماعتوں کو یکے بعد دیگرے فوجی حکومتوں نے ٹوٹ پھوٹ سے دوچار کئے رکھا۔

شہری معاشرے کی تقلیب اور سیکولر سیاسی جماعتیں تشکیل دیکر پاکستان میں اسلامائزیشن کے اس مطالبے کی راہ روکی جاسکتی ہے۔ جو مذہبی جماعتیں اور انتہا پسند اسلامی گروہ کر رہے ہیں۔ حالیہ چند برسوں کے دوران امریکہ نے پاکستان کے مقبول و معروف سیاستدانوں کی بدعنوانیوں اور ناقص گورننس پر پاکستانی فوج اور سویلین امراء شاہی کی طرف سے کی جانے والی تنقید کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کی توثیق بھی کی۔ تاہم کسی دیرپا سیاسی عمل کی عدم موجودگی میں پاکستان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسے دیانت دار سیاستدان پیدا کرلے جو ملک کو چلاسکیں۔ فوج جس کے پاس سیاسی جواز کا فقدان ہے اپنے ان اسلام پسند اتحادیوں کی مدد سے ملکی معاملات پر بدستور اثر انداز ہوتی رہے گی جو اپنی حمایت کی قیمت کے طور پر اسلامی نظریاتی ریاست کے تصور کے ساتھ وابستگی مانگتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ امریکہ پاکستانی سیاست پر فوج کے حق کو تسلیم کرے۔ اسے چاہئے کہ ایک دیرپا آئینی اور سیاسی عمل پر اصرار کرے۔ سیاسی بدعنوانیوں اور مالی بدانتظامیوں سے بے شک صرف نظر نہ کیا جائے۔ لیکن اسے مسلسل اور بار بار فوجی مداخلت کا جواز بھی نہ بننے دیا جائے کیونکہ یہی وہ مداخلت پاکستان کے لئے اپنی سہ جہتی نظریاتی پالیسی سے ناطہ توڑنا دشوار بنا دیتی ہے۔

ماضی میں معتدل اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کی سیاست نے اسلام پسندوں کو محدود کرنے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ جب بھی کسی منتخب سیاسی راہنما نے اسلام پسندوں کے مطالبات کو مسترد کیا۔ شدید ردعمل کے خدشات عملی شکل اختیار نہ کر سکے۔ 1972ء اور 1977ء کے درمیانی عرصہ میں اسلام پسندوں کی مخالفت کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو نے

سرکاری اور عوامی شعبوں میں خواتین کے کردار کو کامیابی سے وسعت دی اور 1997ء میں جب نواز شریف نے جمعہ کی ہفتہ وار مذہبی چھٹی منسوخ کی تو انہیں محدود سے ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ بطور متبادل، جن حکومتوں نے سیاسی جواز اور سٹریٹیجک مقاصد کے حصول کے لئے ان کی حمایت طلب کی، ان کے طفیل اسلام پسندوں نے اپنی بڑی پالیسی فتوحات حاصل کرلیں۔ مصر اور ترکی جیسے دوسرے مسلمان ملکوں کی حکومتوں کے برعکس پاکستانی حکومت بالخصوص پاکستانی فوج نے اس سیاسی اور انتہا پسند اسلام کی حوصلہ افزائی کی جسے عام حالات میں محدود بنیاد کی حامل حمایت دستیاب ہے۔ اسلامائزیشن کے عمل کو محدود یا منقلب کرنے پر جمہوری اتفاق رائے پاکستان کی عوامی زندگی پر سے اسلام پسندوں کے اثرات کو رفتہ رفتہ کم کردے گا۔ اسلام پسند ایک مخصوص نقطہ نظر کے نمائندہ اقلیتی پریشر گروپ کے طور پر اپنا کردار برقرار رکھیں گے۔ لیکن ملک کی مجموعی سمت پر سے ان کا غیر متناسب رسوخ ختم ہوجائے گا۔

اگر امریکہ پاکستان کی گورننس کے فوج اور سیکیورٹی سروسز سے متعلقہ پہلوؤں کی اصلاح کا مطالبہ کرے تو اس ملک میں اسلام پسندوں کا رسوخ محدود ہوجائیگا۔ امریکہ پاکستان کے بدعنوان اور غیر موثر سیاستدانوں کو تو ڈانٹتا جھڑکتا رہا لیکن فوج کے تجاوزات پر اس نے ہمیشہ ہلکی تنقید کی۔ 1988ء سے 1999 تک جب پاکستان پر بظاہر سویلین حکمران حکومت کررہے تھے۔ امریکی حکام ان پر معمول کی تنقید کرتے رہے لیکن انہوں نے فوج اور انٹیلی جنس سروسز کے منفی کردار پر تبصرہ کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ حالانکہ ان کے اس کردار کے واضح شواہد موجود تھے۔ 1988ء، 1990ء اور 1997ء کے انتخابات میں آئی ایس آئی نے اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق نتائج حاصل کئے۔ لیکن امریکہ نے عوامی سطح پر اس چیز کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ مقابلتاً جب فوج نے سیاستدانوں کی ناکامیاں گنوائیں تو امریکہ نے ان حدود وقیود کے اثرات کا نوٹس لئے بغیر فوج کی بات مان لی۔ جو آخرالذکر نے سیاستدانوں کے لئے خود قائم کررکھی تھیں۔ امریکہ پاکستان کی حالیہ تاریخ کے بارے میں فوج کے تحریف شدہ بیان کو کم از کم عوامی سطح پر تسلیم کرلیتا ہے۔ اکثر اوقات یہی فرض کیا گیا کہ قومی سلامتی اور سیاستدانوں کی نااہلی پر فوج کے اپنے تفکرات نے اسے سیاست میں دخل اندازی پر مجبور کیا۔ اس بات پر کبھی غور نہیں کیا گیا کہ ممکن ہے سیاسی نااہلیوں کا جزوی باعث فوج ہی بن رہی ہو یا سیاسی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کے پس منظر میں اس کی سیاسی اختیارات کے حصول کی خواہش کارفرما ہو۔

امریکہ کو چاہئے کہ اب اسلامی جنگ جوؤں کے لئے پاکستانی فوج کی حمایت، ملکی سیاست پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے استعمال اور آئینی وجمہوری حکومت کو اختیارات کی منتقلی سے انکار سے درگزر یا صرف نظر نہ کرے۔ امریکہ اس وقت پاکستان کو امداد دینے والے اہم ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ لیکن نائن الیون کے بعد پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کا معتد بہ حصہ غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کردیا گیا۔ کیونکہ واشنگٹن نے امریکی امداد کو غیر مشروط رکھا۔ اسے خرچ کرنے کے لئے پاکستانی حکومت کے طریق کار میں کسی قابل ذکر تبدیلی کا مشاہدہ نہیں کیا گیا۔

فوج پر اخراجات کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے اور ایک عام پاکستانی کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لئے درکار سماجی خدمات پر مطلوبہ سطح سے کم خرچ کیا جا رہا ہے۔ امریکہ کو چاہئے کہ اپنی امداد کو پاکستان کی اندرونی سیاست میں رسوخ پیدا کرنے کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کرے۔ اگرچہ القاعدہ کے خلاف جنرل مشرف کا تعاون ایک مثبت پیش رفت ہے۔ لیکن واشنگٹن اسلام پسند جنگ جوؤں کو حاصل ریاستی سرپرستی، تعلیم اور صحت عامہ کی سہولتوں کی قیمت پر ایٹمی ہتھیاروں اور میزائلوں کی تیاری اور جمہوریت سے فرار کو نظرانداز نہ کرے۔ ان تمام عوامل کا اسلامی انتہا پسندی کے مستقبل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

امریکہ کے پاس پاکستان کے ساتھ تعلق کے حوالے سے بہتر اور قلیل المیعاد متبادلات کا فقدان ہے۔ امریکی پالیسی سازوں کو چاہئے کہ اپنی پالیسیوں کی سابقہ ناکامیوں کا ادراک کریں اور غلطیوں کو دہرانے سے گریز کریں۔ امریکہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات سے قلیل المیعاد فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے اور نادانستہ طور پر اس ملک کے مسائل کو نمایاں کر رہا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کی سول اور فوجی اشرافیہ کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی سہ جہتی پالیسی نے پاکستان کو کس طرح یکے بعد دیگرے نقصانات اور تباہیوں سے دوچار کیا۔ پاکستان کو معرض وجود میں لاتے وقت ملک و قوم کی تعمیر کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی غور کئے بغیر جلد بازی سے کام لیا گیا۔ شاید طویل المیعاد غور کے ذریعے اس غلطی کی اصلاح کا وقت آن پہنچا ہے۔ پاکستانی اشرافیہ اور ان کے امریکی مہربانوں کو چاہئے کہ پاکستان کو ایک نظریاتی ریاست کی بجائے فعال اور قابل عمل ریاست بنانے کے لئے مل کر کام کریں۔

Notes

1. "A Short History of the Revivalist Movement in Islam" by Syed Abul Ala Maudoodi.
2. "Ayub Khan: Pakistan's First Military Ruler" by Altaf Guahar.
3. Ayub: Soldier and Statesman" by Rais Ahmad Jafri.
4. "A Journey to Disillusionment" by Sherbaz Khan Mazari.
5. "An Atlas of the 1971 India-Pakistan War" by John H. Gill.
6. "A Judiciary in Crisis: The Trial of Zulfiqar Ali Bhutto" by T.W. Rajratnam.
7. "A Study of History (Vol. 8)" by Arnold Toynbee "Afghani stan: Key to A Continent" by John C. Griffiths.
8. "An Analysis of the Kargil Crisis" by Shaukat Qadir"
9. "Author's personal diary" written during 1990 Election Campaign.
10. "Author's personal diary" from 01-09-1991 to 15-05-1992.
11. "Between Myth and History" by Ayesha Jalal .
12. "Betrayal of Another Kind: Islam, Democracy and the Army in Pakistan" by Lt. Gen. Faiz Ali Chishti.
13. "Bhutto: Trial and Execution" by Victoria Schofield.
14. "Battle Ready" by Tom Clancy and Toni Zinni.
15. "Constitutional Foundations of Pakistan" by Safdar Mehmood.

16. "Conflict Unending: India – Pakistan Tensions Since 1947" by Sumit Ganguly.

17. "Civil – Military Relations in Pakistan: From Zulfiqar Ali Bhutto to Benazir Bhutto" by Saeed Shafqat.

18. "Disenchanted Allies" by Dennis Kux.

19. "Danger in Kashmir" by Josef Korbel.

20. "Elections in Pakistan: A brief History" by Human Rights Commission of Pakistan.

21. "Fifty Years of the Kashmir Dispute: The Diplomatic Aspect" by Abdussattar.

22. "Facts are Facts" by Wali Khan.

23. "Friends Not Masters" by Ayub Khan.

24. "From Crisis to Crisis: Pakistan 1962 – 1969" by Herbert Feldman.

25. "From the Shadows" by Robert M. Gates.

26. "Fateh: Afghanistan Mein Roosi Shikast kay Memaar General Akhtar Abdul Rehman ki Daastaan-i-Hayat" (The Victor: Life story of the architect of Russian defeat in Afghanistan by Haroon-Ur-Rashid.

27. "Generals in Politics – Pakistan 1958 – 1982" by Muhammad Asghar Khan.

28. "General Zia Kay siasi Tazadaat" (Political contradictions of General Zia) by Khalid Kashmiri.

29. "Ghost Wars" by Steve Coll.

30. "General Muhammad Zia-ul-Haque: Shakhsiat our Karnamy" (General Muhammad Zia-ul-Haq – The Man and His Achievements) by Zia-ul-Islam Ansari.

32. "Guardians of Deen (Faith) and Country" by Maulana Masood Azhar.

32. "Halfway to Freedom" by Margaret Bourke.

33. "Horned Moon" by Ian Stephen.

34. "How Pakistan Got Divided"? by Maj. General Rao Farman Ali Khan.

35. "Hard Choices: Critical Years in America's Foreign Policy" by Cyrus Vance.

36. "Islamization of Pakistan" by Dr. Afzal Iqbal.

37. "Inside RAW: The story of India's Secret Service Service" by Ashok Raina.

38. "India and Pakistan: A Continent Decides" by Lord Birdwood.

39. "India – Pakistan: In War and Peace" by J.N. Dixil.

40. "India: A Study in Profile" by Lt. Col. Javed Hassan.

41. "India: Torture, Rape and Deaths in Custody" by Amnesty International – 1992.

42. "Judging the State" by Paula Newsberg.

43. "Jehad-i-Kashmir wa Afghanistan" (Jehad in Kashmir and Afghanistan) by Muhammad Amir Rana.

44. "Kashmir: A Disputed Legacy" by Alastair Lamb.

45. "Kashmir in the Crossfire" by vicoria Schofield.

46. "Kashmir 1947: Rival Version of History" by Prem Shankar Jha.

47. "Khaki Shadows: Pakistan 1947 – 1997" by General Khalid Mahmood Arif.

48. "Kashmir Chalo" (Let us go to Kashmir) by Aamir Ahmad Khan.

49. "Kashmir Underground" by Sati Sahni.

50. "Last Days of Premier Bhutto" by Kausar Niazi.

51. "Maudoodi and the Making of Islamic Revivalism" by Sayyed Vali Reza Nasr.

52. "Memoirs" by Lt. Gen. Gul Hassan Khan.

53. "Mera Azeem Bhai" (My great brother) by Amin-ul-Haque (Gen. Zia-ul-Haque's younger brother)

54. "Military Rule, Islamism and Democracy in Pakistan" by Sayyed Vali Reza Nasr.

55. Out of Afghanistan: The Inside Story of the Soviet Withdrawal" by Diego Cordovez and Selig S. Harrison.

56. "Pakistan's Crisis in Leadership" by Maj. Gen. Fazal Muqeem Khan.

57. Pakistan: A Modern History" by Ian Talbot.

58. "Pakistan: The Formative Phase" by Khalid bin Sayeed.

59. "Pakistan: History and Politics" by M. Rafique Afzal.

60. "Pakistan Seeks Security" by Aslam Siddiqui.

61. "Pakistan: A Political Study" by Keith Callard.

62. "Pakistan: The Heart of Asia" by Liaquat Ali Khan.

63. "Pakistan in the Twentieth Century" by Lawrence Ziring.

64. Pakistan's Foreign Policy: An Historical Analysis" by S.M. Burke.

65. "Pakistan: A Dream Gone Sour" by Roedad Khan.

66. "Pakistan in 1971: The Disintegration of a Nation" by Robet La Porte Jr.

67. "Pakistan in 1972: Picking Up the Pieces" by Robert La Porte Junior.

68. "Pakistan Under Bhutto 1971 – 1977" by Shahid Javed Buki.

69. "Pakistan in Transition" by William Howard Riggins.

70. "Pakistan Under Bhutto: Current History" by Khurshid Hyder.

71. "Pakistan in 1975 – The Hydra of Opposition" by Richard S. Wheeler.

72. "Pakistan Leadership Challanges" by Lt. Gen. Jehandad Khan.

73. "Phir Martial Law Aa Gaya" (And then came Martial Law) by Prof. GhafoorAhmad.

74. "Pakistan 1978: At the Brink Again" by Eric Gustafson.

75. "Pakistan in 1983: Internal Stresses More Serious than External Problems" by Khalid bin Sayeed.

76. "Pakistan 1984: Digging In" by William L. Richter.

77. "Pakistan in 1985: Testing Time For the New Order" by William M. Richter.

78. "Pakistan's Strategic Significance" by Ralph Braibanti.

79. " Power and Principle" by Z bigniew Brzezinski.

80. "Pakistan's Economic Performance in the 1980s: Implications for Political Balance" by John Adams.

81. "Pakistan in 1988: From Command to Conciliation Politics" by Rasul B. Rais.

82. "Pakistan's Nuclear Program: A National security Perspective" by Gen Mirza Aslam Beg.

83. "Pakistan Responding Change" by Mushahid Hussain.

84. "Pakistan in 1989: The Politics of Stalemate" by Lawrence Of Ziring.

85. "Pakistan and the Talibaan: Flux in an old Relationship-?" by Tara Kartha.

86. "Pakistan in 1997: Nawaz Shanif's second Chance to Govern" by Anwar H. Syed.

87. "Pakistan in 1998: the Polity Under Pressure" by Hassan Askari Rizvi.

88. "Pakistan: Democracy Is Not Everything" by Richard N. Haass.

89. "Pakistan in 2002: Democracy, Terrorism and Brinkmanship" by Ian Talbot.

90. "Patterns of Global Terrorism 1991" by U.S Department of State (1992)

91. "Pakistan in 1993: Some Democratic Changes" by Tahir Amin.

92. Pakistan in 1995: The Continuing Crisis" by La Porte Jr.

93. "Pakistan in 1994: The Politics of Confrontation" by Tahir Amin.

94. "Pakistan in 1996: Starting over Again" by Robert la Porte Jr.

95. "Pakistan in 1992: Waiting for Change" by Rais Ahmad Khan.

96. "Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah: Speeches as Governor General of Pakistan (1947-48)

97. "Raiders in Kashmir" by Maj. General Akbar Khan (Retd)

98. Reports on the General Electons in Pakistan 1970-1971 by Election Commission of Pakistan (1972)

99. "Rifts Appear in US-Pakistan Alliance: by Steve coll.

100. Sectarian and Religiol Political Terrorism in Pakistan by Musa Khan Jalalzi.

101. "Socio-Economic Indicatons of the Peoples' Party Vote in Punjab" by Shahid Javed Burki.

102. "South Asian Crisis: India, Pakistan and Bengladesh" by Robert Jackson.

103. "Simla Agreement" Signed by Premiers of Pakistan and India on July2, 1972.

104. "Shaheed-e-Islam" (Martyr for Islam) by Abdul Hameed Chaudry.

105. "Soldiers in politics" by Eric A Nordlinger.

106. "Sectarianism in Pakistan: The Radicalization of Shi'i and Sunni Identities" by Muhammad Qasim Zaman.

107. "Security Assistance Programme under Pressler Amendment Suspension" by Bigadier General John D Howard US Defense Representative in Islamabad on Feb 6, 1991 (An Information paper)

108. Secretary of State James A Baker III to Prime Minister Nawaz Sharif on May 10,1992.

109. "The Sole Spokesman: Jinnah, The Muslim League and the Demand for Pakistan" by Ayesha Jalal.

110. "The State of Martial Law" by Ayesha Jalal.

111. "The United States and Pakistan 1947 – 2000" by Dennis kux.

112. "The Emergence of Pakistan" by Ch. Mahmood Ali.

113. The United Nations and Kashmir" M.M.R. Khan.

114. "The Pakistan Army" by Stephen P. Cohen.

115. "The Vanguard of the Islamic Revolution: The Jama'at-i-Islami of Pakistan" by Seyyed Vali Raza Nasr.

116. "The Military in Pakistan: Image and Reality" by Brigadier A.R. Siddiqi.

117. "The Story of Kashmir: Yesterday and Today" by Verinder Grover.

118. "The Impasse of American Foreign Policy" by Hans Morgenthau.

119. "The United States and Pakistan: The Evolution of an Influence Relationship" by Shirin Tahir – Kheli.

120. The British Papers: Secret and Confidential India, Pakistan and Bengla Desh Documents 1958 – 1969 by Roedad Khan.

121. "The Subtle Subversion: The State of Curricula and Text books in Pakistan" by A.H. Nayyar and Ahmad Saleem.

122. "The Story of My Struggle" by Maj Gen Tajammal Hussain Malik.

123. The American Papers: Secret and Confidential, India, Pakistan and Bengladesh Documents 1965-1973 by Roedad Khan.

124. "The end and the Beginning: Pakistan 1969-1971" by Herbert Feldman.

125. "The Separatins of East Pakistan" by Hassan Zaheer.

126. "Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971" by Lt. Gen (Retd) Kamal Mateenuddin.

127. "The Bengladesh Revolution and Its Aftermath" by Talukdar Munir uzzaman.

128. "The Last Days of United Pakistan" by G.M. chaudhary.

129. "The Vanquished Generals and the Liberation War of Bangladesh" by Muntassir Mamoon.

130. Tilt Policy Revisited" by Christoper van Hollen.

131. "The Mirage of Power: An Inquiry into the Bhutto Years 1971-1977" by Mubashir Hassan.

132. "The Political Dynamic of Islamic Resurgence in Pakistan" by William H. Richter.

133. "The Betrayal of East Pakistan" by Lt.Gen.A.A.K.Niazi.

134. "The March 1977 Elections: Where Everyone Lost" by Marvin G. Weinbaum.

135. "The military and politics in Pakistan 1947-1986" by Hassan Askari Rizvi.

136. "The Crisis in Kashmir: Portents of war, Hopes of Peace" by sumit Gangnli.

137. "The Pressler Amendment" by Larry pressler (American senate).

138. "Taliban: Militant Islam, oil and Fundamentalism in Central Asia" by Ahmad Rashid.

139. "Trial and Error: The Advent and Eclipse of Benazir Bhutto" by Iqbal Akhund.

140. "The October 1990 Elections in Pakistan" Reports of the International Delegations.

141. "Talibaan" by Ahmad Rashid.

142. "The Taliban Phenomenon: Afghanistan 1994-1997" by Kamal Mateenuddin.

143. "The Unholy Nexus: Pak Afghanistan Relations under the Taliban" by Imtiaz Gul.

144. "The 9/11 Commission Report".

145. "The Murder of History in Pakistan" by K.K.Aziz.

146. "The Search for Peace in Afghanistan" by Barnett R. Rubin.

147. "The origins of Conflict in Afghanistan" by Jeffery J. Roberts.

148. "The Talibaan: War, Religion and the New order in Afghanistan" by Peter Marsden.

149. "The Tragedy of Afghanistan" by Raja Anwar.

150. "The Accidental Coup" by Louis Dupree.

151. "The Bear Trap: Afghanistan's Untold Story" by Brigadier Muhammad Yousaf and Major Mark Adkin.

152. "United States and Pakistan" by Tahir-Kheli.

153. "Witness to Surrender" by Siddique Salik.

154. "Waiting for Allah: Pakistan's Struggle for Democracy" by Christina Lamb.

155. "Working with Zia: Pakistan's Power Politics 1977-1988" by General Khalid Mahmood Arif.

156. "White Paper on the Performance of Bhutto Regime" by Govt: of Pakistan.

157. "Western Dominance and Political Islam: Challange and Response" by Khalid bin Saeed.

158. "Zulfi Bhutto of Pakistan" by Stanley wolpert.

159. "Zia-ul-Haque Shaheed: Aik Tajzia" (The Mantyr Zia-ul-Haque-An Analysis) by Mahmood Javed.

160. "Zia-ul-Hauqe and I" by Abdul Qayyum.

161. "Zia's Pakistan: Polictics and Stability in a Front Line State" by Craig Baxter.

162. "Zulfiqar Ali: Bhutto and Pakistan 1967-1977" by Rafi Raza.

پاکستان

فوج اور مُلّاؤں کے درمیان

''یہ کتاب پاکستانی سیاست کو قریب سے جاننے اور سمجھنے والے کی ایک جامع اور مدلل تحریر ہے''۔

پیٹر برجن

،سی این این کے تجزیہ نگار اور

کثیر فروخت کی حامل کتاب ''ہولی وار ،اسامہ بن لادن کی خفیہ زندگی'' کے مصنف

. . . .

''ہم حسین حقانی کے مشکور ہیں کہ اُنہوں نے پاکستان کے بااثر اسلام پرستوں اور ملکی فوج کے درمیان گہرے روابط پر ایک تفصیلی کتاب تحریر کی۔ اُن کے مطابق فوج اور اسلام پرستوں کے یہ دیرینہ روابط انتہائی پیچیدہ اور کئی مسائل کا سبب ہیں۔ موجودہ حالات کے ادراک کے لئے اُن کی تحقیق کا گہری نظر سے جائزہ ضروری ہے''۔

سٹیفن پی کوہن

،بروکنگز انسٹیٹیوٹ

،مصنف : پاکستان کا تصور اور پاکستانی فوج۔

وین گارڈ بکس

لاہور، کراچی، اسلام آباد

ISBN: 978-969-402-513-1

www.vanguardbooks.com